طلسمِ محبت

محی الدین نواب

فہرست

طلسم محبت	4
رقص اجل	79
بے حس	159
چیلنج فنڈ	222
آخری کمرہ	268
نامعلوم	315

طلسمِ محبت

اس نوجوان کا قصۂ عجیب جو ایک بھٹکتی ہوئی آتما کو پسند آ گیا تھا۔
اگر وہ نوجوان اسے نہ ملتا تو وہ راکھ بن کر بکھر جاتی۔
دنیا میں محبت سے بڑا جادو کوئی نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی توڑ ہے
اسرار و تجسس میں لپٹی ایک دلگداز و رومانی داستان

تقسیمِ ہند سے قبل برٹش آرمی میں میرے ماموں ملازم تھے۔ وہ جس کور میں ملازم تھے اسے اردو زبان میں "رسالہ" کے نام سے پکارا جاتا تھا اور اس دور میں رسالہ کے جوانوں کے پاس گھوڑے ہوتے تھے۔ جبکہ آج کل کے دور میں موٹر وہیکل استعمال کی جاتی ہے۔

اس دور میں جب بھی رسالہ کا جوان اپنے گھر چھٹی پر آتا تھا تو اسے اپنا گھوڑا اور ہتھیار ساتھ لانے کی اجازت ہوتی تھی۔

ماموں ہر سال دو ماہ کی چھٹی گھر پر گزارتے تھے۔ ماموں کا گھر ضلع رہتک (بھارت) کے ایک گاؤں کاہنور میں تھا اور وہیں پر ان کی زرعی زمینیں بھی تھیں جسے ان کے بھائی کاشت کیا کرتے تھے۔ رسالہ کی نوکری اور زراعت کا کام بڑی خوش اسلوبی سے چل رہا تھا اور گھر میں ہر طرح کی خوش حالی تھی۔

ایک دفعہ وہ سالانہ چھٹیوں میں اپنے گھوڑے پر سوار گھر آ رہے تھے۔ گرمیوں کے دن تھے اور گرمی بھی اپنی جوانی پر تھی۔ گرم ہواؤں کے تھپیڑوں نے حلق میں کانٹے چبھو دیئے تھے۔

انہوں نے پیاس کی شدت سے پریشان ہو کر اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ نزدیک و دور پانی کہیں نظر نہیں آیا۔ گھوڑا بھی پیاسا تھا۔ وہ ہانپتا کانپتا نڈھال سا سُست رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔

اچانک ان کی نظر درختوں کے درمیان ایک کنوئیں پر پڑی۔ انہوں نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ دیں۔ اس کا رخ کنوئیں کی جانب کر کے خراماں خراماں آگے بڑھنے لگے۔ وہ خوش بھی تھے اور حیران بھی۔ خوش اس لئے تھے کہ پانی نظر آ گیا تھا اور حیرانی کی وجہ اس کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھی ہوئی وہ عورت تھی۔

ماموں جھاڑیوں کی اوٹ سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ نہایت ہی حسین و جمیل دکھائی دے رہی تھی۔ عمدہ لباس میں ملبوس اور قیمتی زیورات سے آراستہ اپنے گھڑے میں پانی بھر رہی تھی۔ اس نے بہت خوبصورت سا گھاگھرا پہنا ہوا تھا جس کی چھوٹی سی چولی پر بیل بوٹے اس خوبصورت انداز میں بنائے گئے تھے کہ وہ اس کے مغرور سینے کے ابھار کو واضح کر رہے تھے۔

چنری کو سر پر رکھ کر پیچھے کمر پر پھیلایا ہوا تھا۔ وہ پانی بھرنے کے ساتھ ساتھ زار و قطار رو بھی رہی تھی۔

ماموں ہمت کر کے کنوئیں کے قریب آئے۔ ڈول اس کے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے ہچکچاتے ہوئے اس سے پانی مانگا۔

اس نے اپنی گھنیری اور لانبی پلکوں کا پردہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ کاجل سے بھری ہوئی چمکتی آنکھوں نے انہیں سحرزدہ کر دیا۔ ان میں عجیب سا خمار تھا۔ ماموں ان جھیل جیسی آنکھوں میں کہیں ڈوب گئے تھے۔

وہ مترنم لہجے میں بولی تو انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ "تم کون ہو ہندو یا مسلم؟"

وہ بولے۔ "میں الحمدللہ مسلمان ہوں۔"

وہ انہیں میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں تو ہندو ہوں۔ تمہیں پانی نہیں پلا سکتی۔ اگر تم نے یہاں پانی پیا تو ہمارا یہ کنواں نشٹ ہو جائے گا۔"

انہوں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "مجھے اور میرے گھوڑے کو بہت پیاس لگی ہے۔ تم ہم دونوں کو پانی پلا دو۔ رام بھلی کرے گا۔"

اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ سورج جیسے سوا نیزے پر تھا۔ دھوپ اور لُو سے بدن جل رہا تھا۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ مسافر اور گھوڑے کو شدت سے پیاس لگی ہو گی۔

وہ بولی۔ "پانی تو میں پلا دوں گی مگر تمہیں میری ایک بات ماننی ہو گی۔"

وہ پیاس سے نڈھال ہو رہے تھے۔ انہوں نے بے بسی سے کہا۔ "میں تمہاری ہر بات مانوں گا۔ تم خدا کے لئے مجھے پانی پلا دو۔"

وہ پیاس اور تھکن سے نڈھال ہو کر گھاس پر بیٹھ گئے۔ وہ بھی ان کے برابر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "تم خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم کھا کر مجھے وچن دو، جو میں کہوں گی تم وہ کرو گے۔"

ان کی آنکھوں میں دھوپ چبھ رہی تھی۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق انہوں نے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم کھا کر اسے وچن دیا۔ "تم ہمیں پانی پلا دو، اس کے بعد جو کہو گی میں کرنے کو تیار ہوں۔"

اس نے یہ سنا تو خوشی خوشی ماموں کو اور ان کے گھوڑے کو پانی پلانے لگی۔ یہی نہیں بلکہ اس نے انہیں مٹھائی اور عمدہ قسم کے پھل بھی کھلائے۔ نہ جانے وہ مٹھائی اور پھل کہاں سے آئے تھے؟ ماموں بھوک پیاس سے نڈھال تھے، حیران تو ضرور ہوئے مگر چپ رہے۔

اس نے کہا۔ "تم تھکے ہوئے ہو۔ درخت کی چھاؤں میں ذرا آرام کر لو۔ جب تک میں تمہارے گھوڑے کو گھاس کھلاتی ہوں۔"

پیٹ بھر جانے کے بعد آنکھوں میں نشہ چھانے لگا تھا۔ وہ ذرا ستانے کے لئے ایک درخت کے سائے میں لیٹ گئے پھر نہ جانے کب ان کی آنکھ لگ گئی۔

وہ جب سو کر اٹھے تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔ وہ ان کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے اپنے نہایت قریب دیکھ کر وہ بوکھلا کر اٹھ بیٹھے۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ گھوڑا دوسرے درخت کے سائے میں کھڑا گھاس کھا رہا تھا اور بہت چاق و چوبند دکھائی دے رہا تھا۔

وہ انہیں بڑے دلربا انداز میں دیکھ کر مسکرا رہی تھی پھر مٹکے سے پانی نکالتے ہوئے بولی۔ "منہ ہاتھ دھو لو۔ تازہ دم ہو جاؤ گے۔"

اس نے ٹھنڈے پانی سے ان کا ہاتھ منہ دھلایا، وہ اپنے رومال سے چہرے کو خشک کرنے لگے۔ وہ ان کے سامنے بیٹھ کر بڑی گہری نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

ماموں اس زمانے میں اپنی بھرپور جوانی میں تھے۔ وجیہہ اور پرکشش تھے۔ فوجی جوان ہونے کے باعث ان کا جسم کسرتی اور ٹھوس تھا جس نے ماموں کی خوبصورتی اور جوانی میں چار چاند لگا دیئے تھے۔

وہ اس کی نگاہوں کی تپش کو برداشت نہ کرتے ہوئے ذرا سے جھینپ گئے۔ ماموں فطرتاً شرمیلے تھے۔ اس نے انہیں شرماتے ہوئے دیکھا تو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی کی کھنک میں بھی عجیب طرح کی شیرینی گھلی ہوئی تھی۔ وہ بولی۔ "تم تو کنواری لڑکیوں کی طرح شرما رہے ہو۔"

ماموں شرمندہ سے ہو کر بولے۔ "نہیں .... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ تم میرے لئے غیر اور اجنبی ہو اور مجھے غیر عورتوں سے شرم محسوس ہوتی ہے۔"

ان کی بات سن کر اس نے للچائی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھا پھر اٹھلا کر بولی۔ "اب میں تمہارے لئے اجنبی یا غیر نہیں ہوں۔ تمہیں مجھ سے شرمانا یا گھبرانا نہیں چاہئے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بڑی ادا سے چلتے ہوئے ان کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی۔ پھر اپنا سر ان کے کشادہ سینے پر رکھ دیا اور بازوؤں کو ان کے گلے کا ہار بنا دیا۔ اس کی سانسوں کی گرمی ان کے سینے کو چیرتی ہوئی دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر رہی تھی۔

انہوں نے گھبرا کر خود کو اس سے چھڑانا چاہا لیکن ذرا سی کوشش کے بعد ہی انہیں محسوس ہوا کہ اس کی گرفت کافی مضبوط ہے۔ وہ نہ تو اس کی گرفت سے آزاد ہو سکتے تھے اور نہ ہی اٹھ کر کھڑے ہو سکتے تھے۔

وہ ان کی بے بسی دیکھ کر چیلنج کرنے کے انداز میں بولی۔ "اگر طاقت ہے تو آزاد ہو کر دکھاؤ۔"

وہ حیران ہو رہے تھے کہ جوان مرد سپاہی ہو کر ایک نازک اندام سے خود کو چھڑا نہیں پا رہے تھے۔

وہ دوبارہ کسمسائے مگر خود کو آزاد نہ کرا سکے۔ تھک ہار کر انہوں نے خود کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اس نے جب دیکھا کہ ماموں نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں تو وہ ان سے الگ ہو کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "تم تو خواہ مخواہ ہی گھبرا رہے ہو۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتی۔ بس تمہاری جوانی اور خوبصورتی دیکھ کر تم پر پیار آ گیا تھا۔"

سورج کافی ڈھل چکا تھا۔ دھوپ کی تمازت میں بھی کمی آ چکی تھی۔ موسم کچھ ٹھنڈا ہو چکا تھا لیکن وہ انہیں اپنی قربت سے گرما رہی تھی۔ وہ ذہن کو جھٹک کر اپنی جگہ سے

اٹھتے ہوئے بولے۔ "تمہاری خاطر مدارات کا بہت بہت شکریہ۔ اب مجھے جانے کی اجازت دو تاکہ رات ہونے سے قبل کسی گاؤں میں پہنچ سکوں اور وہاں رات گزار کر صبح اپنے گھر کی طرف سفر اختیار کر سکوں۔"

وہ ایک ادا سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی پھر اپنی چولی کو درست کرتے ہوئے ان کے قریب ہو کر بولی۔ "تم نے پانی پینے سے پہلے اپنے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سوگند کھا کر وچن دیا تھا کہ میں جو کہوں گی تم ویسا ہی کرو گے مگر تم وچن پورا کرنے سے پہلے ہی جانے کی بات کر رہے ہو؟"

اس کی بات سن کر انہیں یاد آیا کہ انہوں نے اس کی بات ماننے کا وعدہ کیا تھا۔

وہ بولے۔ "اچھا تم جلدی سے بتاؤ' تمہارے لئے کیا کروں؟"

اس نے گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ اس کے گداز سینے کا لمس انہیں بے چین کرنے لگا۔ سمجھ میں نہیں آیا کیا کریں۔

وہ بولی۔ "تم وعدہ کرو' مجھے اپنی شریکِ حیات بناؤ گے۔"

وہ ایک دم سے چونک گئے۔ اس نے بات ہی ایسی کی تھی جو ان کے سر پر بم کی طرح پھٹ پڑی تھی۔ وہ پریشانی کے عالم میں خود کو اس سے الگ کرنے کی کوشش کرنے لگے مگر ناکام رہے۔

وہ سینے سے لگی بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں بہت دکھیاری عورت ہوں۔ رام کے نام پر مجھے خود سے الگ نہ کرو۔ اگر تم نے مجھے ٹھکرا دیا تو میں اسی وقت تمہارے سامنے اپنی جان دے دوں گی۔"

ماموں اس صورتِ حال سے گھبرا گئے۔ وہ وعدہ تو کر ہی چکے تھے۔ بے بسی سے بولے۔ "تم مجھے اپنا دکھ سناؤ' اس کے بعد ہی میں کوئی فیصلہ کر سکوں گا۔"

وہ ان سے الگ ہو گئی پھر انہیں شانوں سے تھام کر بٹھاتے ہوئے بولی۔ "تم سکون سے بیٹھ جاؤ تاکہ میں اپنی دکھ بھری بپتا سنا سکوں۔"

وہ ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔ وہ سر جھکا کر گھاس کو اپنے ہاتھ سے نوچنے لگی۔ شاید داستان شروع کرنے کے لئے الفاظ جمع کر رہی تھی۔ ماموں ہمہ تن گوش بیٹھے تھے۔

اس نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا پھر بولی۔ "یہاں سے دس کوس کے فاصلے پر ہمارا گاؤں ہے۔ جہاں مَیں ماتا پِتا' بہن بھائیوں اور سکھیوں کے ساتھ بڑے سکھ چین سے زندگی گزار رہی تھی۔ ہمارے گھر میں ہر طرح کا آرام تھا۔ کھانے پینے کی فراوانی تھی۔ میرے پتا جی گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار تھے اور پنچائیت کے سرپنچ بھی تھے۔ اس وجہ سے پورا گاؤں ہماری بڑی عزت کیا کرتا تھا۔"

اپنے باپ کا ذکر کرتے ہوئے اس کے چہرے پر دکھ اور کرب کے سائے لہرانے لگے تھے۔ اس نے آنکھوں سے گرنے والے پانی کے دو قطروں کو اپنی چنری سے صاف کیا پھر بولی۔ "زندگی کے دن بڑے آرام اور سکون سے گزر رہے تھے۔ میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی اور بڑے ناز و نعم سے پلی تھی۔ مجھ سے چھوٹی ایک بہن اور ایک بھائی تھا۔ ہمارے والدین ہمیں بہت پیار کرتے تھے۔ خاص طور پر میری ہر خواہش کا احترام کیا جاتا تھا جس کے باعث میں کچھ خودسر بھی ہو گئی تھی۔"

وہ مسکرا رہی تھی اور خلا میں یوں تک رہی تھی جیسے سارا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے ہو۔

وہ بولی۔ "گھر کا کام کاج نوکرانی کرتی تھی اور میں سارا دن سکھیوں کے ساتھ کھیتوں' گاؤں کی گلیوں اور گھروں میں کھیلتی پھرتی۔ جوانی کب آئی' مجھے کچھ خبر نہ ہوئی۔ ہاں اتنا فرق ضرور محسوس ہوا کہ میری طرف اٹھنے والی نظروں کے انداز بدل گئے تھے۔ ماں ہمیشہ مجھے چنری اوڑھے رہنے کی ہدایت کرنے لگی تھی لیکن پھر بھی میرا لاابالی پن نہ گیا۔ میرے یوں آزادانہ پھرنے کے باوجود کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کوئی میرے قریب ہونے کی کوشش کرتا۔ آخر گاؤں کے سرپنچ کی بیٹی جو تھی۔"

اپنی الھڑ جوانی کا ذکر کرتے ہوئے جو خوشی کے سائے اس کے خوبصورت چہرے پر لہرا رہے تھے وہ ایک دم سے ہوا ہو گئے۔

وہ ذرا ناگواری سے بولی۔ "پھر وہ منحوس دن آ گیا جس دن سے ہمارے گھر کی تباہی اور بربادی شروع ہو گئی اور ہماری عزت و شہرت خاک میں مل گئی۔ میرے سارے گھر والے رام کو پیارے ہو گئے اور گاؤں والوں نے مجھے منحوس کہہ کر گاؤں سے نکال دیا۔ تب سے مَیں اس کنوئیں پر رہ رہی ہوں۔ اس بدبخت نے میرے گھر والوں کی عزت اور

شہرت کو اور میری زندگی کو برباد کر دیا۔"

وہ کسی ہرجائی کا ذکر کر رہی تھی۔ ایسے وقت اس کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔ اس کی سانسوں سے انتقام کی آگ کی تپش محسوس ہو رہی تھی۔

وہ کسی ناگن کی طرح پھنکارتے ہوئے بولی۔ "اس نے آنے کا وعدہ کیا تھا مگر اب تک نہیں آیا۔ اب مجھے اس سے سخت نفرت ہو گئی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ وہ ایک بار مجھ سے ملنے آئے تو میں اسے آنِ واحد میں قتل کر دوں گی۔ اس کے لہو سے ہی میرے اندر کی آگ بجھے گی۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ ماموں اس کا لہجہ اور اس کے خیالات سن کر کچھ سہم گئے تھے پھر ہمت کر کے بولے۔ "تم نے اصل قصہ تو سنایا ہی نہیں جس کی وجہ سے یہ سب کچھ تمہارے ساتھ ہوا تھا۔"

اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ "آج سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے میری ایک سہیلی کی برات قریبی شہر سے آئی۔ میں اور میری تمام سہیلیاں خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھیں۔ ہم سب ہم عمر تھیں۔ گاؤں کی صاف آب و ہوا اور خالص خوراک نے ہماری جوانی کو دوچند بنا دیا تھا۔ ہمارے رنگ و روپ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے اور میں تو سرپنچ کی بیٹی تھی۔ کبھی کوئی فکر مجھے چھو کر نہیں گزری تھی۔ بے فکری اور خوش حالی نے میرے حُسن و شباب کو مزید نکھار بخش دیا تھا۔ چہرہ تو یوں بھی سرخ و سفید تھا لیکن سہیلی کی شادی کی خوشی نے رخساروں پر گلاب کھلا دیئے تھے۔"

وہ اپنے حُسن کا تذکرہ کر رہی تھی اور ماموں اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ اس کی باتوں میں جھوٹ نہیں تھا۔ وہ واقعی بلا کی حسین تھی۔ چہرے پر اب بھی گلاب کھلے ہوئے تھے۔

وہ بولی۔ "ہمارے رواج کے مطابق برات کو تین دن تک لڑکی والوں کے گھر روکا جاتا تھا۔ میری سہیلی کی برات بھی تین دن تک ہمارے گاؤں میں رکی تھی اور یہی تین دن میرے لئے منحوس ثابت ہوئے جو ہمارے ہنستے بستے گھر پر قیامت بن کر ٹوٹے تھے۔"

وہ ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگی۔ "میری سہیلی کے دولہا کے ساتھ اس کا ایک دوست .... شہ بالا بن کر آیا تھا۔ اس کا نام پربھو تھا اور شودر برادری سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ

ایک صحت مند خوبرو جوان تھا۔ میں نے پہلی بار کسی جوان لڑکے کو غور سے دیکھا تھا اور اسے دیکھ کر پہلی بار میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئی تھیں۔ وہ ایک ہی نظر میں میرے دل میں گھر بناتا چلا گیا۔ شاید دوسری طرف اس کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی میرے قیامت خیز حُسن و شباب کو دیکھ کر دل و جان سے مجھ پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ جب بھی ہماری نظریں ملتیں تو ایک دلفریب مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیلنے لگتی۔ اس کی نگاہوں سے محبت کا اظہار ہونے لگا تھا۔ بس یہ محسوس کرتے ہی میں تو ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔ تنہائی میں گنگنانے لگی تھی۔"

اس کے چہرے پر گلاب سے کھل رہے تھے۔ باسی محبت کی یاد اس کی آنکھوں میں باسی پھولوں کی پتیوں کی طرح بکھر رہی تھی۔ ماموں بڑی توجہ سے اس کے چہرے کو پڑھ رہے تھے اور اس کی داستانِ حیات سن رہے تھے۔

وہ نظریں جھکا کر بولی۔ "ہم آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو محبت کا پیغام دینے لگے۔ ہماری اس خاموش محبت کا سلسلہ دو دن تک چلتا رہا۔ ان دو دنوں نے میری دنیا ہی بدل دی تھی۔ کوئی دل میں بس جائے تو ہر منظر اتنا حسین ہو جاتا ہے۔ اس تجربے سے میں پہلی بار گزر رہی تھی۔ ہمارے رواج کے مطابق دلہن کی بہنوں کے علاوہ اس کی سکھیوں کو بھی دولہا کی سالیاں ہی کہا جاتا تھا۔ ہم سب سہیلیاں ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہمارے ساتھ دولہا اور اس کا شہ بالا پربھو بھی موجود تھا۔ سالیاں ہونے کے ناتے ہم سب دولہا سے ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ میں اور پربھو ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھ رہے تھے۔ سب ہی کی توجہ دولہا کی طرف تھی۔ اچانک پربھو نے مجھے کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس نے ایسا اشارہ پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ اس میں پیار بھرا حکم چھپا ہوا تھا۔

"کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گئی۔ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیا کروں؟ میں نے ایک بار پھر چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کسی کی توجہ میری طرف نہیں تھی۔ سب دولہا سے چھیڑ چھاڑ کرنے میں مشغول تھیں۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور چپ چاپ اٹھ کر کمرے سے باہر چلی آئی۔ برآمدے میں آ کر دیکھا' تمام مرد اور خواتین صحن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے کچھ کھانے میں مصروف تھے۔

"برآمدہ تقریباً ویران تھا۔ مَیں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ پربھو کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں دائیں طرف مڑ کر دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگی۔ اس طرف ایک قطار میں تین چار کمرے بنے ہوئے تھے۔

"میں برآمدے کی جالیوں سے آنگن کی طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک ایک مضبوط گرفت نے میرا بازو پکڑ لیا اور پھر تقریباً کھینچتے ہوئے ایک کمرے میں لے آیا۔ میں چیخنا چاہتی تھی مگر آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ اچانک اس افتاد نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

"اس گرفت نے کمرے میں آ کر مجھے آزاد کر دیا۔ وہاں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ یہاں میرے علاوہ اور کون ہے پھر چٹخنی چڑھانے کی آواز سنائی دی۔

"میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے کسی کو دیکھنے اور محسوس کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایسے وقت دو بازوؤں کے حصار نے میری کمر کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔

"اندھیرے اور خاموشی میں سوائے دھڑکنوں اور سانسوں کی آواز کے کچھ سنائی یا سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرا ذہن فوراً پربھو کی طرف گیا۔ ہو نہ ہو' یہ وہی ہے۔ اس احساس سے میں سرشار ہونے لگی۔ خود کو اس کے حوالے کر دیا۔"

وہ بڑے واضح الفاظ میں اپنی داستان سنا رہی تھی اور میرے شرمیلے ماموں خاموشی سے سر جھکائے اس کی گفتگو سن رہے تھے اور دل ہی دل میں اس کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ یہ کیسی بے باک عورت ہے؟ ایک غیر شخص کو اپنا قصہ اتنے کھلے لفظوں میں سنا رہی ہے۔

رات کافی گزر چکی تھی۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ اپنا قصہ سنانے کے دوران میں اس عورت نے ایک لالٹین روشن کر لی تھی۔ اس کی روشنی میں اس کی سیاہ آنکھوں کی چمک مزید بڑھ گئی تھی۔

ماموں کچھ سہمے ہوئے تھے۔ انہیں رہ رہ کر اس کی مضبوط گرفت یاد آ رہی تھی۔ وہ ایک فوجی جوان تھے لیکن اس کے باوجود خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرانے میں ناکام رہے تھے۔ پھر انہیں یہ باتیں بھی الجھا رہی تھیں کہ وہ اس ویرانے میں تازہ پھل اور

مٹھائی کہاں سے لائی تھی اور اب جبکہ رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا تو اس نے نہ جانے کہاں سے لالٹین روشن کرلی تھی۔

ماموں کچھ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ الجھ رہے تھے مگر خاموش تھے۔ وہ اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "ہم دونوں بہت آگے نکل چکے تھے۔ جب طوفان تھم گیا تو میں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ وہ بڑے پیار .... سے بولا۔ "تم مجھ پر وشواس کرو۔ میں تمہیں دھوکا نہیں دوں گا۔ تمہارے گھر والوں سے تمہارا ہاتھ مانگوں گا۔ تمہیں اپنی دلہن بنا کرلے جاؤں گا۔"

"میں اس کے سینے میں منہ چھپا کر سسک رہی تھی اور وہ شادی کے وعدے کر رہا تھا۔ مجھے تسلیاں دے رہا تھا۔

"اچانک دروازے کو باہر سے بُری طرح پیٹا جانے لگا۔ اس آواز نے ہمارے ہوش اڑا دیئے۔ میں نے گھبرا کر پربھو کی طرف دیکھا۔ اب تک آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو چکی تھیں۔ اس کی بھی حالت میری طرح تھی۔ وہ بھی گھبرایا ہوا تھا اور آنکھیں پھاڑے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں نے سرگوشی میں پوچھا۔ "پربھو! اب کیا ہو گا؟"

"اس کے جواب دینے سے پہلے میرے پتا جی کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے پکار رہے تھے۔ ان کی آواز سن کر تو میری حالت مردے جیسی ہو گئی۔ دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔

"ہم نے دروازہ نہیں کھولا۔ آخر گاؤں والوں نے اس کو پیٹ کر توڑ ڈالا۔ دروازہ کھلتے ہی بہت سے افراد کمرے میں گھسے چلے آئے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کھڑے تھے۔

"گاؤں والوں نے ہمیں علیحدہ کیا اور کمرے سے باہر لے آئے۔ براتیوں کے ساتھ آنے والے ایک معمر شخص نے کہا۔ "اس سارے معاملے میں قصور لڑکی کا ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر لڑکا کچھ نہیں کر سکتا تھا اس لئے آپ لوگ پربھو کو چھوڑ دیں۔"

"گاؤں والوں نے ان کی بات پر غور کیا اور آپس میں مشورہ کرنے کے بعد پربھو کو براتیوں کے حوالے کر دیا۔

"تمام مرد اور عورتوں کی نظریں مجھ پر تھیں۔ سب دبی دبی زبان میں کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے۔ میں جس کے ساتھ بدنام ہوئی تھی وہ مجھ سے نظریں ملائے بغیر چپ چاپ اپنے براتیوں کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ اس نے تو ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں لیکن اب مجھے تنہا اس بدنامی کی آگ میں جلنے کے لئے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

"میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ میرے گھر والوں کی عزت خاک میں مل چکی تھی۔ لوگوں کی چبھتی ہوئی باتیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ میں بت بنی کھڑی تھی۔

"اچانک ہونے والے شور نے مجھے چونکا دیا۔ میرے پتا جی زمین پر گرے ہوئے تھے۔ بہت سے افراد ان پر جھکے ہوئے تھے۔ میں انہیں پکارتی ہوئی ان کی طرف بڑھی لیکن .... لیکن وہ میری بدنامی کا صدمہ برداشت نہ کرتے ہوئے جلد ہی رام کو پیارے ہو گئے۔ انہیں دل کا شدید دورہ پڑا تھا۔"

وہ کہتے کہتے رونے لگی۔ وہ بڑے دکھ سے اسے دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اندھی محبتیں کیسے ہنستے بستے گھر اجاڑ دیتی ہیں؟ پل بھر کے جذباتی لمحے عمر بھر کا روگ بن جاتے ہیں۔

وہ چنری سے آنسو خشک کرتے ہوئے بولی۔ "بس اس قیامت خیز رات نے میری دنیا اندھیر کر دی۔ ایک صدمہ محبوب کے بے وفا ہونے پر دل کو لگا تھا مگر دوسرا صدمہ تو مجھے جیتے جی مار گیا۔ میں خود کو اپنے پتا جی اور ان کی عزت و شہرت کا قاتل سمجھنے لگی۔ یہ سوچ سوچ کر جان نکلی جا رہی تھی کہ اب پتا جی کی چتا کے ساتھ میری ماں کو بھی جلنا ہو گا۔ سب عزیز و اقارب دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ پورا گاؤں ماتم کدہ بن گیا تھا۔ سب کے باہمی مشورے کے مطابق مجھے میرے گھر کے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ میں روتی رہی چیختی رہی مگر کسی نے میری آہ و بکاہ نہ سنی۔

"میں اپنے ماں باپ کا آخری دیدار بھی نہ کر سکی۔ اگلے روز میرے پتا جی کا کریا کرم کر دیا گیا اور ہماری راجپوت برادری کی رسم کے مطابق ماں کو بھی اس آگ میں جلا دیا گیا۔ اس طرح وہ بھی میری چھوٹی سی بھول کے باعث جل کر راکھ ہو گئیں۔"

وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ ماموں نے ہمت کر کے آگے بڑھ کر اس کے شانے کو

تھپتھپایا۔ واقعی اس کی بپتا بڑی دکھ بھری تھی۔

اس نے ان سے پوچھا۔ "تمہیں بھوک لگی ہوگی؟ میں ابھی تمہارے لئے پھل اور مٹھائی لاتی ہوں۔"

وہ اٹھ کر جانے لگی۔ ماموں نے اس کا بازو پکڑ کر اسے بٹھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے بھوک نہیں ہے۔ تم اپنی داستان سناؤ۔"

وہ ان کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئی پھر بولی۔ "میرے ماں باپ کا کریا کرم کرنے کے بعد مجھے آزاد کر دیا گیا۔ تب تک میری سہیلی کی برات بھی واپس جا چکی تھی۔ میرا کوئی بڑا بھائی نہیں تھا لہٰذا میری سرپرستی میرے چچا اور تایا نے سنبھال لی۔ انہوں نے میرا گھر سے نکلنا' لوگوں سے ملنا جلنا بند کر دیا تھا۔ ویسے بھی اتنی بدنامی کے بعد میرا دل بھی گھر سے باہر جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ میں سارا سارا دن خود کو گھر کے کاموں میں مصروف رکھتی۔

"میری چچی اور تائی بات بات پر مجھے طعنے دیتی رہتیں۔ میں اس طعنہ زنی کو بڑے صبر سے برداشت کرتی تھی۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا کیونکہ غلطی میری ہی تھی۔ میں نے ہی جوانی میں دیوانی ہو کر عزت و آبرو کو ایک غیر کے حوالے کر دیا تھا اور بے غیرتی کی آخری حد کو بھی پار کر گئی تھی۔

"میرے چچا اور تایا نے ہمارے گھر اور زمین و جائیداد پر قبضہ کر لیا تھا۔ انہوں نے گھر میں کام کرنے والی نوکرانی کی بھی چھٹی کر دی تھی۔ میں تو ویسے ہی خود کو کام وغیرہ میں مصروف رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ نوکرانی کے چلے جانے کے بعد چچی اور تائی کا ہر حکم میرے لئے ہوتا تھا اور میں ان کے ہر حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور تھی۔

"پے در پے صدمات میری زندگی کو بوجھ بناتے جا رہے تھے۔ ایک بار پھر مجھ پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ان دنوں ہمارے گاؤں میں طاعون کا مرض بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا۔ ہر روز دو چار افراد اس بیماری کے باعث لقمۂ اجل بن جاتے تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ شاید یہ بیماری ہی مجھے اس بدنامی کی زندگی سے نجات دلا دے گی۔

"مگر بھگوان کے بھید وہی بہتر جانتا ہے۔ ابھی مجھ گناہگار کی سزا ختم نہیں ہوئی تھی۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد میرے جینے کا سہارا میرے چھوٹے بہن بھائی تھے۔ میری ساری محبتیں اور توجہ ان دونوں کے لئے تھیں۔

"لیکن بھگوان نے انہیں بھی مجھ سے چھین لیا۔ اس بیماری نے میری جان لینے کے بجائے میرے پیاروں کی جان لے لی۔ میرا پورا گھرانہ اجڑ گیا۔

"میرے تایا اور چچا کو پتا جی کی جائیداد ہڑپ کرنے کا کھلا راستہ مل گیا۔ انہوں نے پورے گاؤں میں یہ مشہور کر دیا کہ میں منحوس ہوں۔ میں نے اپنے پورے گھرانے کو تباہ کر دیا ہے۔ سب کی جانیں لے لی ہیں۔

"پورا گاؤں مجھے اچھوت سمجھنے لگا۔ سب میرے قریب آنے سے کترانے لگے۔ کوئی مجھ سے بات بھی نہیں کرتا تھا۔ محلے کی عورتیں ہمارے گھر آتیں تو میری چچی اور تائی سے کہتیں۔ "جب ہم تمہارے گھر آیا کریں تو اس سے کہہ دیا کرو کہ یہ اپنے کمرے سے نہ نکلا کرے۔"

"یوں میں گھر میں قیدی بن کر رہ گئی۔ ساری ساری رات بھگوان کی پوجا کرتی رہتی اور اپنے گناہوں کی معاف مانگتی رہتی۔

"کچھ عرصے بعد میری سہیلی شہر سے گاؤں اپنے میکے والوں سے ملنے کے لئے آئی۔ اسے بھی میری بربادی کا علم ہو چکا تھا اور مجھ پر لگی ہوئی پابندیوں سے بھی آشنا تھی۔ میں نے جب یہ سنا کہ وہ شہر سے گاؤں آئی ہے تو میرا دل اس سے ملنے کے لئے تڑپنے لگا۔ دل میں کہیں یہ آس چھپی ہوئی تھی کہ اس کے ذریعے پربھو کی کوئی اطلاع ضرور ملے گی۔ اس کی بے وفائی کے باوجود دل میں اس کی محبت اب تک زندہ تھی۔ شاید پہلی محبت اسی کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے میں بدنام ہوئی' میری دنیا اجڑ گئی' پھر بھی اس کے لئے میرا دل مچل رہا تھا۔ میں کسی بھی طرح اپنی سہیلی سے ملنا چاہتی تھی لیکن مجبور تھی۔

"ایک رات محلے کی عورتیں اوز میری تائی' چچی رام لیلا دیکھنے گئیں۔ وہ جانتی تھیں کہ میں گھر سے باہر نہیں نکلوں گی مگر میں تو موقع کی تاک میں تھی۔ چپ چاپ پچھلے دروازے سے نکل کر سہیلی کے گھر کی طرف جانے لگی۔ گاؤں کے کچے مکانات دور دور بنے ہوئے تھے۔ گلیوں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شاید تمام گاؤں والے رام لیلا دیکھنے گئے تھے۔ کسی کسی گھر سے روشنی کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔

"میں گلیاں پار کرتی ہوئی کھیتوں کی طرف آ گئی۔ کھیتوں کے اس پار بھی مکان بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک میری سہیلی کا گھر تھا۔ میں ذرا سہمی ہوئی تھی۔ گیدڑ کی آواز

ماحول کو مزید پُراسرار بنا رہی تھی۔ مَیں اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی پگڈنڈی پر چل رہی تھی اور کوشش کر رہی تھی کہ جلد از جلد اپنی منزل پر پہنچ جاؤں۔

"چاندنی رات اپنے جوبن پر تھی۔ سارا منظر واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا اس لئے میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی چلتی جا رہی تھی۔ اچانک میری نظر سامنے سے آتے ہوئے ایک شخص پر پڑی۔ میں ٹھٹک گئی۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

"شاید اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا' وہ بھی اپنی جگہ رک گیا تھا۔ میں ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ جس سے ملنے اور جس کا ذکر سننے کے لئے میں تڑپ رہی ہوں اور جس کی تڑپ نے مجھے یوں تنہا ویران رات میں گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا ہے وہ ایسے اچانک نگاہوں کے سامنے آ جائے گا۔

"اندھیرا نہ ہونے کے باعث میں نے فوراً ہی اسے پہچان لیا۔ وہ کوئی اور نہیں تھا .... میرا پربھو تھا .... میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیرنے لگے۔ میں تقریباً دوڑتی ہوئی آگے بڑھی۔

"لیکن وہ مجھے بڑھتا دیکھ کر پلٹ کر جانے لگا۔ اس کا یہ انداز میری سمجھ مین نہیں آیا۔ چاندنی اچھی خاصی تھی۔ ایسے میں یہ بات ناممکن تھی کہ اس نے مجھے پہچانا نہ ہو۔

"میں اسے پکارتی ہوئی تیزی سے دوڑنے لگی۔ پربھو .... پربھو .... رک جاؤ .... میں تمہاری پدمنی ہوں .... پربھو!"

"میں اسے پکارتی رہی' دوڑتی رہی مگر وہ نہیں رکا بلکہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

"میں نے اسے آواز دے کر کہا۔ "رک جاؤ پربھو! اپنی پدمنی کو تنہا مت چھوڑ کر جاؤ۔ میں اس دھرتی پر اکیلی رہ جاؤں گی۔ کوئی بھی میرا اپنا نہیں رہا۔ سوائے تمہارے .... تم بھی مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے تو میں جیتے جی مر جاؤں گی۔ تمہارے ساتھ بدنام ہوئی ہوں' تمہارے سنگ ہی اپنا جیون بتانا چاہتی ہوں پربھو!"

"وہ میری باتیں سن کر رک گیا۔ دل کو کچھ آس بندھی' اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا پھر گھور کر غصے سے غراتے ہوئے بولا۔ "میرے پیچھے مت آ واپس چلی جا .... ورنہ پچھتائے گی۔"

"اتنا کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ میری سہیلی کا گھر آ چکا تھا۔ وہ ایک گلی کے اندر جاتا ہوا دکھائی دیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے وہاں تک آئی مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ نہ جانے کہاں گم ہو گیا تھا؟

"میں دیوانوں کی طرح ایک گلی سے دوسری گلی میں دوڑ رہی تھی۔ اسے پکار نہیں سکتی تھی۔ میری آواز سن کر کوئی بھی باہر آ سکتا تھا۔ مجھے دیکھ سکتا تھا۔

"ان مکانات کے دوسری طرف بھی کھیت پھیلے ہوئے تھے اور دائیں طرف کچھ فاصلے پر مرن گھاٹ تھا۔ میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ دور دور تک ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے مرن گھاٹ کی طرف دیکھا۔ اس کا بوسیدہ سا دروازہ دھیرے دھیرے ہل رہا تھا۔ ہوا نہ ہونے کے برابر تھی۔ مجھے شک ہوا کہ شاید پربھو اندر گیا ہے۔

"میں تیزی سے چلتی ہوئی مرن گھاٹ کے دروازے کے پاس آئی۔ چھوٹی سی چاردیواری سے اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ پنڈت جی کی کٹیا میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ ایک جھاڑی کی اوٹ سے پربھو کی جھلک نظر آئی۔ وہ مجھے دیکھ کر چھپ رہا تھا۔

"میں دوڑتی ہوئی مرن گھاٹ کے اندر آئی اور اسے آوازیں دیتی ہوئی اس جھاڑی کی طرف بڑھنے لگی۔

"میرے وہاں پہنچتے ہی اچانک نہ جانے وہ کہاں غائب ہو گیا۔ میں نے اسے پکارتے ہوئے جھاڑی کے چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

"اچانک کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں چونک گئی پھر پلٹ کر دیکھا تو آخری کریا کرم کرنے والے پنڈت جی دکھائی دیئے۔ وہ شاید میری آوازیں سن کر جاگ گئے تھے اور اپنی کٹیا سے باہر آ گئے تھے۔

"انہوں نے بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بات ہے بیٹا! کسے پکار رہی ہو؟"

"میں نے جھاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "پنڈت جی! یہاں .... یہاں ابھی میرا پربھو چھپا ہوا تھا۔ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے لیکن پتا نہیں اچانک وہ کہاں چلا گیا ہے؟"

"بیٹا! اس مرن گھاٹ کے ویرانے میں سوائے میرے اتنی رات گئے کوئی نہیں ہو سکتا۔ لوگ تو دن کے وقت بھی یہاں آنے سے ڈرتے ہیں۔ صرف ضرورت کے وقت ہی ادھر کا رخ کرتے ہیں۔"

"نہیں .... وہ یہاں تھا۔ اسی جھاڑی کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔"

انہوں نے پوچھا۔ "تمہارا اس سے کیا رشتہ ہے؟"

"ان کا سوال سن کر میں چونک پڑی۔ سوچنے لگی کہ انہیں کیا جواب دوں؟ کیا یہ بتا دوں کہ اس کی وجہ سے میں پورے گاؤں میں بدنام ہو چکی ہوں' کیا یہ بتا دوں کہ اسی کی وجہ سے میرے ماتا پتا بے موت مارے گئے ہیں اور یہ سب کچھ سہنے کے بعد بھی اسے دیوانوں کی طرح ڈھونڈ رہی ہوں۔ مجھے یہ شبہ بھی تھا کہ شاید پنڈت جی بھی میرے بارے میں جانتے ہوں گے۔ آخر کو میں بدنام تو اسی علاقے میں ہوئی تھی اور میرے پتا جی اور ماتا جی کا کریا کرم بھی اسی مرن گھاٹ میں ہوا تھا۔

"میں نے سر جھکا کر پوچھا۔ "آپ کو اس واقعے کا علم تو ہو گا' جب یہاں کے ایک گھر کی شادی میں گاؤں کے سرپنچ رام کو پیارے ہو گئے تھے؟"

"وہ تائید میں سر ہلا کر ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولے۔ "ہاں .... وہ بے چارے بڑے غیرت مند تھے۔ بیٹی نے منہ پر کالک ملی تو دنیا سے ہی منہ موڑ کر چلے گئے۔ ان کا کریا کرم میں نے ہی کیا تھا۔"

"میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "میں .... میں وہی کرموں جلی ہوں جس نے ان کی جان لے لی تھی۔"

"انہوں نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ "اور یہ وہی پربھو ہے جس نے مجھے بدنام کیا تھا جو ابھی یہاں چھپا ہوا تھا۔ مجھے رسوا کر کے اب مجھ سے منہ چھپا رہا ہے۔"

"میں رونے لگی۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تم فکر نہ کرو' اگر وہ یہاں آیا ہے تو ضرور کہیں چھپا ہو گا۔ ہم اسے ڈھونڈیں گے۔"

"پھر میں نے اور پنڈت جی نے پورے مرن گھاٹ کو اچھی طرح چھان ڈالا۔ ہم دونوں لالٹین کی روشنی میں ایک ایک جھاڑی اور درخت کے آگے پیچھے دیکھ رہے تھے مگر

نہ اسے ملنا تھا اور نہ وہ ملا۔

"تھک ہار کر پنڈت جی نے کہا۔ "بیٹا! مجھے لگتا ہے تمہاری نظروں کو دھوکا ہوا ہے۔ اگر وہ یہاں ہوتا تو ضرور نظر آ جاتا۔"

"میرا دل کسی طرح نہیں مان رہا تھا۔ میں وہاں سے باہر آ کر دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں پر نظریں دوڑانے لگی لیکن کوئی نہیں تھا۔ بلا کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سوائے گیدڑوں کی بھونڈی آوازوں کے اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

"میں واپس آ کر مایوسی سے بولی۔ "اب تو رات بھی کافی گزر چکی ہے۔ میرے گھر والے رام لیلا دیکھنے گئے تھے۔ وہ واپس آ چکے ہوں گے۔ مجھے گھر میں نہ پا کر شدید غصے میں ہوں گے۔ ایسے وقت میں واپس جاؤں گی تو وہ مجھے جان سے مار ڈالیں گے۔ ویسے بھی وہ ہماری جائیداد ہڑپ کرنے کے چکر میں ہیں۔ مجھے تو واپس جاتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔"

"انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بڑے پیار سے کہا۔ "تم میرے ساتھ میری کٹیا میں رہ سکتی ہو۔ صبح ہوتے ہی میں تمہارے گھر جا کر ان لوگوں کو سمجھاؤں گا کہ تم غلطی سے بھٹکتی ہوئی یہاں تک پہنچ گئی تھیں اور تمہیں میں نے پناہ دی تھی۔ وہ میری بہت عزت کرتے ہیں۔ میری وجہ سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

"ہم کٹیا میں آ گئے۔ وہاں زمین پر ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ انہوں نے دوسری چٹائی بچھاتے ہوئے کہا۔ "یہاں آرام سے لیٹ کر سو جاؤ۔"

"ہم لیٹ گئے۔ میری آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ پربھو کے ہرجائی پن پر دل خون کے آنسو رو رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ غصہ بھی آ رہا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ ایک بار مجھ سے مل لے' بات کر لے' میرا قصور مجھے بتا دے۔

"لیکن وہ تو چھلیا تھا' چھل کر رہا تھا۔ جھلک دکھا کر نہ جانے کہاں گم ہو جاتا تھا؟

"میں کروٹیں بدل رہی تھی۔ کسی طرح قرار نہیں آ رہا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر پنڈت جی کی طرف دیکھا' وہ گہری نیند میں تھے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بے چینی سے پہلو بدلنے لگی پھر اٹھ کر کٹیا سے باہر آ گئی۔

"ہر طرف چاند کی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ ماحول بڑا پُراسرار اور بھیانک لگ رہا تھا۔ پتا نہیں کتنے انسانی جسم وہاں چتاؤں میں جلائے گئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ان سب کی آتمائیں پورے مرن گھاٹ میں ٹہل رہی ہیں اور مجھے دیکھ رہی ہیں۔ پربھو کی محبت ایسے ماحول میں بھی میری ہمت بندھا رہی تھی۔ میری نظریں جھاڑی کی طرف بھٹک رہی تھیں مگر وہاں اس وقت بھی کوئی نہیں تھا۔

"میں مایوس سی ہو کر پلٹی۔ کٹیا کے اندر جاتے ہوئے' میں نے بے اختیار دائیں طرف دیکھا تو چونک گئی۔ دور مرن گھاٹ کے ایک درخت کے نیچے آگ کے شعلے دکھائی دے رہے تھے۔

"میرے دل میں سوال پیدا ہوا' وہاں کس نے آگ جلائی ہے؟ کہیں پربھو تو نہیں.........

"یہ خیال آتے ہی میں جھاڑیوں کی آڑ میں دبے قدموں آگے بڑھنے لگی۔ میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ وہاں پربھو ہی آگ جلائے پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ میں ایک جھاڑی کے پیچھے دبک کر بیٹھ گئی۔

"وہ آنکھیں بند کئے کسی منتر کا جاپ کر رہا تھا۔ اس کے کپڑوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے نظر آ رہے تھے۔ اس کے سامنے ایک بکرا پڑا ہوا تھا جس کا سر کٹا ہوا تھا۔ ایک برتن میں ماش کی دال کا آٹا گندھا ہوا رکھا تھا۔ اس کے گھٹنے کے پاس ایک بڑا سا خنجر پڑا ہوا تھا۔

"شاید اس خنجر سے اس نے بکرے کی بلی دی تھی۔ میں حیرت سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی پھر ہمت کر کے آگے بڑھی۔ آگ کی روشنی اس کے چہرے کے نقوش کو ابھار رہی تھی۔

میں نے دھیرے سے پکارا۔ "پربھو......... پربھو!"

"وہ منتر کے جاپ میں مگن تھا۔ میں نے ذرا تیز آواز میں پکارا "پربھو.........!"

"اس نے ایک دم سے آنکھیں کھولیں پھر میری طرف گھور کر دیکھا۔ میں سہم گئی۔ اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیا بات تھی کہ نظریں نہیں ملائی جا رہی تھیں۔

"پھر بھی میں آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ "پربھو! تم مجھے رسوا کر کے تنہا چھوڑ کر کیوں

چلے گئے۔ اگر اس وقت تم مجبور تھے تو بعد میں کسی طرح مجھ سے رابطہ کر سکتے تھے۔"

"وہ خاموشی سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں ایک ایک قدم اٹھاتے ہوئے اس کے نزدیک ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکتے ہوئے گرجدار آواز میں کہا۔

"وہیں ٹھہر جا' میں اب تجھ سے کوئی رشتہ نہیں رکھ سکتا۔"

"میں اس کی بات سن کر بڑے دکھ سے بولی۔ "اگر تم نے کوئی رشتہ نہیں رکھنا تھا تو مجھ سے محبت کے دعوے کیوں کئے تھے؟ شادی کا وعدہ کیوں کیا تھا؟ تمہاری وجہ سے میرا جیون برباد ہو گیا۔ آخر تم نے مجھے کس جرم کی سزا دی ہے؟"

"میں سراپا سوال بنی اس کے سامنے گھٹنے ٹیک کے بیٹھ گئی۔ وہ مجھے پیچھے دھکیلتے ہوئے تیز آواز میں بولا۔ "چلی جا یہاں سے .... تیری ذات سے جو چاہئے تھا وہ میں لے چکا۔ اب مجھے تیری ضرورت نہیں ہے۔ میرا وقت برباد نہ کر......... جا یہاں سے۔"

میں غم و غصے سے اسے گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ "تم میری عزت کے قاتل ہو۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ تم نے مجھ سے جھوٹ بول کر میرے ساتھ کھلواڑ کیا ہے۔"

اس نے ایک جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑایا پھر میرے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔ "تُو میرا وقت ضائع کر رہی ہے۔ میرے چلے میں مداخلت نہ کر......... چلی جا یہاں سے ورنہ بہت پچھتائے گی۔"

"تکلیف سے میری جان نکلی جا رہی تھی پھر بھی میں بول رہی تھی۔ "نہیں جاؤں گی۔ تمہیں میری مانگ میں سیندور بھرنا ہو گا۔ مجھے اپنی پتنی بنانا ہو گا۔"

"اس نے ایک جھٹکے سے دھکا دیتے ہوئے مجھے زمین پر گرا دیا اور خود میرے اوپر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ میں خوف سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دبانا شروع کر دیا۔ میرے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکلنے لگیں۔

"میں خود کو آزاد کرانے کے لئے ہاتھ پاؤں چلانے لگی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میرے دیدے پھیلنے لگے تھے۔ میں چیخ کر پنڈت جی کو بلانا چاہتی تھی۔ ہاتھوں اور پیروں سے جیسے جان نکل رہی تھی۔ وہ مسلسل میرے اوپر بیٹھا گلا دبا رہا تھا۔ اس کے

ہاتھوں کی گرفت مضبوط تھی۔ لاکھ کوشش کے باوجود میں خود کو آزاد نہیں کر پا رہی تھی۔

"میرے ناخن اس کے چہرے پر خراشیں ڈال رہے تھے جس سے اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ خطرناک لگ رہا تھا۔ میرے سر سے محبت کا بھوت اتر چکا تھا۔ اب کسی بھی طرح اس ظالم سے خود کو آزاد کرانا تھا۔

"کچھ دیر بعد اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس نے ایک ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا تھا اور دوسرے ہاتھ سے کچھ تلاش کر رہا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ نہ جانے اب وہ کیا کرنے والا ہے۔

"میں خود کو اس سے چھڑانے کے لئے ایک بار پھر کسمسائی مگر ناکام رہی۔ تکلیف کی شدت سے میں نڈھال ہونے لگی تھی پھر حیرت اور خوف کے مارے میری جان نکل گئی۔ اس کے ہاتھوں میں وہی بڑا سا خنجر تھا جس سے اس نے بکرے کی بَلی دی تھی۔ اس کی تیز دھار آگ کی روشنی میں چمک رہی تھی۔

"میں دہشت کے مارے اس کے چہرے اور جسم کو بری طرح نوچنے لگی مگر اس پر کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے خنجر کو اپنے سر سے اونچا کیا پھر تیزی سے اسے نیچے لا کر میرے سینے میں گھونپ دیا۔

"مجھے ایسا لگا جیسے آگ کی ایک لکیر میرے سینے میں اترتی چلی گئی ہے۔ اس نے ایک جھٹکے سے خنجر کو کھینچ کر میرے سینے سے نکالا۔ تب تک اس کا ہاتھ میرے منہ پر سے ہٹ چکا تھا۔ میرے حلق کی دلدوز چیخ نے مرن گھاٹ کے سناٹے کو چیر ڈالا۔

"میرے سینے سے نکلنے والے لہو کے فوارے نے پربھو کا چہرہ سرخ کر دیا تھا۔ وہ اپنے چہرے کو صاف کرتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں تکلیف کی شدت سے تڑپ رہی تھی۔ میری اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا پھر اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں کہ کیا ہوا؟ بس ایسا لگا جیسے ہاتھوں پیروں سے جان کھینچ کر نکالی جا رہی ہے۔ ان لمحات میں پتا چلا کہ شریر سے آتما کیسے نکلتی ہے؟"

وہ اپنی روداد سناتے سناتے چپ ہو گئی۔ ماموں اس کا منہ تک رہے تھے۔ اس کے منہ سے آگے بہت کچھ سننا چاہتے تھے لیکن منہ بند تھا' زبان چپ تھی' وہ بڑے پیار اور لگاوٹ سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

وہ بولی۔ "کیا بتاؤں کہ پھر کیا ہوا؟ سب کچھ جیسے ایک بھیانک خواب لگا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اپنی لاش دیکھی۔ میں نے اپنے چچا' چچی' تایا اور تائی وغیرہ کو مگرمچھ کے آنسو بہاتے دیکھا۔ وہ سب میرے شریر کو چتا میں جلا رہے تھے۔ دل ہی دل میں خوش تھے کہ میری تمام زمین اور جائیداد ان کی ہونے والی تھی۔"

ماموں نے کہا۔ "اسے تو تم ایک بھیانک خواب کہہ رہی ہو۔ میں حقیقت سننا چاہتا ہوں۔ اس نے تمہارے سینے میں خنجر گھونپ دیا تھا' اس کے بعد کیا ہوا؟"

"اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ خنجر گھونپ دینے سے موت ہو جاتی ہے۔ مقدر میں جیوت رہنا لکھا ہو تو موت نہیں آتی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا میں دھرتی پر ہوں یا پرلوک میں ہوں یا دونوں کے بیچ میں ہوں؟ نہ اِدھر کی ہوں' نہ اُدھر کی ہوں۔ میری بلا سے' کچھ سمجھ میں نہ آئے۔ میرے من کی شانتی کے لئے اتنا ہی بہت ہے کہ میں تمہارے پہلو میں ہوں۔"

ماموں الجھ گئے تھے۔ انہیں اپنے سوالوں کے صحیح جواب نہیں مل رہے تھے۔ ایسی گول مول باتوں سے یہی سمجھ میں آتا تھا کہ خنجر سے حملہ کرنے کے باوجود وہ زندہ رہ گئی تھی۔ انہوں نے پوچھا۔ "پربھو کہاں گیا؟"

"وہ کہاں جا سکتا تھا؟ اس کے بعد تو میں نے دشمنوں سے گن گن کر بدلے لئے۔ اس رات تو وہ وہاں سے بھاگ گیا تھا لیکن وہ جہاں بھی جا رہا تھا' مجھے دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے دوسری رات مرن گھاٹ میں شیطانی پوجا شروع کی پھر ایک بکرے کی بَلی دی۔ اس کے لہو میں بھیگ کر منتروں کا جاپ کرنے لگا۔ یہ بات میں جانتی ہوں کہ چلہ کاٹنے اور منتروں کا جاپ کرنے کے بیچ میں کوئی غلطی ہو جائے تو چلہ کاٹنے والے کا دماغ الٹ جاتا ہے۔ میں نے ایسے ہی وقت اس کے منہ پر ایک تھپڑ مارا۔ اس نے بوکھلا کر آنکھیں کھول دیں۔ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔"

ماموں نے حیرانی سے پوچھا۔ "تم نظر کیوں نہیں آ رہی تھیں؟"

"مجھے کیا پتا؟ اس کا دماغ الٹ گیا تھا۔ اس نے پھر سے منتر پڑھنا چاہا۔ میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یوں آنکھیں پھاڑنے کے باوجود میں نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ چکرا کر چاروں شانے چت ہو گیا۔ جب اس کی آنکھ

کھلی تو وہ اپنے ہوش و حواس کھو چکا تھا۔ وہ زندہ ہے' چلتا پھرتا ہے۔ شہر شہر' گاؤں گاؤں جاتا ہے لیکن اپنے آپ کو نہیں پہچانتا۔ کبھی ہنستا ہے' کبھی کپڑے پھاڑتا ہے۔ کبھی جنون کی حالت میں اپنے بدن کو نوچنے لگتا ہے۔ میں نے اس کا جیون موت سے بدتر بنا دیا ہے۔ میرے چچا' تایا بھی دن رات سہمے ہوئے سے رہتے ہیں۔ وہ میری زمینوں پر جاتے ہیں۔ میری کسی چیز کو ہاتھ لگاتے ہیں تو میں انہیں ایسی سزائیں دیتی ہوں کہ وہ ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگتے ہیں اور ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ پدمنی کی آتما ہم سے بدلہ لے رہی ہے۔"

ماموں نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ "تم آتما تو نہیں ہو' میری طرح زندہ ہستی ہو؟"

"وہ مجھے آتما کہتے ہیں' کہنے دو۔ میں تو اپنے سندر شریر کے ساتھ زندہ ہوں۔"

"تم اپنی زمین اور جائیداد ان سے واپس کیوں نہیں لے لیتیں؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "مجھے اب ان چیزوں کی ضرورت نہیں رہی۔ میں آزادی سے گھومتی پھرتی ہوں۔ مجھے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے۔ میں جہاں چاہتی ہوں وہاں چلی جاتی ہوں۔"

"پربھو کہاں ہے؟"

"میں نے اسے مار ڈالا۔ وہ چالیس دن کا چلہ کاٹنے والا تھا۔ میں نے چالیسویں دن اس کی بلی چڑھا دی۔ اب جو بھی پربھو کی طرح مجھے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے' میں اس کے ساتھ چالیس راتیں گزارتی ہوں پھر چالیسویں رات کو اس کی بلی چڑھا دیتی ہوں۔"

ماموں نے سہم کر اسے دیکھا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو؟ تم جس سے محبت کرتی ہو' اسے چالیسویں دن مار ڈالتی ہو؟"

"ہاں جو مرد محبت کرنے کا ناٹک کر کے عورت کی جوانی سے کھیلتے ہیں پھر انہیں بدنام ہونے کے لئے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اب میں ہر چالیس دن بعد ایسے کسی مرد کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہوں۔"

ماموں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ "مجھے جانا چاہئے' جلد سے جلد گھر پہنچنا ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "ڈر گئے' ہاہاہا......... مرد ہو کر ڈر گئے۔ میں تو ان مردوں کے خلاف نفرت ظاہر کر رہی تھی جو سندر ناریوں کو دیکھ کر دیوانے ہو جاتے ہیں پھر ان کے شریر سے کھیل کر بھاگ جاتے ہیں۔ تم ان میں سے نہیں ہو۔ تم اتنی دیر سے میرے ساتھ ہو مگر اب تک میرے بدن کو ہاتھ نہیں لگایا۔ میں ہی دل سے مجبور ہو کر تم سے بار بار لپٹ رہی ہوں۔ مجھے تمہارے ہی جیسے سیدھے سادے اور اچھے کردار والے مرد کی تلاش تھی۔"

یہ کہتی ہوئی وہ ان کے گلے کا ہار بن گئی۔ انہوں نے اپنی گردن سے اس کی بانہوں کو ہٹانا چاہا' نہیں ہٹا سکے۔ اپنے سینے سے الگ کرنا چاہا' نہیں کر سکے۔ میدان مارنے والا سپاہی سامنے سے پہاڑ ہٹا سکتا ہے لیکن ایک نازک اندام جونک کو اپنے بدن سے الگ نہیں کر سکتا تھا۔

وہ پہلے بھی زور آزمائی کر چکے تھے اور ہار مان چکے تھے۔ بے بسی سے بولے۔ "کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہو؟ مجھے جانے دو۔ میں نے تمہیں ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ تمہیں بدنام نہیں کیا ہے۔ جو تمہاری خوبصورتی اور جوانی کے دشمن ہیں' ان سے انتقام لو۔"

"یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میں تم سے انتقام لینا چاہتی ہوں؟ میں تو تمہیں دیکھتے ہی تمہاری دیوانی ہو گئی ہوں۔ میں چالیس دنوں کے بعد کیا چالیس جنموں کے بعد بھی تمہیں ہلاک نہیں کروں گی۔ میں ہمیشہ تمہاری داسی بن کر رہوں گی۔"

وہ ان کے سینے سے لگی ہوئی التجا کر رہی تھی۔ اس کی قربت انہیں مدہوش بنا رہی تھی۔ اس کی پیار بھری باتیں ان کے دل کو سرشار کر رہی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار وہ ایسے جذبات سے روشناس ہو رہے تھے۔

وہ بڑے میٹھے انداز میں بولی۔ "تم نے اپنے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سوگند کھا کر مجھے وچن دیا تھا کہ میرا کہا مانو گے۔"

"مجھے یاد ہے' تم بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے؟"

وہ ان سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔ "یہاں سے کچھ فاصلے پر میرا گاؤں ہے۔ میں تمہیں وہاں لے جانا چاہتی ہوں۔"

ماموں اس کی طرف مائل ہونے لگے تھے۔ اس کے حسنِ بلاخیز نے ان پر سحر سا

طاری کر دیا تھا۔ وہ اس کی فرمائش کو مسترد نہ کر سکے۔

انہوں نے اسے گھوڑے پر سوار کیا اور خود بھی اس کے پیچھے بیٹھ گئے۔ گھوڑے کی لگامیں پدمنی کے ہاتھوں میں تھیں اور وہ اس کی قربت کے سحر میں کہیں کھو گئے تھے۔ انہیں کچھ ہوش نہیں تھا کہ وہ انہیں کہاں لے جا رہی ہے؟

وہ مدہوش سے ہو کر اس سے لپٹے ہوئے تھے۔ گھوڑا سرپٹ دوڑتا جا رہا تھا۔ اب وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ وہ اس کی طرف کیوں مائل ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ حسن کا جادو جگا رہی ہے یا اور کوئی جادو انہیں کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت نہیں دے رہا ہے۔ گھوڑا ایک جگہ رک گیا۔ انہوں نے حیرانی سے دیکھا۔

وہ ایک شادی کے پنڈال میں کھڑے تھے۔ انہوں نے گھوڑے پر سے اتر کر پریشانی کے عالم میں پدمنی کی طرف دیکھا۔

وہ شرمائی لجائی سی مسکان کے ساتھ انہیں دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے پوچھا۔ "یہ .... یہ سب کیا ہے؟ تم مجھے کہاں لے آئی ہو؟"

وہ نظریں جھکا کر شرمانے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی' پنڈال کی بہت سی عورتوں نے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا پھر انہیں ایک کمرے میں لے آئیں۔ ماموں حیران پریشان سے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ کمرے میں آ کر ان عورتوں نے پدمنی اور ماموں کو بڑے خوبصورت بستر سے آراستہ ایک چارپائی پر بٹھا دیا اور ڈھولک کی تھاپ پر سہاگ کے گیت گانے لگیں۔

انہوں نے پدمنی کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں جھکائے مسکرا رہی تھی۔ اس کے چہرے کی گلابی رنگت سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بہت خوش ہے۔ انہیں بے اختیار اس پر پیار آ گیا۔

کچھ دیر بعد ان دونوں کو دولہا دلہن کی طرح سجایا گیا۔ پدمنی عروسی جوڑے میں حور لگ رہی تھی۔ ماموں کو بھی دولہا کا لباس پہنایا گیا تھا۔ وہ سحرزدہ سے تھے' کسی سے کچھ نہیں پوچھ رہے تھے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

وہ اس وقت بھی خاموش رہے جب ان کے دامن سے پدمنی کا آنچل باندھ کر اگنی پھیروں کے لئے کہا گیا۔ وہ کسی معمول کی طرح ہر بات مانتے جا رہے تھے۔ اگنی کے سات

پھیرے پورے ہو گئے۔

چند عورتیں پدمنی کے آنچل کی گرہ کھول کر اسے ایک کمرے میں لے گئیں۔ بہت سے مرد اور عورتیں اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ سب کے چہروں سے خوشی جھلک رہی تھی۔

کچھ دیر بعد ماموں کو ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

انہوں نے دروازے کو اندر سے بند کیا اور پھر پلٹ کر دیکھا۔ وہ کمرہ گلاب کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ فرش پر گلاب کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ان کی نظروں کے سامنے پھولوں سے لدی ہوئی سیج سجی ہوئی تھی۔ کمرے میں جگہ جگہ موم بتیاں روشن کی گئی تھیں جو ماحول کو مزید رومانوی بنا رہی تھیں۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے سیج کی طرف بڑھنے لگے۔ پھولوں کی لڑیوں کی اوٹ سے سرخ جوڑے میں سمٹی ہوئی پدمنی کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ ان کا دل بے اختیار اسے چھونے کے لئے مچلنے لگا۔

وہ بستر پر اس کے قریب آ کر بیٹھ گئے۔ اس کا چہرہ گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر دھیرے دھیرے گھونگھٹ الٹ دیا۔ یوں لگا جیسے پورے کمرے میں چاندنی سی پھیل گئی ہے۔ وہ سحرزدہ سے ہو کر اس کے عروسی حُسن کو دیکھ رہے تھے۔ پہلے ہی اس کے نوخیز حُسن کا جادو انہیں مدہوش بنا رہا تھا' اب دلہن بن کر تو وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ چہرے کے پُرکشش نقوش میں مزید نکھار پیدا ہو گیا تھا۔

وہ آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔ انہوں نے سرگوشی میں کہا۔ "آنکھیں کھولو .... میری طرف دیکھو۔"

اس نے دھیرے دھیرے گھنیری پلکوں کا سائبان اٹھایا تو کاجل سے بھری ہوئی چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں اپنا جادو جگانے لگیں۔ انہوں نے بے اختیار ہو کر اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ پکے ہوئے پھل کی طرح ان کی آغوش میں چلی آئی۔

اس کی قربت انہیں دیوانہ بنا رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے بازوؤں میں پگھلتے رہے' سرشار ہوتے رہے۔ پدمنی ہر لمحے نئے اور خوبصورت اسرار سے پردہ اٹھاتی رہی اور انہیں بے خود کرتی رہی۔

☆======☆======☆

دھوپ کی تپش ان کے چہرے کو سلگا رہی تھی۔ انہوں نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھولیں۔ چاروں طرف تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ان کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ اسی جنگل میں درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسرے درخت کے نیچے ان کا گھوڑا بندھا ہوا گھاس کھا رہا تھا لیکن پدمنی کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ کنوئیں کی طرف دیکھا وہ بھی ویران پڑا ہوا تھا۔ وہ بے چینی سے پدمنی کو ڈھونڈنے لگے۔ جنگل میں اِدھر اُدھر تلاش کرنے کے باوجود وہ نہ ملی۔ نہ جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔

وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے واپس اسی درخت کے نیچے آ گئے۔ ان کی نظر اپنے سفری بیگ کے برابر رکھی ہوئی ایک خوبصورت سی کپڑے کی پوٹلی پر پڑی۔ انہوں نے جھک کر اسے اٹھایا۔ کافی وزنی معلوم ہو رہی تھی۔ اسے کھول کر دیکھا تو حیران رہ گئے۔ سونے کی اشرفیوں سے بھری وہ چھوٹی سی پوٹلی ان کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔

اس زمانے میں سونے کی اشرفی کا سکہ چلتا تھا۔ ایک سکہ پندرہ روپے کے برابر ہوتا تھا۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ جنگل اب بھی ویران تھا پھر وہ اسی جگہ بیٹھ گئے اور ان اشرفیوں کو شمار کرنے لگے۔ ان کی حیرانی میں اضافہ ہوتا گیا۔ گنتی پوری ہوئی تو معلوم ہوا کہ اشرفیوں کی تعداد پانچ ہزار ہے۔ یعنی پچھتر ہزار روپے۔

انہوں نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ اشرفیوں کو دوبارہ پوٹلی میں بھرا اور اسے بند کر کے اپنے سفری بیگ کے اندر چھپا دیا۔ انہوں نے اتنی بڑی رقم یک مشت پہلی بار دیکھی تھی اس لئے گھبرائے ہوئے تھے۔ اس وقت ان کی تنخواہ صرف نو روپے ماہوار تھی۔

بے خیالی میں ان کی نظر اپنے لباس پر پڑی تو وہ حیران رہ گئے۔ ان کے بدن پر نہایت قیمتی اور نفیس لباس تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ اشرفیوں پر حیران تھے کہ اتنی بڑی رقم یہاں کون چھوڑ گیا ہے اور اب لباس کو دیکھ کر ان کی نظریں سراپا سوال بنی ہوئی تھیں۔

انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ رات کے وقت وہ عام سے لباس میں ملبوس تھے پھر یہ دولہا کا پہناوا انہوں نے کب پہنا؟ وہ سوچنے لگے۔ ذہن پر زور دینے لگے۔ ان کی آنکھوں میں ایک ہلکا سا منظر ابھرا۔ وہ لگن منڈپ میں آگ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں

دولہا کی طرح سجایا گیا تھا اور ان کے برابر پری چہرہ پدمنی دلہن کے روپ میں شرمائی لجائی سی بیٹھی تھی۔

اس کے بعد سارا منظر واضح ہوتا چلا گیا۔ گزری ہوئی رات کی ایک ایک بات یاد آتی چلی گئی۔ پدمنی کے ہمراہ گزارے ہوئے وہ تنہائی کے لمحات ان کے دل کو بے چین کرنے لگے۔ اس کی قربت کا احساس پھر سے ان کے دلی جذبات کو دہکانے لگا۔

پدمنی کا خیال آتے ہی وہ ایک بار پھر مضطرب ہو کر متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ کبھی یوں لگتا تھا جیسے خواب دیکھا تھا' کبھی وہ کپڑوں کو دیکھتے تھے تو گزرے ہوئے لمحات سچے ثابت ہوتے تھے۔ پدمنی کے ساتھ گزرا ہوا ایک ایک پل کہہ رہا تھا کہ وہ ان کی دھرم پتنی بن چکی ہے اور وہ اس دھرم پتنی کے ساتھ سہاگ رات گزار کر مجازی خدا بن چکے ہیں۔

انہوں نے گھوڑے پر اپنا سفری بیگ رکھا' وہاں سے جانا چاہتے تھے لیکن دل ایک رات کی دلہن کے لئے مچل رہا تھا۔ انہیں یہ سوچنا اور سمجھنا چاہئے تھا کہ وہ دلہن اور وہ براتی سچ ہونے کے باوجود چھلاوا تھے اور جب اس طرح کا چھل فریب ہو تو وہ سچ ہونے کے باوجود سچ نہیں ہوتا۔ ان کے ذہن پر پردہ پڑ گیا تھا۔ وہ ذہانت سے سمجھ نہیں سکتے تھے۔ وہ آگے جانے کے لئے گھوڑے پر سوار ہو گئے جبکہ وہ ان کے حواس پر پہلے سے سوار ہو چکی تھی۔

انہوں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ وہ دوڑنے لگا۔ لگام ان کے ہاتھوں میں تھی۔ فی الحال سمجھ نہیں سکتے تھے کہ خود بے لگام ہو گئے ہیں۔ وہ اپنے آپ میں نہیں تھے۔ اس کی یادوں میں گم چلے جا رہے تھے۔ گھوڑا تربیت یافتہ تھا اس لئے لگام ڈھیلی ہونے کے باوجود ان کی منزل تک پہنچ گیا تھا۔

وہ گم صم سے گھوڑے سے اتر کر گھر میں داخل ہوئے۔ سب کو خبر تھی کہ وہ چھٹیاں گزارنے گاؤں آنے والے ہیں۔ ان کی دو بہنیں اور ایک بڑے بھائی تھے۔ دونوں بہنوں کا نکاح ہو چکا تھا اور اب رخصتی ہونے والی تھی۔

ماموں کی چھٹیوں کا انتظار تھا۔ سب نے فیصلہ کیا کہ جب وہ چھٹیاں گزارنے گھر آئیں گے تو ان ہی دنوں کوئی تاریخ رخصتی کے لئے مقرر کر دی جائے گی۔

دوسرے دن دونوں ماموؤں کا نکاح پڑھا دیا جائے گا تاکہ گھر خالی نہ رہے۔ بیٹیوں کی جگہ بہوئیں آ جائیں۔

سورج تقریباً غروب ہو چکا تھا۔ گھر کے تمام افراد آنگن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی وہ سب خوشی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ نانی جان نے فوراً انہیں کلیجے سے لگا لیا۔ ان کی بلائیں لینے لگیں۔ آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیر رہے تھے۔ وہ انہیں پونچھتے ہوئے ان سے علیحدہ ہوئیں تو نانا جان نے سینے سے لگا لیا۔ بیٹے سے دوری سارا سال انہیں تڑپاتی رہتی تھی اور جب وہ چھٹیوں پر گھر آتے تھے تو گھر میں عید کا سا سماں نظر آتا تھا۔

بھائی بھی مصافحہ کر کے گلے سے لگ گئے۔ وہ بہنوں کے سلام کا جواب دیتے ہوئے وہیں ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ماحول بڑا جذباتی ہو گیا تھا اس لئے سب ہی کی آنکھوں کے گوشے نم تھے۔ سب خاموش تھے۔

اچانک نانی نے چونک کر ان کی طرف دیکھا پھر حیرت سے پوچھا۔ "اے بیٹا! یہ تم نے کیا حلیہ بنایا ہوا ہے؟ یہ لباس تو دولہا پہنتے ہیں۔ تم نے کیوں پہنا ہوا ہے اور اتنا قیمتی لباس تمہارے پاس کہاں سے آیا؟"

ان کے سوال پر سب ہی انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ ملنے ملانے میں کسی کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا۔ ماموں ایک دم سے گڑبڑا گئے۔ ذہن تو ان کا پدمنی میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگے' ایسا کیا معقول جواب دیں جو گھر والوں کو مطمئن کر دے۔

پھر اچانک ہی ایک خیال ان کے دماغ میں آیا۔ وہ بولے۔ "دراصل ہم سب دوستوں نے چھٹیوں پر آنے سے پہلے الوداعی دعوت کا پروگرام بنایا تھا۔ اسی دعوت میں میرے دوستوں نے جبراً یہ بھڑکیلا لباس پہنا دیا تھا۔ میں یہی پہن کر چلا آیا۔"

نانی نے کہا۔ "میں تمہارے سر پر سہرا سجانے کی تیاری کر رہی ہوں اور تم پہلے سے ہی دولہا بن کر آ گئے؟"

ان کی ایک بہن ان کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ "ویسے ہمارے بھائی جان اس لباس میں شہزادے لگ رہے ہیں۔"

نانا جان بولے۔ "ارے شہزادہ تو یہ سر پر سہرا سجانے کے بعد ہی لگے گا۔"

سب خوش ہو رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے مگر وہ خاموشی سے سر جھکائے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ شادی کا ذکر سنتے ہی پدمنی کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات یاد آنے لگے۔ وہ ابھی تک اس سوال میں الجھے ہوئے تھے کہ کیا پدمنی سے ان کی شادی ہو چکی ہے؟

ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات بھی واضح ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہوا' وہ سب ایک فریب تھا' دھوکا تھا۔ دین اسلام میں نکاح کے بغیر شادی نہیں ہوتی۔ آگ کے گرد سات پھیرے لگانے سے بھلا شادی کیسے ہو سکتی ہے؟

لیکن اس حقیقت کو وہ تسلیم نہیں کر رہے تھے یا تسلیم کرنے کے باوجود جھٹلا رہے تھے۔ دل کا جھکاؤ پدمنی کی طرف تھا۔ یہ سوچ کر خود کو مطمئن کر رہے تھے کہ انہوں نے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم کھا کر اس سے وعدہ کیا تھا اور اس سے شادی کر کے انہوں نے اس وعدے کو پورا کیا ہے لہٰذا اس اعتبار سے جو کیا وہ درست ہے۔

انہوں نے خود کو کسی حد تک مطمئن کر لیا تھا لیکن گھر میں ان کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اب الجھن صرف یہ رہ گئی تھی کہ اس شادی سے انکار کیسے کیا جائے۔ گھریلو ماحول اور بچپن کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ وہ بزرگوں کے سامنے لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ بے دھڑک شادی سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔

اسی کشمکش میں مبتلا وہ خاموشی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ سفری بیگ کو ہاتھ میں تھام کر اپنے کمرے کی طرف بڑھے۔ بہن نے کہا۔ "بھائی جان! منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو جائیں۔ کھانے کا وقت ہو رہا ہے' میں کھانا لگاتی ہوں۔"

انہوں نے پلٹ کر کہا۔ "مجھے ابھی بھوک نہیں ہے' میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ نانی جان نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ "جب سے آیا ہے گم صم سا ہے۔ نہ جانے کیا بات ہے؟ تھکا تھکا سا لگ رہا ہے۔ مجھے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔"

بڑے ماموں نے کہا۔ "ماں جی! آپ کو وہم ہو گیا ہے۔ اتنا لمبا سفر طے کر کے آیا ہے۔ تھکن تو لازمی ہو گی۔ کچھ دیر آرام کرے گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ بستر پر لیٹے تو سر بھاری ہو رہا تھا۔ کچھ سوچنے سمجھنے کی سکت نہیں تھی۔ انہیں جلد ہی نیند نے آلیا۔

☆======☆======☆

نانی جان صبح بیدار ہوتے ہی سب سے پہلے ماموں کے کمرے میں گئیں۔ رات بھر وہ ان کے بارے میں سوچتی رہی تھیں۔ جب سے واپس آئے تھے خاموشی سے اپنے کمرے میں جا کر مسلسل سو رہے تھے۔ رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔

وہ دروازہ کھول کر اندر آئیں۔ انہیں گہری نیند میں بے سدھ پڑے دیکھا۔ ان کے سرہانے آ کر بیٹھ گئیں۔ وہ اس سے پہلے بھی چھٹیوں میں گھر آتے تھے مگر اس قدر تھکے ہوئے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ یہی بات نانی جان کو کھٹک رہی تھی۔

انہوں نے بالوں میں بڑی شفقت سے انگلیاں پھیرتے ہوئے پیشانی کو چوما تو احساس ہوا کہ وہ گرم ہے۔ انہوں نے ہاتھوں سے چھو کر دیکھا وہ بخار میں پھنک رہے تھے۔

انہوں نے پریشان ہو کر پکارا۔ "منور .... منور میرے لعل!"

وہ بخار کی شدت کے باعث غنودگی میں تھے۔ نانی جان ان کے کمرے سے نکل کر باہر آئیں۔ بڑے ماموں اور نانا جان زمینوں پر گئے ہوئے تھے۔ وہ بیٹیوں کے کمرے میں آ کر بولیں۔ "ارے میرا بچہ بخار میں جل رہا ہے۔ تم اس کے پاس جاؤ۔ میں حکیم صاحب کو بلا کر لاتی ہوں اور ہاں ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتے رہنا۔"

دونوں بہنیں ان کے کمرے میں چلی گئیں اور وہ برقع اوڑھ کر حکیم صاحب کی طرف جانے لگیں۔

وہ بھائی کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔ ایک بہن ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنے لگی اور دوسری ان کے پاؤں دابنے لگی۔

کچھ دیر بعد ہی وہ حکیم صاحب کے ہمراہ واپس آ گئیں۔ انہوں نے نبض دیکھنے کے بعد دوائیں دیں۔ نانی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "حکیم صاحب! میرا بچہ کب تک ٹھیک ہو جائے گا' پریشانی کی تو کوئی بات نہیں ہے نا؟"

انہوں نے کہا۔ "پریشان نہ ہوں۔ شہر سے گاؤں کا فاصلہ اچھا خاصا ہے اور پھر گھوڑے کی سواری تھکا دیتی ہے۔ اس تھکن کے باعث ہی انہیں بخار ہوا ہے۔ آپ

دوائیں انہیں کھلائیں' انشاء اللہ یہ جلدی ہی صحت یاب ہو جائیں گے۔"

وہ بولیں۔ "مگر یہ تو بے سدھ پڑا ہوا ہے۔ آنکھیں بھی نہیں کھول رہا ہے۔"

"بخار کی شدت نے غنودگی طاری کر رکھی ہے۔ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتی رہیں۔ یہ کچھ دیر بعد ہی ہوش میں آ جائیں گے۔"

وہ دوائیں دے کر چلے گئے۔ وہ تینوں ان کی خدمت گزاری میں لگ گئیں۔ ٹھنڈے پانی کی پٹیوں کا اثر تھا کہ وہ کچھ دیر بعد ہوش میں آ گئے۔ بخار میں کمی ہو چکی تھی۔ نانا جان اور بڑے ماموں بھی واپس آ گئے تھے۔ گھر کے تمام افراد ان کی عیادت کر رہے تھے۔ سب کی نظروں میں وہ بیمار تھے لیکن اصل حقیقت وہی جانتے تھے۔ غنودگی کی حالت میں پدمنی ان کے پہلو میں رہی تھی اور وہ اس کی قربت سے دلی جذبوں کو تسکین پہنچا رہے تھے۔

پہلے سارا منظر دھندلا سا تھا پھر سب کچھ واضح ہوتا چلا گیا۔ نہ جانے وہ اچانک کہاں سے آ کر ان کے پہلو میں سما گئی تھی؟ وہ اس کے مجازی خدا بن چکے تھے۔ شوہر کی حیثیت سے اپنا حق وصول کرنے لگے تو پدمنی نے انہیں روک دیا اور پھر بولی۔ "جب میرے پاس آیا کرو تو پہلے میری مانگ میں سیندور بھرا کرو۔"

اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی۔ اسے کھول کر ان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "یہ لو .... اسی سیندور کو میری مانگ میں بھر دو پھر میں تمہاری آغوش میں چلی آؤں گی۔"

انہوں نے ایک چٹکی سے اس کی مانگ بھر دی۔ اس کے بعد وہ بغیر کسی حیل و حجت کے ان کی مانگیں پوری کرنے لگی پھر پتا نہیں کتنا وقت گزرتا چلا گیا۔ گھر والے سمجھ رہے تھے کہ وہ سو رہے ہیں اور وہ خود نہیں سمجھ رہے تھے کہ سو رہے ہیں' جاگ رہے ہیں یا اس حسینہ سے سحرزدہ ہو رہے ہیں۔ گھر والوں کی آواز سن کر وہ ہوش میں آئے تو پتا چلا کہ وہ کچھ دیر پہلے تیز بخار میں پھنک رہے تھے۔ انہوں نے عجیب طلسماتی لمحات گزارے تھے۔

اس کا خیال آتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ اب وہ کہاں دکھائی دینے والی تھی۔ کمرے میں ان کے اپنے موجود تھے جو ان کے ہوش میں آنے اور بخار اتر

جانے پر مطمئن نظر آ رہے تھے۔

انہوں نے بستر کی طرف دیکھا۔ وہ تنہا بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں دیوانہ بنانے والی بستر کو ویران کر کے جا چکی تھی۔ وہ بڑی حسرت سے سوچنے لگے۔ اچانک ان کی نظر اپنے تکیے پر پڑی تو دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔

تکیے کے کنارے ذرا سا سیندور بکھرا ہوا تھا۔ پہلے وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ پدمنی ایک خواب تھی یا حقیقت؟ اب تکیے پر بکھرے سیندور نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ جانِ حیات ان کی آغوش میں آئی تھی۔ ذرا سے سیندور نے ان کی الجھن دور کر دی تھی۔

دوپہر تک ان کی طبیعت ٹھیک ہو گئی۔ وہ نانا جان کے کمرے میں آئے۔ وہاں نانی جان اور بڑے ماموں بھی موجود تھے۔ شام کو دونوں بیٹیوں کی رخصتی اور بیٹوں کی شادی کی تاریخ مقرر کرنے ان کے سسرال جانا تھا۔ وہ تینوں کمرے میں بیٹھے اسی معاملے پر گفتگو کر رہے تھے۔

ماموں یہ باتیں سن کر ٹھٹک گئے۔ ان کے ہاتھوں میں وہی کپڑے کی چھوٹی سی پوٹلی تھی جس میں پانچ ہزار سونے کی اشرفیاں تھیں۔ وہ اسے نانا جان کے حوالے کرنے آئے تھے۔

انہوں نے وہ پوٹلی نانا جان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ابا جی! اس میں جو کچھ بھی ہے وہ میں آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔"

سب انہیں اور اس پوٹلی کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ نانا جان نے اسے لے کر حیرت سے پوچھا۔ "یہ بہت وزنی ہے۔ اس کے اندر کیا ہے؟"

"آپ اسے کھول کر دیکھ لیں۔"

انہوں نے اس کے بند منہ کو کھولا تو حیرت کے مارے ان کا بند منہ بھی کھل گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے سونے کی اشرفیوں سے بھری پوٹلی کو دیکھ رہے تھے۔ نانی جان اور بڑے ماموں ان کی حالت دیکھ کر الجھ رہے تھے۔

نانی جان نے پوچھا۔ "آپ اس قدر حیران پریشان سے کیوں ہو گئے' آخر اس پوٹلی میں ایسا کیا ہے جو آپ آنکھیں جھپکانا ہی بھول گئے؟"

انہوں نے چونک کر انہیں دیکھا پھر اس خزانے کی پوٹلی ان کو تھما دی۔ بڑے ماموں

نے بھی جھک کر دیکھا تو وہ بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان دونوں نے سر اٹھا کر ماموں کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے سوچ کے ذریعے پدمنی کے پاس پہنچے ہوئے تھے۔

نانا جان نے تفتیشی لہجے میں پوچھا۔ "یہ اشرفیوں سے بھری پوٹلی تم کہاں سے لائے ہو؟"

انہوں نے چونک کر جواب دیا۔ "یہ مجھے راستے میں پڑی ملی تھی۔"

وہ ذرا تیز لہجے میں بولے۔ "سچ بتاؤ' کہیں تم اسے کسی سے چھین کر تو نہیں لائے ہو؟"

نانی جان اپنے بیٹے پر کیسے الزام آنے دیتیں۔ ان کے جواب دینے سے پہلے ہی تڑپ کر بولیں۔ "آپ کیا میرے بچے سے پولیس والوں کی طرح سوال جواب کر رہے ہیں؟ کیا میرا بیٹا آپ کو چور نظر آتا ہے؟"

انہوں نے کہا۔ "ایسی بات نہیں ہے۔ اپنے بیٹے پر جتنا اعتماد تمہیں ہے اتنا ہی مجھے بھی ہے لیکن بچے جب کوئی چیز باہر سے لائیں تو اس کے بارے میں پوچھ گچھ کرنا والدین کا فرض ہوتا ہے۔"

ماموں نے کہا۔ "جنگل میں کنوئیں پر پانی پینے کے لئے رکا تو یہ پوٹلی اس کی منڈیر کے پاس پڑی ہوئی تھی۔ شاید کوئی پانی پینے کے بعد اسے وہاں بھول کر چلا گیا ہے۔ میں نے انہیں شمار کیا تھا۔ پورے پانچ ہزار ہیں۔"

ان تینوں نے حیرت سے اس پوٹلی کو دیکھا۔ اتنی بڑی رقم کا سن کر وہ حیران تھے۔ کانوں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ نانی جان نے جلدی سے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا پھر سرگوشی میں بولیں۔ "ارے آہستہ بولو' کسی کو بھنک بھی پڑ گئی تو چور اچکوں کی نظریں ہمارے گھر پر لگ جائیں گی۔"

نانا جان ماموں کا جواب سن کر مطمئن ہو گئے تھے اور خوش تھے کہ بیٹے نے فرماں برداری کا ثبوت دیا ہے۔ اتنی بڑی رقم کو لالچی انداز میں چھپانے کے بجائے اسے بزرگوں کے سپرد کیا ہے۔

انہوں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "خدا نے ہمارا ہاتھ تھاما ہے۔ غیب سے مدد کی ہے۔ ہمیں اس خدائے بزرگ و برتر کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ ہمارے چاروں بچوں کی شادی

ہونے والی ہے۔ اس رقم سے ہمیں بہت سہارا ملے گا۔"

وہ سب سوچ سمجھ کر اس رقم کو خرچ کرنے کے بارے میں منصوبہ بندی کرنے لگے مگر ماموں جان پریشان ہو کر سوچنے لگے کہ آج شام والد صاحب ان کی شادی کی تاریخ مقرر کر دیں گے۔ وہ ان کے سامنے انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کا ذہن الجھ رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ اس سلسلے میں بزرگوں سے کس طرح بات کریں۔

وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئے۔ بے چینی سے ٹہلنے لگے پھر بستر پر بیٹھ کر تکیے پر بکھری چٹکی بھر سیندور پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ اسی لمحے انہیں اپنے ہاتھ پر پدمنی کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ انہوں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کمرہ خالی تھا' وہ تنہا تھے۔ شادی ہو جانے کے بعد کمرے کی تنہائی کسی عذاب سے کم نہیں ہوتی۔ وہ گھبرا کر باہر آ گئے۔

وہ تمام بزرگ ابھی تک اسی کمرے میں تھے۔ وہ وہاں جانا نہیں چاہتے تھے۔ شادی کے ذکر سے انہیں کوفت ہو رہی تھی۔ اسی لئے وہ بہنوں کے کمرے میں آ گئے۔ چند دنوں بعد گھر میں شادی کا ہنگامہ ہونے والا تھا۔ بہنیں اسی کی تیاری میں مصروف تھیں۔ پورے گھر میں شادی کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں مگر ان کے دل میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ وہ ایک شادی کے بعد دوسری شادی نہیں کرنا چاہتے تھے اور جیسی شادی انہوں نے کی تھی' اسے شاید کوئی تسلیم نہ کرتا۔

وہ وہاں سے اٹھ کر گھر سے باہر آ گئے۔ انہیں کہیں سکون نہیں مل رہا تھا۔ وہ برگد کے سائے میں آ کر چبوترے پر بیٹھ گئے مگر بے چینی کسی طرح کم نہیں ہو رہی تھی۔ جب انسان کچھ کہنا چاہتا ہو اور کہہ نہ پاتا ہو تو اندر گھٹن بڑھ جاتی ہے۔

ان کے اندر بھی یہی ہو رہا تھا۔ وہ اپنے دل کا غبار نکالنا چاہتے تھے۔ اپنے ذہن کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے تھے اور سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ یہ بات کس سے کریں۔ کسے اپنا ہمراز بنائیں۔ نانا جان کے سامنے اپنا فیصلہ سنانا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا مگر یہ بات کہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتے' ان تک پہنچانی ضروری بھی تھی۔

شام سے پہلے یہ بات بزرگوں تک پہنچانے کے لئے دل بے چین تھا۔ نانا جان آج شام پنچایت میں شادیوں کی تاریخ مقرر کر کے سارے معاملات طے کرنے والے تھے۔

ماموں کے پاس وقت بہت کم رہ گیا تھا اور جو باقی تھا' وہ ریت کی طرح مٹھی سے نکلتا جا رہا تھا۔

وہ مضطرب ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ عصر کا وقت ہو چلا تھا۔ وہ نانا جان کے روبرو بات کرنے کا فیصلہ کر کے دروازے کی طرف بڑھے لیکن وہاں پہنچتے ہی حوصلہ پست ہو گیا۔ وہ ایک بزدل کی طرح پلٹ آئے۔

اپنی بات بزرگوں تک پہنچانے کے لئے کسی کی سرپرستی ضروری تھی۔ وہ سوچنے لگے کسے ذریعہ بنایا جائے؟ پھر انہیں بڑے ماموں کا خیال آیا۔ یہ خیال آتے ہی انہوں نے گھر کی طرف دیکھا۔ وہ اٹھ کر جانے ہی والے تھے ایسے ہی وقت دروازے سے نانا جان اور بڑے ماموں باہر آئے۔ انہیں ایسا لگا جیسے وقت کی ریت پوری طرح ان کے ہاتھ سے پھسل چکی ہے۔ نانا جان کی تیاری بتا رہی تھی کہ وہ ان کی تقدیر کے فیصلے پر مہر لگانے جا رہے ہیں۔

وہ انہیں روکنا چاہتے تھے۔ احتجاج کرنا چاہتے تھے لیکن سعادت مندی نے ہونٹ سی رکھے تھے۔ وہ دونوں تانگہ اسٹینڈ کی طرف جا رہے تھے۔ انہوں نے درخت سے ٹیک لگا کر سوچا۔ "بزرگوں کی نافرمانی کرنے سے ڈر لگ رہا ہے لیکن یہ ضروری بھی ہے۔ ابا جی سے بات نہ کی گئی تو معاملہ الجھ جائے گا۔ میں کبھی خود کو دوسری شادی کے لئے تیار نہیں کر سکتا۔ ابھی صرف تاریخ طے کی جا رہی ہے' مجھے شادی سے پہلے کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا۔"

وہ گہری سوچ میں گم تھے۔ بہت سی باتوں پر غور کر رہے تھے۔ بڑے ماموں نانا جان کو رخصت کر کے واپس آ گئے۔ گھر کے اندر جاتے ہوئے ان کی نظر چھوٹے ماموں پر پڑی تو وہ ان کے پاس چلے آئے پھر پوچھا۔ "کہاں گم ہو؟"

انہوں نے چونک کر دیکھا پھر بولے۔ "بزرگ! ہمیشہ ہماری بہتری کے لئے سوچتے ہیں لیکن کبھی کبھی ان کے فیصلے اولاد کے لئے الجھن کا باعث بن جاتے ہیں مگر ان سے یہ غلطی انجانے میں ہوتی ہے۔ آج ہمارے بزرگ بھی انجانے میں ایک غلطی کر رہے ہیں۔"

انہوں نے پوچھا۔ "یہ .... تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولے۔ "وہ .... دراصل بات یہ ہے کہ.........."

وہ خاموش ہو گئے' سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کن لفظوں میں اپنا مدعا بیان کریں۔ انہیں یہ فکر بھی ستانے لگی تھی کہ شادی سے انکار کی وجہ بھی پوچھی جائے گی تو وہ کیا جواب دیں گے؟

وہ انہیں خاموش دیکھ کر بولے۔ "تم کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئے۔ کیا اپنی الجھن مجھے نہیں بتاؤ گے؟"

بھائی کے شفقت بھرے انداز نے ان کی ہمت بندھائی۔ وہ بولے۔ "دراصل بھائی جان! میں یہ .... یہ شادی .... نہیں کر سکتا۔"

انہوں نے چونک کر حیرت سے پوچھا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ بزرگوں کا فیصلہ میری زندگی کے لئے بہتر نہیں ہے۔"

"بزرگوں کے فیصلے کو غلط کہہ رہے ہو۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟"

"بس .... میں شادی نہیں کر سکتا۔"

"اگر تمہیں شادی نہیں کرنی تھی تو اباجی کے پنچائیت میں جانے سے پہلے یہ بات انہیں بتا دیتے۔ وہ سب کے سامنے شادی کی تاریخ طے کرنے گئے ہیں۔ تمہارا انکار ان کا سر نیچا کر دے گا۔ وہاں سارے معاملات طے کئے جا رہے ہیں اور تم انکار کر رہے ہو؟"

"ہمارا گھریلو ماحول اور بچپن کی تربیت ایسی ہے کہ ہم بزرگوں کے سامنے زبان نہیں کھول سکتے۔ ان کی نافرمانی نہیں کر سکتے۔ میں کل سے اسی الجھن میں گرفتار ہوں۔ ابا جی کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرنے کے لئے راستے تلاش کر رہا ہوں۔"

وہ بڑے ماموں کا ہاتھ تھام کر بولے۔ "بھائی جان! مجھے یقین ہے' آپ میرا یہ فیصلہ ان تک پہنچانے میں میری مدد کریں گے۔"

"ابا جی مجھ سے انکار کی وجہ دریافت کریں گے۔"

"میں ملٹری میں ایک معمولی سپاہی ہوں۔ مجھے آگے بڑھنے کے لئے ابھی بہت محنت کرنی ہے۔ میں خود کو صوبے دار کے عہدے تک لے جانا چاہتا ہوں۔ اس لئے فی الحال شادی کے جھنجٹ میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

"یہ تو الجھن والی بات نہیں ہے۔ اگر تم اپنی ملازمت میں ترقی کے باعث شادی نہیں کرنا چاہتے تو ٹھیک ہے صرف نکاح پڑھوا لو۔ رخصتی ایک یا دو سال بعد کر دی جائے

گی۔"

وہ ان کی بات سن کر چونک گئے پھر بولے۔ "نکاح ہو یا شادی .... بات تو ایک ہی ہے۔ نہ جانے میری ترقی میں کتنا وقت لگے۔ نکاح کے بعد انسان بندھ جاتا ہے کچھ عرصے بعد ہی رخصتی کے لئے دباؤ ڈالا جائے گا۔ کوئی اپنی بیٹی کو کب تک گھر بٹھائے گا؟"

انہوں نے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "منور! سچ بتاؤ .... ملازمت کی وجہ سے انکار کر رہے ہو یا کوئی پسند آ گئی ہے؟"

وہ نظریں چراتے ہوئے بولے۔ "نہیں بھائی جان! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔"

"اگر ایسی بات نہیں ہے تو میرا مشورہ بالکل درست ہے۔ نکاح پڑھوا لو۔ تمہارے اس فیصلے سے بزرگ بھی خوش ہو جائیں گے۔"

وہ الجھتے ہوئے بولے۔ "آپ میری الجھن کو سمجھ نہیں رہے۔ میں اس شادی کے قابل نہیں ہوں۔"

انہوں نے چونک کر دیکھا پھر کچھ سوچ کر دھیمی آواز میں بولے۔ "اگر ایسی بات ہے تو تمہیں کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہئے تھا۔"

انہوں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا پھر بولے۔ "آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ مجھے کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ بس میرا یہ کام کر دیں۔ ابا جی تک میری بات پہنچا دیں۔"

"تم نے بات ایسی کہی ہے کہ وہ سنتے ہی آگ بگولا ہو جائیں گے۔ شادی کی بات پنچائیت تک پہنچ چکی ہے۔ تمہارے فیصلے کو شاید ہی تسلیم کیا جائے؟"

وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ "خیر تم فکر نہ کرو۔ اباجی واپس آ جائیں تو میں ان سے بات کرتا ہوں۔ آگے تمہاری قسمت ...."

وہ چلے گئے۔ ماموں جان ان کی سرپرستی حاصل کر کے ذرا مطمئن ہو گئے۔ اندر کی گھٹن ختم ہو چکی تھی۔ دل کا غبار نکل چکا تھا۔ اب صرف نانا جان کے غصے کا سامنا کرنا تھا اور وہ اس وقت کے لئے خود کو تیار کرنے لگے۔

☆------☆------☆

نانا جان کی واپسی کے بعد پورے محلے میں مٹھائی تقسیم کی گئی گھر میں سب کا منہ میٹھا کرایا جا رہا تھا۔ نانی جان کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ اڑی اڑی پھر رہی تھیں۔ نانا جان بھی بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ حکیم صاحب نے انہیں میٹھا کھانے سے منع کیا تھا مگر اولاد کی خوشی میں پرہیز کو انہوں نے بالائے طاق رکھا ہوا تھا۔

بڑے ماموں نانا جان کی خوشی دیکھ رہے تھے۔ ایسے موقع پر کوئی بھی صدمہ پہنچانے والی بات ان سے کہتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ چار اولادوں میں سے اگر ایک کی شادی نہ بھی ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا مگر شادی کی بات گھر سے نکل کر پنچایت تک پہنچ چکی تھی۔ سارے معاملات طے ہو چکے تھے۔ اس کے بعد انکار کی کوئی معقول وجہ ہونی چاہئے تھی۔ چھوٹے ماموں نے جو وجہ بتائی تھی' اس کا حل نکاح کی صورت میں نکل سکتا تھا مگر وہ اس بات کے لئے بھی راضی نہیں تھے۔

وہ بھی بوڑھے والدین کی خوشیاں دیکھ رہے تھے۔ انہیں بھی ان سے محبت تھی۔ اگر پدمنی سے شادی نہ ہوئی ہوتی تو وہ کبھی اپنے والدین کے فیصلے سے انکار نہ کرتے مگر وقت اور حالات نے انہیں بزرگوں کی نافرمانی اور ان کے فیصلے کو مسترد کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ انہیں اپنے والدین سے بہت محبت تھی مگر پدمنی کی محبت سب پر حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی چاہت کا سحران کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ وہ انہیں کسی دوسری دلہن کے بارے میں سوچنے کی مہلت ہی نہیں دے رہی تھی۔

بڑے ماموں کشمکش میں مبتلا تھے' الجھ رہے تھے۔ انہوں نے چھوٹے ماموں کی طرف اس امید سے دیکھا کہ شاید انہوں نے اپنے فیصلے میں ترمیم کی ہو مگر ان کے انداز نے انہیں سمجھا دیا کہ ان کا حتمی فیصلہ بدل نہیں سکتا۔

انہوں نے نانا جان اور نانی جان سے کہا۔ "مجھے آپ دونوں سے ضروری بات کرنی ہے مگر تنہائی میں.........."

نانا جان نے دونوں بیٹیوں اور چھوٹے ماموں کو کمرے سے باہر جانے کو کہا۔ وہ تینوں چلے گئے تو بڑے ماموں بولے۔ "ابا جی! آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ زمانہ شناس ہیں آپ کے فیصلے ہماری بہتری کے لئے ہوتے ہیں۔ تمام والدین اپنی اولاد کی خوشی اور بہترین مستقبل کے بارے میں سوچتے ہیں مگر بعض اوقات ان کا بہتر فیصلہ درپردہ اولاد کے لئے

الجھن پیدا کر دیتا ہے۔"

انہوں نے پوچھا۔ "آخر بات کیا ہے' جو تم اتنی لمبی تمہید باندھ رہے ہو؟ مختصر الفاظ میں مقصد بیان کرو۔"

"میں اسی طرف آ رہا ہوں۔ ابا جی! آپ نے ہم چاروں بہن بھائیوں کی شادی کا فیصلہ کیا ہے اور آپ کے فیصلے سے انکار کی جسارت ہم میں سے کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ آپ کی شان میں گستاخی ہو گی۔ ہم کبھی گستاخ اولاد کہلانا پسند نہیں کریں گے۔"

نانی جان بولیں۔ "بیٹا! پہیلیاں نہ بجھواؤ' اصل بات کی طرف آؤ۔"

انہوں نے دونوں کی طرف دیکھا پھر ہچکچاتے ہوئے بولے۔ "میں جو بات کہنے جا رہا ہوں' اسے گستاخی نہ سمجھیں۔ دراصل .... وہ .... منور .... منور شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

نانا جان ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ شدید غصے میں ہیں۔ نانی جان بھی ان کی بات سن کر گھبرا گئی تھیں۔ انہیں اپنے شوہر کے غصے کا علم تھا۔ وہ اپنے مزاج کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرتے تھے۔ وہ گرج کر بولے۔

"منور شہر میں رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مجھ سے زیادہ عقلمند ہو گیا ہے۔ لگتا ہے وہاں کی ہوا نے اپنا اثر دکھایا ہے۔ اسے بلاؤ۔ میں ابھی اس کے دماغ سے بغاوت نکالتا ہوں۔ اس کی یہ جرأت کہ میرے فیصلے سے انکار کرے اور انکار بھی کب کر رہا ہے؟ جب بات پنچایت تک پہنچ چکی ہے۔"

وہ انہیں شانوں سے پکڑ کر بٹھاتے ہوئے بولے۔ "ابا جی! میں اس وقت آپ کی حالت سمجھ رہا ہوں۔ تسلی سے بیٹھ کر بات کریں۔ اگر منور میں خود بات کرنے کی ہمت ہوتی تو وہ مجھے بیچ میں کیوں لاتا۔ ہماری پرورش ایسے ماحول میں ہوئی ہے کہ ہم اپنی شادی کے بارے میں بزرگوں کے روبرو کچھ نہیں بول سکتے۔ شادی ہی کیا' ہم کسی بھی معاملے میں آپ کے سامنے آواز بلند نہیں کر سکتے۔"

"پھر اس نے یہ جرأت کیوں کی؟ پنچایت کے سامنے میری پگڑی اچھالنے کے لئے' یا اس بیٹی کے باپ کے سر کو جھکانے کے لئے؟"

"آپ غلط سوچ رہے ہیں۔ اس کا ایسا کوئی مقصد نہیں ہے۔ وہ تو صرف اپنی

ملازمت میں کسی اہم عہدے تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اس لئے شادی سے انکار کر رہا ہے۔"

"شادی ہو جائے گی تو کیا برٹش آرمی اسے کوئی اہم عہدہ دینے سے انکار کر دے گی؟ ملازمت میں ترقی کا دار و مدار اہلیت اور لگن پر ہوتا ہے۔ وہ ترقی کو سہارا بنا کر شادی سے انکار کر رہا ہے' یہ سراسر بہانہ ہے۔"

نانی جان نے کہا۔ "ہو سکتا ہے' وہ کسی اور کو پسند کرنے لگا ہو' مگر بتانے سے شرما رہا ہو؟ میں اسے بلاتی ہوں لیکن آپ وعدہ کریں کہ نرم لہجہ اختیار کریں گے۔ میں نہیں چاہتی کہ جوان اولاد باپ سے بددل ہو جائے۔"

وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آئیں۔ ماموں اپنے کمرے میں تھے اور آنے والے وقت اور حالات کا سامنا کرنے کے لئے خود کو تیار کر رہے تھے۔ انہیں اس بات کا اندازہ تھا کہ نانا جان بال کی کھال نکالیں گے۔

وہ بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ نانی جان دروازہ کھول کر اندر آئیں۔ انہوں نے چونک کر دیکھا۔ وہ بولیں۔ "بیٹا! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ہم بڑے خوش تھے کہ چاروں کے فرائض سے سبکدوش ہو رہے ہیں مگر تم نے تو ہماری خوشیوں پر پانی پھیر دیا۔ تمہارے ابا جی بلا رہے ہیں۔ تم جوان ہو' تمہارا خون گرم ہے لیکن میری ایک التجا ہے کہ اپنے باپ کے سامنے آواز اونچی نہ کرنا' تسلی سے بات کرنا۔ میری پرورش اور تربیت کی لاج رکھنا۔"

"ماں جی! اسی لئے میں نے اپنا فیصلہ بھائی جان کے ذریعے ان تک پہنچایا ہے۔ میں تو ان کا سامنا کرنے سے بھی گھبرا رہا ہوں' بات کیسے کروں گا؟"

انہوں نے بڑی شفقت سے اپنے سعادت مند بیٹے کی طرف دیکھا پھر ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔ "حق بات کہنا نافرمانی نہیں ہے۔ تم پڑھے لکھے ہو' جوان ہو' اپنی زندگی کے بارے میں کوئی غلط فیصلہ نہیں کرو گے۔ میں جانتی ہوں تمہارے فیصلے میں ضرور کوئی نہ کوئی مصلحت ہو گی آؤ میرے ساتھ' اپنے ابا جی سے خود بات کرو۔"

وہ انکار کرنا چاہتے تھے لیکن ماں کی باتوں سے حوصلہ مل رہا تھا۔ اس لئے خاموشی سے ان کے ساتھ نانا جان کے کمرے میں آ گئے۔ ان سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ سر جھکا کر چارپائی کے سرے پر بیٹھ گئے۔

نانا جان ذرا تیز لہجے میں بولے۔ "منور! جو کچھ میں نے سنا ہے' کیا وہ درست ہے؟"

ان سے سوال پوچھا گیا تھا لہٰذا جواب دینا ضروری تھا مگر زبان تو جیسے تالو سے چپک گئی تھی۔ ایک ذرا سا لفظ "ہاں" کہنے سے ہچکچا رہی تھی۔

وہ دوبارہ بولے۔ "میں کچھ پوچھ رہا ہوں؟ کیا تمہیں شادی سے انکار ہے؟"

انہوں نے گھبرا کر بڑے ماموں کی طرف دیکھا پھر سر کو تائیدی انداز میں جنبش دے کر نحیف سی آواز میں بولے "جی .... ابا جی.........!"

"انکار کی وجہ؟"

اس سوال پر انہوں نے سوالیہ نظروں سے پھر بڑے ماموں کو دیکھا۔ نانا جان بولے۔

"اسے کیا دیکھ رہے ہو؟ اسے تو تم نے ایک بہانہ بتایا ہے جو میں سن چکا ہوں مگر اب اصل حقیقت تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔"

ماموں ان کی بات سن کر گھبرا گئے۔ انہیں یہ اندازہ تو تھا کہ نانا جان اچھی طرح چھان بین کریں گے مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان کے جھوٹ کو پہچان لیں گے۔

وہ سر جھکا کر بولے۔ "ابا جی! یہ بہانہ نہیں ہے۔ جو کچھ آپ کو بتایا گیا ہے وہی اصل حقیقت ہے۔"

"جھوٹ نہ بولو......... تمہارا کمزور لہجہ میری پیش گوئی کو سچ ثابت کر رہا ہے۔ میں تمہارا باپ ہوں' باپ کے سامنے جھوٹ نہ بولو۔ اصل حقیقت سے آگاہ کرو۔ شاید ہم سب مل کر کوئی بہتر راستہ تلاش کر سکیں۔"

انہوں نے بڑے ماموں کو دیکھا پھر نانی جان کی طرف دیکھا۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے سچ بولنے کے لئے سہارا تلاش کر رہے ہوں۔ وہ سوچ رہے تھے کہ انہوں نے پدمنی کے بارے میں بتایا تو گھر والے اس سے ملنا چاہیں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ہندو عورت سے شادی کو تسلیم نہ کریں۔ انہوں نے اپنی دانست میں کوئی غلط قدم نہیں اٹھایا تھا۔ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم کھا کر وعدہ کیا تھا۔ اسے نبھایا تھا۔

وہ سر جھکا کر ہچکچاتے ہوئے بولے۔ "وہ .... اصل بات یہ ہے کہ .... میں .... میں شادی کر چکا ہوں۔"

ان تینوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ایسا دھماکہ کریں گے۔ سب کا اندازہ یہی تھا کہ شاید انہیں کوئی لڑکی پسند آ گئی ہے؟ مگر

یہاں تو بات پسندیدگی سے آگے نکل چکی تھی۔

اولاد والدین سے چھپ کر شادی کر لے تو انہیں بہت صدمہ پہنچتا ہے پھر یہ تو اس زمانے کی بات ہے جب بیٹے جوان ہونے کے بعد بھی ماں باپ سے نظریں ملا کر بات نہیں کرتے تھے۔ نانی جان کے دل پر تو جیسے صدمے کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ بیٹے کے سر پر اپنے ہاتھوں سے سہرا سجانے کی متمنی تھیں۔

انہوں نے صدمے سے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”میری تربیت میں کس بات کی کمی رہ گئی تھی جو تم نے اتنا بڑا قدم اکیلے ہی اٹھا لیا۔ تم ہمیں اپنی پسند بتاتے میں خود اپنی بہو کو اس گھر میں لاتی۔“

وہ اس سے آگے کچھ نہ بول سکیں۔ آنسوؤں میں الفاظ ڈوب گئے۔ وہ آنچل میں منہ چھپا کر رونے لگیں۔ نانا جان غصے میں بھرے بیٹھے تھے۔ گرج کر بولے۔ ”ناخلف اولاد! نکل جاؤ اس کمرے سے .... میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔“

بڑے ماموں نے نانا جان سے کہا۔ ”خدا کے لئے ابا جی! اس بات کو دل پر نہ لیں۔ زیادہ غصہ آپ کی صحت کے لئے ٹھیک نہیں ہے۔ منور کو جو کرنا تھا‘ وہ کر چکا۔ میں سمجھ رہا ہوں کہ اس بات سے آپ کو شدید صدمہ پہنچا ہے لیکن ہمیں اسے ٹھنڈے دل و دماغ سے قبول کرنا ہو گا۔“

وہ چھوٹے ماموں کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”اس نے نافرمانی کی ہے اور اس کی سزا یہ ہے کہ یہاں سے چلا جائے۔ میرے گھر میں ایک نافرمان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔“

نانی جان نے روتے روتے چونک کر دیکھا۔ وہ اپنے بیٹے کو خود سے جدا ہوتے کیسے دیکھ سکتی تھیں؟ انہوں نے آنسو بہا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیا تھا۔ وہ ایک انجانی بہو کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو چکی تھیں مگر نانا جان کے فیصلے نے ان کا دل دہلا دیا۔

وہ تڑپ کر بولیں۔ ”یہ .... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میرے بیٹے کو غلطی کی اتنی بڑی سزا تو نہ دیں۔ اس نے شادی کی ہے‘ گناہ نہیں کیا۔ میں اپنے بچے کو اس گھر سے کہیں نہیں جانے دوں گی۔ اس نے جس سے بھی شادی کی ہے‘ اب وہ ہماری بہو ہے اور میں انہیں اسی گھر میں رکھوں گی۔“

”ٹھیک ہے مگر اس سے کہو کہ ابھی میری نظروں سے دور ہو جائے۔“

”اس سے یہ تو پوچھیں کہ بہو ہے کہاں؟ ساتھ کیوں نہیں لایا؟ ہمیں اس کا پتا بتائے۔ میں خود اسے لینے جاؤں گی۔“

وہ جھنجلا کر بولے۔ ”جو پوچھنا ہے خود ہی پوچھو۔“

نانی جان نے ماموں سے پوچھا۔ ”بولو بیٹا! ہماری بہو کس گاؤں میں رہتی ہے اور اسے اپنے ساتھ کیوں نہیں لائے؟“

وہ الجھ گئے۔ انہیں تو خود اس کا پتا معلوم نہیں تھا پھر گھر والوں کو کیا بتاتے‘ وہ بولے۔ ”میں نہیں جانتا کہ وہ کس گاؤں میں رہتی ہے؟“

ان تینوں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ نانی نے پوچھا۔ ”کیا مطلب .... تم نے اس سے شادی کی اور اس کے گاؤں کے بارے میں نہیں جانتے؟“

بڑے ماموں نے پوچھا۔ ”اس سے تمہاری ملاقات کہاں ہوئی تھی؟“

انہوں نے کہا۔ ”میں ایک جنگل سے گزر رہا تھا۔ پیاس کے باعث حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ وہیں ایک کنوئیں کے پاس اس سے ملاقات ہوئی تھی۔“

بڑے ماموں نے پوچھا۔ ”یہ پچھلے سال کی بات ہے؟“

”نہیں یہ دو دن پہلے کی بات ہے۔“

وہ حیرت سے بولے۔ ”پہلی ہی ملاقات میں شادی بھی ہو گئی؟“

”صورتِ حال ہی کچھ ایسی تھی۔ اس نے پانی پلانے سے پہلے مجھے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم دی تھی کہ وہ جو کہے گی‘ مجھے وہی کرنا ہو گا۔“

نانی جان نے پوچھا۔ ”اس نے کیا کہا تھا؟“

”پانی پینے کے بعد میں واپسی کے لئے پلٹا تو اس نے مجھے میرا وعدہ یاد دلایا اور مجھ سے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم کھا کر وعدہ کیا تھا اس لئے انکار نہ کر سکا۔“

نانی جان نے پوچھا۔ ”شادی میں اس کے گھر والے شامل ہوئے ہوں گے؟ تم ان کے گھر بھی گئے ہو گے؟“

انہوں نے پوچھا تو وہ تفصیل سے پورا واقعہ سنانے لگے۔ وہ تینوں بڑی حیرانی سے

سن رہے تھے اور انہیں بے یقینی سے دیکھ رہے

جب انہوں نے آگ کے گرد سات پھیروں اور لگن منڈپ کا ذکر کیا تو نانی جان نے چونک کر پوچھا۔ "کیا وہ ہندو ہے؟"

نانا جان نے غصے سے کہا۔ "سن لیا .... بڑا مان تھا اپنے بیٹے پر .... صاحب زادے ایک ہندو عورت سے شادی کر کے آ رہے ہیں۔ وہ بھی ان ہی کی رسم کے مطابق۔ اسے اپنے مذہب میں لانے کے بجائے خود اس کے دھرم میں داخل ہو گئے۔"

وہ بے بسی سے بولے۔ "شادی کا فیصلہ تو میں نے صرف قسم پوری کرنے کے لئے کیا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا' مجھے کچھ معلوم نہیں کہ کیسے ہوا؟ صبح آنکھ کھلی تو میں اس جنگل میں تھا۔"

بڑے ماموں نے پوچھا۔ "اور وہ عورت جس سے تمہاری شادی ہوئی تھی' وہ کہاں گئی؟"

"میں بیدار ہوا تو تنہا تھا۔ پدمنی کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہیں میرے پہلو میں اشرفیوں سے بھری پوٹلی رکھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد گھر تک میں نے کیسے سفر کیا' مجھے کچھ علم نہیں۔"

نانا جان اور نانی جان ایک دوسرے کو تشویش بھرے انداز میں دیکھ رہے تھے۔ بڑے ماموں نے پوچھا۔ "اس کا مطلب ہے تمہاری اس سے دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی؟"

"وہ کل رات میرے پاس آئی تھی۔"

ان تینوں نے چونک کر پوچھا۔ "کیا........؟"

نانی بولیں۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ اگر وہ یہاں آتی تو اس سے ہماری بھی ملاقات ہوتی۔"

"کل رات وہ میرے کمرے میں میرے ساتھ تھی۔"

بڑے ماموں بولے۔ "ہم رات کو صحن میں سوتے ہیں۔ اگر رات وہ تمہارے کمرے میں آئی تھی تو گھر میں آنے کے لئے دروازے سے ہی اندر آئی ہو گی؟ ہم سب وہیں تھے' ہمیں تو وہ نظر نہیں آئی۔"

"آپ لوگ یقین کریں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے کل رات سیندور سے اس

کی مانگ بھری تھی۔"

نانا جان نے کہا۔ "یہ کیا اول فول بک رہا ہے؟"

"اگر آپ کو میری بات پر یقین نہیں ہے تو کمرے میں جا کر میرا تکیہ دیکھ لیں۔ اس کے کنارے پر چٹکی بھر سیندور بکھرا ہوا ہے۔"

کسی کو ان کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ نانی جان سینے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ "ہائے .... میرے بچے کو کیا ہو گیا ہے؟ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے؟"

نانا جان اور بڑے ماموں اٹھ کر ان کے کمرے میں چلے گئے۔ نانی جان ان کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ بولے۔ "ماں جی! آپ تو میری بات کا یقین کریں۔ آج بھی وہ میرے پاس آئے گی تو میں ضرور اس سے آپ کی ملاقات کراؤں گا۔"

وہ حیرت سے ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں واپس آ گئے۔ ان کی خاموشی اور سنجیدگی نانی جان کو تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔ انہوں نے پوچھا۔ "کیا ہوا' کیا منور سچ کہہ رہا ہے؟"

نانا جان گہری سنجیدگی سے انہیں دیکھتے ہوئے بولے۔ "ہاں .... یہ سچ کہہ رہا ہے۔ تکئے پر سیندور موجود ہے۔"

انہیں یقین نہیں آیا۔ وہ اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ کچھ دیر کے بعد واپس آ کر بولیں۔ "میرے بچے کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ ابھی مجھ سے کہہ رہا تھا وہ آج بھی آئے گی اور یہ اس سے ہماری ملاقات کرائے گا۔"

انہوں نے سوالیہ نظروں سے ماموں کی طرف دیکھا۔ وہ بولے۔ "ہاں .... آج رات وہ آئے گی تو اس سے آپ لوگوں کی ملاقات کراؤں گا۔"

بڑے ماموں نے پوچھا۔ "وہ یہاں کس وقت آئے گی؟"

"مجھے وقت کا تو اندازہ نہیں' شاید آدھی رات کے بعد آئے۔"

نانی نے حیرت سے کہا۔ "آدھی رات کے بعد ایک تنہا عورت کیسے آئے گی؟ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا' یہ کیا کہہ رہا ہے؟"

نانا جان نے چھوٹے ماموں سے کہا۔ "ٹھیک ہے' ہم اس سے ملاقات کریں گے۔ اب تم اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔"

وہ بڑے ماموں کی طرف دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے۔ نانا جان نے کہا۔ "یہ ضرور کسی چھلپٹ میں آگیا ہے۔ جنگل کا راستہ ویران ہوتا ہے۔ وہیں سے کوئی آسیب وغیرہ اس پر سوار ہوا ہے۔"

نانی جان رونے لگیں۔ "یااللہ! میرے بچے کو اپنے حفظ و امان میں رکھیو۔"

تمام گھر والے آدھی رات کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ بات بہنوں کو بھی معلوم ہو چکی تھی۔ وہ اور نانی جان آیتیں وغیرہ پڑھنے میں مصروف تھیں۔

ماموں اپنے کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گئے۔ وہ خود کو بہت پُرسکون محسوس کر رہے تھے۔ ذہن بالکل خالی تھا' اس لئے جلدی ہی سو گئے۔

اس زمانے میں گھڑیاں عام نہیں تھیں۔ گھڑیالی ایک بڑا سا گھنٹا بجا کر لوگوں کو وقت بتایا کرتا تھا۔

اچانک سوتے سوتے ماموں کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ پتا نہیں رات کا کون سا پہر تھا' وہ وقت کا اندازہ کر ہی رہے تھے کہ گھڑیالی کے گھنٹا بجانے کی آواز سنائی دی۔

ماموں گننے لگے۔ "ایک دو تین.........."

گھڑیالی گھنٹا بجا رہا تھا اور وہ گن رہے تھے۔ بارہ کے بعد گہری خاموشی چھا گئی۔ رات کے بارہ بجے تھے۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ وہ دوبارہ سونے کے لئے لیٹے تو آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگے۔ نیند کو بلانے میں ناکام ہونے لگے۔

اچانک انہیں دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا' وہ دھیرے دھیرے کھلتا جا رہا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھے پھر حیرت سے سوچنے لگے۔ "میں تو چٹخنی لگا کر سویا تھا پھر یہ کیسے کھل گیا؟"

دروازہ مکمل طور پر کھل گیا۔ ستاروں کی روشنی میں کھلے ہوئے دروازے سے نسوانی سایہ دکھائی دے رہا تھا۔ انہوں نے جلدی سے اٹھ کر لالٹین جلالی۔ روشنی ہوتے ہی وہ واضح طور پر دکھائی دینے لگی۔ دروازے پر جانِ حیات اپنے قیامت خیز حُسن اور تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ اس کے سامنے لالٹین کی روشنی ماند پڑ گئی۔

وہ دلکش مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے کمرے میں داخل ہوئی پھر دروازے کو بند کر کے وہیں کھڑی ہو گئی۔ وہ اٹھ کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔ "یونہی دور دور سے بے چین کرتی رہو گی؟ آؤ.......... میرے پاس آکر بیٹھو۔"

اس نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔ انہوں نے ٹھٹک کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ پدمنی! آج تمہارا رویہ کچھ بدلا ہوا ہے؟"

وہ بولی۔ "میں تمہاری پتنی ہوں۔ میرے ہوتے ہوئے تم دوسری شادی کرنے کی تیاری کر رہے ہو؟"

"میں نہیں میرے گھر والے کروانا چاہتے تھے۔ آج میں نے سب سے کہہ دیا کہ میری شادی ہو چکی ہے۔"

"پھر تو تمہارے گھر والے بہت ناراض ہوئے ہوں گے۔"

"ہاں.......... ہوئے تھے لیکن بعد میں سب نے قبول کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور وہ لوگ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"میں کسی سے نہیں ملوں گی۔ میں صرف تمہاری ہوں' ہم دونوں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور اسی طرح ملتے رہیں گے۔"

"تم ان کی بہو بن چکی ہو۔ وہ تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں اور میری بھی یہی خواہش ہے۔ کیا تم میری خوشی پوری نہیں کرو گی؟"

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے ان کی طرف بڑھنے لگی پھر ان کے سینے سے لگ کر بولی۔ "میں تمہاری ہر خواہش پوری کر سکتی ہوں لیکن تمہارے گھر والوں سے نہیں مل سکتی۔ میں مجبور ہوں۔"

وہ خمار آلود آواز میں دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔ اس کی سانسوں کی تپش ان کے جذبات کو گرما رہی تھی' اس کا دھیما لہجہ دیوانہ بنا رہا تھا۔ ان کے دل و دماغ پر نشہ سا چھانے لگا۔ ان میں یہ پوچھنے کی سکت بھی نہ رہی کہ وہ ان کے گھر والوں سے کیوں نہیں مل سکتی' اس کی کیا مجبوری ہے؟

اس کی قربت انہیں مدہوش بنا رہی تھی' دنیا جہان سے بیگانہ کر رہی تھی۔ وہ کچھ نہ بول سکے۔ اس کا بدن بول رہا تھا۔ ایسی بولی کو سن کر بڑے بڑے شہ زوروں کی بولتی بند

ہو جاتی ہے۔

وہ اس کے طلسماتی حسن میں گرفتار ہوتے چلے گئے۔ یہ ایسی قید ہوتی ہے جہاں سے قیدی رہائی کی تمنا نہیں کرتا۔

گھر کے تمام افراد آنگن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھے ان دیکھی اور انجانی بہو کا انتظار کر رہے تھے۔ سب کی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ فضا بہت پُرسکون تھی۔ نئی دلہن کے آنے کی ہلچل پیدا نہیں ہو رہی تھی۔

نانی جان بولیں۔ ”مجھے نہیں لگتا کہ وہ آئے گی۔ آدھی رات گزر چکی ہے۔“

نانا جان کو ماموں کی باتوں پر اور ان کی سنائی ہوئی کہانی پر یقین نہیں تھا لیکن سیندور کا آنکھوں دیکھا ثبوت انہیں الجھا رہا تھا۔

انہوں نے بڑے ماموں سے کہا۔ ”منور کو بلاؤ۔ آدھی رات گزر چکی ہے۔ آخر وہ کب آئے گی؟ ہم اس کے انتظار میں کب تک جاگتے رہیں گے؟“

بڑے ماموں نے ان کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ انہوں نے دوبارہ دستک دیتے ہوئے انہیں پکارا۔ ”منور! دروازہ کھولو۔“

اب بھی گہری خاموشی چھائی رہی۔ انہوں نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ لالٹین جل رہی تھی۔ اس کی روشنی میں وہاں کی ہر چیز واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ ان کی نظر بستر پر پڑی تو حیرت کے مارے ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

چھوٹے ماموں جب اپنے کمرے میں سونے کے لئے آئے تھے تو گھر کے تمام افراد صحن میں چارپائیوں پر آ کر بیٹھ گئے تھے۔ اس کے بعد وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلے تھے۔ دروازہ مستقل بند رہا تھا لیکن اب وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے خالی بستر کو دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے' منور کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ اس کمرے کا کوئی دوسرا دروازہ بھی نہیں ہے' گلی میں جو کھڑکی کھلتی ہے' اس میں بھی آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں پھر......... پھر وہ کہاں چلا گیا؟

انہوں نے پورے کمرے کو چھان مارا۔ چارپائی کے نیچے بھی دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ پریشانی کے عالم میں بوکھلائے ہوئے باہر آئے۔ ان کی حالت دیکھ کر سب گھبرا گئے۔

نانا جان نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟ تم اس قدر پریشان کیوں ہو؟ منور تو ٹھیک ہے نا؟“

نانی جان کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں۔ ”میرا منور تو خیریت سے ہے نا؟“

بڑے ماموں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھنے سے روک دیا۔ سب سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ بولے۔ ”اندر وہ ہوتا تو میں ضرور اس کی خیریت معلوم کرتا۔“

نانا جان نے حیرت سے پوچھا۔ ”یہ .... تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ وہاں کوئی نہیں ہے۔ کمرہ خالی ہے۔“

نانی جان نے چیخ کر کہا۔ ”نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔“

وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر تیزی سے کمرے کی طرف بڑھیں۔ اندر آ کر ماموں کو پکارنے لگیں مگر آواز سننے والا نہ جانے کہاں چلا گیا تھا؟ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ دونوں بہنیں اور نانا جان بھی کمرے میں آ گئے۔ خالی کمرہ دل دہلا رہا تھا۔

نانی جان نے روتے ہوئے پوچھا۔ ”وہ چڑیل میرے بچے کو نہ جانے کہاں لے گئی ہے؟ کسی مولوی کو بلاؤ۔ شہر کی نوکری نے میرا بچہ مجھ سے چھین لیا۔ نہ وہاں ملازمت کرتا اور نہ ہی اس منحوس جنگل سے گزرتا۔ وہ ڈائن میرے بچے کو کھا جائے گی۔ تم لوگ جاؤ' اسے تلاش کرو۔“

وہ روتے روتے بے ہوش ہو گئیں۔ گرنے ہی والی تھیں کہ بیٹیوں نے آگے بڑھ کر انہیں سنبھال لیا۔ بڑے ماموں مکان کے باہر چاروں طرف دیکھ آئے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ”ابا جی! میرا خیال ہے' ہمیں گاؤں والوں کو اطلاع کرنی چاہئے۔ سب مل کر تلاش کریں گے تو شاید وہ کہیں مل جائے۔“

وہ تائید میں بولے۔ ”ہوں .... تم ٹھیک کہتے ہو .... ہمیں یہی کرنا چاہئے۔“

انہوں نے محلے کے لوگوں کو جمع کیا۔ تمام مرد حضرات ہاتھوں میں لاٹھیاں اور لالٹینیں لے کر چھوٹے ماموں کی تلاش میں مختلف گلیوں اور محلوں میں پھیل گئے۔ تقریباً پورا گاؤں جاگ چکا تھا۔ محلے کی عورتیں نانی جان کے پاس اظہارِ افسوس کے لئے جمع ہونے لگیں۔ وہ ہوش میں آ چکی تھیں۔ ان سب کو بیٹے پر بیتا ہوا واقعہ سنا رہی تھیں۔

گاؤں کا چپا چپا چھان لیا گیا۔ مسجد سے لے کر دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں

بھی تلاش کیا گیا لیکن ان کا کہیں نام و نشان نہیں ملا۔ پیروں کے نشان دیکھ کر کھوج لگانے والا کھوجی بھی ان کے ساتھ تھا۔ اسے کسی جگہ ان کے پیروں کے نشانات نہیں ملے۔

ان میں سے ایک بزرگ نے مشورہ دیا۔ "گھڑیالی سے معلوم کرو۔ شاید اس نے منور کو دیکھا ہو؟"

مشورہ قابلِ قبول تھا۔ بڑے ماموں گھڑیالی کے مکان کی طرف چلے گئے۔ تمام مرد حضرات آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ سب کا یہی خیال تھا کہ کوئی بدروح انہیں اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ ایسی مافوق الفطرت چیزیں تو انسانی لہو کی دشمن ہوتی ہیں۔ دیکھو ....اب منور کا کیا انجام ہو گا؟

دوسری طرف گھر میں محلے کی عورتیں ایسی باتیں کر کے نانی جان کا دل دہلا رہی تھیں۔ بہنیں جائے نماز پر بیٹھی مختلف آیاتِ قرآنی کے ورد میں مصروف تھیں اور رو کر بھائی کی واپسی اور خیریت کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔ گاؤں میں اکثر چھوٹے موٹے واقعات تو ہوتے رہتے تھے لیکن اس واقعے نے پورے گاؤں کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔

کچھ دیر بعد بڑے ماموں واپس آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ نانا جان نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ہوا.......... کوئی خبر ملی؟"

وہ بولے۔ "اس نے بتایا ہے کہ وہ نصف شب کا گھڑیال بجا کر فارغ ہوا تو کچھ دیر بعد اس نے ایک شخص کو شمشان گھاٹ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے اسے آوازیں بھی دی تھیں مگر وہ رکا نہیں تھا۔ ڈر کے مارے اس نے بھی اس کا پیچھا نہیں کیا۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھتا رہا' وہ شخص شمشان گھاٹ کے اندر جا چکا تھا۔"

نانا جان نے تمام افراد کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ سب کی متفقہ رائے یہی تھی کہ وہ منور ہی ہو گا۔

دس پندرہ افراد پر مشتمل یہ چھوٹی سی فوج شمشان گھاٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہاں دروازے سے داخل ہوتے ہی پنڈت جی کی چھوٹی سی کٹیا بنی ہوئی تھی۔ نانا جان کے کہنے پر انہیں جگایا گیا۔ وہ سمجھے کہ شاید مسلمانوں نے ان پر حملہ کر دیا ہے۔ وہ گھبرائے ہوئے باہر آئے۔ نانا جان نے انہیں اپنے مسئلے سے آگاہ کیا تو ان کی جان میں جان آئی۔ تمام افراد لالٹینیں ہاتھ میں لئے اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ کچھ دیر بعد ایک شخص کی آواز سنائی

دی۔ "سب لوگ یہاں آ جائیں ...... منور مل گیا ہے۔"

یہ آواز سنتے ہی نانا جان' بڑے ماموں اور تمام افراد دوڑتے ہوئے اس جگہ پہنچے۔ ماموں ایک درخت کے نیچے زمین پر گہری نیند میں تھے۔ بڑے ماموں نے جلدی سے جھک کر ان کے دل کی دھڑکنیں سنیں۔ وہ زندہ تھے لیکن ہوش و حواس سے بیگانہ تھے۔ خوشی کے مارے نانا جان کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے دو جوان بیٹوں میں سے کسی بدروح نے ایک کو ان سے چھین لیا ہے۔ اب انہیں زندہ سلامت دیکھ کر خوشی سے رونے لگے۔ چند بزرگوں نے انہیں دلاسا دیا۔ گاؤں والے انہیں ایک چارپائی پر ڈال کر گھر لے آئے۔

نانی جان انہیں دیکھتے ہی روتے ہوئے ان سے لپٹ گئیں۔ وہ بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔ وہ دھاڑیں مار مار کر بول رہی تھیں۔ "میرے لعل! تُو کہاں چلا گیا تھا؟ میرا بچہ کس مصیبت میں پھنس گیا ہے؟ منور!.......... منور! آنکھیں کھولو........... منور!؟"

وہ بے ہوش تھے۔ ان کے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔ نانی جان نے چونک کر سوالیہ نظروں سے نانا جان کی طرف دیکھا' پھر پوچھا۔ "یہ جواب کیوں نہیں دے رہا ہے؟"

وہ بولے۔ "بے ہوش ہے۔ حکیم صاحب کو بلوایا ہے' وہ آ کر اس کا معائنہ کریں گے۔"

دونوں بہنیں بھی ان کی حالت دیکھ کر رونے لگیں۔ محلے کی عورتیں انہیں دلاسے دے رہی تھیں۔ سب کی نظروں میں ان کی واپسی کسی معجزے سے کم نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد حکیم صاحب آ گئے۔ انہوں نے معائنے کے بعد کہا۔ "بخار کی شدت کے باعث یہ بے ہوش ہو گیا ہے۔ دوا تو میں دے دوں گا لیکن جس حالت میں صاحب زادے کو شمشان گھاٹ سے لایا گیا ہے' اس کا تقاضا ہے کہ کسی مولوی یا عالم سے رجوع کیا جائے۔ میری دوا کے ساتھ دعا بھی لازمی ہے۔ میرا مشورہ مانیں اسے فوراً کسی اچھے عالم کو دکھائیں۔ اس سلسلے میں دیر نہ کریں۔"

گاؤں والوں کو ان کی بات سے اتفاق تھا۔ وہاں ایک عالم فاضل مولانا رہتے تھے۔ ان کو بلوایا گیا۔ اچانک ماموں کسمسائے۔ تمام افراد کی توجہ ان کی طرف تھی۔ انہوں نے

آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ نانی جان نے کہا۔ "خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے تم ہوش میں آ گئے۔ اب کیسی طبیعت ہے؟"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ تمام افراد کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔ "آپ لوگ کیوں جمع ہیں؟ میں تو اپنے کمرے میں سویا تھا۔ آنگن میں کیسے آ گیا؟"

نانا جان نے ان کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "بیٹے! تم اپنے کمرے میں ہی سوئے تھے لیکن آدھی رات کے بعد ہم نے جا کر دیکھا تو تم وہاں نہیں تھے۔"

نانی جان نے پوچھا۔ "تم شمشان گھاٹ میں کیسے پہنچ گئے؟ اپنے کمرے میں جا کر تم باہر ہی نہیں آئے تھے۔"

وہ حیران سے ہو کر ان کی باتیں سن رہے تھے۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ شمشان گھاٹ کا تذکرہ کیوں کر رہے ہیں؟ انہیں صرف اتنا یاد تھا کہ وہ اپنے کمرے میں پدمنی کے ساتھ تھے۔

بڑے ماموں نے کہا۔ "تم مرگھٹ میں ایک درخت کے نیچے سو رہے تھے۔ ہم تمہیں وہاں سے اٹھا کر لائے ہیں۔"

وہ نفی میں سر ہلا کر بولے۔ "نہیں .... میں اپنے کمرے میں تھا۔ آپ سب مجھے وہاں سے اٹھا کر آنگن میں لے آئے ہیں۔"

انہوں نے کہا۔ "یہ تمام افراد اس بات کے گواہ ہیں کہ تم شمشان گھاٹ میں تھے۔"

"میں نہیں مانتا........."

"تو کیا ہم سب جھوٹ بول رہے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم .... صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں اپنے کمرے میں تھا۔"

وہ کسی کی بات نہیں مان رہے تھے۔ انہیں کچھ یاد نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد مولانا صاحب تشریف لائے۔ ماموں نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا پھر ناگواری سے اٹھ کر جانے لگے تو بڑے ماموں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا۔ تمام افراد خاموشی سے صحن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ نانی جان ان کے برابر بیٹھی ہوئی تھیں۔ مولانا صاحب نے

ایک گہری نظر ماموں پر ڈالی۔ وہ سر جھکائے ہوئے تھے۔ ان سے نظریں نہیں ملا رہے تھے۔ مولانا نے نانا جان اور بڑے ماموں سے کہا۔ "اسے کمرے میں لے چلو۔"

بڑے ماموں انہیں کمرے میں لے گئے۔ نانا جان اور مولانا صاحب بھی وہاں آ گئے۔ نانی جان بھی اندر آنا چاہتی تھیں لیکن انہوں نے منع کر دیا۔ دروازہ بند کر دیا گیا۔ باہر بیٹھے ہوئے افراد میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ سب ہی کسی غیر معمولی واقعے کے منتظر تھے۔

مولانا صاحب' نانا جان اور بڑے ماموں کمرے میں رکھے موڑھوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ماموں سر جھکائے چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا صاحب زیر لب کسی آیت کا ورد کرتے ہوئے گہری نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ کچھ بے چین اور مضطرب سے دکھائی دے رہے تھے۔

انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور بلند آواز میں آیتیں پڑھنے لگے۔ ماموں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور تحکمانہ لہجے میں بولے۔ "بیٹھ جاؤ........."

وہ کسی معمول کی طرح خاموشی سے بیٹھ گئے اور ایک ٹک انہیں تکنے لگے۔ انہوں نے پوچھا۔ "تم شمشان گھاٹ کیسے پہنچے' تمہیں وہاں کون لے کر گیا تھا؟"

انہوں نے آنکھیں بند کر کے سر جھکا لیا پھر اس طرح جھومنے لگے جیسے ان پر حال آ رہا ہو۔ ان کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور وہ دھیرے دھیرے کانپ رہے تھے۔ نانا جان اور بڑے ماموں نے پریشان ہو کر مولانا کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں تسلی دی۔

کچھ دیر بعد وہ آنکھیں کھول کر دیکھنے لگے۔ وہ انگارے کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ انہوں نے مولانا صاحب کو گھورتے ہوئے کہا۔ "یہاں سے چلے جاؤ' تمہارے منتر مجھ پر اثر نہیں کریں گے .... جاؤ یہاں سے........."

ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی' لہجہ بھی انجانا تھا۔ مولانا صاحب بولے۔ "تم اس کا پیچھا چھوڑ دو پھر میں بھی چلا جاؤں گا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولے۔ "اس کا پیچھا چھوڑ دوں .... تمہیں دنیا چھوڑنے پر مجبور

کردوں گی لیکن اسے نہیں چھوڑوں گی۔"

مولانا صاحب زیر لب آیتوں کا ورد کرنے لگے۔ ماموں غصے سے کانپتے ہوئے بولے۔ "تم ہمارے بیچ میں نہ آؤ ورنہ سنکٹ میں پڑو گے۔"

وہ مسلسل ورد کئے جا رہے تھے۔ انہوں نے تیز لہجے میں کہا۔ "مولانا! گھر جا .... تمہارا بچہ بیمار ہے۔ بڑے سنکٹ میں ہے اس کی خبر لو۔"

نانا جان اور بڑے ماموں نے چونک کر مولانا صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ مطمئن دکھائی دے رہے تھے۔ باہر سے دروازے کو زور سے پیٹا گیا۔ تینوں نے چونک کر دیکھا مولانا صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے دروازہ کھولنے کی اجازت دی۔ بڑے ماموں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ ایک شخص گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "بھائی جان کہاں ہیں؟"

بڑے ماموں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ دروازے کے باہر کھڑا ہوا کہہ رہا تھا۔ "میں مولانا صاحب کا چھوٹا بھائی ہوں۔ ان کے بیٹے کی حالت بہت خراب ہے۔ اس کے منہ سے خون نکل رہا ہے۔ بھابی بہت پریشان ہیں۔"

مولانا صاحب چونک گئے' پڑھتے پڑھتے رک گئے۔ بیٹے کا معاملہ تھا۔ اپنا خون' وہاں خون تھوک رہا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ مجبوری اور بے بسی سے بولے۔ "پتا نہیں میرے بچے کو کیا ہو گیا ہے؟ میرا جانا ضروری ہے۔ میں واپس آ کر دوبارہ وظیفہ شروع کروں گا۔ یہ کوئی پریت آتما ہے۔ اللہ کے کلام میں بڑی طاقت ہے۔ انشاء اللہ صاحب زادے کو جلدی ہی اس آسیب سے نجات مل جائے گی۔"

وہ چلے گئے' ماموں آنکھیں بند کئے سر جھکائے خاموشی سے بیٹھے ہوئے تھے پھر انہوں نے دھیرے دھیرے سر اٹھا کر بڑے ماموں اور نانا جان کی طرف دیکھا۔ اس وقت تک نانی جان اور دونوں بہنیں کمرے میں آ چکی تھیں۔ وہ دھیمے لہجے میں بولے۔ "آپ لوگ ناحق پریشان ہو رہے ہیں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا .... میں سونا چاہتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے لئے مجھے تنہا چھوڑ دیں۔"

نانی جان ان کے پاس بیٹھنا چاہتی تھیں' ان سے باتیں کرنا چاہتی تھیں۔ نانا جان نے کہا۔ "اسے آرام کرنے دو۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ابھی مولانا صاحب آ کر وظیفہ پڑھیں گے۔ خدا بہتر کرے گا۔ فی الحال اسے تنہا چھوڑ دو۔"

وہ سب باہر آ گئے۔ نانا جان آنگن میں بیٹھے ہوئے محلے کے افراد کو کمرے میں ہونے والے واقعے کی تفصیل سنانے لگے۔

دوسری طرف مولانا صاحب تیزی سے چلتے ہوئے گھر پہنچے۔ بیٹے کے کمرے میں آئے تو بیگم نے بتایا۔ "پتا نہیں نواز کو کیا ہو گیا ہے؟ دو تین بار خون تھوک چکا ہے۔ میں سمجھ رہی تھی کہ مسوڑھے سے خون نکل رہا ہے لیکن بار بار ایسا ہوا تو میں نے پریشان ہو کر آپ کو بلوایا ہے۔"

بچہ آنکھیں بند کئے لیٹا ہوا تھا۔ انہوں نے اس کے سرہانے بیٹھ کر سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ "نواز! بیٹے .... اب کیسی طبیعت ہے؟"

اس نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا پھر کہا۔ "ٹھیک ہوں۔"

مولانا صاحب نے ایک دم سے چونک کر کمرے میں چاروں طرف دیکھا پھر بیگم سے کہا۔ "تم ذرا دیر کے لئے باہر جاؤ اور جب تک میں اجازت نہ دوں اندر نہ آنا۔ میں چند آیات پڑھ کر اس پر دم کروں گا اس لئے تنہائی ضروری ہے۔"

وہ ان کا حکم سن کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ بچہ آنکھیں بند کئے لیٹا ہوا تھا۔ انہوں نے پائنتی کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک نہایت ہی حسین و جمیل عورت قیمتی زیور' سے آراستہ بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ لباس سے ہندو لگ رہی تھی۔

وہ بچے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "تمہارا بچہ بڑا سندر اور معصوم ہے۔ تم اسے چاہتے بھی بہت ہو لیکن دوسروں کے جھمیلوں میں پڑ کر اسے خود سے دور کر رہے ہو۔ آج یہ خون تھوک رہا ہے۔ کل یہ خون کی الٹیاں کرے گا۔ اس کے بعد.........."

وہ قہقہے لگانے لگی۔ انہوں نے غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "تیری شیطانی طاقت میرے خدا کے کلام سے زیادہ طاقتور نہیں ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "یہ خون تھوکتا رہے گا' الٹیاں کرتا رہے گا۔ اس کے بعد .... رام رام ست ہے۔"

انہوں نے زیر لب آیتوں کا ورد شروع کر دیا۔ وہ قہقہے لگا رہی تھی پھر اچانک غائب ہو گئی۔ انہوں نے بیٹے کی طرف دیکھا۔ وہ گہری اور پُرسکون نیند سو رہا تھا۔

دوسری طرف ماموں نیند میں چونک گئے۔ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اِدھر اُدھر سر گھما

کر کمرے کو ایسے دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں پھر انہوں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ صحن میں کوئی نہیں تھا۔ سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ وہ کمرے سے باہر آئے۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے صحن سے گزر کر دروازہ کھول کر گھر سے باہر آ گئے۔ گرمیوں کی دوپہر تھی۔ گلی میں کوئی نہیں تھا۔ چند بچے ایک درخت کے سائے میں کھیل رہے تھے۔

وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے ایک طرف چلنے لگے۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ کہاں جا رہے ہیں۔ پدمنی کی کشش اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ پکار رہی ہے' بلا رہی ہے اور وہ بے اختیار گاؤں سے باہر جانے والے راستے پر بڑھتے جا رہے تھے۔

مولانا صاحب بیٹے کی حالت دیکھ کر مطمئن ہو گئے تھے۔ انہوں نے ایک تعویذ لکھ کر اس کے گلے میں ڈال دیا پھر بیگم کو بلا کر کہا۔ "اب اس کی طبیعت بہتر ہے۔ میں نے حفاظت کے لئے ایک تعویذ پہنا دیا ہے۔ تم اس کا خیال رکھو۔ میں منور کے سلسلے میں ان کے گھر جا رہا ہوں۔"

وہ بولیں۔ "آخر اسے ہوا کیا تھا؟"

"تم جانتی ہو' شیطانی طاقتیں مجھے پریشان کرتی ہیں۔ منور جس پریت آتما کے زیر اثر ہے' وہی مجھ سے بدلہ لینے یہاں آئی تھی۔ تم فکر نہ کرو۔ میں نے حصار کھینچ دیا ہے۔ اب وہ یہاں آنے کی جرأت نہیں کرے گی۔"

وہ بیگم کو مطمئن کر کے گھر سے باہر آ گئے۔ سورج سر پر آ گیا تھا۔ بڑی تیز دھوپ تھی۔ ہوا ایسی گرم تھی جیسے آگ چھوڑ کر گزر رہی ہو۔ گلیاں ویران سی تھیں لیکن بازار میں دال' چاول اور سبزیاں خریدنے والے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ منور کے متعلق سوچتے جا رہے تھے۔ اب سے دس برس پہلے انہوں نے ایک چنڈال کے کالے جادو کا توڑ کیا تھا۔ آج بھی یہ یقین تھا کہ اس نادیدہ عورت سے جو اب انہیں دکھائی دینے لگی ہے اس سے منور کو نجات دلائیں گے۔

بازار کے بیچ میں کالی ماتا کا ایک مندر تھا۔ وہ اس مندر کے سامنے سے گزرنے لگے۔ ایسے ہی وقت اچانک لڑکھڑا کر اوندھے منہ گر پڑے۔ انہیں ایسا لگا جیسے کسی نے

کر بھینچ دیا ہو۔ ان کی ہڈیاں دکھنے لگی تھیں۔ پورا جسم کانپنے لگا تھا۔ کتنے ہی لوگ ان کے پاس دوڑتے ہوئے آئے تھے۔ ان میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی' وہ سبھی مولانا صاحب کی عزت کرتے تھے۔ وہ انہیں سہارا دے کر اٹھانے لگے۔

وہ اس قدر کمزوری محسوس کر رہے تھے کہ اٹھ کر کھڑے نہ ہو سکے۔ وہیں زمین پر بیٹھے رہ گئے۔ ایک نے کہا۔ "میں آپ کو دیکھ رہا تھا۔ آپ نے ٹھوکر نہیں کھائی تھی پھر اچانک کیسے گر پڑے؟ کیا دھوپ برداشت نہیں ہو رہی ہے؟"

وہ بولنا چاہتے تھے مگر بول نہیں پا رہے تھے۔ سینہ ایسا جل رہا تھا جیسے اندر آگ لگی ہو۔ پورا جسم لرز رہا تھا۔ سر دائیں بائیں ہل رہا تھا۔ ایک مسلمان حکیم صاحب کو اور ایک ہندو وید مہاراج کو بلا کر لے آیا۔ وہ دونوں اپنے اپنے طور پر ان کا معائنہ کرنے لگے۔ وید مہاراج نے کہا۔ "ان کو لُو لگ گئی ہے۔ گنے کا رس لے کر آؤ۔"

حکیم صاحب نے کہا۔ "سپاہی منور حسین کو کل رات شمشان گھاٹ سے لایا گیا تھا۔ کوئی چڑیل اس کے پیچھے لگ گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے' وہ مولوی صاحب سے انتقام لے رہی ہے۔"

مولوی صاحب نے "ہاں ہاں" کے انداز میں سر ہلایا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ حکیم صاحب کی تائید کر رہے ہیں کیونکہ لرزہ طاری ہونے کے باعث ویسے بھی ان کا سر دائیں بائیں اور اوپر نیچے ہل رہا تھا۔ وہ بے بس ہو گئے تھے۔ کچھ بولنے کے لئے زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ انہوں نے منہ کھول کر ایک آیت پڑھنے کا ارادہ کیا لیکن منہ کھولتے ہی زبان دانتوں کے درمیان آ گئی۔ وہ تکلیف کی شدت سے چیخنے لگے۔

اسی وقت انہیں ایک نسوانی قہقہہ سنائی دیا۔ وہ مردوں اور عورتوں کی بھیڑ میں کھڑی ہوئی تھی۔ ہنستی ہوئی کہہ رہی تھی۔ "میں سمجھ گئی ہوں۔ جب تُو پڑھنے لگتا ہے تو میری آتما شکتی کمزور پڑنے لگتی ہے۔ مجھے واپس جانا پڑتا ہے۔ اب میں تجھے پڑھنے کا موقع نہیں دوں گی۔ تجھ میں ہمت ہے تو زبان ہلا کر دکھا۔"

وہ بول رہی تھی۔ مولوی صاحب لرزتے ہوئے ایک ایک فرد کا منہ دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے کوئی اس عورت کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ کسی کو دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ایک شخص گنے کا رس لے آیا۔ حکیم صاحب نے رس بھرا گلاس ان کے منہ سے لگایا۔ وہ ایک ایک گھونٹ پینے لگے پھر رک گئے۔ وید مہاراج نے کہا۔ مولانا! پورا گلاس پی لو۔ دل اور دماغ کو ٹھنڈک پہنچے گی۔ آپ چلنے پھرنے لگیں گے۔"

وہ گلاس پھر ان کے ہونٹوں سے لگایا گیا۔ انہوں نے ایک گھونٹ پیا تو گنے کا رس سرخ ہونے لگا۔ سب لوگ حیرانی سے دیکھنے لگے۔ وہ منہ سے خون اگل رہے تھے۔ وہ خون گنے کے رس میں حل ہو رہا تھا۔ حکیم صاحب نے فوراً ہی گلاس کو ان کے منہ سے ہٹا کر ایک طرف پھینک دیا۔ اپنے شانے پر رکھے ہوئے بڑے رومال سے ان کا منہ پونچھنے لگے۔ اسی وقت انہوں نے ابکائی لی۔ ایک بڑی سی قے کی پھر بیٹھے بیٹھے گر پڑے۔ اس سے پہلے کہ کوئی ان کے لئے کچھ کرتا' ان کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ وہ ہمیشہ کے لئے ساکت ہو گئے۔

وہ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ چند منٹوں میں ان کی موت کی خبر گھر گھر پہنچ گئی۔ نانا جان اور بڑے ماموں اور گھر کی عورتیں سب ہی پریشان ہو گئے۔ ان کے ذہنوں میں یہی خیال آیا کہ اس بلا نے انہیں بے دردی سے مار ڈالا۔ ان کے بھائی نے آ کر اطلاع دی تھی کہ ان کے بیٹے کے منہ سے خون نکل رہا ہے۔ وہ بیٹے کو بچانے گئے تھے۔ اس بلا نے بیٹے کو چھوڑ کر ان سے خون کی الٹیاں کرائیں پھر انہیں مار ڈالا۔

ان سب کو ماموں جان کی فکر ہوئی۔ وہ دوڑے دوڑے ان کے کمرے میں آئے تو کمرہ ان کے وجود سے خالی تھا۔ انہوں نے مکان کے دوسرے حصوں میں جا کر دیکھا۔ مکان کے باہر چاروں طرف انہیں پکارا مگر نہ وہ آئے' نہ ان کی صداؤں کا جواب آیا۔

نانا جان نے پریشان ہو کر کہا۔ "وہ اس کڑی دھوپ میں کہاں جائے گا؟ وہ تو بستر پر آرام سے لیٹا ہوا تھا۔"

نانی جان سینہ پیٹ کر رونے لگیں۔ ماموں کی دونوں بہنیں انہیں پکڑ کر مکان کے اندر لے آئیں۔ بڑے ماموں نے گاؤں کے پنچوں کو خبر دی پھر یہ خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ عورتیں اور بچے یہ معلوم کر کے سہم گئے تھے کہ کوئی بلا ان کے گاؤں میں آ گئی ہے۔ وہ مولوی صاحب کو مار ڈالنے کے بعد سپاہی منور حسین کو کہیں لے گئی ہے۔ اگر یہی سلسلہ رہا تو وہاں کوئی زندہ نہیں بچے گا۔

ایک بوڑھے نے کہا۔ "پچھلی رات منور کو شمشان گھاٹ سے لایا گیا تھا۔ وہ بلا اسے وہیں لے گئی ہو گی۔ ہمیں وہاں جا کر دیکھنا چاہئے۔"

بوڑھے اور جوان اپنے اپنے گھروں سے لاٹھیاں لے کر آ گئے پھر گاؤں سے باہر شمشان گھاٹ کی طرف جانے لگے۔

☆------☆------☆

شمشان گھاٹ میں جگہ جگہ جلی ہوئی لاشوں کی ہڈیاں پڑی رہتی تھیں۔ کہیں پیروں کی ہڈیاں تھیں' کہیں ہاتھوں کی انگلیاں مٹی سے جھانکتی تھیں۔ کہیں پسلیاں دکھائی دیتی تھیں اور کہیں کھوپڑی دانتوں سمیت مسکراتی ہوئی لگتی تھی۔ پورا انسانی ڈھانچہ نظر نہیں آتا تھا۔ کتے اور گیدڑ ڈھانچوں کو دانتوں سے بھنبھوڑ کر اِدھر اُدھر کھینچ کر لے جاتے تھے۔ جلی ہوئی چتاؤں کی راکھ ہوا سے اڑتی رہتی تھی۔ ایسے ماحول میں وہ دونوں دھندلے دھندلے سے دکھائی دے رہے تھے۔

ایک گھنے درخت کے سائے میں پکا چبوترا بنا ہوا تھا۔ ماموں اس چبوترے پر بیٹھے ہوئے تھے اور وہ ان کے زانو پر سر رکھے لیٹی ہوئی کہہ رہی تھی۔ "وہ مولوی تمہیں مجھ سے چھین لینا چاہتا تھا۔ میں نے پہلے اس کے بیٹے کو بیمار کر کے چتاؤنی دی کہ وہ میرے اور تمہارے پریم بندھن کو نہ توڑے لیکن اس نے اپنا مسلمانی منتر پڑھ کر مجھے بھگا دیا۔"

ماموں جان نے پوچھا۔ "کیا وہ تمہیں مجھ سے دور کر دے گا؟"

"اس کے اچھے بھی نہیں کر سکیں گے۔ میں نے بعد میں مولوی کو کچھ پڑھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ خون تھوک کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔"

"تب ہی وہ میرے کمرے سے جانے کے بعد واپس نہیں آیا اور میں تمہارے پاس آ گیا۔"

"تم ہمیشہ میرے پاس آتے رہو گے۔ میں تمہیں دنیا والوں سے چھین کر رہوں گی۔ اتنے بڑے سنسار میں تم میری آخری محبت ہو۔ اگر تم مر جاؤ گے تو میں بھی فنا ہو جاؤں گی۔"

"ہندو عورتیں اپنے پتی کے ساتھ چتا میں جل مرتی ہیں۔ کیا میں مر جاؤں گا تو تم میری چتا جلاؤ گی اور میرے ساتھ جل مرو گی؟"

"نہیں، میں بہت پہلے ہی مرنے کے بعد چتا میں جل چکی ہوں۔ میرا یہ خوبصورت بدن راکھ ہو چکا ہے۔"

وہ اس کے بدن کو چھو کر سہلاتے ہوئے بولے۔ "کیوں مذاق کرتی ہو۔ تم راکھ نہیں ہو سکتیں۔ تمہارا بدن ٹھوس ہے۔ میری آغوش میں ہے۔"

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اس خود غرض، ہرجائی پربھو نے مجھے خنجر سے ہلاک کیا تھا۔ تمہیں سمجھ لینا چاہئے تھا کہ میں اسی وقت مر گئی تھی۔ میرے رشتے داروں نے مجھے چتا میں جلا دیا تھا۔ میں جل کر راکھ ہو گئی تھی۔"

"پھر تمہارا یہ وجود کیسے ہے؟"

"کالے جادو کے ایک تانترک گرو دیو تھے۔ وہ میری جوانی پر مرمٹے تھے۔ انہوں نے میری راکھ کو سمیٹ کر میری آتما کو قابو میں کر کے پھر سے یہ شریر (جسم) بنا دیا۔ دس برس تک میرے شریر سے کھیلتے رہے پھر ان کا آخری وقت آ گیا۔ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "گرو دیو! تمہارے بعد میرا کیا ہو گا، کیا میں پھر راکھ ہو جاؤں گی؟"

وہ بولے۔ "تُو نے مجھے پرسن (خوش) کیا ہے۔ میرے بعد تُو دو مردوں کے ساتھ بیاہ رچا کر زندہ رہ سکتی ہے۔ اگر وہ مر جائیں گے تو تیرا یہ شریر پھر سے راکھ ہو جائے گا۔"

پدمنی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ماموں کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ "وہ مجھے آشیرواد دے کر مر گئے۔ میں نے ان کے مرتے ہی ایک جوان سے بیاہ رچا لیا۔ گرو دیو نے کہا تھا میرے پتی کی عمر جتنی زیادہ ہو گی، اتنی ہی زندگی مجھے بھی ملتی رہے گی۔

"میں نے دل میں ٹھان لیا کہ اپنے پتی کو بیمار نہیں ہونے دوں گی اور مرنے نہیں دوں گی۔ میرے اس پتی کا نام رگھو ویر تھا۔ اس کے گھر والوں نے سمجھ لیا کہ کوئی بلا رگھو ویر کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ وہ اسے چھڑانے کے لئے اور مجھ سے نجات دلانے کے لئے گیانی پنڈتوں اور جادو کا توڑ کرنے والے عاملوں سے مدد مانگنے لگے۔

"وہ سب میرے پیچھے پڑ گئے۔ ہندو مہا گیانی اور مسلمان عامل اپنے اپنے طریقے سے میرے خلاف عمل کرنے لگے۔ کبھی وہ مجھے مجبور کر دیتے کہ میں رگھو ویر کو چھوڑ کر چلی جاؤں۔ کبھی میں ان کے عمل کو ناکام بنا دیتی تھی اور اپنے رگھو کو ان سے چھین کر لے آتی تھی۔ وہ میرے لئے بہت اہم تھا۔"

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ ناگواری سے سوچنے لگی۔ ماموں نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ چپ کیوں ہو گئیں، کیا سوچ رہی ہو؟"

وہ نفرت سے بولی۔ "ایک پیر بابا ہے۔ میرا جانی دشمن ہے۔ رگھو کے ماتا پتا اسے پتا نہیں کہاں سے ڈھونڈ لائے تھے۔ پہلے میں نے اس کی پرواہ نہیں کی لیکن جب وہ عمل کرنے لگا تو میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ جب تک وہ رگھو ویر کی بستی میں رہا، میں وہاں نہ جا سکی۔

"وہ دو گھنٹے تک وہاں رہا پھر رگھو ویر کے گلے میں ایک تعویذ پہنا کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں رگھو ویر کے مکان میں آئی۔ اس کے ماتا پتا اور بہن بھائی مطمئن ہو گئے۔ اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جانا چاہتی تھی مگر نہ جا سکی۔ کوئی غیبی قوت مجھے روک رہی تھی۔

"میری نظریں اس کے گلے کی طرف گئیں۔ وہاں وہ تعویذ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "رگھو! میرے رگھو ویر! کیا میرے پاس نہیں آؤ گے؟"

وہ بڑی بے بسی سے بولا۔ "میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تمہارے پاس آنے کو جی چاہتا ہے مگر ایسا لگتا ہے کوئی مجھے روک رہا ہے۔"

"وہ تعویذ تمہیں روک رہا ہے۔ تم اسے اتار کر کھڑکی سے باہر پھینک دو۔ وہ کمرے میں نہیں رہے گا تو میں تمہارے پاس آ جاؤں گی۔"

"میں نے پیر بابا کے اصرار پر ماتا جی کی قسم کھائی ہے کہ اسے نہیں اتاروں گا۔ تم جانتی ہو، ہم راجپوت ہیں، قسم پوری کرنے کے لئے اپنی جان بھی دے دیتے ہیں۔"

"کیا یہ تعویذ کسی اور تدبیر سے الگ نہیں ہو سکتا؟"

"پیر بابا نے کہا۔ ناپاکی کی حالت میں تعویذ بے اثر ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا تھا یہ تعویذ مقدس ہے پہلے غسل کرو اور وعدہ کرو کہ استنجا کیا کرو گے۔ میں نے غسل کیا۔ ان سے استنجا کا وعدہ کیا۔ تب انہوں نے یہ تعویذ پہنایا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم نے ماں کی قسم کھائی ہے، اس کا پالن کرو۔ تعویذ اپنے سے الگ نہ کرو لیکن استنجا کے سلسلے میں قسم نہیں کھائی ہے۔ مجھے وچن دو، استنجا نہیں کرو گے۔ یہ صرف مسلمان کرتے ہیں۔ تم ہندو ہو، تم نہیں کرو گے۔"

"میں وچن دیتا ہوں استنجا نہیں کروں گا۔"

"اب میری ایک اور بات مانو' ایک جگ بھر کے گنے کا رس پیو۔"

اس نے تعجب سے پوچھا۔ "ایک جگ بھر کے .... تم اتنا رس پینے کے لئے کیوں کہہ رہی ہو؟"

"یہ ہماری محبت کے لئے سوم رس ہو گا۔ تم سوال نہ کرو۔ گلی کے نکڑ پر گنے والا ہے' ابھی جاؤ۔"

"میں وہاں سے دور چلی گئی۔ وہ اپنے مکان سے نکل کر گلی سے گزرتا ہوا گنے والے کے پاس آیا پھر وہاں بیٹھ کر گلاس بھر بھر کے رس پینے لگا۔ گنے والا تعجب سے بولا۔ "کیا ہوا ہے بھیا! پیٹ میں آگ لگی ہے کیا؟"

وہ بولا۔ "یہی سمجھ لو۔ آج تمہاری کمائی زیادہ ہو رہی ہے۔"

"وہ ایک اندازے سے جگ بھر رس پینے کے بعد مکان میں واپس آیا۔ اپنے کمرے میں پہنچا۔ تھوڑی دیر بعد ہی تیزی سے چلتا ہوا ٹائلٹ میں گیا۔ دو تین منٹ کے بعد واپس آیا تو میں کمرے میں آ گئی۔ اس سے لپٹ کر بولی۔ "یہ بے اثر ہو گیا ہے۔ تم اسے الگ نہ کرو۔ میں کر دیتی ہوں۔"

میں نے وہ تعویذ اس کے گلے سے اتار کر بستر پر ڈال دیا' پھر اسے ساتھ لے کر وہاں سے دور ایک ویرانے میں آ گئی۔ "آہ! کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں اس کھنڈر میں نہ جاتی۔"

ماموں نے پوچھا۔ "وہاں کیا ہوا؟"

وہ بولی۔ "میں اپنے دشمنوں سے لڑ سکتی ہوں۔ تقدیر سے نہیں لڑ سکتی۔ اس کے مقدر میں لکھا تھا کہ اس کی زندگی کے دن پورے ہو جائیں گے۔ وہ مجھے بازوؤں میں لے کر پیار کر رہا تھا۔ ایسے ہی وقت ایک زہریلے سانپ نے اسے ڈس لیا۔ زہر اتنا زود اثر تھا کہ میں کسی وید یا سپیرے کو بلا نہ سکی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔"

وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ اداسی سے سوچنے لگی۔ ماموں نے پوچھا۔ "کیا وہ مجھ سے بھی تگڑا جوان تھا۔ اسے یاد کر کے اداس ہو رہی ہو۔"

"وہ تمہاری طرح تھا۔ مر گیا' تم مل گئے۔ میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑا مگر یہ سوچ کر دل دکھتا ہے کہ وہ جلدی کیوں مر گیا۔ وہ پچیس پچاس برس جیتا تو میری عمر بھی اتنی ہی

ہوتی۔ وہ بوڑھا ہو کر مرتا۔ میں جوان ہی رہتی۔ اس کے بعد تمہاری طرح کوئی جوان میری زندگی میں آتا۔ وہ پچاس برس سے اوپر جیتا۔ میں سو برس کی ہو کر بھی جوان رہتی۔"

وہ ماموں سے لپٹ کر بولی۔ "تم میری زندگی کے آخری مرد ہو۔ پتا نہیں تمہاری عمر کتنی ہے' جس دن تمہیں موت آئے گی' اس دن میں راکھ ہو جاؤں گی۔ میری اس آتما شکتی کا انت ہو جائے گا۔"

ماموں نے کہا۔ "اگر تم اس تعویذ کو بے اثر نہ کرتیں' وہ تم سے دور رہتا۔ اس کھنڈر میں نہ جاتا تو زندہ رہتا۔ تم اسے دور ہی دور رکھ کر اسے زیادہ جینے کا موقع دے سکتی تھیں۔"

"اس کے مقدر میں سانپ کے زہر سے مرنا تھا' وہ مر گیا۔ گرو دیو نے کہا تھا' مجھے ہر رات اپنے مرد کے ساتھ رہنا ہو گا۔ اگر دو راتیں اس سے دور رہوں گی تو میرا بدن ٹھوس نہیں رہے گا۔ میں دھیرے دھیرے راکھ ہو جاؤں گی۔"

وہ ماموں کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ "میں تمہارے ساتھ بہت لمبی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ یہاں سے پچاس کوس پر ایک گاؤں ہے۔ وہاں ایک بڑا مانا ہوا جوتشی ہے۔ ہم اس کے پاس جائیں گے۔ وہ تمہارے ہاتھ کی ریکھا دیکھ کر بتا دے گا کہ تم کتنی لمبی عمر تک زندہ رہو گے۔"

اس نے چونک کر ماموں کو دیکھا پھر کہا۔ "پھر مصیبت آ رہی ہے۔"

انہوں نے پوچھا۔ "کیسی مصیبت؟"

"ادھر دیکھو' تمہارا باپ اور بھائی بستی والوں کے ساتھ آ رہے ہیں۔"

انہوں نے ادھر دیکھا پھر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ سب ہاتھوں میں لاٹھیاں لئے اس شمشان گھاٹ میں انہیں تلاش کر رہے تھے پھر ایک نے کہا۔ "وہ دیکھو منور وہاں ہے۔"

پدمنی ان سے لپٹ کر بولی۔ "یہ لوگ تمہیں لے جائیں گے۔ میں تمہیں جانے نہیں دوں گی۔"

"تم نے مولوی صاحب کو مار ڈالا ہے۔ اب ہماری بستی میں کوئی عمل کرنے والا

نہیں ہے۔ تم رات کو میرے کمرے میں آ سکتی ہو۔"

وہ سب قریب آ گئے۔ بڑے ماموں نے پوچھا۔ "منور! تم بار بار اس مرگھٹ پر کیوں آ جاتے ہو' کیا وہ چڑیل یہاں ہے؟"

ماموں نے پدمنی کو دیکھا پھر کہا۔ "وہ نہیں ہے۔ یہاں برگد کے سائے میں بڑی ٹھنڈک ہے۔ یہاں آرام سے سونے آیا تھا۔"

نانا جان نے کہا۔ "نالائق .... ہمارے مکان کے سامنے برگد کا گھنا سایہ دار درخت ہے۔ تجھے وہاں ٹھنڈی چھاؤں نہیں ملی۔ یہاں ہمیں پریشان کرنے آیا ہے۔ چل یہاں سے۔"

"ابا جان! آپ ناراض نہ ہوں۔ آپ ان سب کو واپس لے جائیں' میں تھوڑی دیر بعد آ جاؤں گا۔"

ایک شخص نے کہا۔ "وہ ڈائن ضرور اسے روک رہی ہے۔ اسے ہمارے ساتھ نہیں آنے دے گی۔ تم چلتے ہو یا ہم تمہیں اٹھا کر لے چلیں۔"

وہ پدمنی کے پیچھے چھپتے ہوئے بولے۔ "میں کہہ چکا ہوں' تھوڑی دیر بعد آؤں گا۔ مجھ سے زبردستی نہ کرو ورنہ بہت برا ہو گا۔"

"ارے دھمکی کیا دیتا ہے۔ ہم تیری چہیتی کو مٹی میں ملا دیں گے۔ چل یہاں سے.........."

دو جوان آگے بڑھے۔ اسے پکڑ کر لے جانا چاہتے تھے۔ پدمنی نے ایک کو زور دار طمانچہ رسید کیا۔ وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹ گیا۔ دوسرے نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

یہ سوال کرتے ہی اس کے منہ پر بھی ایک ہاتھ پڑا۔ وہ دونوں سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ وہ مارنے والی انہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ دور کھڑے ہوئے لوگ ان دونوں کے چیخنے اور پیچھے ہٹنے کی وجہ پوچھنا چاہتے تھے۔ وہ زمین پر پڑے ہوئے پتھر اٹھا کر انہیں مارنے لگی۔ وہ سب وہاں سے بھاگنے لگے۔ نانا جان اپنی جگہ کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "منور! تو اس کا ایسا دیوانہ ہو گیا ہے کہ اپنی بستی کے بھائیوں اور بزرگوں کو چوٹ کھاتے دیکھ رہا ہے۔ اب میں تیرے پاس آتا ہوں اور دیکھنا چاہتا ہوں کہ باپ کو زخمی ہوتے کیسے دیکھے گا۔"

وہ آگے بڑھے۔ ماموں نے عاجزی سے کہا۔ "پدمنی! میرے ابا جان سے گستاخی نہ کرنا۔ ابھی مجھے جانے دو' رات کو آ جانا۔"

نانا جان نے آگے بڑھ کر ان کے ایک بازو کو جکڑ کر کہا۔ "چل یہاں سے.........."

وہ ان کے ساتھ جانے لگے۔ پدمنی خاموش کھڑی دیکھتی رہی۔ وہ عارضی جدائی برداشت کر سکتی تھی۔

ماموں جان کو گھر لایا گیا۔ نانا جان نے سختی سے کہا۔ "آئندہ تم تنہا نہیں رہو گے۔ دن میں ہم میں سے کوئی تمہارے ساتھ رہے گا۔ رات کمرے میں سونے جاؤ گے تو دروازے پر تالا لگایا جائے گا۔"

پھر انہوں نے بڑے ماموں سے کہا۔ "حکیم صاحب کہہ رہے تھے کہ ہری پور میں ایک پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ ان کا نام پیر بابا جلال الدین اجمیری ہے۔ ان کے نام چٹھی لکھو۔ منور کے تمام حالات بیان کرو۔ ان سے التجا کرو کہ وہ ہمارے منور کو اس بلا سے نجات دلا دیں۔"

بڑے ماموں اسی وقت پیر بابا کے نام ایک چٹھی لکھنے بیٹھ گئے۔ گھر کے سب ہی لوگ منور ماموں کی نگرانی کرنے لگے۔ وہ گھر کے اندر صحن میں یا چھت پر جاتے تو بہنیں یا نانی جان ان کے ساتھ رہتی تھیں اور کلام پاک کی آیتیں پڑھتی رہتی تھیں۔ ان کے گھر سے باہر جانے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ رات کو ماموں جان اپنے کمرے میں سونے گئے تو اس کمرے کے دروازے کو بند کر کے تالا لگا دیا گیا۔ مکان سے باہر نکلنے کے لئے جو بڑا سا بیرونی دروازہ تھا' اسے بھی مقفل کر دیا گیا۔

اس طرح سب مطمئن ہو گئے مگر ماموں جان کا اطمینان ختم ہو گیا۔ وہ بند کمرے میں ایک قیدی کی طرح بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ رات کے دس بجے تک سب ہی سو جانے کے عادی تھے لیکن انہیں نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ تھک ہار کر بستر کے سرے پر بیٹھ گئے۔ اسی وقت گھڑیالی نصف شب کا گھنٹا بجانے لگا۔ "ایک .... دو .... تین.........."

ماموں جان بے چینی سے گننے لگے۔ بارہ کے آخری گھنٹے کے ساتھ ہی سریلی ہنسی سنائی دی۔ انہوں نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ بند دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ اس کی

دونوں بانہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ماموں اٹھ کر تیزی سے چلتے ہوئے اس کی بانہوں میں آ گئے۔ خوش ہو کر بولے۔ "دروازہ مقفل ہے' تم کیسے آ گئیں؟"

"میں تو آ سکتی ہوں اور اس مقفل دروازے سے باہر جا سکتی ہوں لیکن آج تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکوں گی۔ تمہارے باپ نے باہر والے دروازے پر تالا ڈال دیا ہے۔"

وہ دونوں بستر پر آ گئے۔ منور نے کہا۔ "میں باہر نہیں جا سکتا۔ کوئی بات نہیں' ہم یہاں بھی رات گزار سکتے ہیں۔ کیا تمہیں میرا یہ کمرہ پسند نہیں ہے؟"

"مجھے کسی بھی مکان کی چاردیواری اور آرام دہ بستر پسند نہیں ہے۔ مجھے شمشان گھاٹ پسند ہے۔ وہاں بچی کچھی ہڈیاں بکھری رہتی ہیں۔ انسانی جسموں کی راکھ اڑتی رہتی ہے۔ وہ مجھے اس لئے اچھی لگتی ہے کہ میں بھی اندر سے راکھ ہوں۔"

"تم راکھ نہیں ہو' آگ ہو' شعلہ ہو۔ تمہارے بغیر میں بالکل خالی خالی سا ہو جاتا ہوں۔ میری جان! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔"

"ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ میں اپنے مخالفوں سے تمہیں بچاتی رہوں گی۔"

"کب تک بچاتی رہو گی؟ آج بھائی جان نے ایک بہت ہی پہنچے ہوئے بزرگ کو چٹھی لکھی ہے۔ وہ ہری پور میں رہتے ہیں۔ انہیں پیربابا جلال الدین اجمیری کہتے ہیں۔"

وہ ایک جھٹکے سے الگ ہو گئی۔ بستر پر اٹھ بیٹھی زیر لب بڑبڑائی۔ "جے مہا کالی' رکھشا کرنے والی.........."

وہ بستر چھوڑ کر ساڑھی پہنتے ہوئے بولی۔ "یہ وہی پیربابا ہے۔ اس نے رگھو ویر کو سمجھو کہ مجھ سے چھین لیا تھا۔ میں اسے گنے کا رس نہ پلاتی اور وہ ناپاک نہ ہوتا تو وہ پیربابا اسے ہمیشہ کے لئے مجھ سے دور کر دیتا۔"

وہ پریشان ہو کر ٹہلنے کے انداز میں اِدھر سے اُدھر گئی پھر اس نے پوچھا۔ "وہ چٹھی کہاں ہے؟"

"بھائی جان شام کو اسے لیٹر بکس میں ڈال آئے تھے۔"

وہ غصے سے بولی۔ "مجھ سے بہت بڑی دشمنی کی جا رہی ہے۔ اگر وہ تمہارا بھائی نہ

ہوتا تو میں ابھی اسے خون کی الٹیاں کرا دیتی۔"

"غصہ نہ کرو۔ وہ چٹھی ابھی لیٹر بکس میں پڑی ہو گی۔ ہرکارہ آدھی رات کے بعد گھر سے نکلتا ہے۔ آس پاس کے چار گاؤں کے لیٹر بکس سے چٹھیاں جمع کر کے شہر کے ڈاک خانے میں پہنچاتا ہے۔"

اس کی بات پوری ہونے تک وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اس زمانے میں پوسٹ مین کو ہرکارہ کہتے تھے۔ یہ ہرکارے آدھی رات کے بعد چار چار چھ چھ گاؤں کی چٹھیاں جمع کر کے صبح تک قریبی شہر کے ڈاک خانوں میں چٹھیاں پہنچاتے تھے پھر وہاں سے گاؤں والوں کے نام آنے والی چٹھیاں لا کر گھر گھر میں پہنچایا کرتے تھے۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک رات کو سفر کرتے تھے اس لئے ہاتھ میں ایک لاٹھی ہوتی تھی۔ اس لاٹھی کے اوپری سرے پر گھنگرو بندھے ہوتے تھے۔ وہ دھیمی رفتار میں دوڑتے وقت لاٹھی کو زمین پر مارتے جاتے تھے۔ گھنگرو بجتے جاتے تھے۔ کتے اور گیدڑ اس آواز سے دور بھاگ جاتے تھے۔ چور اچکے بھی لاٹھی دیکھ کر چھپ جاتے تھے۔ دن کے وقت گاؤں والے گھنگرو کی آواز سن کر سمجھ لیتے تھے کہ ہرکارہ ان کے سندیس لایا ہے۔

وہ لیٹر بکس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ پورے گاؤں میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سب ہی سو رہے تھے۔ تمام گھروں میں اندھیرا تھا۔ باہر کتے بھٹک رہے تھے۔ اسے دیکھ کر بھونکنے لگے تھے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ کتے نادیدہ بلاؤں کو دیکھ لیتے ہیں اور واقعی وہ اسے دیکھ رہے تھے اور دور ہی دور سے بھونک رہے تھے۔

اس نے ایک طرف دیکھا۔ گھنگھروؤں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ آوازیں قریب آ رہی تھیں۔ اس زمانے میں جوگنگ کا لفظ مستعمل نہیں تھا۔ وہ نہایت سست رفتاری سے جوگنگ کرتا' زمین پر لاٹھی مارتا اور گھنگھرو بجاتا ہوا آیا پھر لیٹر بکس کے پاس رک گیا۔ لاٹھی زمین پر رکھ کر بڑبڑانے لگا۔ "پتا نہیں' آج یہ کتے اس قدر کیوں بھونک رہے ہیں؟"

اس نے جیب سے چابی نکال کر لیٹر بکس کے چھوٹے سے تالے کو کھولا پھر اپنا بڑا سا تھیلا کھول کر تمام خطوط اس میں رکھنا چاہتا تھا۔ اسی وقت نسوانی آواز سن کر چونک گیا۔

"ہری پور کی چٹھیاں مجھے دو۔

اس نے سر اٹھا کر ایک حسین و جمیل عورت کو دیکھا پھر خوف سے کانپنے لگا۔ یہ پورے گاؤں میں مشہور تھا کہ وہاں ایک بلا آئی ہوئی ہے اور سپاہی منور کا بیان تھا کہ وہ بہت ہی سندر ہے۔

وہ ایک ہاتھ پھیلا کر بولی۔ "میں تمہیں کچھ نہیں کروں گی۔ ہری پور کی چٹھیاں الگ کر دو۔"

اس نے فوراً ہی خطوط کے ڈھیر میں سے ہری پور جانے والی پانچ چٹھیاں الگ کیں۔ وہ بولی۔ "جس پر پیر بابا جلال الدین اجمیری کا نام لکھا ہے' وہ چٹھی الگ کرو۔"

ہر کارے نے اس نام کی چٹھی اس کی طرف بڑھائی۔ وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ "میں اسے ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔ تم بیڑی پیتے ہو؟"

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔ "پھر تو ماچس بھی ہو گی؟"

اس نے پھر اوپر نیچے سر ہلایا۔ وہ بولی۔ "اس چٹھی کو آگ لگا دو۔"

اس نے فوراً ہی ماچس کی ڈبیا سے ایک تیلی نکال کر سلگائی پھر اس چٹھی کو آگ لگا دی۔ وہ جلنے لگی۔ وہ چپ چاپ کھڑی اسے جلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ جب وہ پوری طرح جل گئی تو اس نے کہا۔ "کسی سے نہ کہنا تُو نے اس ایک چٹھی کو آگ لگا دی ہے۔ تیری زبان سے کچھ نکلا تو مولوی کی طرح خون کی الٹیاں کر کے مرے گا۔"

وہ دونوں؛ کان پکڑ کر بولا۔ "میں مر جاؤں گا' تب بھی اس چٹھی کی بات نہیں کروں گا۔"

وہ جلدی جلدی تمام خطوط اٹھا کر تھیلے میں ڈالنے لگا پھر سر اٹھا کر دیکھا تو وہ نہیں تھی۔ اس نے کھڑے ہو کر دور دور تک دیکھا۔ وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ کتوں نے بھی بھونکنا بند کر دیا تھا۔

☆------☆------☆

ایک ہفتے تک ماموں جان پُرسکون رہے۔ انہیں قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔ انہیں مکان سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی اور رات کو دروازے مقفل رکھے جاتے تھے۔ ماموں جان قیدی بن کر خوش تھے۔ خوب کھاتے پیتے اور گھر والوں سے ہنستے بولتے تھے۔ رات کو

گیارہ بجے تک کمرے میں سونے چلے جاتے تھے۔ ٹھیک بارہ بجے وہ ان کا دل بہلانے اور رت جگا منانے چلی آتی تھی۔

نانا جان نے بڑے ماموں سے کہا۔ "ایک ہفتہ گزر چکا ہے' ہری پور سے کوئی جواب نہیں آیا۔"

بڑے ماموں نے کہا۔ "میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ حکیم صاحب کہہ رہے تھے کہ پیر بابا اصولوں کے پابند ہیں۔ خطوط کے جواب ضرور دیتے ہیں یا خود چلے آتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ نہ چٹھی کا جواب آ رہا ہے' نہ وہ خود آ رہے ہیں۔"

"تم نے وہ چٹھی صحیح طرح لیٹر بکس میں ڈالی تھی؟"

"جی ہاں' ابا جان! میں نے کوتاہی نہیں کی ہے۔ چٹھی کو وہاں پہنچنا چاہئے۔"

وہ سوچ میں پڑ گئے پھر بولے۔ "منور! اب آسیب زدہ نہیں لگتا ہے۔ خوش رہنے لگا ہے۔ ایسا اس لئے ہے کہ ہم نے اسے تالے چابی میں رکھا ہے لیکن وہ مرد بچہ ہے' کب تک چار دیواری میں رہے گا؟"

"جی ہاں' میں بھی یہ سوچتا ہوں۔ اس پر سے پابندی اٹھائی جائے گی۔ دروازے مقفل نہیں کئے جائیں گے تو وہ پھر آ جائے گی یا منور شمشان گھاٹ چلا جائے گا۔"

"جب تک پیر بابا نہیں آئیں گے' ہمیں اطمینان نہیں ہو گا۔"

منور ماموں کو اطمینان تھا کہ پیر بابا نہیں آئیں گے لیکن ایک شام وہ خلافِ توقع وہاں پہنچ گئے۔ ان کی ایک خاص بگھی تھی جس میں بیٹھ کر وہ حکیم صاحب کے ساتھ آئے تھے۔ نانا جان نے بصد احترام انہیں خوش آمدید کہا۔ انہیں بیٹھک میں لے کر آئے۔ حکیم صاحب نے کہا۔ "میں اچانک ایک ضروری کام سے ہری پور گیا تھا۔ وہاں کام سے فارغ ہو کر محترم پیر صاحب سے ملاقات کی اور ان کے سامنے منور کے حالات بیان کئے۔ آپ نے ایک ہفتے پہلے جو چٹھی لکھی تھی وہ ان تک نہیں پہنچی ہے۔"

پیر بابا نے کہا۔ "کوئی بات نہیں' چٹھی نہیں آئی۔ حکیم صاحب آ گئے۔ جب ہم نے سنا کہ اس بلا کا شکار ہونے والے خون کی الٹیاں کر کے مرتے ہیں تو ہم سمجھ گئے' وہ پدمنی ہے۔"

بڑے ماموں نے پوچھا۔ "یہ پدمنی کون ہے؟"

انہوں نے کہا۔ "اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے' وہی جانتا ہے۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ ایک ماہ پہلے یہاں سے چالیس کوس دور سوترا گاؤں میں ایک نوجوان پر یہ بلا آئی تھی۔ نوجوان کا نام رگھو ویر تھا۔ ہم نے اسے اس بلا سے نجات دلائی تھی اور اسے تاکید کی تھی کہ وہ ہمیشہ پاک و صاف رہا کرے لیکن اس نے ہماری ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ ناپاکی کے باعث وہ بلا اس پر حاوی ہو گئی۔ ویسے اس کے دن پورے ہو گئے تھے۔ ایک سانپ کے ڈسنے سے وہ مر گیا۔"

منور ماموں کو معلوم ہو چکا تھا کہ پیربابا آ گئے ہیں۔ وہ پریشان ہو گئے۔ دل ہی دل میں پدمنی کو پکارنے لگے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ انہیں اس خوبصورت بلا سے دور کر دیا جائے۔ ان کے اندر اتنی بے چینی تھی کہ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ صحن سے گزرتے وقت نانی جان نے آواز دی۔ "بیٹا! کہاں جا رہے ہو؟"

وہ جواب دیئے بغیر جا رہے تھے لیکن بیٹھک کے دروازے پر پہنچ کر ٹھٹک گئے۔ نانا جان اس دروازے سے باہر آ رہے تھے۔ انہوں نے ڈانٹ کر پوچھا۔ "کہاں جا رہے ہو؟"

"جی' وہ کچھ دیر کے لئے کھلی فضا میں رہنا چاہتا ہوں۔"

"ابھی اندر چلو' پیربابا نے کہا ہے' ابھی غسل کرو اور صاف ستھرا لباس پہنو۔"

بڑے ماموں نے باہر آ کر کہا۔ "منور! میرے ساتھ آؤ' پیربابا نے کہا ہے' تمہیں تنہا نہ چھوڑا جائے۔ تم غسل خانے میں جاؤ۔ میں تمہارا لباس لے کر آتا ہوں۔"

وہ مجبور ہو گئے۔ انہیں بزرگوں کی ہدایات پر عمل کرنا پڑا۔ وہ غسل خانے میں چلے گئے۔

پدمنی کو معلوم ہو گیا' پیربابا آئے ہیں۔ وہ ان سے ایسی خوفزدہ ہو جاتی تھی کہ ان کی موجودگی میں کئی سو گز دور چلی جاتی تھی۔ اب وہ اس گاؤں میں قدم نہیں رکھ سکتی تھی۔ وہ پریشان ہو کر گاؤں کے باہر بھٹکنے لگی۔

منور ماموں غسل سے فارغ ہو کر صاف ستھرا لباس پہن کر اپنے کمرے میں آئے تو نانا جان وہاں پیربابا اور حکیم صاحب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ انہیں سلام کر کے بستر کے سرے پر بیٹھ گئے۔ بستر کی چادریں اور تکیئے کے غلاف بدل گئے تھے۔ کمرے کی محدود فضا میں عطر اور اگربتی کی خوشبو پھیل رہی تھی۔

پیربابا' منور ماموں کو غور سے دیکھ رہے تھے اور زیر لب کچھ پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا صرف ایک نام پوچھا۔ "کیا اس کا نام پدمنی ہے؟"

انہوں نے سر جھکا کر دھیمی آواز میں کہا۔ "جی ہاں۔"

وہ بولے۔ "بستر پر پالتی مار کر بیٹھ جاؤ۔ سر پر ٹوپی یا رومال رکھو۔"

نانا جان نے اپنی ٹوپی اتار کر ان کے سر پر رکھ دی۔ وہ بولے۔ "میں قرآن مجید کی ایک آیت پڑھ رہا ہوں۔ میرے ساتھ ساتھ پڑھو جو الفاظ سمجھ میں نہ آئیں' مجھ سے پوچھتے رہو۔"

وہ تحت اللفظ میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے لگے۔ ماموں جان بھی ان کے ساتھ پڑھنے لگے۔ پڑھنے کا یہ سلسلہ تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہا پھر انہوں نے بڑے ماموں سے کہا۔ "گندم کا ایک دانہ طشتری میں رکھو اس پر شہد کے چند قطرے ٹپکاؤ پھر اسے یہاں لے آؤ۔"

بڑے ماموں کمرے سے چلے گئے۔ پیربابا نے کہا۔ "منور حسین! تم نے غسل کیا' جسم کی صفائی ہوئی۔ ہم نے ایک آیت گھنٹے بھر تک پڑھائی۔ تمہارے قلب کی صفائی ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کی رضا سے ہم تمہارے ذہن کو قابو میں کریں گے۔ تاکہ وہ آئندہ تمہیں اپنی طرف مائل نہ کر سکے۔"

بڑے ماموں ایک طشتری میں گندم کا ایک دانہ لے آئے۔ وہ شہد میں بھیگا ہوا تھا۔ وہ بولے۔ "اب ہم چند آیتیں پڑھیں گے۔ اس کے بعد اس گندم کے دانے کو تمہارے بائیں کان کے پیچھے لگا دیں گے۔ یہ دانہ اس وقت تک وہاں چپکا رہے گا جب تک وہ بلا نیست و نابود نہیں ہو گی لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ ہماری دو ہدایات پر سختی سے عمل کرو گے۔ بولو عمل کرو گے؟"

منور ماموں نے کہا۔ "جی ہاں۔"

"پہلی ہدایت یہ ہے کہ تم ہمیشہ پاک و صاف رہو گے۔ دوسری ہدایت یہ ہے کہ تم پدمنی کی کسی بات پر عمل نہیں کرو گے۔"

"جی.......... میں آپ کی دونوں ہدایات پر عمل کروں گا۔"

وہ کلام پاک کی چند آیتیں قرأت کے ساتھ پڑھنے لگے۔ انہوں نے اس گندم کو

چٹکی میں پکڑ رکھا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ تک پڑھتے رہنے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر منور ماموں کے پاس آئے پھر اس گندم کے دانے کو ان کے بائیں کان کے پیچھے لگایا تو وہ دانہ وہاں چپک کر رہ گیا۔

وہ بولے۔ "اللہ تعالیٰ تمہیں اس بلا سے محفوظ رکھے۔ ہم نے اپنا کام کیا ہے۔ تم اپنا کام کرو گے۔ ہماری ہدایات پر سختی سے عمل کرو گے۔"

پھر وہ نانا جان سے بولے۔ "آیئے' ہم بیٹھک میں چلیں۔ صاحب زادے کو تنہا رہنے دیں۔"

وہ سب انہیں کمرے میں تنہا چھوڑ کر بیٹھک میں آ گئے۔ نانا جان نے پیر بابا سے کہا۔ "محترم! میں اور میرے گھر والے آپ کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری دلی تمنا ہے کہ آپ یہاں کچھ عرصہ قیام کریں۔ ہمیں میزبانی کا موقع دیں۔"

"ہم ہری پور میں دن رات مصروف رہتے ہیں پھر بھی ہمیں دو راتیں یہاں گزارنی ہوں گی۔ ہم یہاں رہ کر منور حسین کا مشاہدہ کرتے رہیں گے۔ اسے بہکنے اور بھٹکنے نہیں دیں گے۔"

ادھر منور ماموں پُرسکون تھے۔ وہ پہلی بار پدمنی کے لئے بے چینی محسوس نہیں کر رہے تھے۔ دل اور دماغ ہلکے پھلکے سے لگ رہے تھے۔ وہ جلد ہی رات کا کھانا کھا کر سو گئے۔ بارہ بجے تک انتظار نہیں کیا۔ دس بجے ان کی آنکھ لگ گئی۔ وہ گہری نیند سوتے رہے پھر اچانک ہی ان کی آنکھ کھل گئی۔ گھڑیال رات کے بارہ بجا رہا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ڈھن ڈھن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ گن رہے تھے۔ بارہ کا آخری گھنٹا سنائی دیا پھر خاموشی چھا گئی۔ کوئی آواز نہیں تھی۔ اس کے قدموں کی آہٹ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ٹھیک وقت پر آنے والی کے آگے دیوار کھڑی کر دی گئی تھی۔ اسے راستہ نہیں مل رہا تھا۔

پھر دروازے کے باہر صحن میں کوئی سفید پوش دکھائی دیا۔ قریب آنے پر پتا چلا وہ پیر بابا جلال الدین اجمیری تھے۔ زیر لب کچھ پڑھ رہے تھے۔ ان پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ وہ بستر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لیٹ گئے پھر ان کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔

وہ رات گزر گئی پھر دوسرا دن بھی گزر گیا۔ گاؤں والے کہہ رہے تھے کہ انہوں نے آدھی رات کے بعد کسی عورت کی چیخیں سنی ہیں۔ وہ چیخیں گاؤں کے باہر کبھی اِدھر کبھی اُدھر سنائی دیتی تھیں۔ وہ باہر ہی بھٹک رہی تھی۔ بستی کے اندر نہیں آ رہی تھی۔

دوسری رات چیخیں نہیں تھیں' آہیں اور کراہیں سنائی دیتی رہی تھیں۔ پیر بابا نے دو راتیں گزارنے کے بعد کہا۔ "اب بلا کا زور ٹوٹ گیا ہے۔ منور میری ہدایات پر عمل کرتا رہے گا تو وہ بلا ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے گی۔"

وہ اپنی بگھی میں بیٹھ کر واپس ہری پور چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد منور ماموں کے کانوں میں اس کی آہیں رک رک کر آنے لگیں۔ انہوں نے دو راتوں کے بعد پہلی بار بے چینی محسوس کی۔ نانا جان سے کہا۔ "مجھے بہت سکون حاصل ہو رہا ہے۔ نیند آ رہی ہے۔ میں سونا چاہتا ہوں۔"

انہوں نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے۔ تمہاری دیوانگی ختم ہو گئی ہے۔ جاؤ' آرام سے سو جاؤ۔"

وہ کمرے میں آ گئے۔ دروازے کو بند کر کے بستر پر آ کر بیٹھ گئے۔ دل کہہ رہا تھا وہ آ جائے' ابھی آ جائے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دل کی مراد پلک جھپکتے ہی پوری ہو جاتی ہے۔ وہ آ گئی۔ ماموں ایک دم سے کھڑے ہو گئے۔ وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ "قریب نہ آنا۔ میری حالت دیکھو' میں راکھ ہو رہی ہوں۔ دو راتوں سے تمہارے بغیر موت سے لڑ رہی ہوں۔ آج بھی نہ ملتے تو میں راکھ ہو جاتی۔"

اس کی حالت کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے اور بدن پر پہلے جیسی شادابی اور دلکشی نہیں رہی تھی۔ اس کا وجود ٹھوس نہیں لگ رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "مجھے چاہتے ہو تو میری بات پر فوراً عمل کرو۔ مجھے بچا لو۔ تمہارے بدن سے کوئی چیز چپکی ہوئی ہے اسے الگ کر کے پھینک دو۔"

ماموں جان نے اپنے بائیں کان کو ہاتھ لگایا پھر کہا۔ "یہ گندم کا دانہ ہے۔ پیر بابا نے تاکید کی ہے کہ میں تمہاری کسی بات پر عمل نہ کروں۔"

"کیا میری محبت کا یہی صلہ دو گے۔ میں مرنے والی ہوں۔ آخری خواہش پوری نہیں

کرو گے؟ میری خواہش پوری کرتے ہی میرا یہ بدن پھر ٹھوس ہو جائے گا۔ میں پھر حسین اور دلکش دکھائی دوں گی۔ تم نے پہلی ملاقات میں اپنے خدا اور رسول کی قسم کھائی تھی کہ میری بات مانو گے۔"

انہیں اپنی قسم یاد آئی وہ پھر کان کے پیچھے ہاتھ لے گئے۔ گندم کے اس دانے کو وہاں سے الگ کرنا چاہا۔ وہ الگ نہیں ہوا۔ وہ اسے کھینچ کر الگ کرنے لگے لیکن وہ ایسے چپک گیا جیسے جسم کا ایک حصہ بن گیا ہو۔ وہ بے بسی سے بولے۔ "یہ الگ نہیں ہو رہا ہے۔"

وہ تڑپ کر بولی۔ "کچھ کرو' اس کا الٹ کرو۔ اس عمل کی نفی کرو۔ اپنی جوتی کان سے لگاؤ میں ابھی تمہاری آغوش میں آ جاؤں گی۔"

ماموں نے جھک کر فرش پر سے اپنی جوتی اٹھائی۔ ان کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ انہوں نے وہ جوتی اپنے بائیں کان سے لگا دی۔ پدمنی کے منہ سے ہائے نکلی۔ پیر بابا کا عمل بے اثر ہو گیا تھا۔ وہ پھر سے حسین اور پُرکشش دکھائی دینے لگی۔

انہوں نے مقدس عمل کی تذلیل کی تھی۔ یکبارگی وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ہاتھ سے جوتی گر پڑی۔ وہ تھر تھر کانپتے ہوئے فرش پر گر پڑے۔ پدمنی چیختی ہوئی ان کے پاس آئی۔ "نہیں' تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ تم زندہ رہو گے۔ میرے لئے زندہ رہو گے۔ نہیں تو میں فنا ہو جاؤں گی۔"

وہ تکلیف کی شدت سے تڑپ رہے تھے پھر اچانک ہی ان کی تکلیف ختم ہو گئی۔ سانسیں ختم ہو گئیں۔ وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ پدمنی چیخ مار کر ان سے لپٹ گئی۔

نانا جان' نانی جان' بڑے ماموں اور دونوں بہنیں صحن میں تھے۔ ایک نسوانی چیخ سن کر چونک گئے۔ بڑے ماموں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "چیخ کی آواز منور کے کمرے سے آئی ہے۔"

وہ ادھر جانے لگے۔ سب ہی ان کے پیچھے دوڑ پڑے۔ کمرے کا دروازہ کھولا تو ماموں جان فرش پر پڑے ہوئے تھے۔ دیکھتے ہی پتا چل گیا کہ وہ زندگی ہار چکے ہیں۔ ایک بات جو سب نے حیرانی سے دیکھی' وہ ڈھیر ساری راکھ تھی جو ان کے بے جان جسم سے لپٹی ہوئی تھی۔

وہ عجیب سی بات کبھی کسی کی سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔

☆======☆======☆

رقصِ اجل

محی الدین نواب کا قلم جب انسانی جذبات واحساسات کو احاطہ تحریر میں لانے کے لئے رواں ہوتا ہے تو صفحہ قرطاس پر موتیوں کی لڑیاں پروتا چلا جاتا ہے۔ وادی کشمیر میں ہر وقت جاری رہنے والے رقصِ اجل، زندگی اور موت کی دھوپ چھاؤں میں سفر کرتی دلوں کو جھنجھوڑ دینے والی کہانی۔

موں سوں ہوائیں چل رہی تھیں۔ یہ سرد ہوائیں ہزار جتن کے باوجود ہڈیوں میں اُتر رہی تھیں۔ غضب کی سردی تھی۔ شاداب سر سے پاؤں تک گرم کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ بستر کے پاس انگیٹھی میں انگارے دہک رہے تھے۔ اس کا چہرہ کشمیری سیب کی طرح سرخ تھا۔ انگیٹھی کی آگ اس کے چہرے کو اور سرخ بنا رہی تھی۔ آگ کے قریب بیٹھنے کے باوجود سردی لگ رہی تھی اور اس سرد رات کی تاریکی میں اسے باہر جانا تھا۔

ماں نے اسے کھانا کھانے کو کہا تھا لیکن وہ کمبل سے باہر نہیں نکلنا چاہتی تھی۔ اس نے کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ باپ نے کہا۔ "سردی تو اور بڑھے گی اور تُو تو برف باری میں بھی باہر نکل جایا کرتی ہے۔ آج تجھے کیا ہوا ہے؟"

آج وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔ ماں باپ کو گہری نیند سلا کر گھر سے جانا تھا۔ جنہوں نے پیدا کیا، پال پوس کر جوان کیا۔ انہیں چھوڑ کر جانا تھا۔

وہ سوچتی تھی، یہ پہاڑ جیسی زندگی ان پہاڑوں کے درمیان رہ کر کیسے گزرے گی۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں کوئی مستقل روزی کا ذریعہ نہیں تھا۔ باپ اور بھائی وہاں سے بیس میل دور سری نگر جاتے تھے، شہر میں مزدوری کرتے تھے، کبھی رات کو واپس آتے تھے، کبھی دو چار دنوں تک شہر میں ہی رہ جاتے تھے۔ اس گاؤں میں تقریباً سو مکانات تھے۔ وہاں سبھی رہنے والے زندگی کو پہاڑ کی طرح کاٹ رہے تھے۔ ایک تو مشکل سے گزارا ہوتا تھا، اوپر سے جوان لڑکیاں بھی پہاڑ بن جاتی تھیں۔ گاؤں کے جوان مزدوری کے لئے شہر جاتے تھے۔ شہر والے انہیں پھانس لیتے تھے یا تو وہ شادیاں کر لیتے تھے یا شہر میں موج مستی کر کے چلے آتے تھے۔ گاؤں میں شادیاں کر کے بال بچوں کی مصیبتیں جھیلنا نہیں چاہتے تھے۔

بھارتی فوجی ہر دوسرے تیسرے دن ادھر آیا کرتے تھے۔ کبھی گھروں کی تلاشیاں لیا

کرتے تھے۔ کبھی مخبروں سے معلوم کرتے تھے کہ وہاں کسی نے کسی مجاہد کو پناہ تو نہیں دی ہے؟

اکثر مجاہدین لائن آف کنٹرول پار کر کے مختلف علاقوں میں جا کر چھپتے تھے۔ اس گاؤں کی طرف بھی آتے تھے۔ وہاں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ ہندو مخبری کرتے تھے کہ اس بستی میں کوئی اجنبی آیا تھا پھر کہیں گم ہو گیا تھا۔

ایسے اجنبیوں کو وہاں کے مسلمان یا تو پناہ دیتے تھے یا پھر اس گاؤں سے دور انہیں کسی محفوظ جگہ پہنچا دیتے تھے۔ بھارتی جاسوس اور فوجی انہیں تلاش کرنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ گھروں میں گھس کر جوان لڑکیوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ایسا دو بار ہو چکا تھا کہ ایک فوجی افسر نے جس لڑکی کو بھی چھیڑا تھا، وہ دو چار دنوں بعد اس گاؤں سے لاپتا ہو گئی تھی۔ ان میں سے ایک کی لاش پائی گئی تھی۔ دوسری کا پتا نہ چلا کہ وہ کہاں گم ہو گئی ہے۔

شاداں بھی گھر سے بھاگنے والی تھی۔ جبار جان نے اس سے محبت کی قسمیں کھائی تھیں۔ وعدہ کیا تھا کہ اسے سری نگر لے جا کر شادی کر لے گا۔ بہت بڑے مکان میں رکھے گا۔ وہ شاداں کے ماں باپ سے اس کا رشتہ مانگ سکتا تھا لیکن اس بستی میں وہ بدنام تھا۔ مسلمان اس سے نفرت کرتے تھے۔ ایک بار اس کی مخبری کے باعث پڑوس کے ایک مکان میں چھاپا مارا گیا تھا۔ وہاں پناہ لینے والا مجاہد فرار ہو چکا تھا لیکن پناہ دینے والوں پر قہر نازل ہوا تھا۔ فوجی ان کے جوان بیٹے کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ اسے ٹارچر سیل میں لے جا کر ایسی اذیتیں دی تھیں کہ وہ جوان بیٹا ہاتھ پاؤں سے اپاہج ہو گیا تھا۔

اس بستی کے مسلمان جبار جان سے نفرت بھی کرتے تھے اور ڈرتے بھی تھے۔ وہ ان کے بارے میں فوجیوں تک جھوٹی خبریں بھی پہنچا سکتا تھا اور انہیں مصیبت میں ڈال سکتا تھا۔ وہ کبھی کبھی دروازے پر آ جاتا تو جبراً اس سے مسکرا کر ملنا پڑتا تھا۔

اس نے شاداں سے کہا تھا۔ "تیرے ماں باپ کبھی مجھے داماد نہیں بنائیں گے۔ مجھ سے محبت ہے، مجھ پر بھروسا ہے تو میرے ساتھ چل۔ میں شادی کر کے تجھے عزت و آبرو سے رکھوں گا۔ بعد میں تیرے ماں باپ بھی مان جائیں گے۔ وہاں بڑوں بڑوں تک میری پہنچ ہے۔ تیرے بھائی کو کہیں نوکری پر لگا دوں گا۔ شہر میں تُو بھی رہے گی۔ تیرا بھائی بھی

کام کرے گا تو ماں باپ بھی یہاں آ کر شہری زندگی گزاریں گے۔"

وہ ایسے ہی خواب دیکھتی تھی۔ کوئی آئے اور اسے دلہن بنا کر شہر لے جائے۔ اب جبار جان اس کے یہ خواب پورے کر رہا تھا۔ اس سے یہ طے پایا تھا کہ وہ آدھی رات کے بعد گھر سے نکلے گی اور بستی کے باہر اسے ملے گی۔ جبار جان نے وعدہ کیا تھا کہ وہ شام ہی سے بستی کے باہر ایک ہندو بنیے کے مکان میں رہے گا۔ وہاں سے اسے سری نگر لے جائے گا۔

وہ سلگتی ہوئی انگیٹھی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے سردی سے کانپنا چاہئے تھا مگر وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔ پہلی بار ایسا قدم اٹھا رہی تھی جس سے ماں باپ کی ذلت ہو سکتی تھی۔ بعد میں انہیں ماننا پڑتا کہ وہ عزت سے ہے۔ پتا نہیں کیا ہونے والا تھا۔ جو بھی ہوتا بعد میں دیکھا جاتا۔ ابھی نوجوانی کے جوش میں وہ گھر سے نکلنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

آدھی رات کے بعد باپ کے خراٹے سنائی دینے لگے۔ وہ کچھ بیمار تھا اس لئے شہر نہیں گیا تھا۔ بھائی مزدوری کے لئے گیا تھا۔ دو چار دن بعد آنے والا تھا۔ اس نے چھوٹی سی کھڑکی سے دوسرے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ بوڑھے والدین کمبل میں لپٹے ہوئے سو رہے تھے۔ اس نے اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھا۔ اپنے بستر سے اونی شال اٹھا کر اسے بدن سے لپیٹ کر دبے قدموں چلتے ہوئے دروازے کے پاس آئی پھر اسے آہستگی سے کھول کر باہر نکل گئی۔

اندھیری رات تھی' رات کے پچھلے پہر چاند نکلنے والا تھا۔ وہ تاریکی میں چھپی ہوئی جانے لگی۔ ایک تو مون سون ہوائیں چل رہی تھیں پھر تھوڑی دیر پہلے بارش بھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے سردی اور بڑھ گئی تھی۔ وہ اونی شال اچھی طرح لپیٹے ہوئے جا رہی تھی۔ بستی کے مکانات پہاڑی کے نشیب و فراز میں دور دور بنے ہوئے تھے۔ کوئی اس کی آہٹ نہیں سن سکتا تھا اور نہ ہی اندھیری رات میں کوئی اسے دیکھ سکتا تھا۔

ایک ٹیلے کے پاس اچانک ہی کسی نے چھلانگ لگائی۔ اس کے سامنے پہنچ کر گرتے گرتے سہارے کے لئے اس سے لپٹ گیا اور اس کے ساتھ زمین پر گر پڑا۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اجنبی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ "چپ رہو۔ میں تمہیں نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

شاداں کو یوں لگ رہا تھا جیسے کمبل نے اسے لپیٹ لیا ہے۔ وہ بُری طرح جکڑی ہوئی تھی۔ سردی کا موسم گزر گیا تھا۔ گرمی آ گئی تھی۔ آسمان پر سفید بادل تھے۔ بارش کے بعد تارے چمکنے لگے تھے' دھیمی دھیمی روشنی میں اجنبی جوان کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں تھوڑی دیر تک چپ رہے۔ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر شاداں نے کہا۔ "چھوڑو مجھے' کون ہو تم؟"

وہ جیسے سحرزدہ سا ہو گیا تھا۔ اسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ اس کی بات پر چونک گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر سرگوشی میں پوچھا۔ "کیا تم مسلمان ہو؟"

"ہاں۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"کیا اس بستی میں پناہ ملے گی؟ تم کہاں رہتی ہو؟ مجھے اپنے گھر لے چلو۔"

وہ جس گھر کو چھوڑ آئی تھی' وہاں اسے کیسے لے جا سکتی تھی۔ وہ زمین سے اٹھ کر شال کو اچھی طرح لپیٹتے ہوئے بولی۔ "میں .... میں یہاں نہیں رہتی ہوں۔ میں کچھ نہیں جانتی۔"

وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اس سے دور ہوتی چلی گئی۔ یہ سمجھ گئی تھی کہ وہ کنٹرول لائن پار کر کے آنے والا کوئی مجاہد ہے۔ اس نے اپنے بیگ میں اسلحہ چھپا کر رکھا ہو گا' اس بستی میں پناہ لینے آیا ہو گا۔ وہ مجبور تھی' اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ خود کسی کی پناہ میں جا رہی تھی۔

بنیے کے مکان کے پچھواڑے جبار جان ایک سائبان کے نیچے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے دھیمی آواز میں پکارا۔ "شاداں میں یہاں ہوں۔"

وہ دوڑتے ہوئے آ کر اس سے لپٹ گئی۔ اس نے کہا۔ "تم نے بڑی دیر کر دی۔ رات کے دو بج رہے ہیں۔ یہاں سے جلدی نکل چلو۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ "بابا بیمار ہے' بہت کھانس رہا تھا۔ جب اس کے خراٹے سنائی دیئے ہیں' تب آئی ہوں۔"

وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے بستی سے دور ہوتے گئے۔ تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں ٹھٹک گئے۔ جبار جان نے پلٹ کر دیکھا پھر کہا۔ "تمہاری بستی میں فائرنگ ہوئی ہے۔"

وہ بڑے دکھ سے بولی۔ "بیچارہ۔"

جبار جان نے حیرانی سے پوچھا۔ "کسے بیچارہ کہہ رہی ہو؟"

"ابھی راستے میں ایک مسلمان اجنبی مجھ سے ٹکرایا تھا۔ وہاں پناہ لینے گیا تھا۔"

"پھر تو گیا ہی گیا سمجھو' پتا نہیں یہ لوگ کیوں مرنے چلے آتے ہیں؟"

وہ پھر ایک طرف آگے بڑھنے لگے۔ شاداں نے کہا۔ "ایسی حقارت سے نہ بولو۔ وہ سر سے کفن باندھ کر ہماری آزادی کے لئے آتے ہیں۔ یاخدا مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے اسے بے موت مارا ہے۔"

"اس کے لئے ایسا کیوں سوچ رہی ہو؟"

"وہ مجھ سے پناہ مانگ رہا تھا۔ میں اسے گھر لے جا سکتی تھی مگر نہیں لے گئی۔ اسے کیسے بتاتی کہ گھر سے بھاگ کر آئی ہوں۔"

وہ چلتے چلتے اسے خیالی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اسے پکڑ رکھا تھا' جکڑ رکھا تھا' اس کا موسم بدل رہا تھا' جیسے تقدیر بدل رہا ہو۔

جبار جان نے کہا۔ "اسے گھر لے جاتیں تو کیا ہوتا' فائرنگ کی آواز سنی ہے نا؟ ایک گولی تمہیں بھی لگتی۔ مجھے دعائیں دو۔ میرے عشق نے تمہیں بچالیا ہے۔"

وہ باتیں کرتے رہے اور آگے بڑھتے رہے۔ تقریباً پانچ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک ریسٹ ہاؤس میں آ گئے۔ وہ بولا۔ "ہم یہاں ذرا دم لیں گے۔ میں تمہیں گرما گرم قہوہ پلاؤں گا۔"

اس نے پوچھا۔ "یہ اتنا بڑا مکان کس کا ہے؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "یہ مکان نہیں ہے' ریسٹ ہاؤس ہے۔ یہاں بڑے بڑے افسر آ کر رہتے ہیں۔"

وہ سہم کر بولی۔ "وہ لوگ ہمیں دیکھتے ہی پکڑ لیں گے۔"

"وہ ہمیں کیوں پکڑیں گے؟"

"انہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں گھر سے بھاگ کر آئی ہوں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "تم گھر سے بھاگ کر آئی ہو۔ ان کے باپ کا کیا جائے گا' پھر میں جو تمہارے ساتھ ہوں۔ کہہ دوں گا کہ تم میری گھر والی ہو۔ تمہیں سری نگر لے جا رہا

ہوں۔"

وہ ریسٹ ہاؤس کے سامنے پہنچتے ہوئے بولی۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"یہاں کے سب لوگوں سے میری جان پہچان ہے۔ میرے ساتھ رہ کر ڈرو گی تو زندگی کیسے گزارو گی؟"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے برآمدے میں آئی۔ چوکیدار نے اسے دیکھتے ہی سلام کیا۔ اس نے کہا۔ "دروازہ کھولو۔ ہم تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد جائیں گے۔"

چوکیدار دروازہ کھول کر چلا گیا۔ وہ کمرے میں آ کر بولا۔ "دیکھا تم نے' یہاں میرا حکم چلتا ہے۔ تم یہاں بیٹھو' میں گرما گرم قہوہ لے کر آتا ہوں۔"

"کہاں سے لاؤ گے؟"

"ریسٹ ہاؤس کے پیچھے بڑا سا باورچی خانہ ہے۔ میں ملازم سے کہوں گا۔ وہ قہوے کے ساتھ کچھ کھانے کے لئے بھی لے آئے گا۔" وہ باہر جاتے ہوئے بولا۔ "دروازہ بند نہ کرنا' میں ابھی آ رہا ہوں۔"

وہ جانے لگا۔ شاداں دروازے کے باہر آ کر کھڑی ہو گئی۔ تنہا کمرے میں ڈر لگ رہا تھا۔ جبار جان وہاں سے چلتا ہوا برآمدے کے آخری کمرے میں جا رہا تھا۔ وہ بھی ادھر جانے لگی۔ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ اکیلی نہیں رہے گی۔ اس کے ساتھ باورچی خانے میں جائے گی۔

وہ اس آخری کمرے کے پاس آئی پھر کھڑکی کے پاس پہنچ کر ٹھٹک گئی۔ کمرے کے اندر وہ فوجی افسر دکھائی دیا جو ایک ہفتے پہلے ان کی بستی میں آیا تھا۔ ان کے گھر کی تلاشی لی تھی۔ اس روز باپ اور بھائی گھر میں نہیں تھے۔ ماں نے افسر سے کہا۔ "آپ کو کسی نے جھوٹی خبر دی ہے۔ ہم کبھی کسی اجنبی کو پناہ نہیں دیتے ہیں۔"

وہ افسر شاداں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے اس کی ماں سے بولا۔ "ہمارے جاسوس جھوٹی خبر نہیں پہنچاتے ہیں۔ جب وہ پاکستانی پکڑا جائے گا تو میں تیری چھوکری کو بھی پکڑ کر لے جاؤں گا۔ تیرے سامنے اس کا وہ حال کروں گا کہ تُو دیکھ نہیں سکے گی' اندھی ہو جائے گی۔"

اس نے ایسا کہتے کہتے شاداں کو سینے سے لگا کر دبوچ لیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے خود کو چھڑا کر ماں کے پیچھے آ گئی تھی۔ وہ مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا ہنستا ہوا وہاں سے چلا گیا تھا۔

اب وہی افسر ریسٹ ہاؤس کے اس کمرے میں نظر آ رہا تھا۔ جبار جان دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "میں تو آپ کا غلام ہوں۔ بڑی مشکل سے اسے پٹا کر لایا ہوں۔"

افسر نے کہا۔ "چھوکری زبردست ہے۔ ایک بار اسے سینے سے لگانے کے بعد میری نیند اڑ گئی تھی۔ سالی بھیجے کے اندر گھس گئی ہے۔ آج میں.........."

اس نے آگے ایسی شرمناک بات کہی جسے سن کر وہ لرز گئی۔ دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے۔ دیدے پھاڑ پھاڑ کر ہاتھ جوڑنے والے غلام کو دیکھنے لگی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مخبری کرنے والا دلال یہ بھی کر سکتا ہے۔

وہ افسر اپنی جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر جبار جان کو دے رہا تھا۔ وہ تیزی سے پلٹ کر وہاں سے بھاگنے لگی۔ جبار جان نے بخشش لے کر پھر ہاتھ جوڑے اور کہا۔ "میں یہاں رہوں گا' آپ موج کریں' بعد میں اسے ٹھکانے لگانا ہو گا۔ دوسری لڑکیوں کی طرح یہ بھی واپس نہیں جائے گی۔"

چوکیدار نے دروازے پر آ کر کہا۔ "جبار بابو! وہ جو آپ کے ساتھ آئی تھی' وہ بھاگتے ہوئے کہیں جا رہی ہے۔"

وہ دونوں چونک گئے۔ جبار جان نے غصے سے کہا۔ "وہ کہاں جا رہی ہے' اسے پکڑو۔ تم نے اسے جانے کیوں دیا؟"

وہ جواب سنے بغیر تیزی سے دوڑتا ہوا جانے لگا۔ وہ سمجھتا تھا کھونٹے سے بندھی ہوئی گائے رسی کی لمبائی تک بھاگتی ہے۔ آخر کھونٹے کی طرف واپس آ جاتی ہے۔ وہ ضرور اپنے گھر کی طرف جا رہی ہو گی۔ وہ بھی اسی طرف دوڑتے ہوئے جانے لگا۔

ابھی چاند نہیں نکلا تھا۔ چاندنی ہوتی تو وہ ذرا دور سے نظر آ جاتی۔ وہ دور تک دوڑتا ہوا آیا پھر پکارنے لگا۔ "شاداں .... شاداں تم کہاں ہو؟"

دور سے اس کی آواز سنائی دی۔ "خبردار میرے پاس نہ آنا' میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی' میرے پاس آؤ گے تو میں منہ پر تھوک دوں گی۔"

"ایسی بات کیوں کہہ رہی ہو؟ اچانک مجھ سے نفرت کیوں کر رہی ہو؟ رک جاؤ۔ میں تمہاری غلط فہمی دور کر دوں گا۔"

اس کا جواب سنائی نہیں دیا۔ وہ تیزی سے دوڑنے لگا۔ اسے یہ اندیشہ تھا کہ وہ بستی میں واپس جائے گی تو اس کی یہ حرکت اسے تمام مسلمانوں کی نظروں میں اور قابلِ نفرت بنا دے گی۔

وہ تاریکی میں ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔ سخت چوٹیں آئیں۔ تکلیف سے کراہتے ہوئے اٹھنے لگی۔ لنگڑاتے ہوئے چلنے لگی۔ ایک گھٹنے میں چوٹ لگی تھی۔ دوڑنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا قریب آ گیا۔ وہ پیچھے ہٹ کر ایک پتھر سے لگ کر چیختے ہوئے بولی۔ "میرے قریب نہ آنا۔ تم جھوٹے ہو' مکار ہو' فوجیوں کے دلال ہو' میں تم پر تھوکتی ہوں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "آخری بار تھوکو گی۔ کوئی دیکھنے نہیں آئے گا۔ میرے ساتھ چلو۔ تمہیں عیش کراؤں گا۔ ہمارے میجر صاحب بڑے دیالو ہیں۔ مجھے اور زیادہ انعام دیں گے۔"

"لعنت ہے تم پر.......... ہٹے کٹے ہو کر محنت مزدوری نہیں کرتے' دلالی کرتے ہو۔ کیا اپنی بہن کو بھی فوجیوں کے پاس لے جاتے ہو؟"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولا۔ "تم ہی بہن بن جاؤ اور دیکھو کہ بہن اور بیٹی کی بھی دلالی ہوا کرتی ہے۔"

وہ اسے کھینچ کر لے جانا چاہتا تھا' وہ نہیں جانا چاہتی تھی۔ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوششیں کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "زندہ رہنا چاہتی ہو تو سیدھی طرح چلو' ورنہ ادھر کھائی ہے' نیچے پھینک دوں گا۔"

وہ بڑی مشکل سے ہاتھ چھڑا کر بولی۔ "پھینک دو' مار ڈالو مجھے' میں نے ماں باپ کی بدنامی کا خیال نہیں کیا۔ غیرت مند بھائی کا سر جھکا دیا۔ مجھے مر جانا چاہئے لیکن میں پہلے گھر جا کر معافی مانگوں گی انہیں یقین دلاؤں گی کہ عزت سے واپس آئی ہوں۔ وہ معاف نہیں کریں گے تو میں پھندا لگا کر مر جاؤں گی۔"

وہ پلٹ کر بستی کی طرف بھاگنے لگی۔ جبار جان اس کے پیچھے دوڑا' دوڑتے ہی

اچھل کر اوندھے منہ گرا۔ اس کی چیخ سن کر شاداں رک گئی۔ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ جبار جان بھی اٹھتے ہوئے دیکھنے لگا۔ ایک چٹان کے پیچھے وہ کھڑا ہوا تھا۔ اسی نے ٹانگ اڑا کر اسے گرایا تھا۔

پچھلے پہر کا چاند نکل آیا تھا۔ چاندنی پھیل رہی تھی۔ وہی اجنبی نظر آ رہا تھا جس نے اسے پکڑا تھا جکڑ لیا تھا۔ پہلے موسم بدل کر گیا تھا' اب مقدر بدلنے آیا تھا۔

جبار جان نے غرا کر پوچھا۔ "کون ہے بے تو؟"

اجنبی نے پوچھا۔ "کیا اپنے باپ سے بھی ایسے ہی بولتے ہو؟"

پھر اس نے شاداں سے کہا۔ "اور تم .... تم تو اس بستی میں تھیں۔ اتنی رات کو اکیلی کہاں جا رہی ہو؟ یہ بدمعاش کون ہے؟"

"میں اس کا آدمی ہوں' یہ میری گھر والی ہے۔"

شاداں نے تھوکتے ہوئے کہا۔ "تھو .... یہ دلال ہے' کمینہ ہے' کتا ہے' یہ شادی کرنے کے بہانے مجھے ایک فوجی افسر کے پاس لے جا رہا تھا۔"

اجنبی نے کہا۔ "میں سن رہا تھا' یہ سچ کہتا ہے۔ کتے کی موت مرے گا۔"

جبار جان نے کہا۔ "مجھے موت کی دھمکی نہ دو۔ ایک بہت بڑے جیوتشی نے کہا ہے کہ میری زندگی ختم ہونے والی ہے۔ میں جلد ہی مرنے والا ہوں۔ جب مرنا ہی ہے تو ڈرنا کیا۔ میں تو مرتے مرتے بھی تمہیں لے مروں گا۔"

اجنبی نے کہا۔ "عجیب اتفاق ہے' ایک بہت بڑے ڈاکٹر کی میڈیکل رپورٹ نے کہا ہے کہ میری عمر بھی کم رہ گئی ہے۔ میں سال چھ مہینے سے زیادہ نہیں جیوں گا۔ معلوم ہوتا ہے ہم دونوں کی پیش گوئیاں کرنے والے درست ہیں۔ شاید ہم ایک دوسرے کے ہاتھوں یہاں مرنے والے ہیں۔"

جبار جان نے اچانک ہی چھلانگ لگا کر اسے دبوچ لیا پھر اسے رگیدتے ہوئے پیچھے پتھر سے ٹکرا دیا۔ اس کے منہ پر گھونسا مارنا چاہتا تھا لیکن اجنبی ہٹ گیا۔ گھونسا پتھر پر لگا۔ جبار جان کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس کے منہ پر گھونسا پڑا۔ وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا۔

شاداں سینے پر ہاتھ رکھے ایک طرف کھڑی دونوں کو گتھم گتھا ہوتے دیکھ رہی تھی۔ کبھی جبار جان اس پر بھاری پڑ رہا تھا' کبھی اجنبی اس پر غالب آ رہا تھا۔ شاداں نے ایک

طرف پڑے ہوئے بیگ کو دیکھا' خیال آیا اجنبی نے اس میں اسلحہ چھپا کر رکھا ہو گا۔ اسے بیگ تک پہنچنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ جبار جان کے پاس بھی اسلحہ نہیں تھا۔ دونوں خالی ہاتھ لڑ رہے تھے۔

وہ دوڑتے ہوئے بیگ کے پاس آئی۔ اسے کھول کر دیکھا' اندر دوسرے سامان کے ساتھ ایک شاٹ گن اور بلٹس رکھے ہوئے تھے۔ وہ شاٹ گن نکال کر چیختے ہوئے بولی۔ "اجنبی ہٹ جاؤ' میں اسے گولی مار دوں گی۔ یہ کتا میرے ہاتھوں مرے گا۔"

جبار جان اس نے شاٹ گن کو دیکھتے ہی اجنبی کو اس کی طرف دھکا دیا' پھر وہاں سے بھاگنے لگا۔ شاداں نے فائر کیا۔ وہ اناڑی تھی۔ صحیح نشانہ نہیں لگا سکتی تھی۔ اس کا دوسرا فائر بھی خالی گیا۔ اجنبی نے اس سے گن لے کر گولی چلائی۔ اس وقت تک وہ ایک موڑ پر پہاڑی ٹیلے کے پیچھے گم ہو گیا تھا۔

وہ بولا۔ "دور نکل گیا ہے' نہ نشانے پر آئے گا نہ پکڑا جائے گا۔"

وہ بولی۔ "تم نہ آتے تو وہ مجھے مار ڈالتا۔ میں شرمندہ ہوں' میں تمہیں پناہ دینے کے لئے اپنے گھر لے جا سکتی تھی مگر وہ شیطان مجھے بہکا کر ادھر لا رہا تھا۔"

"وہ بھاگ گیا ہے۔ تم تنہا کیسے جاؤ گی؟ میں ابھی تمہاری بستی کی طرف سے آ رہا ہوں' وہ تو بہت دور ہے۔ میں تمہیں پہنچانے کے لئے وہاں تک نہیں جا سکوں گا۔"

"ہاں یاد آیا' میں نے بستی میں فائرنگ کی آواز سنی تھی۔ مجھے یہی خیال آیا کہ فوجیوں نے تمہیں گولی ماری ہے۔ خدا کا شکر ہے تم زندہ سلامت ہو۔"

"انہوں نے اندھیرے میں گولی چلائی تھی۔ میں بچ کر ادھر چلا آیا ہوں۔ اندھیرے میں راستہ بھٹک گیا تھا۔ اب چاندنی میں سفر کر سکوں گا۔"

"تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں سوپور جاؤں گا' پھر وہاں سے بھی آگے جانا ہے۔"

وہ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی پھر بولی۔ "میں دو بار سوپور جا چکی ہوں' تمہیں وہاں تک پہنچا سکتی ہوں۔"

"تم اپنے گھر نہیں جاؤ گی؟ کیا تمہیں اپنے گھر سے باہر بھٹکنا اچھا لگتا ہے؟"

"پہلے بھٹک گئی تھی' تم سے امید ہے مجھے بھٹکنے نہیں دو گے۔ میں اپنے گھر نہیں

جاؤں گی۔"

"پھر کہاں جاؤ گی؟"

"میں گھر سے بھاگ کر آئی ہوں۔ واپس جاؤں گی تو بستی والے دیکھیں گے۔ یہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ کیا تم میری شرم رکھو گے؟"

وہ حیرانی سے بولا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

وہ تو پہلی ملاقات میں ہی سحرزدہ ہو گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد بہت دیر تک اسے خیالی آنکھوں سے دیکھتا رہا تھا' مجبور تھا۔ اس کے پیچھے نہیں جا سکتا تھا۔ بستی میں پناہ لے کر دوسرے دن آزاد کشمیر کی طرف جانا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے مگر تقدیر انہیں بھٹکا کر پھر روبرو لے آئی تھی۔

وہ کہہ رہی تھی۔ "ہو سکتا ہے' وہ شیطان کہیں چھپا ہو۔ تم چھوڑ کر جاؤ گے تو وہ پھر آ کر مجھے پکڑ لے گا۔ کیا تم ایسا چاہو گے؟"

"میں تمہاری بستی کی طرف تمہیں نہیں لے جا سکتا۔ دشمن تلاش کر رہے ہوں گے۔ تمہیں اپنے ساتھ کہاں لے جاؤں؟ میں تو خود بھٹک رہا ہوں۔ پتا نہیں کنٹرول لائن پار کر سکوں گا یا نہیں؟"

"ہم دونوں اس پار جائیں گے۔ زندگی رہی تو جئیں گے ورنہ ادھر ہی گولیوں کا نشانہ بن جائیں گے۔ میں تمہارے ساتھ جینا مرنا چاہتی ہوں۔"

"اچانک اتنا بڑا فیصلہ نہ کرو۔ اگر سوپور میں تمہارا کوئی ہے تو میں تمہیں وہاں پہنچا دوں گا۔"

"میرا کوئی نہیں ہے۔ کیا میں اچھی نہیں ہوں؟ مجھ میں کوئی عیب ہے؟ یا گھر سے بھاگ کر تمہاری نظروں سے گر گئی ہوں۔ اگر ایسا ہے تو مجھے گولی مار کر جاؤ۔ میں نظروں سے گر کر زندہ نہیں رہوں گی۔ یہ تمہارے لئے آسان ہو گا۔ میں مصیبت بن کر تمہارے پیچھے پیچھے نہیں آؤں گی۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ میں تمہیں کسی محفوظ مقام تک پہنچا سکتا ہوں۔ میرے ساتھ زندگی گزارنے کی باتیں نہ کرو۔ تم نہیں جانتیں' میری زندگی بہت تھوڑی سی رہ گئی ہے۔"

"تم ابھی کہہ رہے تھے کہ بہت بڑے ڈاکٹر نے تمہاری موت کی پیش گوئی کی ہے۔ کیا کسی کے کہنے سے آدمی مر جاتا ہے؟ تم زندگی سے مایوس کیوں ہوتے ہو؟"

"یہ کسی انسان کی پیش گوئی نہیں ہے۔ میڈیکل رپورٹ ہے۔ میں کینسر کا مریض ہوں' شاید ایک برس جی سکوں گا' اس سے پہلے کسی مہینے کسی دن بھی مر سکتا ہوں۔"

"تم نہیں مرو گے۔ میرے مقدر سے جیو گے۔ میں تمہیں اپنی عمر دے دوں گی۔"

"تم محبتیں دے سکتی ہو' مجھ پر قربان ہو سکتی ہو لیکن اپنی عمر نہیں دے سکتیں' ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ مجھے دیر ہو رہی ہے' یہاں خطرہ بڑھتا جا رہا ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے مجھے جانا چاہئے۔ تم اپنے بارے میں دانشمندی سے فیصلہ کرو۔"

وہ اس کا بیگ اٹھا کر آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ "فیصلہ کر چکی ہوں۔ آگے بڑھتے رہو اور جو بولنا ہے' بولتے رہو۔ میں تو گھر سے نکل چکی ہوں' کہیں تو جانا ہی ہے۔ اس لئے جا رہی ہوں۔ تمہیں بوجھ لگوں گی تو کسی کھائی میں دھکا دے دینا۔"

وہ پریشان ہو رہا تھا' اس کے پیچھے چلتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ تم مصیبت نہیں ہو' بہت اچھی ہو' میں .... میں پہلی بار تمہیں دیکھ کر تمہاری آرزو کرنے لگا تھا۔ اس تھوڑی سی زندگی میں کوئی میری آخری خواہش پوچھے تو میں تمہیں مانگوں گا لیکن تمہاری زندگی تباہ نہیں کروں گا۔ تمہیں چند دنوں یا چند مہینوں کی سہاگن نہیں بناؤں گا۔"

وہ چلتے چلتے رک گئی۔ بیگ کو زمین پر چھوڑ کر اس کے قریب آئی پھر اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ "میں اس شیطان کے جال میں پھنس جاتی تو نہ جانے بے حیائی کی کتنی لمبی زندگی گزارتی۔ اس لمبی زندگی سے کیا عزت کے چند دن بہتر نہیں ہیں؟ تم سے جو عزت اور محبت مجھے ملے گی' وہ کسی اور سے نہیں مل سکے گی۔"

وہ سانسوں کے قریب آ گئی تھی پھر موسم بدل گیا تھا۔ دونوں طرف سے گرم ہوائیں چلنے لگیں۔ کشمیر کی کلی مہک رہی تھی۔ اِدھر کی اُدھر اور اُدھر کی اِدھر دھڑکنیں منتقل ہو رہی تھیں۔ ایسے سنگین لمحات میں کچھ سوچا نہیں جاتا۔ کچھ سمجھا نہیں جاتا۔ فیصلے خود بہ خود ہو جاتے ہیں۔

فیصلہ ہو گیا' فاصلے کم ہو گئے تھے۔

☆------☆------☆

جبار جان اپنی جان بچا کر آ گیا تھا۔ اسے اس بات کا افسوس نہیں تھا کہ شاداں کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ اس بات کی پریشانی تھی کہ موت قریب آ کر گزر گئی تھی۔ دیال سنگھ کی پیش گوئی کے مطابق وہ مرنے والا تھا۔ موت نے خود ہی راستہ بدل لیا تھا۔

گرو نے یہ نہیں بتایا تھا کہ موت کیسے آئے گی؟ طبعی موت مرے گا یا مارا جائے گا۔ اسے مارا جانا پسند نہیں تھا۔ طبعی موت آئے تو مرنا ہی پڑتا ہے لیکن حرام موت کوئی نہیں چاہتا۔ وہ دوسری صبح گرو دیال سنگھ کی چوکھٹ پر گیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر ان کے آگے ٹیک کر بیٹھ گیا۔ گرو نے کہا۔ "بہت پریشان ہو' میں نے پہلے کہا تھا۔ مجھ سے زیادہ باتیں پوچھا کرو۔ تم ضد کرتے رہے۔ مجھے بتانا پڑا۔ اب بتانے کو کیا رہ گیا ہے؟ کیا پوچھنے آئے ہو؟"

وہ اس کے پیروں کو چھو کر بولا۔ "آپ مہا گیانی ہیں۔ آپ کی کوئی بات کبھی نہیں ہوتی۔ بس ایک بات اور بتا دیں' میری موت کیسے ہو گی؟"

"یہ تو ایشور ہی جانتا ہے۔ نہ میں جان سکتا ہوں' نہ بتا سکتا ہوں۔"

"آپ جانتے ہیں' بتانا نہیں چاہتے۔"

"جو نہ بتانے کی بات ہے' وہ میں نے بتا دی۔ میجر صاحب کی سفارش لے کر آئے تھے' میں نے ان کی بات رکھ لی۔"

"جب آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ میری زندگی بہت کم رہ گئی ہے تو یہ بھی بتا سکتے ہیں' مجھے کوئی برا روگ لگے گا' میں بیمار رہ کر مروں گا' یا چلتے پھرتے مروں گا یا کوئی مجھے مار ڈالے گا؟"

"تم مورکھ ہو۔ موت تو کسی بھی بہانے سے آتی ہے۔ اس کی چنتا کیوں کرتے ہو؟"

"پہلے مجھے فکر نہیں تھی۔ کل رات ایک دشمن نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ اس نے مجھ پر ایک نہیں دو گولیاں چلائی تھیں مگر میں زندہ سلامت آپ کے سامنے ہوں۔"

"بھگوان کا شکر کرو' بھوکوں کو کھانا کھلاؤ۔ معلوم ہوتا ہے تمہیں کوئی نہیں مارے گا۔ موت کسی دوسری طرح آئے گی۔ میں اسی طرح اندازے سے کہہ سکتا ہوں۔ کوئی

بات نہیں بتا سکتا۔"

"آپ کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ درست ہوتا ہے۔ آپ نے کہا مجھے کوئی نہیں مارے گا۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ موت کا ڈر نہیں ہے' وہ تو سب کو آنی ہے۔ شکر ہے میں حرام موت نہیں مروں گا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

وہ وہاں سے اٹھ کر آ گیا۔ گرو دیال سنگھ مانا ہوا جیوتشی تھا۔ جنم کنڈلی اور ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر ماضی' حال اور مستقبل کی سچی باتیں بتاتا تھا۔ راج دھانی کے پردھان منتری اسے اکثر بلایا کرتے تھے۔ اس کی ایک ایک پیش گوئی پر اعتماد کرتے تھے۔ اسے راج دھانی میں کوٹھی' کار اور منہ مانگا معاوضہ دینا چاہتے تھے لیکن وہ اپنے باپ دادا کی طرح سری نگر میں ہی رہنا چاہتا تھا۔ پردھان منتری کے پاس جانے اور آنے کے لئے ہیلی کاپٹر بھیجا جاتا تھا۔

اس کی پیش گوئیاں بہت مشہور تھیں۔ جو اسے جانتے تھے اور مانتے تھے' وہ اس کے قصے سناتے رہتے تھے اور وہ قصے من گھڑت نہیں ہوتے تھے۔ وہ جو بات کہتا تھا وہ پتھر کی لکیر بن جاتی تھی۔ جبار جان کو یہ آخری بات سن کر اطمینان ہوا تھا کہ وہ کسی کے ہاتھوں مارا نہیں جائے گا۔

وہ ایک سڑک کے کنارے چل رہا تھا۔ ایک مارکیٹ سے گزر رہا تھا۔ ایک فوجی جیپ اس کے قریب آ کر رک گئی۔ اس نے ایک فوجی افسر کو دیکھ کر دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ افسر نے کہا۔ "اے کہاں مر گیا تھا؟ کیمپ میں کیوں نہیں آیا؟ میجر ورما تجھے پوچھ رہے ہیں۔ چل پیچھے بیٹھ جا۔"

پیچھے دو مسلح جوان بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی اس کے منہ پر کوئی چیز آ کر لگی۔ مرغی کا ایک انڈا اس کی پیشانی سے ٹکرا کر ٹوٹا تھا۔ اس کی زردی اور سفیدی پیشانی سے نیچے چہرے پر پھیل رہی تھی۔ وہ قمیض کے دامن سے منہ پونچھنے لگا۔

فوجی افسر نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر غصے میں کہا۔ "یہ کسی مسلمان کی بدمعاشی ہے۔ دیکھو کون ہے' میرے سامنے کس نے یہ ہمت کی ہے؟"

مسلح جوان جیپ سے اتر کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ مارکیٹ میں لوگوں کی بھیڑ

تھی۔ وہ آس پاس کے دکانداروں اور راہ گیروں سے پوچھنے لگے۔ سب لاعلمی ظاہر ک لگے۔ کسی نے انڈا مارنے والے کو نہیں دیکھا تھا۔ جبار جان نے افسر سے کہا۔ " صاحب ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ آپ لوگوں کی سیوا کرتا ہوں' یہ کچھ مسلمانوں ک نہیں لگتا۔"

جیپ وہاں سے چل پڑی۔ اس نے کیمپ میں آ کر میجر کے سامنے پہنچ کر دونوں جوڑے۔ میجر نے کہا۔ "کیا تجھے چربی چڑھ گئی ہے؟ کل تُو نے حاضری نہیں دی۔"

"حضور جموں کے ایک میجر صاحب منگور بستی کی طرف آئے تھے' ان کی نوکر رہا تھا۔"

"میں تمہیں اسی گاؤں کی طرف بھیجنا چاہتا تھا۔ ایک پاکستانی جاسوس اد علاقے میں ہے۔ کنٹرول لائن پار کرنے والا ہے۔ اس سے پہلے اسے گرفتار کرنا ہو کتنی ہی بستیوں کے گھروں میں دعا سلام کے بہانے گھستے رہتے ہو۔ اس نے کسی م کے گھر میں پناہ لی ہوگی۔ اسے آج ہی کسی طرح ڈھونڈ نکالنا ہے۔"

"مجھے گاڑی مل جائے تو ابھی چلا جاؤں گا۔ اس جاسوس کے بارے میں کچھ بتا گے۔"

میجر نے ایک فائل کھولتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک ماہ پہلے کپواڑہ کی طرف د تھا۔ اس کے بعد کہیں روپوش ہوگیا تھا۔ اس نے کارگل کی طرف جانے والے را فوجی چوکیوں کی تصویریں اتاری ہیں۔ ایک جاسوس نے اسے پکڑ لیا تھا لیکن وہ ا کر کے فرار ہوگیا۔ کل پتا چلا کہ وہ منگور کی طرف کہیں چھپا ہوا ہے۔ وہاں اسے تلا جا رہا ہے۔ ہمارے زخمی جاسوس نے اس کی یہ تصویر اتاری تھی۔ یہ دیکھو۔"

میجر نے اس فائل کو کھول کر اسے دکھایا۔ اس فائل کے ایک کاغذ پر ایک تص ہوئی تھی۔ وہ تصویر کو دیکھتے ہی چونک کر بولا۔ "یہ .... یہ .... حضور یہ تو وہ اس نے کل رات مجھ پر حملہ کیا تھا۔ میں اکیلا تھا' اسے قابو میں نہ کر سکا۔ اس ک ایک شاٹ گن تھی۔"

"ہاں یہ معلوم ہوا ہے کہ اس کے پاس ایک شاٹ گن ہے۔ تمہیں فوراً کسی کیمپ سے مدد حاصل کرنا چاہئے تھی۔"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ پاکستانی جاسوس ہے۔ مجھے ذرا بھی شبہ ہوتا کہ وہ مسلمان ہے اور اس پار سے آیا ہے تو میں کیمپ سے ضرور مدد لینے کے لئے جاتا۔"

میجر نے غصے سے کہا۔ "شٹ ...... وہ کئی بار ہاتھ آ کر نکل گیا ہے۔ ابھی گاڑی اور سپاہیوں کو لے کر جاؤ .... اسے ان علاقوں میں گھیرا جا سکتا ہے۔"

"حضور میں نے پہلے بھی کہا تھا ادھر کے مسلمان میرے دشمن ہوتے جا رہے ہیں۔ مجھے ایک بندوق دے دو۔ کل میرے پاس بندوق ہوتی تو میں اسے جانے نہ دیتا۔"

اس نے اپنے ایک ماتحت کو بلا کر ایک رائفل اور کارتوس لانے کا حکم دیا۔ وہ حکم کی تعمیل کے لئے چلا گیا پھر اس نے پوچھا۔ "یہ پچھلی رات تم سے کہاں ٹکرایا تھا؟"

"میں منگور بستی سے پانچ میل دور ریسٹ ہاؤس کی طرف جا رہا تھا۔ وہیں اس نے مجھ پر اچانک حملہ کیا تھا۔ جلدی میں کہیں بھاگا جا رہا تھا۔ مجھ سے فوراً ہی چھٹکارا پانے کے لئے اس نے شاٹ گن سے فائرنگ کی۔ میں پتھروں کی آڑ میں بچتا ہوا اس سے دور چلا آیا۔ اس وقت اندھیرا تھا۔ اس لئے وہ صحیح نشانہ لگا نہیں پایا اور میں بچ گیا۔ اب آپ رائفل دے رہے ہیں۔ یہ آپ کی مہربانی ہے۔ اب سامنا ہوگا تو اسے زندہ نہیں جانے دوں گا۔"

"بہت مجبوری ہو' تب اسے گولی مارنا۔ ورنہ زخمی کر کے گرفتار کرنا۔ ہمیں اس سے بہت کچھ اگلوانا ہے۔"

"آپ جو حکم دیں گے' وہی کروں گا۔ اسے زندہ گرفتار کر کے لاؤں گا۔"

میجر زیر لب بڑبڑانے لگا۔ وہ کپواڑہ کی طرف دیکھا گیا تھا۔ اس کے دوسرے دن ان آتنگ وادیوں نے اس پُل کو ریموٹ کنٹرول بم سے اڑا دیا جو کپواڑہ اور لولاک کے درمیان ہے۔ اس وقت پُل پر سے ہماری دو فوجی گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ وہ گاڑیاں تباہ ہو گئیں۔ اس میں بیٹھے ہوئے فوجی مارے گئے۔ بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔

"حضور ادھر کنٹرول لائن کی طرف مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔ وہاں آتنگ وادی (دہشت گرد) ان مسلمانوں کے درمیان ایسے چھپ جاتے ہیں کہ پہچانے نہیں جاتے۔"

میجر نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے یہ جاسوس پہلے کسی علاقے میں جاتا ہے۔ وہاں کے تمام حالات معلوم کرتا ہے پھر ان آتنگ وادیوں کو سگنل دیتا ہے۔ وہ بڑی رازداری سے

وہاں کارروائیاں کر کے فرار ہو جاتے ہیں۔"

ماتحت ایک رائفل اور کارتوس کے دو پیکٹ لے آیا۔ جبار جان نے وہ سب پکڑ لیتے ہوئے شکریہ ادا کیا پھر اس دفتر سے باہر آیا۔ باہر ایک چھوٹا سا فوجی ٹرک کھڑا ہوا تھا مسلح سپاہی اس میں بیٹھ رہے تھے۔ ایک جاسوس نے ناگواری سے بڑبڑاتے ہوئے کہا "کیا مصیبت ہے' کل ساری رات منگور بستی میں جاگتا رہا۔ آج صبح آیا ہوں پھر وہاں جانا پڑ رہا ہے۔"

جبار جان نے قریب آ کر پوچھا۔ "تم منگور میں تھے۔ اسی جاسوس کو تلاش کر رہے تھے؟"

"ہاں .... وہ کل رات اندھیرے سے فائدہ اٹھاتا رہا۔ بستی میں ایک بار نظر آیا تھا۔ ہم نے فائرنگ کی۔ وہ بچ کر نکل گیا۔ ہم صبح تک اسے تلاش کرتے رہے۔"

"تم اس بستی میں کریم داد کو جانتے ہو۔ اس کا ایک جوان بیٹا ہے مولا داد اور جوان بیٹی ہے شاداں۔ وہ کم بخت میرا دشمن ہے۔ مجھے بھارتی فوجیوں کا دلال کہتا ہے۔"

اس جاسوس نے کہا۔ "وہ کون سا عزت دار ہے۔ کل رات اس کی جوان بیٹی کہیں بھاگ گئی ہے۔ صبح بستی میں بڑا چرچا ہو رہا تھا۔ چند مسلمان تیرے خلاف بول رہے تھے۔"

"وہ تو میری برائیاں کرتے ہی رہتے ہیں۔ وہ ابھی تک گھر واپس نہیں گئی ہے۔ اس کا مطلب ہے کسی مرد کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ جوانی میں صحیح وقت پر صحیح خوراک نہ ملے تو لڑکیاں ایسے ہی پاگل ہو جاتی ہیں۔ یہ جو پاکستان سے آتنگ وادی آتے ہیں' وہ ایسی لڑکیوں کو اپنی خوراک بناتے ہیں اور وہ سالے بستی والے خواہ مخواہ مجھے بدنام کر رہے ہیں۔"

جاسوس نے اس کی پیٹھ پر ایک ہاتھ مار کر کہا۔ "تو بڑا نیک نام ہے۔ شیطان کے نطفے سے پیدا ہوا ہے۔ ہم سے زیادہ تجھے کوئی نہیں جانتا۔ چل بیٹھ جا' گاڑی جا رہی ہے۔"

وہ گاڑی کے پچھلے حصے میں سپاہیوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ جاسوس اگلی سیٹ پر چلا گیا پھر وہ گاڑی وہاں سے چل پڑی۔ بندہ کسی کو مارنے جاتا ہے تو یہ بھول جاتا ہے کہ وہ بھی مارا جا سکتا ہے۔ پچھلے روز ایسے ہی دو فوجی ٹرک اس پل سے گزرتے ہوئے تباہ ہو گئے

تھے۔ جسے مجاہدین نے ریموٹ کنٹرول بم کے ذریعے تباہ کیا تھا۔ کبھی سب مل کر ایک کو مارتے اور کبھی ایک نہیں مرتا' مارنے والے سب مر جاتے۔

موت کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ انداز بدلنے والی محبوبہ کی طرح پہلے یار کو چھوڑ کر اچانک دوسرے یار کے گلے لگ جاتی ہے۔ انسان کے اندر جو جان ہے' وہ ایک پردیسی کی طرح ہے۔ بدن کی سرائے میں کچھ وقت کے لئے ایک پردیسی کی طرح آ کر ٹھہرتی ہے پھر رخصت ہو جاتی ہے۔

سدا نہیں باغ بغیچے
سدا نہ ہوندے فرش غلیچے
ہر دم فکر چلن دا کیجے
اوڑک موت لٹیسی آ
سجھ بندے تُو نال فکر دے ایہہ جندڑی پردیسی آ

جبار جان کی جندڑی بھی پردیسی تھی۔ ایک جان ایک ہی بار ملتی ہے اور وہ جان اس کے جسم کے سرائے خانے سے رخصت ہونے والی تھی لیکن اسے فکر نہیں تھی۔ وہ جان دینے اور جان لینے کی سوداگری میں مصروف تھا۔ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو موت کے قریب پہنچ کر زندگی کے باغ باغیچے زیادہ سے زیادہ سمیٹنا چاہتے ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں ہتھیار ہوتے ہیں۔ ان کا یہی ایک بنیادی اصول ہوتا ہے کہ آپ مرنے سے پہلے جتنے بندے مار سکتے ہو' مارتے چلے جاؤ۔

وہ گاڑی اپنی مخصوص رفتار سے منگور کی طرف جا رہی تھی۔ ایک سپاہی کان پر ہاتھ رکھ کر اونچی تان لگا رہا تھا۔ سُر میں گا رہا تھا۔

اے جندڑی اے میری سہیلی
کوئی نہ ہو گا ساتھ بیلی
رہے گی اندر گور اکیلی
سانپ اور بچھو کھان
جندڑی دو دن کی مہمان

گرودیال سنگھ کی پیش گوئی اکثر سچ ہوا کرتی تھی۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ جبار جان

کے سلسلے میں بھی پیش گوئی درست ہوتی۔ ایک نجومی کے منہ سے نکلی ہوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوتی لیکن ادھر بھی ہتھیار ہوں تو نہ ہونے والی بات بھی حرفِ آخر ہو جاتی ہے۔

☆======☆======☆

وہ شاداں کے ساتھ صبح تک چلتا رہا۔ سردی غضب کی تھی۔ سورج کی گرمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سورج بھی ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ آگ اگلنا بھول گیا ہے۔

وہ مسلسل چلتے جا رہے تھے۔ اسی لئے بدن میں ذرا گرمی تھی پھر ایک دوسرے کی محبت اور قربت گرما رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "تم شاید تھک گئی ہو؟"

"میں پہاڑوں میں رہتی ہوں۔ تھکنا نہیں جانتی۔ تم تھک گئے ہو تو رک جاؤ۔ تھکن اتار لو۔"

"آگے کوئی بستی نظر آئے گی تو وہاں کچھ کھانے پینے کو ملے گا۔ وہ جگہ محفوظ ہو گی تو ہمیں سونے کا موقع مل جائے گا۔ آگ بھی سینکنے کو ملے گی۔"

وہ چلتے چلتے اسے دیکھنے لگی۔ اس نے کہا۔ "مجھے نہیں راستہ دیکھ کر چلو' نہیں تو ٹھوکر لگے گی۔"

"مجھے کبھی ٹھوکر نہیں لگے گی۔ تم سنبھالنے والے مل گئے ہو۔ میں جب بھی گروں گی' تمہاری ہی آغوش میں گروں گی۔ کل رات سے تم مجھے نئی زندگی دے رہے ہو۔"

"کل رات سے تم نے بھی میری زندگی کا رخ موڑ دیا ہے۔ میں زندگی سے مایوس ہو گیا تھا۔ اب تمہارے ساتھ زندگی کا ایک ایک لمحہ خوبصورت لگ رہا ہے۔ پہلے صرف جہاد کرتے کرتے مرنا چاہتا تھا' اب تم سے اتحاد کرتے کرتے دم توڑنا چاہتا ہوں۔"

"مرنے کی بات نہ کرو۔ محبت کے قصے کہانیوں میں پیار کرنے والے مرتے ہیں۔ ہم نہیں مریں گے۔ اپنی ایک نئی کہانی بنائیں گے۔ جہاد کرنے والے صرف شہید نہیں ہوتے۔ غازی بھی ہوتے ہیں۔ محبت کرنے والے صرف مرتے نہیں ہیں' پیار سے جینا بھی سکھاتے ہیں۔"

"تم بہت اچھی ہو۔ جب ڈاکٹر نے مجھے کینسر کی رپورٹ سنائی تو پہلے میں بہت مایوس ہوا تھا پھر سوچا مرنا ہی ٹھہرا تو کسی بڑے مقصد کے لئے مروں گا۔ کشمیر جاؤں گا' جہاد کروں

گا۔ اس سے پہلے کہ کینسر مجھے مارے' میں شہادت کا درجہ حاصل کروں گا۔"

"خدا نے چاہا تو تم غازی بن کر زندہ رہو گے۔ ویسے تمہیں ہوا کیا ہے؟"

"دماغی تکلیف ہے۔ کبھی کبھی اچانک آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ کانوں سے سنائی نہیں دیتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی ریگ مال سے میرے دماغ کو رگڑ رہا ہے۔ بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ میں برداشت کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تکلیف کیسی بھی ہو' برداشت کرنا پڑتا ہے۔ آخر آرام آ جاتا ہے۔"

وہ اس سے لگ کر چلنے لگی۔ بڑی محبت سے بولی۔ "میں تمہیں کسی وید کے پاس لے جاؤں گی۔ تمہارے سر میں تکلیف ہو گی تو تمہارا سر اپنے سینے میں چھپا لوں گی۔"

وہ چلتے چلتے رک گئے۔ ایک جگہ اونچائی پر درختوں کے پیچھے دھوئیں کی ایک لکیر سی آسمان کی طرف اٹھ رہی تھی۔ جہاں آگ اور دھواں ہوتا ہے۔ وہاں انسانی آبادی ہوتی ہے۔ چولہے جلتے ہیں۔ چمنیوں سے دھواں نکلتا رہتا ہے۔ شاداں نے کہا۔ "ادھر بستی ہے' آؤ چلیں۔"

وہ راستہ بدل کر ادھر جانے لگے۔ وہ بولا۔ "ہم پہلے اس بستی کو دور سے دیکھیں گے۔ وہاں سوچ سمجھ کر جائیں گے۔"

وہ اونچائی پر چڑھنے لگے۔ شاداں نے کہا۔ "میں اکیلی وہاں جاؤں گی۔ تم کہیں چھپ کر رہو گے۔ خطرہ تمہارے لئے ہے' میرے لئے نہیں ہے۔"

"پہلے میں وہاں کے حالات کا جائزہ لوں گا' نہ تم تنہا ہو' نہ تمہیں تنہا جانے دوں گا۔ مرد ہوتا کس لئے ہے۔ میں عورت کو آگے بھیج کر پیچھے سے بندوق چلانے والا مرد نہیں ہوں۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "اسی لئے تم پر مرتی ہوں۔ ویسے ہم کہاں آ گئے ہیں؟ یہ سوپور کا راستہ نہیں ہے۔"

"تم تو کہہ رہی تھیں دو بار سوپور جا چکی ہو۔ راستہ جانتی ہو۔"

"ہاں مگر رات کو راستہ سمجھ میں نہیں آیا۔ اب پتا چلا ہے کہ یہ وہ جگہ نہیں ہے۔"

وہ بلندی پر پہنچ کر ہانپنے لگے۔ اب وہ دھواں کسی اور جگہ نظر آ رہا تھا۔ پھر دو بار گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ چلتے چلتے رک گئے۔ شاداں نے کہا۔ "کبریا ادھر

گڑبڑ ہے۔ فائرنگ کی آواز سے سمجھ میں آتا ہے۔ وہاں بھارتی فوجی ہوں گے۔"

وہ محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگے۔ کبریا نے کہا۔ "اتنا سارا دھواں گھر کے چولہوں سے نہیں نکل رہا ہے۔ آگ لگائی ہوئی ہے۔"

سامنے گھنے درخت دور تک تھے۔ ان کے پیچھے وہ بستی نظر نہیں آرہی تھی۔ جہاں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی۔ پتا نہیں وہاں کیوں ایسا ہو رہا تھا۔ اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ آزادی کے لئے لڑنے والے مقامی مسلمانوں سے بھارتی فوجیوں کا تصادم ہو رہا ہے۔

وہ ایک چھوٹا سا ٹاؤن تھا۔ بھارتی فوجیوں نے وہاں کرفیو لگایا تھا۔ یہ اعلان کیا گیا تھا کہ جو بھی گھر سے نکلے گا' اسے گولی مار دی جائے گی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس طرح وہاں کے مسلمان اپنے اپنے گھروں میں بند رہیں وہ ایک دوسرے سے مل کر متحد ہو کر فوجی کارروائیوں میں مداخلت نہ کریں۔

ان کی کارروائی یہ تھی کہ جو مسلمان ان کی بلیک لسٹ میں تھے' انہیں وہاں سے فرار نہ ہونے دیا جائے۔ کرفیو میں جو بھی گھر سے نکل کر بھاگے گا' وہ ملک دشمن باغی ہو گا۔ وہ کرفیو کی خلاف ورزی کرنے کے بہانے ناپسندیدہ افراد کو گولی مارنا چاہتے تھے اور جو باہر نہ ملتا اور ان کی بلیک لسٹ میں ہوتا تو اسے گرفتار کر کے لے جاتے۔

کتنے ہی چھوٹے بڑے شہروں میں جن مسلمانوں کو ملک دشمن کہہ کر گرفتار کیا گیا' ان کے بارے میں یہ کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ انہیں گرفتار کر کے کہاں لے جایا جاتا ہے۔ ان کے ماں باپ' بہن بھائی' رشتے دار انہیں تھانوں اور جیلوں میں ڈھونڈنے جاتے تھے۔ اونچی اونچی کرسیوں پر بیٹھنے والوں کو درخواستیں لکھ کر بھیجتے تھے۔ عورتیں' بوڑھے اور بچے اس ظلم کے خلاف احتجاج کرتے تھے۔ جلوس نکالتے تھے۔ فریاد کرتے تھے۔ مگر بھارت کی ہر عدالت میں انصاف کی دیوی کا جو مجسمہ رکھا جاتا ہے' اس کے ایک ہاتھ میں ترازو ہوتا ہے۔ ترازو کے پلڑے برابر ہوتے ہیں۔ یعنی انصاف برابر ہو رہا ہے لیکن اس انصاف کی دیوی کی آنکھوں پر پٹی بندھی رہتی ہے۔ یعنی قانون اندھا ہوتا ہے۔ پلڑے برابر رکھ کر سمجھتا ہے کہ انصاف برابر ہو رہا ہے۔

اپنے لہو کے رشتوں اور درد کے رشتوں کی واپسی کے لئے احتجاج کیا جاتا ہے۔

اندھے قانون اور ظلم و ستم کے خلاف مظاہرہ کیا جاتا ہے تو ان پر لاٹھی چارج ہوتا ہے۔ ماؤں کے سر سے چادریں نوچی جاتی ہیں۔ بہنوں اور بیٹیوں کی آبرو لوٹی جاتی ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیا اندھی ہے۔ اندھے انصاف کو نہیں دیکھ رہی ہے۔

پاکستان ٹیلی ویژن کی نشریات انٹرنیٹ کے ذریعے ساری دنیا میں دیکھی جاتی ہیں۔ کشمیریوں پر ہونے والے مظالم پر لائیو LIVE مناظر پیش کئے جاتے ہیں۔ انہیں دنیا دیکھتی ہے۔ بھارتی حکام نے اپنے تمام کیبل آپریٹرز کو حکم دیا ہے کہ وہ پی ٹی وی کو نشریات بند کر دیں۔ یہ ان کے بس میں نہیں ہے۔ ورنہ وہ ساری دنیا کی نشریات بند کر دیتے۔

اس چھوٹے سے ٹاؤن میں یہی ہو رہا تھا۔ بھارتی فوجی کرفیو کے بہانے وہاں کے مسلمانوں کو اپنے گھروں میں بند رہنے پر مجبور کر رہے تھے اور جو کشمیری مسلمان ان کی بلیک لسٹ میں تھے۔ انہیں گرفتار کرنا چاہتے تھے لیکن عورتیں احتجاج کرنے لگیں۔ بوڑھے ٹین ڈبے بجا بجا کر اعلانِ جنگ کرنے لگے۔ جوان اپنے گھروں سے نکل آئے۔ کرفیو کی خلاف ورزی ہونے لگی۔ گولیاں چلنے لگیں۔ آگ لگائی جانے لگی۔ اس کا دھواں دور دور تک پھیل رہا تھا۔

شاداں اور کبریا دور ہی دور سے اس دھوئیں کو دیکھ رہے تھے۔ گھنے درختوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اس بستی کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ایک جگہ بڑے بڑے پتھروں کی آڑ میں چھپ گئے تھے۔ عورتوں اور بچوں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ فوج ان کی بغاوت کو دبانے اور کچلنے کی کوششیں کر رہی تھیں۔ افسران اور جاسوس اس ہنگامے میں یہ دیکھنا اور معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کوئی ان مناظر کی ویڈیو فلم اتار رہا ہے یا نہیں۔

ان کا خیال تھا جو مجاہدین کنٹرول لائن پار کر کے آتے ہیں۔ وہ طرح طرح کے نقصانات پہنچانے کے علاوہ وہاں کی ویڈیو فلمیں بھی بنا کر لے جاتے ہیں۔ وہ بڑے شہروں میں سی' این' این اور عالمی میڈیا کو روک نہیں پاتے۔ چھوٹے شہروں اور علاقوں میں مجاہدین کسی طرح چھپ چھپا کر ویڈیو فلمیں بنا لیتے ہیں۔

شاداں اور کبریا پتھروں کے پیچھے چھپے ہوئے سوچ رہے تھے کہ وہ کیا کر سکتے ہیں۔ وہ کی بستی میں جا کر کچھ کھانا پینا اور رات کی نیند پوری کرنا چاہتے تھے لیکن وہاں بستی والوں کو قیامت کی نیند سلایا جارہا تھا۔ کبریا کے پاس ایک ہی شاٹ گن تھی۔ وہ تنہا کچھ

نہیں کر سکتا تھا۔ بس اس انتظار میں تھا' کوئی موقع ملے گا تو کچھ کر گزرے گا۔

اس ٹاؤن میں تین مجاہدین چھپے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ "یہاں بھارتی فوجیوں کی تعداد پچیس تیس سے زیادہ نہیں ہے۔ یہاں صرف چار کشمیری جوانوں کے پاس اسلحہ ہے اور ہم تینوں مسلح ہیں۔ ان فوجیوں کو منتشر کر کے انہیں مختلف سمت لے جانا چاہئے۔ کچھ ادھر جائیں گے۔ کچھ ادھر آئیں گے۔ وہ تقسیم ہو جائیں گے۔ اس طرح ان سے نمٹا جا سکے گا۔"

انہوں نے یہی کیا۔ وہ تینوں مختلف سمت چلے گئے۔ ایک نے ایک پہاڑی ٹیلے پر چڑھ کر چیختے ہوئے اور ایک چھوٹے سے بیگ کو فضا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھو' اس بیگ میں تمہارے ظلم و ستم کی تصویریں ہیں۔ ویڈیو فلم ہے۔ اسے دیکھ کر دنیا تم پر تھوکے گی۔"

یہ کہہ کر اس نے ٹیلے سے نیچے چھلانگ لگائی پھر چیختے ہوئے ایک طرف بھاگنے لگا۔ "میں جا رہا ہوں' جس نے ماں کا دودھ پیا ہے وہی میرے پیچھے آئے گا۔"

ایک افسر تقریباً دس سپاہیوں کو لے کر ادھر دوڑ لگاتے ہوئے حکم دینے لگا۔ "تم ادھر جاؤ اور تم ادھر سے جاؤ۔ رینج پر آتے ہی اسے گولی مار دو۔"

بستی کے دوسری طرف دوسرے مجاہد نے بھی یہی کیا۔ اس نے بھی ایک چھوٹے سے بیگ کو فضا میں لہراتے ہوئے چیختے ہوئے کہا۔ "تم نہیں چاہتے کہ تمہارے ظلم و ستم کی تصویریں اتاری جائیں مگر تم دیکھو گے' ساری دنیا دیکھے گی۔ میں یہ ویڈیو فلم لے جا رہا ہوں۔"

وہ کہتا ہوا دوڑتا ہوا وہاں سے جا رہا تھا۔ اس کے پیچھے بھی دس بارہ سپاہی دوڑتے ہوئے چلے گئے۔ اس ویڈیو فلم کی بہت اہمیت تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ فلم کسی کے ہاتھ لگے۔ اس لئے وہ کشمیری مسلمانوں کو چھوڑ کر ان کے پیچھے دوڑ پڑے تھے۔

ان دونوں مجاہدین نے انہیں جھانسا دیا تھا۔ ان کے پاس کوئی ویڈیو فلم نہیں تھی۔ تیسرا مجاہد بھی ایک بیگ اٹھائے دوڑتا ہوا ادھر آ رہا تھا۔ جہاں پتھروں کے پیچھے شاداں اور کبریا چھپے ہوئے تھے۔

اس مجاہد کے ایک ہاتھ میں بیگ تھا اور دوسرے ہاتھ میں گن تھی۔ بھارتی فوجی

فائرنگ کرتے ہوئے اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ اس بیچارے کو پلٹ کر فائر کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ جب وہ رینج میں آنے لگے تو کبریا نے شاٹ گن سے نشانہ لے کر گولی چلائی۔ ایک سپاہی گرا۔ دوسری گولی چلی۔ دوسرا سپاہی گرا۔ وہ سب رک گئے۔ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے کہ فائرنگ کہاں سے ہو رہی ہے۔

اس مجاہد کو موقع مل گیا۔ اس نے ایک پتھر کی آڑ میں پہنچتے ہی فائرنگ کی۔ تیسرے سپاہی کو بھی گولی لگی۔ باقی تین سپاہی پیچھے ہٹنے لگے۔ فائرنگ رینج سے دور جانے لگے۔ اس طرح وہ فائرنگ سے محفوظ رہ سکتے تھے لیکن کبریا اور اس مجاہد کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔

مجاہد نے سر گھما کر بڑے بڑے پتھروں کی طرف دیکھا۔ کبریا نے پتھر کے پیچھے سے ہاتھ کا اشارہ کیا پھر اشاروں سے پوچھا۔ "کیا تمہارے پاس اسلحہ ہے؟"

مجاہد نے اشاروں سے سمجھایا۔ "نہیں ہے مگر ٹھہرو' انتظار کرو۔"

اس نے اس بیگ کو پتھر کے پیچھے چھوڑ دیا۔ زمین پر اوندھا لیٹ کر دونوں ہاتھوں سے کہنیوں اور گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا ادھر جانے لگا۔ جہاں ایک سپاہی کی لاش کے پاس مارٹر گن پڑی ہوئی تھی۔

وہ خطرے کو دعوت دے رہا تھا۔ جان پر کھیل کر اسلحہ لینے جا رہا تھا۔ کبریا یہ تماشا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ بھی گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل جھکتا ہوا پتھروں کے پیچھے سے نکل کر مجاہد کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ "فکر نہ کرو' میں تم پر گولی چلانے والوں کو کور COVER کروں گا۔"

ادھر سے ایک سپاہی نے جرأت کی۔ وہ بھی رینگتا ہوا آگے آیا۔ یہ نہیں چاہتا تھا کہ مجاہد کو وہ اسلحہ مل جائے۔ وہ ذرا آگے بڑھ کر گولی چلانا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کبریا نے گولی چلائی۔ دونوں ایک دوسرے سے دور تھے۔ کسی کو گولی نہیں لگ سکتی تھی۔ سپاہی زمین پر لڑھکتا ہوا دور تک آ گیا۔ اس کے دور جاتے ہی مجاہد چھلانگ لگا کر لاش کے پاس آیا۔ اس کے پاس پڑے ہوئے گولیوں کے بیگ کو اور گن کو اٹھایا پھر جھک کر دوڑتا ہوا واپس آنے لگا۔ ایسے وقت کبریا نے مسلسل فائرنگ کی۔ دوسری طرف سے بھی فائرنگ ہو رہی تھی لیکن وہ آگے نہیں بڑھ رہے تھے کیونکہ کبریا کی فائرنگ کی زد میں آ سکتے تھے۔

مجاہد کبریا کے پاس آ گیا۔ وہ دونوں دوڑتے ہوئے پہلے پتھر کے پاس آئے اس کے پیچھے پڑے ہوئے بیگ کو اٹھایا پھر وہاں سے دوڑتے ہوئے دوسرے پتھروں کے پیچھے شاداں کے پاس پہنچ گئے۔

شاداں گن چلا سکتی تھی لیکن نشانہ باز نہیں تھی پھر بھی اس نے ایک گن لے لی۔

وہ تین سپاہی زمین پر رینگتے ہوئے چھوٹے بڑے پتھروں کے پیچھے چھپتے ہوئے آ رہے تھے۔ کبریا' شاداں اور مجاہد کے ساتھ بڑے پتھروں اور گھنی جھاڑیوں کے پیچھے چھپتا ہوا ادھر سے جانے لگا۔ دوسری طرف راستہ تھا۔ وہ چھپتے ہوئے جا رہے تھے۔ تعاقب کرنے والوں کو پیچھے چھوڑتے جا رہے تھے۔

ان کے ایک طرف ایک چھوٹی پہاڑی کی بلندی تھی جو دور نہ جانے کہاں تک گئی تھی۔ دوسری طرف اونچی نیچی ڈھلان تھی۔ وہ بستی سے دور ہو گئے تھے۔ انہیں صرف دھواں نظر آ رہا تھا۔

وہ سمجھ رہے تھے کہ تعاقب میں آنے والے تین سپاہی بھٹک گئے ہیں یا بستی کی طرف چلے گئے ہیں لیکن وہ اس پہاڑی پر چڑھ کر آ رہے تھے۔ انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے لیکن اونچائی پر پہاڑی راستہ اتنا دشوار تھا کہ وہ وہاں اپنا توازن قائم رکھ کر گولی نہیں چلا سکتے تھے۔ صحیح نشانہ نہیں لگا سکتے تھے پھر یہ کہ ان کے چھپنے کے لئے وہاں کوئی جگہ نہیں تھی۔

وہ تینوں اونچائی پر آگے کھلی جگہ کی طرف جانے لگے۔ وہاں چھپ کر فائر کرنے کی جگہ تھی ایسے وقت ایک چھوٹا سا پتھر ایک سپاہی کی ٹھوکر سے لڑھک گیا اور نیچے کی طرف آواز پیدا کرتے ہوئے جانے لگا۔ نیچے سے ان تینوں نے چونک کر اوپر کی طرف دیکھا۔ وہ اوپر تھے' سر پر تھے۔ محاورے کے مطابق سر پر آ پہنچے تھے۔

ان تینوں نے بیک وقت اوپر سے فائرنگ کی۔ نیچے سے بھی جوابی فائرنگ ہوئی۔ ادھر ایک سپاہی کو گولی لگی۔ وہ بلندی سے چیختا ہوا گرا۔ ادھر مجاہد کے حلق سے کراہ نکلی۔ نیچے سے آنے والی گولی اس کے سر پر لگی تھی۔ وہ زمین پر گر پڑا تھا۔

کبریا لپک کر اس کے پاس آیا۔ دوسرے سپاہی کو بھی گولی لگی تھی۔ شاداں تیسرے پر فائرنگ کر رہی تھی۔ کبریا اس مجاہد کے پاس آ کر جھک گیا۔ اسے سہارا دے کر اٹھانا چاہتا

تھا۔ اس نے اپنے بیگ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "ویڈیو.......... ویڈیو فلم ہے۔ اسے لے جاؤ۔"

اس کے گلے میں ایک لاکٹ والی چین تھی۔ وہ اپنے ایک لرزتے ہوئے ہاتھ سے لاکٹ کو کھولنا چاہتا تھا۔ کبریا نے اس کے ہاتھ سے لاکٹ کو لے کر کھولا۔ اندر ایک بوڑھی خاتون کی تصویر تھی۔ اس نے اسے مجاہد کے ہاتھ میں دیا۔ اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے تصویر کو دیکھا پھر اٹک اٹک کر آواز دی۔ "ام.......... ما.......... ماں.........."

اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ "اماں! جسے تُو نے پیدا کیا وہ ابھی تجھے پکار رہا تھا۔ تُو نے کس دل سے سینے پر پتھر رکھ کر بیٹے کو جہاد کے لئے بھیجا تھا۔ کشمیر کو جنت ارضی کہا جاتا ہے۔ تُو نے جنتی بیٹے کو جنت کو جیت لانے کے لئے بھیجا تھا۔ وہ جیت چکا ہے۔ اب جنت میں ہی رہے گا.........."

شاداں دوسری گن اٹھا کر اس تیسرے اور آخری سپاہی پر فائرنگ کر رہی تھی۔ اتنی دیر سے اس کی ایک گولی بھی سپاہی کو نہیں لگی تھی لیکن اناڑی پن کے باوجود وہ اسے بُری طرح دہشت زدہ کر چکی تھی۔ وہ پہاڑی پگڈنڈی پر کھڑا ہوا تھا۔ اسے دائیں بائیں جانے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ جب اس نے ایک طرف جانے کی کوشش کی تو خوف اور بدحواسی سے لڑکھڑا گیا۔ وہاں سے چیختا ہوا نیچے کی طرف لڑھکتا ہوا شاداں سے کچھ دور آ کر زمین پر گر پڑا۔ گرتے ہی دم نکل گیا۔

کبریا نے مجاہد کے بیگ کو کھول کر دیکھا۔ اندر ایک جوڑا لباس تھا۔ ایک ٹارچ لائٹ اور درجنوں گولیاں۔ ایک ویڈیو کیسٹ بھی تھی۔ کیمرہ کسی دوسرے مجاہد کے پاس ہو گا۔ اس کے پاس صرف وہ کیسٹ تھا اور اس نے آخری سانسوں میں کبریا سے کہا تھا کہ وہ ویڈیو کیسٹ لے جائے۔

وہ مجاہدین کی محنتوں کا ثمر تھا۔ ان کی امانت تھی۔ اس ویڈیو کیسٹ کو مجاہدین کی کسی تنظیم تک پہنچانا لازمی تھا اور کبریا کا فرض بھی تھا۔ اس نے کیسٹ کو اپنے بیگ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "بستی کی طرف سے فائرنگ کی آواز نہیں آ رہی ہے۔ پتا نہیں وہاں کے کیا حالات ہیں۔ ہمیں یہاں سے جلد نکل جانا چاہئے۔"

وہ ایک چادر نکال کر اس مجاہد کو سر سے پاؤں تک ڈھانپنے لگا۔ شاداں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بولی۔ "کیا ہم اسے یہیں چھوڑ دیں گے؟"

کبریا کا سر جھک گیا۔ وہ بڑے دکھ سے بولا۔ "ہم اٹھا کر نہیں لے جا سکتے۔ تم اٹھا نہیں سکتیں اور میں اکیلا ہوں۔ آگے کہیں کشمیری مسلمانوں سے ملاقات ہو گی تو ہم اس مجاہد کا ذکر کریں گے۔ ہو سکتا ہے وہ اس کی میت اٹھا کر لے جائیں۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کھڑا ہو کر ذرا سا ڈگمگا گیا۔ ایک ہاتھ سے سر تھام کر دوسرا ہاتھ آگے بڑھا کر یوں راستہ ٹٹولنے لگا جیسے اندھا ہو گیا ہو۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ شاداں کی آواز جیسے بہت دور سے سنائی دی۔ "کیا ہوا.......... کبریا تمہیں کیا ہو رہا ہے؟"

وہ ایک پتھر کے پاس پہنچ کر گرنے لگا۔ اب اسے شاداں کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کیا ایسے ہی موت آتی ہے؟ آنکھوں کی روشنی بجھتی ہے۔ اس دنیا کی کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ دماغ چپ ہو جاتا ہے مگر چپ نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی ریگ مال سے اسے رگڑ رہا ہو۔ وہ شدید تکلیف کے باعث تڑپ رہا تھا۔ کسی گہری تاریک دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔ اس کی شاداں نے بڑی محبت اور بڑے جذبے سے کہا تھا کہ اس پر درد پڑے گا' اس کے سر پر عذاب اترے گا تو وہ اس کے سر کو اپنے سینے میں چھپا لے گی۔ اسے دل کی دھڑکنیں سنائے گی۔ جیسے ماں لوریاں سناتی ہے۔

اور شاداں ایسا کر رہی تھی۔ اسے دونوں بانہوں میں سمیٹ رہی تھی۔ اس کے سر کو اپنے سینے میں چھپا کر سہلا رہی تھی۔ اپنے دل کی دھڑکنوں سے اس کا علاج کرنا چاہتی تھی۔ پاگل تھی' دیوانی تھی۔ محبت میں جان دے دو تب بھی اپنی جان کی جان نہیں بچائی جا سکتی۔

کیا ڈاکٹر کی رپورٹ درست ثابت ہو رہی تھی؟

نہیں.......... ابھی نہیں.......... اے اجل! ذرا دم لے..........

☆======☆======☆

جوان بیٹیاں گھر سے بھاگتے وقت کبھی یہ نہیں سوچتیں کہ ان کے پیچھے بوڑھے ماں باپ کیسی ذلتیں اٹھائیں گے۔ لوگ ان بوڑھوں کو پتھر نہیں ماریں گے مگر طعنے مار مار کر

انہیں شرم سے مرجانے پر مجبور کر دیں گے۔

شاداں کے ماں باپ کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ اپنے پرائے سب ہی چھپی چھپی تھو تھو کر رہے تھے۔ جو اپنے ہوتے ہیں' وہ بھی کچھ کہنے اور کیچڑ اچھالنے کا موقع پا لیتے ہیں۔ اپنا بیٹا مولا داد غصے سے گرج رہا تھا۔ ماں باپ سے کہہ رہا تھا۔ "ایسی بیٹی پیدا کرتے ہوئے شرم نہیں آئی؟ جب اسے پیدا کرنا تھا تو مجھے اس بے غیرت کا بھائی بنا کر کیوں پیدا کیا؟"

باپ نے کہا۔ "کیا بکواس کر رہا ہے۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیسی اولاد پیدا کر رہا ہے۔ اولاد نوجوان ہو کر گل کھلاتی ہے۔ اپنے رنگ ڈھنگ دکھاتی ہے۔"

اس کی ماں نے کہا۔ "محلے پڑوس والوں کو کہنے کا موقع مل گیا ہے۔ ہماری بیٹی بے حیائی کا ثبوت چھوڑ گئی ہے۔ ورنہ تھوڑی بہت بے حیائی ہر گھر میں ہوتی ہے۔ دوسرے ظاہر نہیں ہوتے۔ اس لئے ننگے نہیں کہلاتے۔ بیٹی ہمیں ننگا کر گئی ہے۔"

باپ نے کہا۔ "کیا تالی ایک ہاتھ سے بجتی ہے۔ دوسرا ہاتھ کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔ بدنام کرنے والے یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ بھاگی نہیں ہے' کوئی اسے بھگا کر لے گیا ہے۔ پہلے بھی دو لڑکیاں اس بستی سے غائب ہو گئی تھیں۔ سب نے یہی کہا تھا کہ وہ لڑکیاں بے حیا تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکی کی لاش ملی تو سب کو چپ لگ گئی۔ سب کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ جب میری بیٹی کی لاش ملے گی تو.........."

وہ آگے نہ بول سکا۔ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگا۔ غصے سے گرجنے والے بیٹے نے دیکھا' ماں بھی رونے لگی تھی۔ اس نے کہا۔ "خدا تیری زبان مبارک کرے۔ وہ مر جائے گی۔ ظالموں کا نشانہ بن جائے گی اس کی عزت کی دھجیاں اڑ جائیں گی تو ہم فخر سے کہہ سکیں گے کہ تیری بیٹی' میری بہن بے حیا نہیں تھی۔ اس سے بے حیائی کی گئی ہے۔"

بوڑھے نے روتے ہوئے کہا۔ "ہاں یوں آبرو لوٹنے کا صدمہ ہوتا ہے۔ شرم آتی ہے مگر جوان بیٹی پر بے حیائی کا الزام تو نہیں آتا۔ جیسا اب آ رہا ہے۔"

مولا داد بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ کہنے لگا۔ "بڑی دیر سے میں یہی سوچ رہا ہوں کہ شاداں ایسی نہیں تھی تو ایسا ہوا کیوں' کس نے ایسا کیا ہے؟"

باپ نے کہا۔ "ہماری بستی میں ایک ہی بے غیرت آتا ہے اور وہ ہے جبار جان۔"

مولا داد نے کہا۔ "اس کا نام سن کر میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ وہ فوجیوں کا مخبر نہیں دلال بھی ہے۔ وہ ادھر آئے گا تو میں اسے دبوچ لوں گا۔ اس سے اگلوا کر رہوں کہ میری بہن کو کہاں لے گیا ہے اور اس سے پہلے دو لڑکیوں کو کہاں لے گیا تھا۔ وہ نہیں بولے گا تو میں اسے مار ڈالوں گا۔"

ماں نے کہا۔ "اسے مارنے کے بعد کیا تو بچے گا۔ فوجی درندے تیرا قیمہ بنا د گے۔"

"میں جانتا ہوں۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے مگر یہ بدنام کرنے والے مان جائی گے کہ ہم بے غیرت نہیں ہیں۔ جو ہماری غیرت پر ہاتھ ڈالتا ہے ہم اسے مار کر مرجا ہیں۔"

"تو بھی جا.......... مرجا.......... شاداں گئی تو تو بھی چلا جا۔ ہم بوڑھوں کو بھوک اور بیماری سے مرنے کے لئے چھوڑ دے۔ ہم نے اسی دن کے لئے تجھے پیدا کیا تھا۔"

باپ نے کہا۔ "بیٹی کا نقصان ہو گیا۔ اب بیٹے کا نقصان برداشت نہیں ہو گا۔ ہوش میں رہنا' کوئی ایسا قدم نہ اٹھانا' ہم صدمے سے مرجائیں گے۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔ پڑوسن کی آواز سنائی دی۔ "شاداں کی ماں' فوجی آر ہیں۔ بیٹے کو کہیں بھیج دے۔ میں نے تو اپنے بیٹے کو بھگا دیا ہے۔"

جب کبھی فوج کے آنے کی اطلاع ملتی تھی تو نوجوان بیٹے اور بھائی گھر چھوڑ کر کہیں چلے جاتے تھے۔ یہ اندیشہ رہتا تھا کہ فوجیوں کی بلیک لسٹ میں ان کا نام ہو سکتا ہے۔ انہیں پکڑ کر لے جائیں گے انہیں اذیتیں دیں گے پھر کہیں مرنے کے لئے چھوڑ کر چ جائیں گے۔

مولا داد کلہاڑی اٹھا کر جانے لگا۔ ماں نے راستہ روک کر پوچھا۔ "کلہاڑی کیوں جا رہا ہے؟"

"ہمیں ہتھیار رکھنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ کیا وہ ماریں گے تو میں چپ چاپ م جاؤں گا؟"

"تجھے ان کا سامنا نہیں کرنا ہے۔ کہیں جا کر شام تک چھپنا ہے۔"

مولا داد نے کلہاڑی کو دیکھا۔ اس کی دھار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ماں سے کہا۔ "گھر

میں لکڑیاں نہیں ہیں کیا کھانا نہیں پکائے گی؟ رات کو انگیٹھی نہیں جلائے گی؟ میں لکڑیاں کاٹ کر لاؤں گا۔"

وہ ماں کو ایک طرف ہٹاتا ہوا' دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ باہر خاموشی اور ویرانی تھی۔ مکانوں کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ دکانیں آدھی کھلی' آدھی بند تھیں۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا ایک طرف جانے لگا۔ دور ایک نہر کے پاس فوجی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ مسلح سپاہی گاڑی سے اتر کر بستی کی طرف آ رہے تھے۔ بستی کے مکانات پہاڑی کے نشیب و فراز میں ایک دوسرے سے فاصلے پر بنے ہوئے تھے۔

وہ سپاہی تعداد میں بارہ تھے۔ چار چار کی ٹولی میں بٹ کر بستی کے مختلف حصوں میں آ گئے۔ جبار جان تین سپاہیوں کے ساتھ شاداں کے محلے میں آیا۔ پہلے اسی کے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ ماں نے دروازہ کھولا تو جبار جان نے بڑے ادب سے جھک کر کہا۔ "سلام ماں جی!"

وہ اسے ناگواری سے دیکھ کر بولی۔ "مسلمان السلام علیکم کہتے ہیں۔ تو تو سلام کرنا بھی بھول گیا ہے۔ خالی نام کا مسلمان ہے۔ یہاں کیا لینے آیا ہے؟"

"میرے پیچھے سپاہیوں کو دیکھ رہی ہے۔ میں سرکاری کام سے آیا ہوں۔ ایک آتنک وادی کی تلاش ہے۔ ہمیں گھر کی تلاشی لینا ہے۔"

وہ ایک طرف ہٹ گئی۔ وہ سپاہیوں کے ساتھ اندر آ گیا۔ وہ تین کمروں کا مکان آدھا پتھروں سے اور آدھا لکڑیوں سے بنا ہوا تھا۔ وہ ایک ایک کمرے میں جا کر دیکھنے لگا۔ دراصل شاداں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے بارے میں کچھ سننا چاہتا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "تیرے بچے کہاں ہیں؟"

"وہ بچے نہیں ہیں۔ میرا جوان بیٹا مزدوری کے لئے شہر گیا ہے۔"

"اور جوان بیٹی؟" اس نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر پوچھا۔

وہ جل کر بولی۔ "یہ تجھے معلوم ہو گا' اگر تو مسلمان ہے۔ تیرے اندر ذرا سا بھی ایمان رہ گیا ہے تو کلمہ پڑھ کر بتا دے میری بیٹی کہاں ہے؟"

"کیوں الٹی بات کرتی ہے۔ اپنی بیٹی کی بابت مجھ سے پوچھتی ہے۔ کیا وہ گھر سے بھاگ گئی ہے؟"

"یہ ہماری بیٹیوں اور بہنوں پر الزام ہے کہ وہ گھر سے بھاگ جاتی ہیں۔ انہیں
اٹھا کر لے جاتے ہیں یا ان کا جھوٹا کھانے والے دلال انہیں بہلا پھسلا کر لے جاتے ہیں"
"میں تجھ سے جھگڑا نہیں کروں گا۔ تُو میری ماں کے برابر ہے۔ کلمہ پڑھ کر کہتا
ہوں۔ لا الہ اللہ .... ہمارا تمہارا محمد رسول اللہ۔"
"چپ کافر کی اولاد' کیوں مسلمان کہلاتا ہے۔ تجھے تو ایک کلمہ بھی یاد نہیں ہے"
"ماں جی کلمے سے کیا ہوتا ہے۔ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ تیری بیٹی کو
فوجی نے کوئی ظلم نہیں کیا ہے اگر وہ کسی ریسٹ ہاؤس میں یا کسی کاٹیج میں' کسی افسر کے
پاس ہوتی تو مجھے معلوم ہو جاتا' میں اپنی مری ہوئی ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ ایک
وادی اسے بھگا کر لے گیا ہے۔"
"کتنے افسوس کی بات ہے۔ ان فوجیوں کی طرح تُو بھی مجاہدوں کو آتنک وادی کہتا
ہے۔ کیا تُو نے میری بیٹی کو کسی مجاہد کے ساتھ دیکھا ہے؟"
"میں نے نہیں دیکھا ہے۔ ایک جاسوس نے رپورٹ دی ہے۔ جس آتنک وادی کو
ہم تلاش کر رہے ہیں اسے جوان لڑکی کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ وہ گرفتار ہو گا یا مارا جائے گا
تو تیری بیٹی تجھے مل جائے گی۔"
"اللہ نہ کرے' وہ مجاہد مارا جائے۔ اگر میری بیٹی کسی مجاہد کے ساتھ گئی ہے تو
عزت سے گئی ہے ایک ماں کی دعا ہے کہ مجاہد پر کوئی آنچ نہ آئے۔"
وہ سپاہیوں کے ساتھ باہر جانے لگا۔ دروازے پر شاداں کا باپ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے
جبار جان سے پوچھا۔ "کیا تُو جانتا ہے موت کیسے آتی ہے؟ اور کب آتی ہے؟"
اس نے بوڑھے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ایسا لگا بوڑھے کے اندر سے گرو دیال
سنگھ بول رہا ہے۔ "یہ کوئی نہیں جانتا۔ کیسے آتی ہے؟ اور کب' اچانک آ جاتی ہے مگر
مرنا ہے۔ بھگوان کرے تجھے شانتی سے موت آئے۔ ہری اوم .... ہری اوم۔"
بوڑھے نے کہا۔ "میں تیرے بھلے کے لئے پوچھ رہا ہوں۔ تُو نہیں جانتا۔ موت
کیسے اچانک آ جاتی ہے اور تیرے بھلے کے لئے تجھے سمجھاتا ہوں۔ کم از کم مرتے وقت
کلمہ پڑھنا چاہئے اور تجھے ایک کلمہ بھی یاد نہیں ہے۔ میں تجھے پڑھاتا ہوں۔ پڑھ
.... یاد کر لے۔"

وہ "اونہہ" کہتا ہوا اس سے منہ پھیر کر سپاہیوں کے ساتھ جانے لگا۔ اسے اپنے
پیچھے بوڑھے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ اونچی آواز میں کلمہ پڑھ کر سنا رہا تھا۔ وہ کلمے
سے دور نکل آیا۔ دل عجیب طرح گھبرانے لگا تھا۔ اس کی سمجھ نہیں آتا تھا' کبھی کبھی اسے
کیا ہو جاتا ہے۔ کبھی وہ پورے یقین کے ساتھ موت کو بھول جاتا تھا جیسے سب بھول
جاتے ہیں۔ کبھی موت یاد آتی تو دل کہتا تھا۔ وہ نہیں مرے گا۔ ابھی پتا نہیں کتنے دنوں
تک کتنے برسوں تک جئے گا۔ اکثر لوگ ایسا ہی سوچتے ہیں۔
جیوتشی گرو دیال سنگھ کی پیش گوئی اسے تذبذب میں رکھتی تھی۔ اس کی پیش گوئیاں
اکثر درست ہوا کرتی تھیں۔ ضروری نہیں تھا کہ یہ پیش گوئی بھی درست ہوتی لیکن
نامعلوم سی بے چینی اور گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔
اس نے سپاہیوں سے کہا۔ "گھروں کی تلاشی لو۔ میں گاڑی کی طرف جا رہا ہوں۔
تھوڑی دیر لیٹ کر آرام کروں گا۔"
وہ نہر کی طرف جانے لگا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ پچھلی رات وہ کس طرح مرتے مرتے
بچا تھا۔ شاداں کی مدد کرنے والے مجاہد نے اس پر گولیاں چلائی تھیں۔ خوش قسمتی سے
ایک بھی گولی نہیں لگی تھی۔ گرو دیال سنگھ یہ معلوم نہیں کر سکتے تھے کہ اسے موت کیسے
آئے گی لیکن ان کی باتوں سے یہ امید بندھی تھی کہ وہ کسی کے ہاتھوں مارا نہیں جائے
گا۔ طبعی موت مرے گا۔ مخبری کرنے اور ایک مجاہد کو تلاش کرنے کی مہم جوئی میں اسے
جانی نقصان نہیں پہنچے گا۔
وہ ایک ڈھلان سے اتر کر گاڑی کے پاس آ گیا۔ پیچھے والی سیٹ پر اپنی رائفل رکھ کر
نہر کے کنارے آیا پھر وہاں بیٹھ کر منہ دھونے اور منہ میں پانی بھر کر کلیاں کرنے لگا۔ ایسے
وقت اس نے آہٹ سن کر سر گھماتے ہوئے دیکھا۔ مولا داد ایک ہاتھ میں کلہاڑی اٹھائے
اس کی طرف دوڑتا آ رہا تھا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔
وہ گاڑی کی طرف سے دوڑتا آ رہا تھا۔ یہ ادھر رائفل لینے نہیں جا سکتا تھا۔ ایک
طرف بھاگتے ہوئے بولا۔ "اے کیا پاگل ہوا ہے۔ مجھے مارنے آ رہا ہے تُو جانتا ہے میں
کون ہوں؟"
مولا داد نے کہا۔ "جانتا ہوں' سبھی جانتے ہیں تُو فوجیوں کا دلال ہے۔ زندہ رہنا چاہتا

ہے تو سچ بتا دے' شاداں کہاں ہے؟"

"ارے یہی بتانے تیرے گھر گیا تھا۔ ابھی جا کے اپنی ماں سے' اپنے باپ سے
لے۔ جس آتنگ وادی کو ہم تلاش کر رہے ہیں وہ تیری بہن کو لے گیا ہے۔"

"تُو جھوٹ بولتا ہے۔ باتیں بنا کر دھوکا دیتا ہے۔ میں دھوکا نہیں کھاؤں گا۔"

"میں سچ بول رہا ہوں۔ ہمارے جاسوس نے اپنی آنکھوں سے تیری بہن کو اس
ساتھ دیکھا ہے۔ شاداں اس کے ساتھ دوسری پہاڑی پر تھی۔ وہاں پہنچنے تک وہ
کسی دوسری طرف نکل گئے تھے۔"

"تُو نے ان دو لڑکیوں کے بارے میں بھی بستی والوں سے یہی کہا تھا کہ وہ کس
ساتھ بھاگ گئی ہیں لیکن ایک لڑکی کی لاش دیکھ کر تیرا جھوٹ کھل گیا تھا۔ تیرے
ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ تجھے مرجانا چاہئے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ ایک بڑھک لگا کر فضا میں کلہاڑی لہراتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ جبار جان ا
بڑے سے درخت کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ فوراً ہی چھلانگ لگا کر ایک طرف ہٹ
کلہاڑی کا پھل درخت کے تنے میں پیوست ہو گیا۔ اگر ایک ساعت کی بھی دیر ہوتی
پھل اس کے جسم میں پیوست ہو جاتا۔ وہ ایک دم سے بوکھلا گیا۔ موت کیسے آتی ہے
کب' اچانک آ جاتی ہے؟

اس پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ مرتے مرتے بھی اپنی زندگی کے لئے لڑنا ضروری
ہے۔ کلہاڑی کا پھل درخت کے تنے میں ذرا گہرائی تک پیوست ہو گیا تھا۔ اسے نک
میں ذرا دیر لگی۔ جبار جان چھلانگ لگا کر اس سے لپٹ گیا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔
دوسرے کو مارنے لگے۔ ایک دوسرے سے مار کھانے لگے۔

مولا داد تگڑا جوان تھا۔ محنت و مشقت کرنے والا مزدور تھا۔ اس پر بھاری پڑ رہا
ایک بار اس نے جبار جان کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ سخت زمین پر گرنے کے باعث کر
ریڑھ کی ہڈی میں ایسی چوٹیں لگیں کہ وہ فوراً ہی اٹھنے کے قابل نہ رہا۔ مولا داد
سے پلٹ کر دوڑتا ہوا درخت کے پاس آیا۔ کلہاڑی کے پھل کو اس کے تنے سے نکا
لگا۔ ایک زوردار جھٹکے سے کلہاڑی نکل کر ہاتھوں میں آ گئی۔

جبار جان تکلیف سے کراہتا ہوا آہستہ آہستہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ذرا اٹھ

بیٹھ گیا تھا پھر زوردار بڑھک سن کر چونک گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں کلہاڑی لئے سر پر آن
پہنچا تھا۔ وہ بیٹھا ہوا تھا۔ اٹھنے کے قابل نہیں تھا۔ ایک چیخ مار کر پھر لیٹ گیا۔

کلہاڑی کا تیز دھار پھل سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ ان لمحات میں ہی خوش
فہمی ختم ہو گئی کہ وہ طبعی موت مرے گا۔ کسی کے ہاتھوں نہیں مرے گا۔ آدمی جیسا
سوچے' موت ویسے نہیں آتی پھر کیسے آتی ہے؟

ایسے آتی ہے جیسے آ رہی تھی۔ مسلسل زندہ رہنے کی خوش فہمی ختم ہو رہی تھی۔
وہ چیخنے لگا۔ "رک جاؤ' مجھے نہ مارو۔ میں سچ بول رہا ہوں۔ میری بات سن لو۔"

آدمی موت سے کسی طرح بچنے کے لئے اور جھوٹ بولتا ہے۔ وہ کسی طرح بچ نکلنا
چاہتا تھا۔ تقدیر بچائے گی تو بچے گا۔ ورنہ موت تو کبھی نہیں چھوڑتی۔

کلہاڑی سر سے اونچی ہو گئی تھی اور اب نیچے آ کر اس کے جسم میں پیوست ہونے
والی تھی۔ ایسے ہی وقت گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ مولا داد کے ہاتھوں میں کلہاڑی اٹھی
کی اٹھی رہ گئی۔ وہ چند ساعت کے لئے اسی طرح ساکت رہا پھر کلہاڑی اس کے دونوں
ہاتھوں سے چھوٹ کر گر پڑی۔ دوسری گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ مولا داد کے حلق سے
آخری کراہ نکلی پھر وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ موت کیسے آتی ہے؟

ایسے آتی ہے۔ بڑی ہرجائی ہوتی ہے۔ پہلے یار کو چھوڑ کر دوسرے یار سے لپٹ جاتی
ہے۔ بڑی ناانصافی کرتی ہے۔ ظالم کو مارنا ہوتا ہے مگر غیرت مند بھائی کو مار دیتی ہے۔ کوئی
موت کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟

جبار جان زمین پر چاروں شانے چت پڑا دیدے پھیلائے آسمان کو تک رہا تھا۔ گہری
گہری سانسیں لے رہا تھا۔ یوں سانسوں کی آمدورفت سے خود کو یقین دلا رہا تھا کہ ابھی
زندہ ہے۔ موت آتے آتے پلٹ گئی ہے۔ یہ ابھی نہیں آئے گی پھر کبھی آئے گی۔

ایک افسر دوڑتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ مولا داد کی لاش کو دیکھ کر جبار جان سے
بولا۔ "ابے او کتے' تجھے رائفل دی تھی اور تُو کلہاڑی سے مرنے جا رہا تھا۔"

وہ ہنسنے لگا پھر پھیپھڑوں کی پوری قوت سے زور لگا کر ہنسنے لگا۔ افسر نے ناگواری سے
کہا۔ "یہ پہلا آدمی ہے جسے کتا کہو تو ہنسنے لگتا ہے۔"

وہ ہنستا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا پھر بولا۔ "جتنی گالیاں دینا چاہو دیتے رہو۔ میں تو اس بات

پر ہنس رہا ہوں اور خوش ہو رہا ہوں کہ کبھی کسی کے ہاتھوں مارا نہیں جاؤں گا۔ میں کل بھی بچ گیا تھا اور آج بھی بچ گیا۔ بس یقین ہو گیا۔ قدرت مارے گی تو مروں گا' کوئی مائی کا لال مجھے مار نہیں سکے گا۔"

وہ ہنس رہا تھا' اس ویرانے میں اس کی ہنسی دور دور تک گونج رہی تھی۔

☆======☆======☆

کبریا نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ کسی چھوٹے سے لکڑی کے مکان میں تھا۔ ایک بستر پر پڑا ہوا تھا۔ کمبل کے اندر شاداں اس سے لپٹے ہوئے سو رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا پتا نہیں ہم کتنی دیر سے سو رہے ہیں۔ یہ معلوم کرنا چاہئے کہ یہ جگہ محفوظ ہے یا نہیں؟

اسے یاد آ رہا تھا کہ اسے کس طرح دورہ پڑا تھا۔ وہ عارضی طور پر بصارت سے اور سماعت سے محروم ہو گیا تھا۔ دماغی تکلیف سے دوچار ہوا تھا پھر اسے ہوش نہیں رہا تھا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس کا سر شاداں کے سینے پر تھا۔ وہ اسی پہاڑی کے دامن میں اسے دونوں ہاتھوں سے سمیٹے اپنے سینے سے لگائے بیٹھی تھی۔ وہ اکیلی کیا کر سکتی تھی۔ ایک مجاہد تھا' وہ شہید ہو چکا تھا۔ باقی تین دشمنوں کی لاشیں اِدھر اُدھر پڑی ہوئی تھیں۔ ایسی نازک حالت میں کوئی اس کا ساتھ دینے والا اور اس کے بیمار کو ہسپتال پہنچانے والا نہیں تھا۔

وہ خود ہی ہوش میں آ گیا۔ شاداں نے خوش ہو کر کہا۔ "خدا کا شکر ہے' تم ہوش میں آ گئے۔ میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ ایسے وقت تمہارے کسی کام نہ آ سکی۔"

وہ بولا۔ "یہاں ساری دنیا ہوتی تو وہ بھی میرے کام نہ آتی۔ بیماری سے ڈاکٹر بچاتا ہے۔ جو اپنے ہوتے ہیں۔ وہ بیمار کو سینے سے لگا کر رکھتے ہیں اور تم نے بڑی محبت سے فرض ادا کیا ہے۔"

اس نے اپنا بیگ کھول کر دوائیں نکالتے ہوئے کہا۔ "ایک گولی اور ایک کیپسول کھانا ضروری ہے مگر پانی نہیں ہے۔ پتا نہیں یہ کیپسول پانی کے بغیر حلق سے اترے گا نہیں؟"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ چاروں طرف گھوم کر دیکھنے لگی۔ دور تک ہریالی تھی۔ ہا

تھے۔ کسی پہاڑ سے اپنی کا چشمہ نہیں پھوٹ رہا تھا۔ دور تک کوئی دریا یا نہر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ پریشان ہو کر بیٹھ گئی۔ کبریا نے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ میں پانی کے بغیر انہیں نگلنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

اس نے ہونٹوں کو بند کیا۔ منہ کے اندر تھوڑا سا لعاب دہن جمع کیا پھر ایک گولی منہ میں ڈالی۔ اسے نگلنے لگا۔ نگلتے وقت ٹھسکا سا لگا مگر گولی حلق سے اتر گئی۔ وہ کھانسنے لگا۔ جب کھانسی رک گئی تو اس نے گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے کیپسول کو دیکھا۔ شاداں نے کہا۔ "کیپسول بڑا ہے' حلق میں پھنس جائے گا۔"

"ہاں پھنسے گا مگر کسی طرح نگلنا ہو گا۔ کوشش کرتا ہوں۔"

وہ ہونٹ بند کر کے پھر لعاب دہن جمع کرنے لگا۔ وہ بولی۔ "ذرا سا لعاب ہوتا ہے۔ گولی نہ نگل سکے۔ اسے کیسے نگلو گے؟"

وہ منہ کھول کر کیپسول نگلنا چاہتا تھا۔ شاداں نے ہاتھ پکڑ لیا۔ گھٹنوں کے بل اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔ اس کے چہرے پر جھک گئی۔ اس کے دونوں ہونٹ بند تھے پھر اس نے کیپسول لے کر اس کے منہ میں ڈالا پھر اپنے منہ سے اس کا منہ بند کر دیا۔ ایک گلاس دوسرے گلاس پر اوندھا ہو گیا۔ اس گلاس کی تری اس گلاس میں اترنے لگی۔ کیپسول حلق سے اتر گیا۔

ایک مشکل بڑے پیار سے آسان ہو گئی۔ کوئی آنکھوں سے دل میں سماتا ہے۔ وہ حلق سے دل میں اترنے لگی۔ کبریا نے کہا۔ "آج تک کسی نرس نے کسی مریض کو اتنے پیار سے دوا نہیں کھلائی ہو گی۔"

وہ شرمانے اور مسکرانے لگی۔ اس کا بیگ اٹھا کر بولی۔ "کیا چلنے کے قابل ہو؟"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ جب دورہ پڑتا ہے تب تکلیف ہوتی ہے' تم میری حالت دیکھ چکی ہو مگر آرام آنے کے بعد پہلے جیسی توانائی بحال ہو جاتی ہے۔"

وہ دونوں چلتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ایک چھوٹی سی مسجد دکھائی دی۔ مسجد کے آس پاس ساٹھ ستر مکانات تھے۔ نمازی عصر کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکل رہے تھے۔ انہیں دور سے آتے دیکھ کر رک گئے۔ کبریا نے ان کی طرف آتے

ہوئے سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دیا۔ ایک نے پوچھا۔ "مسافر ہو' کہاں سے آ رہے ہو؟"

کبریا نے کہا۔ "منگور سے۔"

"کہاں جاؤ گے؟"

"ہم سوپور جا رہے ہیں۔"

"سوپور............!" ایک نے پوچھا۔ "سوپور تو پیچھے رہ گیا ہے۔ تم شمالی علاقے کی طرف چلے آئے ہو۔"

دوسرے نے کہا۔ "تمہیں جنوب کی طرف واپس جانا ہو گا۔ تھوڑی دیر میں شام کا اندھیرا پھیلنے والا ہے۔ اپنی گھر والی کے ساتھ کہاں بھٹکتے پھرو گے؟ میرے ساتھ چلو۔"

وہ اس کے پیچھے جانے لگے۔ پیش امام نے اس شخص سے کہا۔ "دین محمد مہمانوں سے صبح تعارف حاصل کر لینا۔ ہم انتظار کریں گے۔"

دین محمد انہیں اپنے گھر لے آیا۔ ایک بڑا سا مکان تھا۔ اس کے بیوی بچے تھے۔ بیوی شاداں کو اپنے ساتھ ایک کمرے میں لے گئی۔ دین محمد نے بیٹھک میں آ کر کہا۔

"یہاں آرام سے بیٹھو۔ بھوکے پیاسے ہو گے۔ سفر کی تھکن بھی ہو گی۔ فکر نہ کرو۔ یہاں کھانا پانی اور بستر سبھی ملے گا مگر پہلے ضروری بات بتا دو۔ ہم سے کچھ نہ چھپاؤ۔ یہاں دوسرے مذہب اور قوم کے لوگ بھی ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کبھی کوئی مجاہد بھٹک کر ادھر آ جاتا ہے تو ہم اسے پناہ دیتے ہیں۔ تمہارے ساتھ ایک عورت ہے۔ تم مجاہد نہیں ہو سکتے۔ تم کون ہو؟ ہم سے کچھ نہ چھپانا۔"

"میں مجاہد ہوں۔ منگور کے قریب میں نے شاداں کو دیکھا۔ ایک بدمعاش اسے تنگ کر رہا تھا۔ اسے جبراً ایک ریسٹ ہاؤس میں بھارتی افسر کے پاس لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے فائرنگ کی تو وہ بھاگ گیا۔ میں اسے منگور تک چھوڑنے نہیں جا سکتا تھا اور وہ خود جانا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے فوجی جگہ جگہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ میں راستہ بھٹک کر یہاں آ گیا ہوں۔"

"ہوں۔" دین محمد سر جھکا کر سوچنے لگا پھر بولا۔ "منہ ہاتھ دھو لو۔ میں کھانا گرم کراتا ہوں۔ یہ سامنے غسل خانہ ہے۔"

وہ غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھونے لگا۔ دین محمد نے اپنی شریکِ حیات کو بلا کر کہا۔ "انہیں روٹی کھلاؤ' میں ابھی آ رہا ہوں۔"

وہ باہر چلا گیا۔ میزبان خاتون نے ان کے لئے دسترخوان بچھایا۔ گھر میں جو کچھ پکا تھا ان کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ وہ بھوکے پیاسے تھے۔ کھانے لگے۔ دین محمد نے واپس آ کر کہا۔ "کھانے کے بعد بیٹھک میں آ جاؤ۔ ہم کچھ ضروری باتیں کریں گے۔"

وہ کھانے کے بعد بیٹھک میں آیا۔ وہاں پیش امام صاحب تین افراد کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ پیش امام صاحب نے پوچھا۔ "آپ کا نام کیا ہے؟"

"میرا نام کبریا حسن ہے۔ میں اپنے بارے میں اپنے میزبان دین محمد صاحب کو بتا چکا ہوں۔ آپ بھی کچھ پوچھنا چاہیں تو پوچھیں۔ ویسے میں آپ لوگوں پر بوجھ نہیں بنوں گا۔"

"ہم مہمان کو بوجھ نہیں سمجھتے اور مجاہدین کو تو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ آپ یہاں بے فکری سے رات گزاریں۔ ہم سب نے اپنی بستی کا ایک چکر لگایا ہے اور یہ یقین کیا ہے کہ آپ دونوں کو یہاں آتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ اچھا ہوا۔ آپ مسجد کی طرف سے آئے تھے۔"

ایک شخص نے کہا۔ "آپ جب تک یہاں رہیں کھڑکیوں اور دروازوں کی طرف نہ آئیں۔ جب تک کوئی آپ کو نہیں دیکھے گا' آپ یہاں محفوظ رہیں گے۔"

کبریا نے کہا۔ "ہم آپ کی ہدایات پر عمل کریں گے۔ ہماری آواز بھی کسی کو سنائی نہیں دے گی۔ ہم صبح ہونے سے پہلے چلے جائیں گے۔"

"آپ لوگوں کے پاس اس علاقے کی مناسبت سے گرم کپڑے نہیں ہیں۔ رات ہو چکی ہے۔ باہر برف پڑنے لگی ہے۔ صبح دھوپ نکلنے تک ہر جگہ برف ہی برف دکھائی دے گی۔ دھوپ نہ نکلی تو برف جمتی ہی رہے گی۔"

ایک اور شخص نے کہا۔ "مجاہدین کبھی کبھی کنٹرول لائن پار کر کے ادھر آتے ہیں اور یہیں سے واپس جاتے ہیں۔ کیا آپ بھی واپس جانا چاہتے ہیں؟"

"جی ہاں' مجھے آزاد کشمیر پہنچ کر ایک بہت بڑی ذمے داری پوری کرنی ہے۔"

"پھر تو آگے سردی بڑھتی جائے گی۔ تمام دن چلتے رہو گے تب کنٹرول لائن تک پہنچو گے۔"

"ہم گرم کپڑے دیں گے۔ کھانے پینے کا سامان دیں گے لیکن پیش امام صاحب آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔"

پیش امام صاحب نے کہا۔ "آپ میری بات کا برا نہ مانیں۔ لڑکی آپ کے لئے نامحرم ہے۔ آپ کو اس طرح اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہئے۔"

کبریا نے سر جھکا لیا۔ دین محمد نے کہا۔ "میری شریکِ حیات نے لڑکی سے پوچھا ہے۔ وہ آپ سے نکاح پڑھوانے کے لئے راضی ہے۔ کیا آپ راضی ہیں؟"

"جی ہاں' یہ نیک کام ہو جائے تو آپ کا بڑا احسان ہو گا۔"

دونوں کا نکاح پڑھا دیا گیا۔ انہیں رات گزارنے کے لئے ایک کمرہ دیا گیا اور اب وہ اسی لکڑی سے بنائے گئے مکان کے ایک کمرے میں نیند سے بیدار ہو کر سوچ رہا تھا۔ اپنے موجودہ حالات پر غور کر رہا تھا۔ کمبل کے اندر اس کی دلہن اس سے لپٹے ہوئے گہری نیند سو رہی تھی۔

باہر برف گر رہی تھی۔ سخت سردی تھی۔ دو کمبل اوڑھنے کے باوجود سردی لگ رہی تھی۔ اس نے شاداں کی طرف کروٹ لے کر سرگوشی میں کہا۔ "شاداں اٹھو' پتا نہیں ہم کب سے سو رہے ہیں۔ شاید صبح ہونے والی ہے۔ ہمیں یہاں سے جانا ہے۔"

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کھلی ہوئی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ وہ اس سے اور لگ کر تیسرا کمبل بن گئی۔ سرگوشی میں کہنے لگی۔ "بڑی سردی ہے۔ تنور سے نہ نکالو۔ کیا جانا ضروری ہے؟"

"ضروری ہے۔ یہاں کسی وقت بھی شکاری کتے آ سکتے ہیں۔ ہم اپنے میزبانوں کے لئے مصیبت نہیں بنیں گے۔ چلو اٹھو' حوصلہ کرو۔"

وہ الگ ہو گیا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا پھر بستر سے اٹھ کر میزبانوں کے دیئے ہوئے گرم کپڑے پہننے لگا۔ اس سے کہنے لگا۔ "تم سو رہی ہو' سوتی رہ جاؤ گی' میں چلا جاؤں گا۔"

وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "نئی دلہن کو چھوڑ کر جاؤ گے' شرم نہیں آئے گی؟"

"دلہن سردی سے ڈرے گی تو شرم آئے گی۔ کیا میری دلہن ایسی کمزور ہے؟"

وہ بستر سے اٹھ کر گرم کپڑے پہننے لگی۔ اچھے خاصے موٹے اونی کپڑے تھے۔ سر سے لے کر گردن تک ڈھانپنے والی اونی ٹوپیاں تھیں۔ دروازے پر دستک سنائی دی۔ کبریا

نے دروازہ کھولا۔ دین محمد نے دھیمی آواز میں کہا۔ "صبح کے پانچ بجنے والے ہیں۔ پندرہ منٹ بعد اذان ہو گی۔ کیا آپ جانے کے لئے تیار ہیں؟"

"ہم بالکل تیار ہیں۔ اب یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔"

شاداں میزبان خاتون سے ملنے چلی گئی۔ انہوں نے ایک چرمی تھیلی دیتے ہوئے کہا۔ "اس میں خشک میوے ہیں۔ ایک بوتل میں سیب کا مربہ ہے۔"

دین محمد نے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ اسے دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے کنٹرول لائن تک پہنچنے کا جو راستہ سمجھایا تھا اس کا نقشہ اس کاغذ میں ہے۔ راستہ بھول جاؤ تو اسے دیکھ لینا۔ راستے میں جو بستیاں آئیں گی ان سب کے نام ترتیب وار لکھے ہوئے ہیں۔"

کبریا نے وہ تہہ کیا ہوا کاغذ لے کر لباس کے اندر ایک جیب میں رکھ لیا پھر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میں ہمیشہ آپ لوگوں کو یاد رکھوں گا۔"

وہ ان سے رخصت ہو کر شاداں کے ساتھ اس گھر سے باہر آیا۔ باہر دو آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ ایک نے کبریا سے بیگ لے کر کہا۔ "آیئے ہم آپ کو بستی کے باہر پہنچا دیں گے۔"

وہ ان کے پیچھے جانے لگے۔ وہ بستی کے باہر ایک لمبا چکر کاٹتے ہوئے اس راستے پر آئے جہاں سے انہیں آگے جانا تھا۔ دور سے اذان کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کبریا نے اپنا بیگ لیتے ہوئے کہا۔ "اب آپ لوگ زحمت نہ کریں۔ ہم چلے جائیں گے۔ آپ جائیں نماز کا وقت ہو رہا ہے۔"

وہ دونوں میزبان سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔ شاداں نے اس کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "تم نے سارا سامان رکھ لیا ہے' اسلحہ بھی ہے؟"

پچھلے دن جہاں آخری تین سپاہیوں سے مقابلہ ہوا تھا' ان کی لاش کے پاس سے انہیں اسلحہ ملا تھا۔ کبریا کی ایک شاٹ گن تھی اور دو ریوالور تھے۔ انہیں آسانی سے بیگ میں چھپایا جا سکتا تھا۔ انہوں نے ایک ایک ریوالور اپنے اپنے لباس کے اندر چھپا لیا تھا۔

برف باری کی وجہ سے دھند اتنی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ہاتھ تھام کر چل رہے تھے۔ وہ خاموش تھے۔ انہیں سورج کے طلوع ہونے اور

دھوپ نکلنے کا انتظار تھا۔ وہ چلتے چلتے ایک دم سے ٹھٹک گئے۔ کسی کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کوئی دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔ "ادھر کوئی نہیں ہے' ہمیں غلط اطلاع ملی ہے۔"

دوسری آواز سنائی دی۔ "یہاں تو ہم اندھے بنے ہوئے ہیں۔ دھند میں کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ دھوپ نکلنے کا انتظار کرو۔ وہ بھی دھوپ نکلنے کے بعد ادھر سے گزریں گے۔"

شاداں اور کبریا نے اپنے لباس کے اندر سے ریوالور نکال لئے تھے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آواز کی سمت دیکھ رہے تھے۔ نہ آگے بڑھ سکتے تھے۔ نہ پیچھے جا سکتے تھے۔ پتا نہیں وہ دو تھے یا دو سے زیادہ تھے۔ دھند نے ان سب کو ایک دوسرے سے چھپا رکھا تھا۔ دھوپ نکلتی تو سب ایک دوسرے پر ظاہر ہو جاتے۔ پتا نہیں کس سے کس کو جانی نقصان پہنچتا۔

کبریا نے سوچا اگر وہ تعداد میں زیادہ ہوں گے تو دھند کے چھٹتے ہی انہیں چاروں طرف سے گھیر لیں گے' بہتر ہے کہ اسی دھند میں آنکھ مچولی کھیلی جائے۔

وہ شاداں کا ہاتھ تھام کر ایک طرف جانے لگا۔ چند گز کا فاصلہ طے کرتے ہی اچانک کسی سے ٹکرا گیا۔ اس ٹکر نے دونوں کو چونکا دیا۔ کبریا نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے اس کے جسم سے ٹکراتے ہی گولی چلا دی۔ وہ کراہتے ہوئے گر پڑا۔ کچھ فاصلے سے آواز سنائی دی۔ "رام بھروسے! کیا ہوا' تم نے گولی کیوں چلائی ہے؟"

کبریا نے اس آواز کی سمت اِدھر اُدھر تین فائر کئے۔ وہاں سے چیخ سنائی دی پھر خاموشی چھا گئی۔ کسی نے بہت دور سے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے وہ ادھر ہیں' ہوشیار رہو۔"

وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر تیزی سے ایک طرف چلتے جا رہے تھے۔ برف میں پاؤں دھنس رہے تھے۔ چلنے میں دشواری ہو رہی تھی مگر ایک فائدہ تھا کہ ان کے قدموں کی آوازیں نہیں ابھر رہی تھیں۔

وہ دونوں ہانپتے رہے اور چلتے رہے۔ تقدیر مہربان تھی۔ سورج نکلنے کے باوجود دھوپ نہیں نکل رہی تھی پھر بھی سورج کی کچھ حرارت تھی۔ قدموں تلے برف آہستہ آہستہ پگھل رہی تھی۔ دھند ویسی ہی تھی۔ البتہ اس حد تک کم ہوئی تھی کہ وہ ایک

دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ آگے دو چار گز کے فاصلے پر نظر نہیں آ رہا تھا۔

اچانک شاداں کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس کا ایک پاؤں گڑھے میں پڑ گیا تھا۔ وہ ادھر گرنے والی تھی مگر ہاتھ کبریا کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ اس سے لپٹ کر ہانپنے لگی۔ کبریا نے کہا۔ "یوں آگے بڑھتے رہنا خطرناک ہو گا۔ آگے گہری کھائی بھی ہو سکتی ہے۔"

وہ ہانپتے ہوئے بولی۔ "ہم یہاں ٹھہریں گے تو وہ آ جائیں گے۔"

"ہم تقریباً تین کلو میٹر دور نکل آئے ہیں۔ دھند چھٹ جائے گی۔ تب بھی وہ ہمیں نہیں دیکھیں گے۔ وہ ہم سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔"

ایک فٹ کے فاصلے پر درخت نظر آ رہا تھا۔ وہ دونوں اس درخت سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک کھڑے رہے۔ آسمان پر سورج نظر آ رہا تھا۔ بہت ہی نرم اور لطیف سی دھوپ محسوس ہو رہی تھی۔ دور تک نظر آنے لگا تھا۔ وہ آگے بڑھنے لگے۔ کچھ دور جاتے ہی فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ ایک گولی سنسناتے ہوئے آئی پھر ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے تنے میں پیوست ہو گئی۔

کبریا شاداں کو کھینچتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ رینگتے ہوئے بولا۔ "ان درختوں کے پیچھے چلو۔"

پیچھے بہت دور سے کسی نے چیخ کر کہا۔ "بچ کر نہیں جاؤ گے۔ ہتھیار پھینک کر سامنے آ جاؤ۔"

وہ دونوں رینگتے ہوئے ایک ایک درخت کے پیچھے چلے گئے۔ اس شخص نے پھر چیخ کر کہا۔ "ہم نے وائرلیس سے خبر بھیج دی ہے۔ تم جہاں جاؤ گے مارے جاؤ گے۔"

کبریا آواز کی سمت پوری توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ وہاں کسی درخت کے پیچھے سے کوئی بول رہا تھا مگر نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ دوبارہ گولی چلانے کے لئے درخت کے پیچھے سے نکلے' اس نے ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر پوری قوت سے پھینکا۔ اس پتھر کے گرنے کی آواز آتے ہی اس نے درخت کے پیچھے سے نکل کر تڑ تڑ دو گولیاں چلائیں۔ کبریا نے ایک گولی چلائی۔ وہ چیخ مار کر اچھلتا ہوا زمین پر گر پڑا۔

شاداں درخت کے پیچھے سے دیکھ رہی تھی۔ اپنے مرد کے لڑنے کے انداز پر فخر کر رہی تھی۔ اس نے گوریلا جنگ کی باقاعدہ تربیت حاصل کی تھی۔ وہ ایسے وقت پوری

طرح حاضر دماغ رہتا تھا اور بڑی حکمتِ عملی سے دشمنوں کو ڈاج دے کر بچ نکلتا تھا۔ وہ درخت کے پیچھے کھڑا ہوا انتظار کرنے لگا۔ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ادھر اور کتنے دشمن ہیں۔

ادھر خاموشی تھی اور وہ خاموشی سے دھوکا نہیں کھانا چاہتا تھا۔ دشمن نہ کمزور ہوتے ہیں نہ نادان ہوتے ہیں۔ وہ بھی تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ طرح طرح کی حکمتِ عملی سے لڑنا جانتے ہیں۔ وہ خاموش رہ کر اسے دھوکا دے سکتے تھے یا گھنے درختوں کے پیچھے سے چھپ چھپ کر دوسری طرف سے آ سکتے تھے۔

وہ ریوالور کو لباس کے اندر رکھ کر اس درخت پر چڑھنے لگا۔ درخت بہت گھنا تھا۔ وہ نظر نہیں آ سکتا تھا۔ وہ ایک اونچی شاخ پر پہنچ کر دیکھنے لگا۔ جسے گولی ماری گئی تھی اس کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ وہاں اور کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہو سکتا تھا وہ صبر و تحمل سے چھپے ہوئے ہوں یا اسے گھیرنے کے لئے دوسری طرف سے آ رہے ہوں۔

اسے وہاں سے جلد نکلنا تھا۔ یہ بات پریشان کن تھی کہ وائرلیس کے ذریعے اس کے بارے میں اطلاع پہنچا دی گئی تھی۔ ان کے بہت زیادہ محتاط اور مستعد ہونے سے پہلے کنٹرول لائن کے کسی علاقے تک پہنچنا ضروری تھا۔ ورنہ وہ دونوں ان ہی اطراف میں پھنس کر رہ جاتے۔

☆------☆------☆

انہیں اطلاع ملی تھی کہ کبریا اس لڑکی کے ساتھ شمالی علاقے کی طرف آیا ہے۔ وہ ان علاقوں میں کس سمت جائے گا یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ جند چونترہ سے سہانی تک اور نہالہ سے کھوئی رٹہ تک سرحدی علاقے ہیں۔ وہ کسی بھی علاقے تک پہنچ کر کنٹرول لائن پار کر سکتا ہے۔

جبار جان فوجی افسروں اور سپاہیوں کے ساتھ ایک ٹرک میں تھا۔ انہوں نے آگے ایک کیمپ سے دو فوجی جیپیں حاصل کیں پھر وہ سب تین حصوں میں تقسیم ہو کر مختلف سمت جانے لگے۔ جبار جان ایک افسر اور چار سپاہیوں کے ساتھ ایک جیپ میں تھا۔ صبح سے مسلسل چلتے رہنے کے باعث وہ ایک بستی کے قریب آئے، چار عورتیں کچھ سامان اٹھائے بستی کی طرف جا رہی تھیں۔ فوجی افسر نے ان کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک

دوشیزہ کو دیکھا پھر جیپ روکنے کا حکم دیا۔ جیپ کا سپاہی ڈرائیور اپنے افسر کے مزاج کو خوب سمجھتا تھا۔ اس نے جیپ کو ریورس چلا کر ان عورتوں کے سامنے لا کر روک دیا۔

وہ چاروں ٹھٹک گئیں۔ انہوں نے مسلح فوجیوں کو دیکھا۔ افسر مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ ایک عورت نے اس حسینہ کو اپنے پیچھے چھپاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بات ہے' ہمارا راستہ کیوں روک رہے ہو؟"

افسر نے کہا۔ "اس کا نام کیا ہے؟"

اس عورت نے کہا۔ "میرا نام کیوں نہیں پوچھتا؟ میں اس کی ماں ہوں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "جوانی میں ماں کا نہیں کسی منچلی کا نام پوچھا جاتا ہے۔"

اس عورت نے تڑخ کر کہا۔ "اس کا نام بہنا ہے۔ چل اسے پکار میری بہنا۔"

جبار جان نے جیپ سے اترتے ہوئے اس عورت کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔ "بہت بولتی ہے۔ ایک ہاتھ پڑے گا تو ہمیشہ کے لئے بولنا بھول جائے گی۔"

دوسری عورتیں پتھر اٹھا اٹھا کر جبار جان کو مارنے لگیں۔ کہنے لگیں۔ "تُو نے مائی کو دھکا دیا ہے۔ تیری ہمت کیسے ہوئی۔ تُو فوجی ہے تو کیا ہوا۔ زیادہ سے زیادہ گولی مارے گا۔ چلا گولی........"

وہ پتھر اٹھا اٹھا کر مار رہی تھیں۔ دوسرے سپاہیوں نے آ کر انہیں روکا۔ افسر نے کہا۔ "جبار جان ان کے منہ نہ لگ۔ ہم جسے چاہتے ہیں وہ خود آ کر ہمارے منہ لگتی ہے۔ گاڑی میں بیٹھ جا۔"

وہ سپاہیوں کے ساتھ گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ جیپ اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ افسر نے جبار جان سے کہا۔ "اس بڑھیا کو دھکا دینے کی کیا ضرورت تھی؟ تُو پرانا شکاری ہے۔ اتنا نہیں جانتا۔ چار عورتیں اکٹھی ہوں تو وہاں چارا نہیں ڈالا جاتا۔ الگ ہوں تو اکیلی کو پھانسا جاتا ہے۔"

وہ بولا۔ "سر غلطی ہو گئی۔ معلوم ہوتا ہے یہ سامنے والی بستی میں رہتی ہیں۔ آپ حکم دیں گے تو میں اس چھوکری کو اٹھا لاؤں گا۔"

"ہمیں بستی میں ٹھہرنا نہیں ہے۔ وہاں کچھ کھا پی کر آگے بڑھنا ہے۔"

وہ بستی میں پہنچ گئے۔ وہاں کے مکھیا نے اپنے لوگوں کے ساتھ آ کر ہاتھ جوڑ کر ان کا

استقبال کیا۔ افسر نے پوچھا۔ "ادھر کوئی آیا تھا؟"

مکھیا نے کہا۔ "یہاں تو مسافر آتے جاتے رہتے ہیں۔ دس دن پہلے پاس والی بستی سے ہمارے دو ملنے والے آئے تھے۔ یہاں جل پان کر کے آگے چلے گئے۔"

"اپنی ذات برادری والوں کی بات نہ کرو۔ کوئی مسلمان ادھر آیا تھا؟ اس کے ساتھ ایک جوان لڑکی ہے۔ ہمیں خبر ملی ہے وہ کل ادھر آئے تھے۔"

مکھیا نے ایک نوجوان سے پوچھا۔ "اے ہریا! کیا ادھر کوئی مسلمان آیا تھا؟"

"نہیں چاچا' یہ چھوٹی سی بستی ہے۔ کوئی آیا ہوتا تو ہمیں ضرور دکھائی دیتا۔"

افسر نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم لوگ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھے ہو جاتے ہو۔ ہمیں جو رپورٹ ملی ہے وہ غلط نہیں ہو سکتی۔ وہ دونوں یہاں آئے تھے۔ تمام رات رہ کر صبح سویرے گئے ہیں۔ یہاں سے ایک کلو میٹر آگے ہماری پٹرولنگ پولیس نے انہیں دیکھا تھا۔ وہ گہری دھند میں چھپ کر کہیں چلے گئے ہیں۔"

مکھیا نے اپنے لوگوں سے کہا۔ "یہ کیا سن رہا ہوں۔ ہمارے فوجی ایک ایک بات کی خبر رکھتے ہیں۔ وہ ہماری بستی میں آئے اور ہم بے خبر رہے۔ بڑے شرم کی بات ہے۔"

ایک شخص نے کہا۔ "وہ مسجد کی طرف سے آئے ہوں گے۔ وہیں کسی کے مکان میں چھپ کر رہے ہوں گے۔ ہم کبھی کبھی ادھر جاتے ہیں۔ کل ادھر نہیں گئے تھے۔"

افسر نے مکھیا سے کہا۔ "ہمیں ادھر لے چلو۔"

چند قدموں کا فاصلہ تھا۔ وہ جیپ کو وہاں چھوڑ کر پیدل چلتے ہوئے مسجد کے پاس آئے' دو چار مسلمان اپنے گھروں سے نکل کر انہیں دیکھنے لگے۔ دین محمد بھی آگیا۔ فوجیوں کو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کوئی گڑبڑ ہے۔ مکھیا نے اس سے کہا۔ "دینا! کل ہماری بستی میں کون آیا تھا؟ اس کے ساتھ ایک جوان لڑکی تھی۔ دیکھ جھوٹ نہ بولنا۔ ہمارے فوجی [illegible] خبر رکھتے ہیں۔"

دین محمد نے کہا۔ "یہ چھوٹی سی بستی ہے۔ کوئی ایک گھر میں کھانسے تو پوری بستی والوں کو آواز سنائی دیتی ہے اگر کوئی کسی لڑکی کے ساتھ آئے گا تو یہاں کسی سے چھپ کر رہ سکے گا۔"

افسر نے دین محمد کو ایک ہاتھ جماتے ہوئے کہا۔ "جتنا پوچھا جائے اتنا ہی بولو۔ وہ دونوں یہاں آئے تھے۔ بولو آئے تھے یا نہیں۔"

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ "نہیں۔"

افسر نے پھر اسے ایک ہاتھ مارا۔ وہ جھنجلا کر بولا۔ "مارتے کیوں ہو؟ اگر میں جھوٹ بول رہا ہوں تو بستی کے دوسرے لوگوں سے بھی پوچھ لو۔ یہ مکھیا ہے' اس بستی کا ذمے دار شخص ہے۔ اسے بھی مارو۔ اس نے بھی یہاں کسی کو نہیں دیکھا ہے۔"

مکھیا نے کہا۔ "اے دینا بکواس نہ کر۔ یہاں تمہارے دس بارہ مکانات ایک ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ کوئی رات کو چھپ کر آئے اور صبح چلا جائے تو ہمیں کیسے خبر ہو گی۔"

افسر نے کہا۔ "مکھیا ٹھیک کہتا ہے۔ یہاں آس پاس تم مسلمانوں کے گھر ہیں۔ ادھر پہلے بھی آتنگ وادی آئے ہوں گے مگر کل جو آئے تھے ان سے بھید کھل گیا ہے۔"

پیش امام صاحب نے آ کر کہا۔ "بھید کھل گیا ہے تو وہ پکڑے گئے ہوں گے۔ کیا ان گرفتار ہونے والوں نے ہمارے خلاف کوئی بیان دیا ہے؟"

"وہ پکڑے نہیں گئے مگر انہوں نے اس بستی سے آگے جا کر پٹرولنگ پولیس کے دو سپاہیوں کو ہلاک کیا ہے۔ آگے کہیں چلے گئے ہیں۔ جب پکڑے جائیں گے تو انہیں پناہ دینے کے جرم میں تم لوگوں کی بھی شامت آئے گی۔ جس نے بھی اپنے گھر میں انہیں پناہ دی ہو گی میں اسے گولی مار دوں گا۔"

"قانون آپ کے ہاتھ میں ہے۔ بندوق آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کچھ بھی کر سکتے ہیں مگر آپ پہلے انہیں گرفتار تو کریں۔ ان سے بیان لیں۔ ان کا بیان ہمارے خلاف ہو گا تو بے شک ہمیں جو چاہیں سزا دیں۔ خدا کے لئے ابھی تو ظلم نہ کریں۔"

افسر نے جبار جان اور سپاہیوں سے کہا۔ "یہاں جتنے مسلمان ہیں' ان کے گھروں میں جاؤ اور تلاشی لو۔ پچھلی رات ان کی موجودگی کا کوئی نہ کوئی سراغ ضرور ملے گا۔"

وہ انہیں گھروں میں گھسنے اور تلاشی لینے سے نہیں روک سکتے تھے۔ وہ سب اپنی عورتوں اور بچوں کو گھروں سے باہر لے آئے۔ ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ جبار جان اور چار سپاہی مختلف گھروں میں گھس کر تلاشی لینے لگے۔ مکھیا نے افسر سے کہا۔ "یہ کام دو سپاہیوں کا ہے۔ آپ میرے گھر چلیں' جل پان کریں۔"

افسر نے کہا۔ "میرے سپاہیوں کے لئے بھی کھانے کا انتظام کرو۔ ہمیں یہاں سے
فوراً آگے جانا ہے۔"

مکھیا کھانے کا انتظام کرنے کے لئے اپنے آدمیوں کو حکم دینا چاہتا تھا۔ ایسے ہی وقت
کتنی ہی عورتیں وہاں آ گئیں۔ ان میں وہ مائی بھی تھی جسے جبار جان نے دھکا دیا تھا۔

مائی نے افسر کو دیکھ کر کہا۔ "ہمیں معلوم تھا تُو یہاں آئے گا۔ وہ مجھے ہاتھ لگانے والا
اور دھکا دینے والا کہاں ہے؟ ہاتھ میں بندوق لے کر سورما بنتے ہو۔ ماں کا دودھ پیا ہے تو
اب ہاتھ لگاؤ۔"

مکھیا نے اس کے اور افسر کے درمیان آ کر کہا۔ "مائی تجھے کیا ہوا ہے۔ افسر بابو سے
یہ کیسی باتیں کر رہی ہے۔"

وہ بولی۔ "مکھیا! یہ افسر بابو تیری بیٹی پہ نیت خراب کر رہا تھا۔ میں اسے باتیں سنانے
لگی تو اس کا ایک آدمی مجھے مارنا چاہتا تھا۔ پوچھ لے اس سے.........."

مکھیا کے تیور بدل گئے۔ اس نے غصے سے افسر کو دیکھا پھر کہا۔ "کیا آپ کو بدمعاشی
کے لئے میری بیٹی نظر آئی تھی؟ ہم اپنے دیس کی سینا کے ہر سپاہی کی عزت کرتے ہیں۔
ہماری بستی میں آتے ہیں۔ ہم انہیں مان دیتے ہیں اور آپ ہمارا مان توڑ رہے ہیں۔"

افسر نے کہا۔ "غصے میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے تمہاری چھوکری کو
ابھی ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ میرے آدمی نے تجھے ہاتھ لگایا تو کیا ہوا۔ تُو تو بوڑھی ہو گئی
ہے۔"

ایک عورت نے کہا۔ "بوڑھی ہو یا جوان۔ اگلی بار کسی کو میلی نظر سے مت
دیکھنا۔"

افسر نے اس کی طرف تھوک کر کہا۔ "سالی دو کوڑی کی عورت مجھ پر حکم چلا رہی
ہے۔ اے مکھیا عورتوں کی یہ پلٹن یہاں سے لے جا۔ میرا ماتھا گھوم گیا تو تیری چھوکری کو
اٹھا کر لے جاؤں گا۔"

مکھیا نے کہا۔ "ایک باپ سے ایسی بے شرمی کی باتیں نہ کرو۔ کیا ہماری بہن بیٹیاں
لوٹ کا مال ہیں؟ بھگوان کے لئے اپنا کام جلدی کرو اور یہاں سے جاؤ۔"

"ہاں جانا تو ہو گا۔ ڈیوٹی سے مجبور ہوں۔ اس آتنگ وادی کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنا

ہے۔ پر ایک بات کہہ دیتا ہوں، تیری چھوکری پر دل آ گیا ہے۔ واپس ضرور آؤں گا۔"

مکھیا غصے سے پاؤں پٹختا ہوا ذرا دور گیا۔ پیش امام صاحب نے پوچھا۔ "کیا ہوا مکھیا!
اپنے پاؤں میں کانٹا چبھ رہا ہے۔ جس شاخ' پر آشیانہ تھا وہی شاخ ٹوٹ رہی ہے؟"

جبار جان سپاہیوں کے ساتھ واپس آ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "وہ بہت چالاک تھے۔
اپنے پیچھے کوئی نشان چھوڑ کر نہیں گئے ہیں۔"

مائی نے ایک پتھر اٹھایا۔ کئی عورتوں نے بھی پتھر اٹھا لئے۔ وہ جبار جان سے بولی۔
"مرد کا بچہ ہے تو آ۔ مجھے ہاتھ لگا۔ ہم نے پاکستان کے ٹی وی میں مسلمان عورتوں کا جلوس
دیکھا ہے۔ ہم ہندو عورتیں بھی جلوس نکالیں گی۔ آج معلوم ہو گیا.......... کتوں کو ہندو
اور مسلمان نظر نہیں آتے۔ وہ تو کسی کو بھی کاٹ لیتے ہیں۔"

افسر نے سبھی کے ہاتھ میں پتھر دیکھے تو ریوالور نکال کر ایک ہوائی فائر کیا۔ تمام
عورتیں سہم کر پیچھے چلی گئیں۔ مرد بھی سہم گئے۔ تمام سپاہیوں نے بندوقیں تان لی تھیں۔
افسر نے سپاہیوں سے کہا۔ "چلو یہاں سے، اگر کوئی پتھر مارے تو اسے گولی مار دینا۔ کوئی
ہمارے پیچھے نہ آئے۔"

وہ غصے سے گرج رہا تھا پھر اس نے مائی سے کہا۔ "تُو نے ہمیں کتا کہا ہے۔ تو میں کتا
بن کر ہی دکھاؤں گا۔"

وہ غصے سے جانے لگا۔ جبار جان اور سپاہی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ جب وہ
ایک گلی کے موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گئے تو دین محمد نے مکھیا سے کہا۔ "وہ مجھے مار رہا
تھا اور تم ہمارے مکھیا ہو کر تماشا دیکھ رہے تھے۔"

مکھیا نے کہا۔ "اور کیا کرتا، کیا اس افسر سے لڑ پڑتا؟ ہماری اوقات کیا ہے؟"

"اوقات بنانے سے بنتی ہے۔ جب اپنی بیٹی پر بات آئی تو تم لڑنے کے انداز میں
بولنے لگے تھے۔ صرف اپنا درد کیوں محسوس ہوتا ہے۔ دوسروں کا کیوں نہیں ہوتا۔ اس
بستی میں ہم گنتی کے لوگ ہیں۔ کیا ہم آپس میں ایک ہو کر نہیں رہ سکتے؟"

"تم لوگوں سے ایکا نہیں ہو گا۔ تم لوگ دیس دروہی ہو۔ غلام کشمیر سے آنے والے
آتنگ وادیوں کو اپنے گھروں میں چھپاتے ہو۔"

دین محمد نے پوچھا۔ "وہ فوجی افسر تمہاری بیٹی کو اٹھا لے جانے کی بات کر رہا تھا۔ کیا

وہ دیس دروہی نہیں ہے؟"

پیش امام صاحب نے کہا۔ "ہم تمام مسلمانوں نے تمہاری بیٹیوں اور بہنوں کو ہمیشہ اپنی بیٹی بہن سمجھا ہے۔ جو ایسا نہیں سمجھتا وہ تمہارا دشمن ہے۔ تعجب ہے کہ دوستوں کو دشمن اور دشمن کو دوست سمجھتے آ رہے ہو۔"

مکھیا کے پیچھے کھڑے ہوئے جوان نے سینہ تان کر کہا۔ "ہم دشمن بننے والے دوستوں سے نمٹنا جانتے ہیں۔ اپنی سینا کی عزت کرتے ہیں مگر اس کا کوئی سپاہی ہماری عزت پر ہاتھ ڈالے گا تو ہم اس سے بھی نہیں ڈریں گے۔"

مکھیا نے کہا۔ "ہم بزدل نہیں ہیں۔ ہماری عورتیں پتھر اٹھا سکتی ہیں تو ہم ہتھیار اٹھا سکتے ہیں۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی ایک شخص دوڑتا ہوا آیا۔ چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ "مکھیا تیری بیٹی کو لے گئے ہیں۔ تیری بیٹی میرے گھر آ رہی تھی۔ انہوں نے اسے روک لیا۔ زبردستی اٹھا کر لے گئے ہیں۔"

یہ سنتے ہی سب لوگ دوڑتے ہوئے ادھر جانے لگے۔ مکھیا کا سر چکرا گیا تھا۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ پیش امام نے کہا۔ "بہت برا ہوا ہے۔ جس کے ہاتھ میں بندوق ہوتی ہے وہ طاقت کے نشے میں ہندو اور مسلمان کو نہیں دیکھتا۔ طیش میں آ کر اپنی ضد پوری کرتا ہے۔"

اس بستی کے تمام مرد' عورتیں' بچے' دوڑتے ہوئے بستی کے باہر تک گئے تھے لیکن وہ فوجی جیپ کہیں نظر نہیں آئی۔ کتے کو کتا کہو تو وہ برا نہیں مانتا۔ آدمی کو کہو تو وہ کتا بن کر ضرور کاٹتا ہے۔ ایسے کتوں کو گولی نہیں ماری جاتی۔ سینے پر تمغے سجائے جاتے ہیں۔

☆======☆======☆

ڈب گاؤں میں خیمہ بستیاں ہیں۔ یہ آزاد کشمیر میں ہے۔ مقبوضہ کشمیر کے سرحدی علاقوں سے اکثر متاثرہ خاندان آتے رہتے ہیں۔ ان کے لئے ایسے خیمے لگائے جاتے ہیں۔ ان خیموں میں بوڑھی عورتیں' مرد اور بچے جاتے ہیں۔ جوان لڑکیاں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں۔ ان میں سے کتنے ہی خاندان جوان بیٹیوں کی بے آبروئی کے تماشے دیکھ کر ان کی ہلاکت کے صدمے اٹھا کر سرحد پار کر کے آتے ہیں۔

ان خیمہ بستیوں میں جوان بھائی اور بیٹے بھی دکھائی نہیں دیتے۔ وہ بھی سرحد کے اس پار شہید ہو چکے ہوتے ہیں۔ ایسی خیمہ بستیاں سرحدی علاقوں میں جگہ جگہ ہیں۔ وہ قسمت کے مارے وہاں بھی سکون سے رہ نہیں پاتے ہیں۔ سرحد پار سے گولیاں چلتی ہیں۔ گولے پھینکے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ وہاں زندگی گزار رہے ہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں اور کہیں نہیں جا سکتے۔ وہاں ہریالی ہے۔ پھول کھلتے ہیں۔ بچوں کے چہرے نہیں کھلتے۔ وہ معصوم بچے چپ چاپ سے رہتے ہیں۔ پرانی شکستہ رائفلوں اور کارتوس کے خول سے کھیلتے رہتے ہیں۔ بوڑھے مویشی پالتے ہیں۔ لکڑیاں کاٹتے ہیں۔ امدادی تنظیمیں محدود راشن سپلائی کرتی ہیں۔

ادھر مجاہدین آتے ہیں۔ دشمنوں پر جوابی حملے کرتے ہیں۔ ان سرحدی علاقوں کی عورتیں' بچے' جوان اور بوڑھے سب ہی ایسے جیتے ہیں جیسے اگلے پل شہید ہو جانا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ موت برحق ہے۔ آج نہیں تو کل مرنا ہی ہے تو پھر جہاد کرتے ہوئے موت کو گلے کیوں نہ لگایا جائے۔ وہ آزادی کی خاطر دیوانوں کی طرح جیتے اور مرتے ہیں۔ انہیں اس بات کی پرواہ نہیں ہے۔ ان کا ایک ہی ایمان ہے۔ ایک ہی عزم ہے کہ جہاد جاری رہے گا۔ یہ جنت ارضی ہماری ہے۔ یہ جنت زندگی میں بھی ہماری ہے اور شہادت کے بعد بھی ہماری رہے گی۔

☆======☆======☆

ایک معمر خاتون ایک امدادی تنظیم کی گاڑی میں بیٹھ کر جگہ جگہ سرحدی علاقوں میں جا رہی تھیں۔ ان کے ساتھ تنظیم کے ارکان' صحافی اور فوٹو گرافرز بھی تھے۔ وہ خیمہ بستی میں امدادی سامان تقسیم کر رہے تھے۔ صحافی اور فوٹو گرافرز وہاں کے چشم دید حالات لکھ رہے تھے اور تصویریں اتار رہے تھے اور وہ معمر خاتون اپنے اکلوتے جوان بیٹے کبریا حسن کو تلاش کر رہی تھیں۔

کبریا کے والد ایک ریٹائرڈ فوجی سپاہی تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ بیٹے کو پاکستان آرمی کا بہت بڑا افسر بنائیں گے۔ بڑا افسر بنانے کے لئے انہوں نے کبریا کو تعلیم دلائی۔ وہ کیڈٹ کالج اور ٹریننگ سینٹر میں رہا۔ ذہنی اور جسمانی محنت و مشقت سے اور سچی لگن سے ہر امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرتا رہا لیکن آخری مرحلے میں وہ اور اس کے والدین

مایوس ہو گئے۔

ٹریننگ سینٹر میں جب آخری بار اس کا میڈیکل چیک اپ ہوا تو توقع کے خلاف رپورٹ نیگیٹو نکلی۔ وہ برین کینسر کے پہلے اسٹیج پر تھا۔

ایک ہی جوان بیٹا تھا اور کوئی اولاد نہیں تھی۔ ماں اپنے بچوں کو دھوپ سے بھی بچاتی ہے۔ بیٹے پر موت کی آنچ آ رہی تھی۔ دھوپ سے بچانے والی ماں اس آنچ سے نہیں بچا سکتی تھی۔ جوان بیٹے کو دیکھ دیکھ کر روتی رہتی تھی۔ باپ نے کہا۔ "رونے سے زندگی نہیں ملتی۔ ہمیں اپنے نصیبوں پر ہنسنا چاہئے' صبر کرو۔"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "صبر نہیں ہوتا۔"

"دعا کرو' دعا پر اعتماد نہیں رہا۔" کاتب تقدیر نے موت کے پروانے پر مہر لگا دی تھی۔ دعا کے پر جلا دیئے تھے۔ وہ عرش تک پرواز نہیں کر سکتی تھی۔

کبریا نے کہا۔ "اماں آنسو پونچھ لو۔ میں یوں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر خاموشی سے نہیں مروں گا۔ جو موت مجھے چیلنج کر رہی ہے میں اس موت کو چیلنج کروں گا۔ ایک بڑے مقصد کے لئے جہاد کروں گا۔ اس سے پہلے کہ کینسر سے موت آئے' میں شہادت حاصل کروں گا۔ کینسر کو ٹھینگا دکھا کر اس دنیا سے جاؤں گا۔"

ماں نے کہا۔ "میں تجھے کہیں جانے نہیں دوں گی۔ تجھے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھوں گی۔"

باپ نے کہا۔ "بیٹے کو دیکھتی رہے گی۔ روتی رہے گی اور مرتی رہے گی۔ بیٹا بھی کسی مقصد کے بغیر بزدلوں کی طرح بیماری سے مار کھاتے کھاتے مر جائے گا۔ میں سپاہی ہوں' اپنے بیٹے کو مار کھانے والا سپاہی نہیں بناؤں گا۔ اسے جانے دے۔"

ڈاکٹر نے اسے دوائیں دی تھیں۔ تاکید کی تھی کہ وہ انہیں روزانہ مقررہ وقت پر استعمال کرے۔ ان کے علاوہ ایک گولی اور ایک کیپسول کے لئے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ دورہ پڑنے کے بعد انہیں استعمال کیا جائے۔ ان کے استعمال سے چوبیس گھنٹوں تک وہ دماغی تکلیف سے محفوظ رہے گا۔

باپ نے اسے اتنی دوائیں خرید کر دیں' جنہیں وہ چار ماہ تک استعمال کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے سفری بیگ میں وہ تمام دوائیں رکھ لیں۔ پھر ماں کے گلے لگ کر باپ سے

رخصت ہو کر وہاں آ گیا۔ مجاہدین کی ایک تنظیم سے رابطہ کیا۔ وہ تربیت یافتہ تھا اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ابتدا میں اسے چھوٹے چھوٹے معرکوں میں حصہ لینے کے لئے بھیجا گیا۔ اس نے بہترین ذہانت اور حکمتِ عملی کا ثبوت دیا۔ تب اسے چند مجاہدین کے ساتھ کنٹرول لائن کے پار لانچ کرایا گیا۔ جب کوئی مجاہد لائن آف کنٹرول کو پار کر کے مقبوضہ کشمیر میں پہنچ جاتا ہے تو مجاہدین کی اصطلاح میں کہا جاتا ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں لانچ ہو چکا ہے۔

کبریا سے کہا گیا تھا کہ وہ چار ماہ کی دوائیں نہ لے۔ ایسی مہم میں کم سے کم ضروری سامان رکھنا چاہئے۔ وہ بیس بائیس دن کے لئے جا رہا ہے۔ اس مدت میں اسے واپس آ جانا چاہئے اور اسے زیادہ زیادہ ایک ماہ کی دوائیں اپنے پاس رکھنا چاہئے۔

میدانِ جنگ میں خوراک کم اور گولے زیادہ رکھے جاتے ہیں۔ اس نے اپنے بیگ میں ڈیڑھ ماہ کی دوائیں رکھیں۔ باقی دوائیں تنظیم کے دفتر میں چھوڑ دیں۔ وہ ماں تنظیم کے دفتر میں آئی تھی۔ ان دواؤں کو وہاں دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔ اس نے کہا۔ "میں اپنے ساتھ بھی کچھ دوائیں لائی ہوں لیکن وہ یہ دوائیں بھی یہاں چھوڑ گیا ہے۔ آپ لوگوں نے یہ دوائیں اس کے پاس کیوں نہیں پہنچائیں؟"

مجاہدین کے ایک ٹرینرز نے کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ اپنے ساتھ ڈیڑھ ماہ کی دوائیں لے گیا ہے پھر یہ کہ مقبوضہ کشمیر کے شہروں میں ایسی دوائیں مل جاتی ہیں۔"

"مگر وہ کہاں ہے؟ آپ کہتے ہیں کہ بائیس دن کے لئے گیا تھا لیکن ایک مہینہ گزر گیا ہے۔ وہ واپس کیوں نہیں آیا؟ آپ اس کی خبر کیوں نہیں لیتے؟"

"ہم اس کے لئے فکر مند ہیں۔ وہ جن مجاہدین کے ساتھ گیا تھا وہ سب بائیس دن سے پہلے اپنے فرائض بخوبی انجام دے کر واپس آ گئے ہیں۔ آپ کے بیٹے نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جس کے بعد ہم کارگل کے محاذ پر جلد ہی کامیابی حاصل کریں گے۔ آپ کو فخر کرنا چاہئے۔"

"فخر تو ساری مائیں کریں گی۔ ساری قوم کرے گی مگر میرا بیٹا کہاں ہے؟"

"وہ ایک معرکے میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا تھا۔ اس کے بعد اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔ بعد میں جو مجاہدین گئے ہیں' وہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے دوران میں اسے

تلاش کریں گے۔ اللہ نے چاہا تو جلدی ہی اس کی خیریت معلوم ہو سکے گی۔"

"آپ مجھے تسلیاں دے رہے ہیں۔ میں نے دل پر پتھر رکھ کر بیمار بیٹے کو جہاد کے لئے بھیجا ہے۔ دل پر پتھر رکھ کر کوئی بری خبر بھی سن لوں گی۔ مجھ سے کوئی بات نہ چھپائیں۔"

"آپ یقین کریں۔ ہم آپ سے کچھ نہیں چھپا رہے ہیں۔ اسے تلاش کیا جا رہا ہے۔ آپ نہیں جانتیں ایسے کتنے سر پھرے جوان ہیں جو گھر بیٹھے بیماری سے لڑنے کے بجائے میدانِ جنگ میں دشمنوں سے لڑ رہے ہیں ان میں سے کچھ غازی بن کر واپس آتے ہیں' کچھ شہید ہو جاتے ہیں۔ ان شہیدوں کا کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ کہاں گم ہو گئے ہیں جب آپ کے بیٹے کا پتا چلے گا تو آپ کو بتا دیا جائے گا۔ ہم آپ سے جھوٹ نہیں بولیں گے۔ دو مجاہدین کل یہاں واپس آنے والے ہیں۔ ان سے کوئی خبر مل سکتی ہے۔"

"میں یہاں رہوں گی۔ اس کا انتظار کروں گی۔ آپ سرحدی علاقوں کی طرف جا رہے ہیں۔ میں بھی چلوں گی۔ وہاں کی خیمہ بستیوں میں زخمی بھی ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے میرا کبریا وہاں زخمی حالت میں ہو۔"

"مجاہدین زخمی حالت میں آتے ہیں تو ہمیں اطلاع مل جاتی ہے۔ آپ کا بیٹا خیمہ بستی میں نہیں ہو گا پھر بھی اپنی تسلی کے لئے آپ ہمارے ساتھ چلی سکتی ہیں۔"

وہ ماں تنظیم کے ارکان کے ساتھ مختلف خیمہ بستیوں کی طرف جا رہی تھی۔ آنسو بھری ویران آنکھوں سے اسے تلاش کر رہی تھی۔ "کہاں ہو بیٹا؟ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ بیک وقت دو محاذوں پر کیسے لڑ رہے ہو۔ دشمنوں سے بھی' بیماری سے بھی' کسی محاذ پر جیتو گے؟ کسی محاذ پر ہارو گے؟"

اس ماں کو ایک بزرگ نے سمجھایا تھا۔ "اللہ تعالیٰ رحمٰن ہے' رحیم ہے' کریم ہے اس کی ذات سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ بیٹے کے لئے دعائیں کرتی رہو۔ وہ رب کریم اپنے فیصلے بدلتا ہے۔ آنے والی موت کا رخ بدل دیتا ہے۔"

وہ ماں دن رات دعائیں مانگتی رہتی تھی۔ پتا نہیں کتنی مائیں اپنے بیمار مجاہدین کے لئے دعائیں مانگ رہی ہوں گی۔ وہ جان پر کھیلنے والے کب اور کہاں جان دے دیتے ہیں دشمنوں سے لڑتے ہوئے مارے جاتے ہیں یا بیماری انہیں مار ڈالتی ہے۔ جہاد کے دوران

میں وہ ہر حال میں شہید ہوتے ہیں۔ مگر ان کی لاشیں نہیں ملتیں۔ وہ بے گور و کفن رہ جاتے ہیں۔

کبریا اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا تھا پھر اسے تنہا کنٹرول لائن کی طرف جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ کبھی دشمن گھیر لیتے تھے۔ کبھی وہ راستے سے بھٹک جاتا تھا۔ یوں بھٹکنے کے دوران میں اسے شاداں کا پیار ملا اور ایک اہم ویڈیو کیسٹ ملی۔ جس کو اپنی تنظیم کے دفتر کی طرف پہنچانا لازمی تھا۔

وہ گھنے درخت سے اتر کر نیچے آ گیا۔ شاداں سے بولا۔ "دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا ہے' معلوم ہوتا ہے وہی ایک دشمن تھا جو وہاں مردہ پڑا ہے۔ ہمیں یہاں سے چلنا چاہئے۔"

اس نے اپنے لباس کے اندر سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا۔ دین محمد نے اس کاغذ پر کنٹرول لائن تک پہنچنے کا نقشہ بنایا تھا۔ وہ اسے کھول کر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کہنے لگا۔ "اس نقشے میں دو چھوٹی بستیوں کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ ان کے بعد چھ کلو میٹر دور کنٹرول لائن ہے۔"

شاداں نے کہا۔ "ہم صبح سے چل رہے ہیں۔ راستے میں کوئی بستی نہیں آئی۔"

کبریا نے کہا۔ "کئی گھنٹوں تک دھند پھیلی ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے ہم ایک بستی کے قریب سے گزرے ہوں۔ ہمیں تو قریب کی چیزیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔"

وہ آگے بڑھتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ خشک میوے نکال کر کھانے لگے۔ شاداں نے اس کے ساتھ لگ کر چلتے ہوئے کہا۔ "آگے پیچھے خطرہ ہی خطرہ ہے۔ سفر کٹھن ہے مگر میں تمہارے ساتھ تمام عمر یونہی چلتی رہوں گی۔"

کبریا ان لمحات میں اپنے بوڑھے والدین کو یاد کر رہا تھا۔ ماں کی آنسو بھری آنکھیں اور ممتا بھرا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ شاداں نے پوچھا۔ "چپ کیوں ہو؟ کچھ سوچ رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "اماں کا دل بہت کمزور ہے۔ ویسے تو وہ بڑی ہمت والی ہیں مگر میری محبت انہیں کمزور بنا دیتی ہے۔ میں نے ایک ماہ پہلے انہیں خط لکھا تھا۔ اپنی خیریت سے آگاہ کیا تھا اور لکھا تھا کہ اب پچیس دنوں کے بعد خط لکھوں گا۔ وہ تنظیم کے پتے پر مجھے خط لکھ

سکتی ہیں۔"

"پھر تو انہوں نے خط لکھا ہو گا۔ جواب کا انتظار کر رہی ہوں گی۔"

"اماں کتنے ہی خط لکھ چکی ہوں گی۔ میں نے پچیس دن کہا تھا۔ اب ایک مہینہ گزر گیا ہے' وہ بہت پریشان ہوں گی۔ میں وہاں جاتے ہی انہیں خط لکھوں گا۔"

"خط کیوں لکھو گے۔ بہو کو ان کے پاس نہیں لے جاؤ گے؟"

"میں میدان چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ پتا نہیں کتنی سانسیں رہ گئی ہیں۔ میں پھر جہاد کے لئے واپس آؤں گا۔ اماں کو وہاں بلا کر تمہیں ان کے سپرد کروں گا۔"

"مجھے چھوڑ کر جانے کی بات نہ کرو۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ یہاں پھر واپس آؤ گے تو میں بھی آؤں گی۔ تمہیں میری ضرورت ہو یا نہ ہو' تمہاری بیماری کو میری ضرورت ہے۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ تم ساتھ رہو گی تو کیا بیماری بھاگ جائے گی؟"

"میں ایک مجاہد کو تنہا چھوڑ سکتی ہوں۔ ایک بیمار کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑوں گی۔"

"اچھا بحث نہ کرو۔ آئندہ کیا ہو گا' یہ کوئی نہیں جانتا۔ ابھی دشمن ہمارے تعاقب میں ہیں آگے بھی انہیں اطلاع مل چکی ہے اور ایک دشمن بیماری میرے اندر ہے۔ کنٹرول لائن پار کرنے سے پہلے ہی کسی نہ کسی سے مات ہو سکتی ہے۔"

اور شاید مات ہونے والی تھی۔ سامنے کچھ فاصلے پر دو بڑے پتھروں کے پیچھے دو آدمی رائفلیں تان کر کھڑے ہوئے تھے۔ کبریا انہیں دیکھتے ہی ٹھٹک گیا۔ وہ پتھروں کے پیچھے تھے۔ اس کی فائرنگ سے بچ سکتے تھے لیکن وہ شاداں کے ساتھ کھلی جگہ کھڑا ہوا تھا۔ بری طرح پھنس گیا تھا۔

وہ اِدھر اُدھر دوڑتا بھاگتا ہوا شاید خود کو فائرنگ سے بچا سکتا تھا لیکن شاداں نہیں جانتی تھی کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہئے۔ وہ بے موت ماری جاتی۔ وہ دونوں رائفل بردار وردی میں نہیں تھے۔ فوجی سپاہی نہیں ہو سکتے تھے لیکن فوج کے مخبروں کے پاس بھی ہتھیار رہا کرتے تھے۔ جبار جان بھی اسی طرح ہتھیار لئے انہیں تلاش کر رہا تھا۔

ایک نے پتھر کے پیچھے سے گرجتے ہوئے پوچھا۔ "تم کون ہو' اس عورت کے ساتھ

کہاں جا رہے ہو؟"

کبریا نے کہا۔ "یہ میری گھر والی ہے۔ ہم پاس والی بستی کھیڑہ کے رہنے والے ہیں۔"

دوسرے نے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

کبریا نے کہا۔ "میرا نام دین محمد ہے۔ ہم کوئی آتنک وادی نہیں ہیں۔"

وہ دونوں ہنسنے لگے۔ ایک نے کہا۔ "آتنک وادی نہیں ہو مگر دونوں کے ہاتھوں میں ہتھیار ہیں۔"

"ہم نے دشمنوں سے بچنے کے لئے ہتھیار رکھے ہیں۔"

کبریا نے زیر لب کہا۔ "شاداں میں تمہارے آگے ڈھال بن رہا ہوں۔ جیسے ہی گولی چلاؤں تم زمین پر گر کر لڑھکتے ہوئے درخت کے پیچھے چلی جانا۔"

وہ فوراً ہی اس کے آگے آ کر بولی۔ "تم کیوں ڈھال بن رہے ہو' مجھے بچانے کے لئے گولی کھاؤ گے؟ مجھے خود غرض اور بے وفا سمجھتے ہو؟"

وہ بولا۔ "یہ کیا حرکت ہے' سامنے سے ہٹو۔ وہ کسی وقت بھی گولی چلا سکتے ہیں۔"

"نہیں ہٹوں گی' تم میرے لئے ڈھال بن کر دشمنوں سے لڑ سکتے ہو۔ کیا میں نہیں لڑ سکتی؟"

یہ کہتے ہی اس نے پلٹ کر ان دشمنوں کی طرف گولی چلائی۔ کبریا فوراً ہی ایک فائر کرتے ہوئے شاداں سے لپٹ کر زمین پر گرتے ہوئے' لڑھکتے ہوئے ایک درخت کی طرف جانے لگا۔ وہ دونوں انہیں دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے۔ جب وہ درخت کے پیچھے چلے گئے تو ایک نے کہا۔ "تم دونوں ایک دوسرے پر مرتے ہو۔ ہم کیا تمہیں ماریں گے؟ مارنا ہوتا تو گولی چلاتے۔"

دوسرے نے کہا۔ "ہم نے ایک بھی گولی نہیں چلائی ہے۔ ہم سامنے آ رہے ہیں۔ ہم بھی محبت کرنے والوں میں سے ہیں۔ ہم پر گولی نہ چلانا۔"

وہ دونوں پتھروں کے پیچھے سے نکل کر کھلی جگہ آ گئے۔ ایک نے کہا۔ "تمہارے ایک جھوٹ کے پیچھے سچ سمجھ میں آ گیا ہے۔ تم کھیڑہ بستی کے رہنے والے نہیں ہو۔ اس بستی میں کوئی مسلمان نہیں ہے۔ تم ہماری طرح مجاہد بھی نہیں ہو سکتے کیونکہ مجاہدین کے

ساتھ عورتیں نہیں ہوتیں۔"

کبریا نے درخت کے پیچھے سے کہا۔ "میں بھی سامنے آ رہا ہوں۔ تم نے خود کو مجاہدین کہا ہے' میں تم پر بھروسا کر رہا ہوں۔"

وہ شاداں کے ساتھ درخت کے پیچھے سے نکل آیا۔ ایک نے پوچھا۔ "کیا تم نے اپنا صحیح نام بتایا ہے؟ کیا تمہارا نام دین محمد ہے؟"

"یہ میرا نام نہیں ہے۔"

"تو پھر تم کبریا حسن ہو۔"

کبریا نے چونک کر پوچھا۔ "تم کیسے جانتے ہو؟"

دوسرے نے کہا۔ "تمہیں یہاں بائیس دنوں کے لئے لانچ کیا گیا تھا اور تم ایک ماہ سے لاپتا ہو۔ تمہاری ماں خط پر خط لکھ رہی ہے۔"

کبریا ریوالور پھینک کر دوڑتا ہوا آ کر اس سے لپٹ گیا۔ وہ دونوں اس سے مصافحہ کرنے اور اسے گلے لگانے لگے۔ ایک نے کہا۔ "میرا نام توقیر احمد ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ "مجھے ربانی کہتے ہیں۔ جب ہم وہاں سے چلے تھے تو تمہاری ماں کا خط آیا ہوا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ وہ تم سے ملنے آ رہی ہے۔ ہم تمہارے لئے بڑے فکرمند تھے۔"

توقیر نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے' تم زندہ سلامت ہو۔ ہم سے کہا گیا ہے کہ ہم یہاں اپنے فرائض انجام دینے کے دوران میں تمہیں تلاش کرتے رہیں۔"

کبریا نے کہا۔ "میں دیر سے واپس جا رہا ہوں مگر کامیاب و کامران جا رہا ہوں۔ یہاں سے کنٹرول لائن کتنے فاصلے پر ہے؟"

"یہاں سے کھیڑہ بستی دو کلو میٹر کے فاصلے پر ہے پھر وہاں سے چھ کلو میٹر کے فاصلے پر کنٹرول لائن ہے۔ شام ہو رہی ہے۔ ابھی سے برف باری ہونے لگی ہے۔ آدھی رات تک بستی میں رہنا ہو گا پھر تاریکی میں اور گہری دھند میں کنٹرول لائن پار کر سکو گے۔"

ربانی نے پوچھا۔ "کیا تمہارے پاس سرحدی تار کانٹوں کو کاٹنے والا آلہ ہے؟"

"نہیں ہے۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ کس طرح اپنے لوگوں سے رابطہ کروں گا۔ کس طرح کنٹرول لائن عبور کروں گا۔ تم دونوں میری رہنمائی کر سکتے ہو۔"

"فکر نہ کرو۔ ہم تمہیں ایک پلاس دیں گے۔ تم تار کانٹوں کو کاٹ سکو گے اور شاید اس کی ضرورت نہ پڑے۔ ہم وائرلیس کے ذریعے تنظیم کے دفتر سے رابطہ کریں گے۔ تمہارے بارے میں اطلاع دیں گے وہ تمہیں کنٹرول لائن پار کرا دیں گے۔"

وہ پتھروں کے پیچھے آئے۔ وہاں توقیر اور ربانی کے سفری بیگ رکھے ہوئے تھے۔ ایک وائرلیس سیٹ بھی تھا۔ وہ وہاں بیٹھ کر اسے آپریٹ کرنے لگے۔ رابطہ ہونے پر توقیر نے اپنا نام بتایا۔ کوڈ ورڈز ادا کئے پھر کہا۔ "کبریا حسن صحیح سلامت ہے۔ ابھی ہمارے ساتھ ہے۔ یہ آج رات کنٹرول لائن پار کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک خاتون بھی ہے۔"

دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ "ایک مجاہد کے ساتھ خاتون کہاں سے آ گئی۔ یہ ہمارے اصولوں کے خلاف ہے۔ میدانِ جنگ میں عورتیں اور بچے ساتھ نہیں رہتے۔ ان کی موجودگی نئے مصائب پیدا کرتی ہے۔"

کبریا نے توقیر سے مائیک لے کر کہا۔ "ہیلو ہیلو .... میں کبریا حسن بول رہا ہوں۔ میرے ساتھ میری شریکِ حیات ہے۔ میں اس کے ساتھ کنٹرول لائن پار کروں گا۔ اگر یہ آپ کے اصولوں کے خلاف ہے تو میں نہیں آؤں گا۔ میرے پاس ایک اہم ویڈیو فلم ہے۔ میں اسے توقیر اور ربانی کے حوالے کر رہا ہوں۔"

دوسری طرف ذرا دیر خاموشی رہی پھر کہا گیا۔ "انتظار کرو۔ ہم ابھی رابطہ کریں گے۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ تنظیم کے صدر دفتر میں بے چینی پیدا ہو گئی۔ ایک نے کہا۔ "یہ کبریا حسن جہاد کرنے گیا تھا یا شادی کرنے۔ وہ عورت مصیبت بن جائے گی۔ کنٹرول لائن پار نہیں کر سکے گی۔"

دوسرے مجاہد نے کہا۔ "اس نے پہلے ہی ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور اب ایک اہم ویڈیو فلم لے کر آ رہا ہے۔ اسے طعنے نہ دو۔ وہ شادی کرنے نہیں گیا تھا' حالات سے مجبور ہو گیا ہو گا۔"

ایک اور مجاہد نے کہا۔ "اسے جو فرائض ادا کرنے تھے وہ ان سے زیادہ کارکردگی کا مظاہرہ کر چکا ہے۔ مسئلہ اس عورت کا ہے۔ رات کو سخت برف باری ہوتی ہے۔ تاریکی اور دھند میں اندھے بن کر سرحدی دلال کے ساتھ آنا پڑتا ہے۔ وہ دلال ایک عورت کو

لانے پر راضی نہیں ہو گا۔ ایک عورت کی وجہ سے وہ خود گرفتار ہو سکتا ہے۔ وہ یہ خطر
مول لینا نہیں چاہے گا۔"

"پھر پتا نہیں وہ عورت کیسی ہو۔ وہ بھارتی جاسوسہ ہو سکتی ہے۔ وہ دھوکا کھا رہا ہو
ہم بھی دھوکا کھائیں گے۔"

"ہم دھوکا نہیں کھائیں گے۔ اسے آزمائیں گے۔ جاسوسہ ہو گی تو گولی مار د
گے۔"

ایسے وقت کبریا کی ماں دفتر میں آئی۔ ان سے پوچھا۔ "میرے بیٹے کی کوئی خبر ملی؟"

"جی ہاں۔ آپ کے لئے خوشخبری ہے۔ کبریا حسن زندہ سلامت ہے۔ انشاء اللہ ک
تک یہاں آ جائے گا۔ ماں کی دعائیں خالی نہیں جاتیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول ک
لی ہے۔"

وہ خوشی سے کھل گئی۔ "یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ میں ابھی جا کر شکرانے کی نما
پڑھوں گی۔"

ایک نے پوچھا۔ "کیا مقبوضہ کشمیر میں آپ کا کوئی رشتے دار ہے؟"

"نہیں، کوئی ہوتا تو یہ اطمینان رہتا کہ بیٹا گم نہیں ہوا ہے۔ اپنے رشتے داروں ک
پاس ہے۔"

"اس نے وہاں شادی کر لی ہے۔"

"کیا؟" وہ حیران ہوئی پھر خوش ہو کر بولی۔ "اس کا مطلب ہے، میرا بیٹا خوش ہے
صحت مند ہے، کیا میری بہو کو ساتھ لا رہا ہے؟"

"وہ لانا چاہتا ہے مگر ہم تشویش میں مبتلا ہیں۔"

ماں نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ایک نے کہا۔ "کنٹرول لائن کا راستہ بہ
دشوار گزار ہے۔ رات کے وقت برف باری اور گہری دھند میں ایک عورت سفر نہیں ک
سکے گی۔ کوئی بُرا وقت آئے تو بھاگنا اور چھپنا پڑتا ہے۔ آپ کی بہو ایسا نہیں کر سکے گی
سرحدی دلال کے لئے مصیبت بن جائے گی۔ اس کے ساتھ آپ کا بیٹا بھی گرفتار ہو
ہے۔ اس کے ساتھ مارا جا سکتا ہے۔"

وہ خوف سے لرز گئی۔ "نہیں، میرا بیٹا زندہ سلامت آئے گا۔ پتا نہیں اس ن

شادی کیوں کی، یہاں آ کر کر سکتا تھا۔ اس سے کہو دلہن کو میکے چھوڑ کر آئے۔ وہ بعد میں
آ جائے گی۔ میں اس کے لئے تڑپ رہی ہوں۔"

وہ سب ایک دوسرے سے مشورہ کرنے لگے کہ یہی مناسب رہے گا۔ وہ فی الحال
اپنی دلہن کو میکے میں چھوڑ دے۔ وہ پھر کبھی آ جائے گی۔ وہ وائرلیس کے ذریعے پھر رابطہ
کرنے لگے۔ تیز برفانی ہواؤں کے باعث رابطے میں دشواری ہو رہی تھی۔ انہیں دوسری
طرف سے توقیر کی آواز سنائی دی۔ ادھر سے کہا گیا۔ "کبریا سے کہو، حالات مؤافق نہیں
ہیں۔ وہ اپنی شریکِ حیات کو فی الحال میکے میں چھوڑ دے، ہم اسے بعد میں لے آئیں
گے۔"

توقیر نے کہا۔ "دلہن کا کوئی میکا نہیں ہے۔ کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ کبریا اسے بے
یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔ میں اس سے بات کر چکا ہوں۔"

"اسے سمجھاؤ، اسے یہاں لانے والا ایجنٹ ایک عورت کو لانے کے لئے راضی نہیں
ہو گا۔"

دوسری طرف سے کبریا کی آواز سنائی دی۔ "میں ایجنٹ کو منہ مانگی رقم دوں گا۔
آپ اسے راضی کریں۔"

"ہم اس سے معاملہ طے کریں گے۔ وہ راضی نہ ہوا تو تم یہاں تنہا آؤ گے۔"

"میں نہیں آؤں گا، ویڈیو کیسٹ توقیر اور ربانی کو دے دوں گا۔ میرا فرض پورا ہو
جائے گا۔"

ماں نے کہا۔ "وہ آئے گا، ضرور آئے گا، یہ کیسی باتیں کر رہا ہے۔ کیا ماں کو چھوڑ کر
دشمنوں میں بیوی کے ساتھ رہے گا۔ مجھے اس سے بات کرنے دو۔"

ایک نے کہا۔ "موسم خراب ہے۔ آپ دیکھ رہی ہیں۔ کتنی مشکل سے باتیں ہو
رہی ہیں۔"

وہ اس سے مائیک لے کر اپنے منہ کے قریب لا کر چیخ چیخ کر بولنے لگی۔ "بیٹے کبریا
سن! میں تمہاری ماں بول رہی ہوں۔ اتنے خراب موسم میں تمہیں تلاش کرتی ہوئی آئی
ہوں۔ کیا میرے پاس نہیں آؤ گے، مجھے چھوڑ کر وہیں رہ جاؤ گے؟"

"اماں! میں تمہاری بہو لے کر آ رہا ہوں، اسے یہاں چھوڑ کر وہیں آؤں گا۔"

"بیٹے مجھے بہو کی خوشی ہے مگر اسے زحمت نہ بناؤ۔ بعد میں رحمت بن کر آنے دو۔"

شاداں دوسری طرف یہ باتیں سن رہی تھی۔ یہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ اب اپنے کبریا کے لئے مصیبت بن رہی ہے۔ وہ تنہا آزاد کشمیر جا سکتا ہے۔ ماں کے گلے لگ سکتا ہے۔ بچھڑے مل سکتے ہیں لیکن وہ ماں بیٹے کو جدا کر رہی ہے۔ وہ بولی۔ "کبریا ماں سے وعدہ کرو، تم تنہا آ رہے ہو۔"

کبریا نے کہا۔ "تم چپ رہو۔ کیا میں نے تمہیں چھوڑ کر جانے کے لئے دلہن بنایا ہے؟"

توقیر نے وائرلیس کے ذریعے کہا۔ "آپ ایجنٹ سے بات کریں۔ ہو سکتا ہے، ان دونوں کو لے جانے کے لئے راضی ہو جائے۔ جب راضی نہیں ہو گا تب دیکھا جائے گا۔ موسم بہت خراب ہے۔ میں انہیں پناہ گاہ کی طرف لے جا رہا ہوں۔ ایجنٹ سے بات کر کے بتائیں۔ وہ آج رات کب تک آئے گا۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ شاداں نے کہا۔ "کبریا ضد نہ کرو، میں آج نہیں تو کل کسی طرح بھی آ جاؤں گی۔"

کبریا نے کہا۔ "میں تم سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ یہ مجاہدین اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے آگے چلے جائیں گے۔ میں ماں کی گود میں پہنچ جاؤں گا۔ تمہارا کہاں ٹھکانا ہو گا؟ ان ویرانوں میں بھٹکتی رہو گی۔ دشمن عزت بھی لیں گے، جان بھی لیں گے۔ کیا تم مجھے بے غیرت سمجھتی ہو؟"

توقیر نے کہا۔ "بے شک مردانگی یہ گوارا نہیں کرتی کہ مشکل وقت میں اپنی عورت کو تنہا چھوڑ دیا جائے۔ ہو سکتا ہے ایجنٹ راضی ہو جائے۔ اگر راضی نہ ہوا تو کیا ہو گا؟"

"میں ایجنٹ کے بغیر کنٹرول لائن پار کروں گا۔ ہر حال میں شاداں کو لے جاؤں گا۔"

"پاگل ہو رہے ہو۔ ایک تو کنٹرول لائن تک پہنچنا ہی دشوار ہو گا۔ بھارتی فوج سے ٹکراؤ ہو سکتا ہے۔ تاریکی اور دھند میں پتا نہیں چلے گا کہ سنسناتی ہوئی گولیاں کہاں سے آ رہی ہیں۔"

ربانی نے کہا۔ "کارگل سے بھمبر تک کنٹرول لائن ہے۔ اُدھر تار کانٹے لگے ہوئے

ہیں۔ بھارتی فوجی چوکس رہتے ہیں۔ باقی سرحدی علاقوں میں تار کانٹے نہیں ہیں۔ سینکڑوں میل تک پھیلی ہوئی سرحد پر باقاعدہ پہرہ نہیں رہتا۔ سرحد کے چپے چپے پر پہرا لگانے کے لئے لاکھوں فوجی جوانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے مسلسل پہرا نہیں رہتا۔ پٹرولنگ آرمی کے جوان کبھی کبھی ادھر سے گزرتے ہیں۔ سرحدی دلال جانتے ہیں کہ کس وقت کس جگہ سے سرحد پار کرنی چاہئے۔ تم یہاں کے راستے نہیں جانتے ہو۔ بھٹک کر دشمنوں کے چنگل میں پھنس جاؤ گے۔ ایجنٹ کے بغیر ادھر جانا نادانی ہو گی۔"

کبریا نے کہا۔ "ہمیں کسی پناہ گاہ میں پہنچا دو۔ میں سوچوں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔"

وہ سب اپنا سامان اٹھا کر وہاں سے ایک سمت جانے لگے۔ توقیر نے کہا۔ "معاملہ طے ہو جائے گا تو ابھی وائرلیس پر بتا دیا جائے گا کہ ایجنٹ آدھی رات کے بعد کب آئے گا اور تم دونوں کے کوڈ ورڈز کیا ہوں گے۔ تمام معاملات طے ہونے کے بعد ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔"

وہ شاداں کے ساتھ سر جھکائے توقیر اور ربانی کے پیچھے جا رہا تھا۔ یہ طے کر چکا تھا کہ جان جائے یا رہے اپنی جان کو یہاں چھوڑ کر تنہا نہیں جائے گا۔

☆======☆======☆

اس فوجی جیپ میں مکھیا کی جوان بیٹی کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جیپ تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ وہ بڑی دیر تک چیختی چلاتی اور تڑپتی رہی۔ کسی طرح خود کو چھڑا کر جیپ سے کود کر بھاگ جانے کی کوششیں کرتی رہی۔ افسر قہقہے لگا رہا تھا۔ چوہے بلی کا کھیل کھیل رہا تھا۔ کبھی اسے بھاگنے کے لئے ڈھیل دے رہا تھا، کبھی دبوچ رہا تھا۔ یوں شکار کو بے بس کر کے مزے لے رہا تھا۔

اس نے کئی کلو میٹر دور آنے کے بعد کہا۔ "بڑی بھرپور ہے، بڑی گرم ہے۔ یہ جہاں رہتی ہو گی وہاں برف پگھل جاتی ہو گی۔ میں بھی پگھل رہا ہوں۔ جیپ روکو، میں اسے جھاڑیوں کے پیچھے لے جاؤں گا۔"

جیپ رک گئی۔ افسر نے اتر کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ وہ خود کو چھڑانے لگی۔ اس نے کہا۔ "بجلی کی طرح مچلتی ہے، کیا نام ہے تیرا؟"

جبار جان نے کہا۔ "میں نے بستی میں سنا ہے اس کا نام پلوی ہے۔ حضور نام سے کیا
لینا ہے۔ کام سے کام رکھیں پھر جلدی نکل چلیں۔ وہ آتنک وادی شاداں کے ساتھ آگے
گیا ہے۔ ہم اندھیرا ہونے سے پہلے اسے گھیر سکیں گے۔ وہ کتا کل سے ہمیں اپنے پیچھے
دوڑا رہا ہے۔"

افسر پلوی کو کھینچ کر لے جا رہا تھا۔ وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس کی پٹائی کرنے
لگا۔ "سالی نخرے کرتی ہے۔"

وہ اسے مارتا جا رہا تھا اور بولتا جا رہا تھا۔ "تیرا باپ مجھے آنکھیں دکھا رہا تھا۔ وہ بڑھ
ہم سب کو کتا کہہ رہی تھی۔ اب ہم دکھائیں گے کہ کیا ہیں۔ میرے بعد سب ہی تجھے
بھنبھوڑیں گے۔ آخر کتے ہیں۔ چودہ انجکشن ضرور لگیں گے۔ تجھے تو مرنا ہی مرنا ہے۔"

وہ اسے ہاتھوں سے اور بھاری بھرکم فوجی جوتوں سے مار رہا تھا۔ وہ مار کھاتے کھاتے
بے حال ہو گئی۔ وہ اسے جھاڑیوں کی طرف گھسیٹ کر لے جاتے ہوئے بولا۔ "کوئی ہم پر
الزام نہیں دے گا کہ ہم نے اس بستی سے تجھے اغوا کیا ہے۔ تیری بستی میں تو آتنک
وادی آتے ہیں۔ تیرا مکھیا باپ انہیں پناہ دیتا ہے۔ ایسے ہی ایک آتنک وادی نے تجھے
یہاں لا کر مار ڈالا ہے۔"

اس لڑکی میں جدوجہد کرنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ "مجھ پر
ظلم نہ کرو۔ تم تو ہمارے فوجی ہو۔ ہماری رکشا کے لئے ہو۔ ہمارا دھرم ایک ہے' ہمارا
کرم ایک ہونا چاہئے۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔ ہمارا دھرم ایک ہے' میں اپنے دھرم کی لڑکی کی عزت نہیں لوٹ
رہا ہوں۔ دنیا والوں کو یہی معلوم ہو گا کہ یہاں آنے والے مسلمان آتنک وادی دہشت
بھی پھیلاتے ہیں اور ہندو ناریوں کی عزت سے بھی کھیلتے ہیں۔ چل تُو مجھے بھی آتنک
وادی سمجھ لے۔"

وہ اپنی عزت بچانے کے لئے جتنی جدوجہد کر سکتی تھی' کر چکی تھی۔ مار کھاتے
کھاتے زخمی ہوتی رہی تھی۔ بالکل نڈھال ہو گئی تھی۔ اب اس میں حوصلہ نہیں رہا تھا۔
آخری وقت خدا ہی یاد آتا ہے۔ اس نے بڑے کرب سے پکارا "ہے بھگوان.........!"

اچانک اس افسر کے حلق سے کراہ نکلی۔ ایک کلہاڑی کا پھل اس کے سر پر پڑ

ہو گیا تھا۔ اس کے دیدے پھیل گئے تھے۔ ایسی کاری ضرب لگائی گئی تھی کہ اس کے منہ
سے پھر دوسری آواز نہیں نکل سکی۔ وہ ایک طرف ڈھلک کر زمین پر آ گیا۔

پلوی ایک دم سے ساکت ہو گئی تھی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا سامنے
ایک لمبا تڑنگا جوان کھڑا ہوا تھا۔ اس کی کلہاڑی کا پھل لہو میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ کلہاڑی کو
ایک طرف پھینک کر افسر کا ریوالور اٹھا رہا تھا۔ افسر ہاتھ پاؤں جھٹک کر تڑپ رہا تھا۔ اس
جوان نے اپنے ایک پاؤں کو اس کی ٹھوڑی کے نیچے حلق پر رکھ کر زور سے دبایا۔ وہ ایک
دم سے ساکت ہو گیا پھر اس نے اپنی کمبل نما شال اتار کر پلوی پر ڈالی۔ وہ اس شال کو
اپنے بدن سے لپیٹتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس جوان نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

"میرا نام پلوی ہے۔ میں پربت کے مکھیا کی بیٹی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگی۔ کہنے لگی۔
"تم بھگوان کا روپ ہو۔ تم نہ آتے تو یہ میری عزت بھی لیتا اور جان بھی لے لیتا۔ تم
میرے لئے دیوتا سمان ہو۔"

وہ اسے قدموں سے اٹھاتے ہوئے بولا۔ "میں دیوتا نہیں ہوں۔ دلبر ہوں۔ میرا نام
دلبر خان ہے۔ تمہاری بستی کی طرف جا رہا تھا۔ یہ تماشا دیکھنے کے لئے رک گیا۔"

پلوی نے مردہ افسر کی طرف دیکھا پھر کہا۔ "جھاڑیوں کے اس پار اس کے سپاہی
ہیں۔ سب کے پاس بندوقیں ہیں۔"

"جانتا ہوں۔ میں انہیں بھی دیکھ چکا ہوں۔ ان سے بھی نمٹنا ہو گا۔"

"وہ چار ہیں۔ ہمیں مار ڈالیں گے۔ یہاں سے چپ چاپ نکل چلو۔"

"نکلنے کا راستہ کہاں ہے۔ اس جھاڑی کے آگے کھلا میدان ہے۔ کہیں بھی
جھاڑیاں' پتھر اور ٹیلے نہیں ہیں۔ ہم چھپ کر نہیں جا سکیں گے۔ یہ ہمیں دوڑا دوڑا کر
ماریں گے۔ یہ چھپنے کی جگہ ہے۔ یہاں میں کچھ کر سکوں گا۔ خدا کو منظور ہو گا تو ہم یہاں
سے بچ نکلیں گے۔"

وہ جھاڑیوں کے پیچھے ایک طرف جا کر دیکھنے لگا۔ دور سڑک کے کنارے جیپ کھڑی
ہوئی تھی۔ وہاں جبار جان تین سپاہیوں کے ساتھ کھڑا ہوا باتیں کر رہا تھا۔ ہنستے ہوئے کہہ
رہا تھا "ہمارا صاحب بڑا رنگیلا ہے۔ مزے لوٹ رہا ہے۔"

ایک سپاہی نے کہا۔ "تمہاری رال کیوں ٹپک رہی ہے۔ صاحب کا جھوٹا تو ہم ہی رہتا ہے۔"

"ہاں مگر بڑی دیر ہو رہی ہے۔ اس آتنگ وادی کے پیچھے جانا ہے۔ ذرا آگے جا صاحب کو آواز دے۔ نہیں تو وہ چھوکری سے چپک کر رہ جائے گا۔"

دو سپاہی وہاں سے چلتے ہوئے جھاڑیوں کی طرف آنے لگے۔ دلبر خان نے سرگ میں پلوی سے کہا۔ "زمین پر لیٹ جاؤ' جلدی کرو۔"

وہ اس کے قریب زمین پر لیٹ گئی۔ اس نے جھاڑی کے پیچھے سے نشانہ لیا پھر گ چلا دی۔ ٹھائیں کی آواز کے ساتھ سپاہی کے حلق سے کراہ نکلی۔ وہ اچھل کر زمین پر پڑا۔ اس نے دوسری گولی چلانے میں دیر نہیں کی تھی۔ دوسرے کو سنبھلنے کا موقع نہیں تھا۔ دوسری گولی چلتے ہی وہ بھی لڑکھڑاتا ہوا پیچھے جا کر گر پڑا۔ فائرنگ کی پہلی آواز پر جبار جان دوڑتا ہوا جیپ کے پیچھے آ کر چھپ گیا تھا۔ تیسرا سپاہی چیخ کر پوچھ رہا تھا۔ "کیا ہے؟ کون فائرنگ کر رہا ہے؟ سر ادھر تو آپ ہیں' کیا آپ نے فائرنگ کی ہے؟"

دلبر خان نے پلوی سے کہا۔ "تم ان سے بولو۔ انہیں ادھر بلاؤ۔"

وہ زمین پر لیٹے ہی لیٹے بولی۔ "میں نے فائرنگ کی ہے۔ تم اپنے صاحب کے ایک ایک کر کے میرے پاس آنا چاہتے تھے .... آ جاؤ .... ایک ایک کر کے آ رہو۔"

جبار جان نے چیخ کر پوچھا۔ "پلوی ہمارا صاحب خاموش کیوں ہے؟ بولتا کیوں نہیں ہے؟"

وہ بولی۔ "میرے پاس آؤ۔ تم بھی بولنا بھول جاؤ گے۔"

جبار جان نے سپاہی سے کہا۔ "آگے نہ جانا۔ اس لڑکی نے کوئی گڑبڑ کی ہے۔ صاحب کی آواز نہیں آ رہی ہے۔ تم ایک لمبا چکر کاٹ کر جھاڑی کے پیچھے جاؤ۔"

سپاہی نے کہا۔ "میں اکیلا جاؤں اور تم یہاں چھپے رہو گے؟"

"میں سپاہی نہیں ہوں' مخبری کرتا ہوں۔ اس آتنگ وادی کو صورت سے ہوں۔ اسی لئے مجھے اس کے پیچھے بھیجا گیا ہے۔ تمہیں جانا ہے تو جاؤ ورنہ صاحب کو کر بھاگ جاؤ۔"

وہ سپاہی ایک طرف چلتا ہوا ایک لمبا چکر کاٹتا ہوا اس جھاڑی کی طرف جانے لگا۔ دلبر خان بھی اپنی جگہ بدل رہا تھا۔ اسے دیکھتا جا رہا تھا پھر اس نے اندازہ کیا کہ وہ شوٹنگ رینج میں ہے۔ تب اس نے گولی چلا دی۔

دلبر خان سے اندازے کی غلطی ہوئی تھی۔ وہ رینج میں نہیں تھا' اسے گولی لگی۔ وہ زخمی ہو کر ایک طرف بھاگنے لگا پھر ایک جگہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ جبار جان کی سمجھ میں آیا کہ وہ بھی گولی کھا کر گر پڑا ہے۔ یہ فائرنگ پلوی نہیں کر رہی ہے ایک یا ایک سے زیادہ لوگ اس کی مدد کے لئے آ گئے ہیں۔ وہاں سے بھاگ جانا دانشمندی ہو گی۔

اس نے جیپ میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا پھر ڈرائیو کرتے ہوئے آگے جانے لگا۔ سپاہی نے اٹھتے ہوئے آواز دی۔ "روکو جبار جان گاڑی روکو' مجھے بھی لے چلو۔"

مگر اس نے سنی ان سنی کر دی۔ گاڑی کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ اس کا یہ یقین پختہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی کے ہاتھوں مارا نہیں جائے گا۔ اب تک یہی ہوتا آ رہا تھا جو اسے مارنے آتا تھا' وہ خود مر جاتا تھا یا پھر وہ دشمن سے بچ نکلتا تھا۔ جیسا کہ اب جان بچا کر جا رہا تھا۔

☆======☆======☆

شاداں اور کبریا لکڑی کے ایک چھوٹے سے مکان میں تھے۔ توقیر اور ربانی نے پھر وائرلیس پر رابطہ کیا تھا۔ ادھر سے کہا گیا تھا کہ ایجنٹ راضی نہیں ہو رہا ہے۔ وہ کسی عورت کے لئے خطرہ مول لینا نہیں چاہتا ہے۔

توقیر اور ربانی سے کہا گیا۔ "وہاں شاداں کا کوئی تو ہو گا۔ وہ دونوں اسے اس کے کسی عزیز کے ہاں پہنچا دیں۔ ایجنٹ صرف کبریا کو آج رات دو بجے سرحد پار کرائے گا۔"

بات پوری نہیں ہو سکی تھی۔ وائرلیس میں خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ توقیر اور ربانی بڑی دیر تک اس کی خرابیاں دور کرنے کی کوششیں کرتے رہے لیکن وہ قابلِ استعمال نہ بن سکا۔ آخر ربانی نے کہا۔ "کوئی ماہر مکینک ہی اسے ٹھیک کر سکے گا۔ یہ ہمارے بس کا نہیں ہے۔"

توقیر نے کہا۔ "چلو اس حد تک بات ہو گئی کہ ایجنٹ رات کے دو بجے تک یہاں آنے والا ہے۔ اب ہم یہاں سے جائیں گے۔ شاداں کو ہمارے ساتھ چلنا چاہئے۔"

کبریا نے کہا۔ "شاداں نہیں جائے گی۔ تم دونوں نے ہمارا بڑا ساتھ دیا ہے۔ ہم

تمہیں ہمیشہ یاد رکھیں گے۔"

ربانی نے کہا۔ "کبریا ضد نہ کرو۔ شاداں ہماری بہن ہے۔ ہم ایک مسلمان کے گھر میں اسے لے جائیں گے۔ وہ اچھے لوگ ہیں۔ اسے بیٹی اور بہن بنا کر رکھیں گے۔ شاداں! تم حالات کو سمجھ رہی ہو۔"

"سمجھ رہی ہوں۔ تمہارے ساتھ جاؤں گی۔"

کبریا نے کہا۔ "بکواس مت کرو۔ تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گی۔"

"میں پھر آ جاؤں گی۔ کتنے ہی ستم رسیدہ قافلے سرحد پار کر کے آزاد کشمیر جاتے ہیں۔ میں بھی کسی قافلے کے ساتھ آ جاؤں گی۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہوں گی۔ وعدہ کرتی ہوں' جلد ہی آؤں گی۔"

کبریا نے کہا۔ "چلو میں بھی واپس چلتا ہوں۔ ہم کسی دن کسی ستم رسیدہ قافلے کے ساتھ سرحد پار کریں گے۔"

"ضد نہ کرو۔ سرحد کے پار تمہاری والدہ انتظار کر رہی ہیں۔ کچھ ان کا تو خیال کرو۔"

"اماں کا خیال رکھنے کے لئے ابا زندہ سلامت ہیں۔ تمہارا خیال رکھنے والا کون ہے۔ میں نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر تمہیں شریکِ حیات بنایا ہے۔ ساری زندگی تمہارا شریک رہوں گا۔"

توقیر نے کہا۔ "تم اپنی ضد میں اپنے فرائض بھول رہے ہو۔ وہ ویڈیو کیسٹ ہمارے دفتر تک کیسے پہنچے گی۔"

"اسے میں لایا ہوں۔ یہ میری ذمے داری ہے۔ میں ہر حال میں اسے پہنچاؤں گا۔ مجھ سے بحث کرنے میں وقت ضائع نہ کرو۔ دو میں سے کوئی ایک بات ہو گی۔ شاداں میرے ساتھ سرحد پار کرے گی یا میں اس کے ساتھ یہیں رہ جاؤں گا۔"

شاداں نے کہا۔ "نہیں کبریا آج تمہیں ہر حال میں اس پار جانا ہے۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

توقیر اور ربانی نے ایک دوسرے کو دیکھا اور کہا۔ "مجاہد کو عاشق نہیں بننا چاہئے اور عاشق کو مجاہد نہیں بننا چاہئے۔"

"ہم جا رہے ہیں۔ یہاں ہوشیار رہنا۔ اس ویرانے میں یہی ایک کاٹیج ہے۔ پٹرولنگ پولیس کی گاڑی ادھر سے گزر سکتی ہے۔"

وہ دونوں اپنا اپنا بیگ اٹھا کر اس سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔ وہ لکڑی کا ایک بہت ہی شکستہ سا مکان تھا۔ صرف ایک کمرے کی چھت سلامت تھی۔ دیواریں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ وہاں کبھی کوئی رہتا ہو گا۔ اب وہاں سردیوں میں برف جمی رہتی ہے۔ ادھر کوئی نہیں آتا۔ کبھی مجاہدین ادھر سے گزرتے ہیں تو تھوڑی دیر کے لئے رک جاتے ہیں مگر دیر تک وہاں نہیں رہتے۔ ایسی جگہ جاسوس یا پٹرولنگ پولیس والے ضرور آتے ہیں۔ وہ بھی وہاں چند گھنٹے گزارنے رکے تھے۔ آدھی رات کے بعد جانے والے تھے۔

اس کمرے میں ایک پرانی سی لالٹین کی روشنی تھی۔ اس روشنی میں ٹوٹا پھوٹا سامان بکھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ کبریا لالٹین اٹھا کر اس کمرے میں ہر طرف جا کر دیکھنے لگا۔ ایک صندوق میں کچھ سامان کے ساتھ ایک لمبا سا چھرا رکھا ہوا تھا۔ وہ کسی وقت کام آ سکتا تھا۔ اس نے اسے اٹھا لیا۔ ایک مضبوط اور موٹی رسیوں کا بنڈل رکھا ہوا تھا۔ اس نے اس بنڈل کو اٹھا کر کہا۔ "یہ رسی بھی کام آ سکتی ہے۔"

شاداں ایک کھاٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "یہ کس کام آئے گی۔"

"باہر برف گر رہی ہے۔ ہم برف پر چلیں گے تو پتا نہیں چلے گا کہ آگے کوئی گڑھا ہے یا نہیں۔ ایسے کسی گڑھے میں گرنے والا برف کے اندر ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ ایسی مضبوط رسی ہو تو اسے تھام کر باہر آ سکتا ہے۔"

وہ بولی۔ "میرے پاس آؤ' میں اکیلی ہوں۔"

وہ اس کے پاس آ کر کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ لالٹین کو بجھا کر بولا۔ "یہاں روشنی دیکھ کر کوئی آ سکتا ہے۔"

شاداں قریب آ کر اس سے لگ گئی۔ کہنے لگی۔ "مجھے کیوں اتنا چاہتے ہو؟ تمہاری چاہت دیکھ کر میں جیسے ہواؤں میں اڑ رہی ہوں۔ مجھے جتنی خوشی ہو رہی ہے اتنے ہی اندیشے بڑھ رہے ہیں۔"

وہ کچھ نہ بولا۔ اسے اپنے جسم و جان سے لگائے رہا۔ اس کی سانسوں میں سماتا رہا اور اسے اپنی سانسوں میں اتارتا رہا۔ وہ بولی۔ "تمہیں کچھ تو سوچنا چاہئے۔ اب بھی وقت

ہے۔ مجھے چھوڑ دو' جانے دو۔"

وہ زبان سے نہیں بول رہا تھا۔ گونگی محبتوں سے سمجھا رہا تھا کہ وہ اسی طرح محبتیں دیتا رہے گا اور مصیبتوں سے لڑتا رہے گا۔ وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ جذبوں کے ہجوم میں نہ کچھ بولا جاتا ہے۔ نہ کچھ سنا جاتا ہے۔ چپ لگ جاتی ہے۔

بڑی دیر تک خاموشی رہی۔ وقت کا پتا نہیں چل رہا تھا کہ کتنا وقت گزرتا جا رہا ہے۔ وہ بڑی دیر سے تاریکی میں تھے اور اب صبح تک تاریکی میں رہنا تھا اور سفر کرنا تھا۔ انہیں اس کمرے سے ایک ایک لاٹھی بھی مل گئی تھی۔ کبریا نے کہا۔ "اسے برف میں ٹیک ٹیک کر آگے بڑھتے رہیں گے تو کسی گڑھے یا کھائی کا پتا چلتا رہے گا۔"

شاداں نے کہا۔ "میں غسل خانے جاؤں گی۔' تم یہاں بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

"شرم نہیں آتی۔ وہاں بھی میرے ساتھ جاؤ گے؟ چپ چاپ بیٹھے رہو۔"

وہ ایک لاٹھی لے کر جانے لگی۔ دونوں اندھیرے کے عادی ہو گئے تھے۔ سمت کا اندازہ تھا۔ وہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔ غسل خانے کی ٹوٹی ہوئی چاردیواری باہر تھی۔ کبریا نے چھرے کو بیگ میں رکھا۔ رسی کے بنڈل میں ہاتھ ڈال کر اسے ایک شانے سے لٹکایا پھر بیگ اور لاٹھی اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ شاداں کے غسل خانے سے نکلتے ہی وہاں سے جانا تھا۔ شاید آدھی رات ہو گئی تھی۔

اس نے طے کیا تھا کہ ایجنٹ کا انتظار نہیں کرے گا۔ جب وہ شاداں کے کام نہیں آ سکتا تھا تو پھر اس سے کوئی کام نہیں لینا چاہتا تھا۔ وہ لاٹھی ٹیکتا ہوا دروازے سے باہر آیا۔ دائیں طرف غسل خانہ تھا۔ تاریکی اور گہری دھند کی وجہ سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "شاداں میں نے سارا سامان اٹھا لیا ہے۔ اب یہاں سے چلنا ہے۔"

جہاں وہ گئی تھی۔ وہاں چپ رہا جاتا ہے۔ کسی بات کا جواب نہیں دیا جاتا۔ کبریا کو جواب نہیں ملا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا۔ "کیا صبح تک وہیں رہنے کا ارادہ ہے۔"

جواب میں خاموشی رہی۔ اس نے کہا۔ "بھئی کچھ تو بول سکتی ہو۔ ہوں' ہاں تو کر سکتی ہو۔"

نہ ہوں کی آواز آئی نہ ہاں کی' مسلسل خاموشی رہی۔ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ تم بولتی کیوں نہیں ہو؟ شاداں! کچھ بولو نہیں تو میں آ رہا ہوں۔"

پھر بھی وہ نہ بولی۔ وہ جیب سے پنسل ٹارچ نکال کر اسے روشن کرتے ہوئے غسل خانے میں آیا۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ اس نے پریشان ہو کر پکارا۔ "شاداں!"

وہ اس سے جھوٹ بول کر اسے دھوکا دے کر اس مکان سے چلی آئی تھی۔ بڑی دیر تک کشمکش میں رہنے کے بعد یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ چھوڑ کر جائے گی تو کبریا اسے ڈھونڈتا رہے گا۔ آخر کب تک ڈھونڈے گا۔ آج نہیں تو کل تھک ہار کر مایوس ہو کر اس پار چلا جائے گا۔

وہ مکان سے باہر آ کر اسے پکارنے لگا۔ سوچنے لگا۔ بار بار پکارنا نادانی ہو گی۔ دشمنوں تک اس کی آواز پہنچ سکتی ہے۔ وہ لاٹھی ٹیک کر آگے بڑھتے ہوئے دھیمی آواز میں بولنے لگا۔ "شاداں! تم یہیں آس پاس ہو۔ میری آواز سن رہی ہو۔ مجھے پریشان نہ کرو۔ آ جاؤ۔"

آس پاس نظر نہیں آ رہا تھا پھر بھی وہ اِدھر اُدھر دیکھنے کی ناکام کوشش کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ "شاداں! میں سمجھ گیا۔ تم میرے لئے مصیبت نہیں بننا چاہتیں۔ تم نے یہ سوچ لیا کہ مجھ سے دور ہو جاؤ گی۔ کہیں گم ہو جاؤ گی تو میں مایوس ہو کر چلا جاؤں گا۔ تم سن رہی ہو تو سن لو۔ میرے پاس نہیں آؤ گی تو میں اس پار نہیں جاؤں گا۔ میں بیمار ہوں شاداں! تم نے یہ نہیں سوچا کہ ایک بیمار کو چھوڑ کر جا رہی ہو۔"

ہر طرف ملگجی دھند تھی' سناٹا تھا' ویرانی تھی۔ اس ویرانے میں وہ بولنے والا تھا۔ سننے والی نہیں تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ایک اندھے کی طرح لاٹھی ٹیکتا ہوا کہاں جا رہا ہے۔ راستہ کہاں ہے۔ منزل کہاں ہے۔ کچھ پتا نہ تھا۔ اب تو منزل وہی ہوتی جہاں وہ مل جاتی۔

اسے وقت کا اندازہ نہیں تھا۔ ویسے آدھی رات ہو چکی تھی۔ باقی آدھی رات بھی اپنے وقت پر گزرنے والی تھی۔ شاداں لاٹھی ٹیکتے ہوئے اس مکان سے نکل آئی تھی۔ یہ جانتی تھی کہ آگے جا کر پتا نہیں کب تک بھٹکنا ہے۔ ویسے بھٹکتے ہوئے کسی نہ کسی بستی تک پہنچ سکتی تھی۔ مسلمانوں کے کسی گھر میں پناہ مل سکتی تھی۔ اگر بھارتی فوجی اس کا محاسبہ کرتے تو وہ کہہ دیتی اپنے شوہر سے بچھڑ گئی ہے۔ پتا نہیں وہ کہاں چلا گیا ہے۔ زیادہ

سے زیادہ یہ ہوتا کہ ایک مجاہد کا ساتھ دینے کے جرم میں اسے گولی مار دی جاتی۔

کبریا کے بغیر جینا مرنا برابر تھا۔ موت کا ذرا بھی ڈر ہوتا تو وہ ایسا قدم نہ اٹھاتی۔ اب وہ یہی دعا مانگ رہی تھی کہ کبریا اسے دیوانے کی طرح تلاش نہ کرے۔ جلد ہی مایوس ہو کر چلا جائے۔

وہ کہیں بھٹک رہا تھا۔ یہ کہیں بھٹک رہی تھی۔ ہو سکتا تھا دونوں ایک دوسرے سے دور نہ ہوں۔ شاید پکارنے سے ایک دوسرے تک آواز پہنچ سکتی ہو لیکن پکارنا نادانی ہوتی۔ اس لئے کبریا خاموش تھا۔ گھڑی کے کانٹے چیونٹی کی رفتار سے بہت آہستہ آہستہ چلتے ہیں مگر انسانی رفتار سے آگے نکل جاتے ہیں۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ ایک جگہ مرغ کی بانگ سنائی دی۔ وہ چلتے چلتے رک گئی۔ دو باتوں کا اندازہ ہوا کہ صبح ہونے والی ہے اور کوئی بستی کہیں قریب ہی ہے۔

کبریا بھی چلتے چلتے ٹھٹک گیا۔ اس نے بھی مرغ کی بانگ سنی تھی۔ جدھر سے آواز آئی تھی ادھر کوئی بستی ہو گی۔ اس کے دل نے پوچھا۔ ”کیا شاداں یہاں پہنچی ہو گی؟“

دوسری طرف شاداں کھڑی ہوئی سوچ رہی تھی۔ کیا مجھے بستی میں جانا چاہئے؟ پتا نہیں یہاں کے لوگ کیسے ہوں گے؟ اسے پناہ دیں گے یا نہیں؟

دور ایک لالٹین کی روشنی دکھائی دی۔ کوئی دروازہ کھول کر باہر آیا تھا۔ وہ دھندلی روشنی سے اندازہ کر رہی تھی کہ لالٹین روشن ہے مگر وہاں چند افراد ایک جیپ کے پاس موجود تھے۔ دور سے نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہاں جبار جان بونٹ کھول کر انجن پر جھکا ہوا بڑبڑا رہا تھا۔ اس گاڑی نے کہاں آ کر دھوکا دیا ہے۔ سالی عورت کی طرح نخرے کر رہی ہے۔ چلنے سے انکار کر رہی ہے۔ چلے گی کیسے نہیں‘ اس کا تو باپ بھی چلے گا۔ ابھی اسٹارٹ کرتا ہوں۔

وہ اسٹیئرنگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ گاڑی کو اسٹارٹ کرنے سے پہلے ہیڈ لائٹ کو آن کیا۔ دونوں ہیڈ لائٹس کی روشنی ذرا دور تک گئی تو وہ ایک دم سے چیخ کر بولا۔ ”شاداں!“

ہیڈ لائٹس کی روشنی پڑتے ہی وہ بوکھلا گئی تھی پھر اسے جبار جان کی آواز سنائی دی۔ وہ خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگنے لگی۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ”اے دوڑو‘ پکڑو۔ اسے جانے نہ دو۔“

وہ پاس والی سیٹ سے رائفل اٹھا کر ادھر دوڑتے ہوئے جانے لگا۔ باقی چند افراد وہاں کے رہنے والے تھے۔ وہ اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے گئے لیکن ہیڈ لائٹس کی روشنی سے ہٹتے ہی اندھے ہو گئے۔ دھند میں دکھائی نہیں دیا کہ جبار جان کہاں گیا ہے اور ان ہنوں کو کہاں جانا ہے۔

کبریا نے بھی دور سے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اپنی جان کو دیکھا تھا۔ وہ بھی لاٹھی ٹیکتا ہوا دوڑتا ہوا‘ روشنی سے بچتا ہوا ادھر جانے لگا۔ آنکھ والوں کی اندھی بھاگ دوڑ پھر شروع ہو گئی۔ وہ تینوں ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ایک دوسرے کی آوازیں سن کر سمجھ سکتے تھے کہ کون کہاں ہے۔

جبار جان نے کبریا کو نہیں دیکھا تھا۔ شاداں کے پیچھے دوڑ پڑا تھا۔ آگے بھی ایسے آثار نظر نہیں آئے کہ کبریا اس کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ اس نے ایک جگہ رک کر آواز دی۔ ”شاداں! جہاں ہو رک جاؤ۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ تمہیں اس آتنگ وادی کے ساتھ بارڈر کے اس پار پہنچا دوں گا۔“

وہ کبریا کو آتنگ وادی کہہ رہا تھا اور دوستی بھی ظاہر کر رہا تھا۔ اس کی بات ختم ہوتے ہی فائر کی آواز گونجی۔ ایک گولی سنسناتی ہوئی اس کے قریب سے گزر گئی۔ وہ خوف سے چیخ مار کر زمین پر گر پڑا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو اور اپنے جسم کو ٹٹول کر یقین کرنے لگا کہ ابھی زندہ ہے۔ وہ اس طرح مرنے والا نہیں ہے۔

وہ تھوڑی دیر تک برف کی سطح پر پڑا رہا۔ کان لگا کر آہٹیں سننے کی کوشش کرنے لگا پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس دھند میں وہ دشمن اس سے آ کر ٹکرا سکتا تھا۔ وہ رائفل کو زمین پر ٹیک کر چلنے لگا۔

اس کی چیخ سن کر کبریا نے پہلے یہی سمجھا کہ گولی لگی ہے۔ وہ مر چکا ہے یا زخمی ہوا ہے۔ اگر زخمی ہوا ہے تو اس کی تاک میں رہے گا۔ وہ محتاط ہو کر آگے بڑھنے لگا۔ پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ اس کے آگے کہیں شاداں ہے۔ پتا نہیں سیدھی جا رہی ہے یا سمت بدل چکی ہے۔ وہ اسے آواز نہیں دے سکتا تھا۔ منہ سے آواز نکلتے ہی جبار جان گولی چلا سکتا تھا۔

وہ آگے بڑھتا ہوا سوچتا رہا۔ یہ نہیں چاہتا تھا کہ شاداں ایک بار نظر آنے پر پھر کہیں

گم ہو جائے۔ اس نے خطرہ مول لیا۔ گھٹنے ٹیک کر لیٹ گیا پھر آواز دی۔ "شاداں! جہاں ہو رک جاؤ۔ تمہاری حماقت سے ہم دشمن کی نظروں میں آ گئے ہیں۔"

ٹھائیں سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ گولی اس کے قریب سے گزری ہو گی لیکن وہ لیٹا ہوا تھا۔ ہاتھ پاؤں کے بل رینگتا ہوا آگے جانے لگا۔ بہت دور سے شاداں کی آواز سنائی دی۔ "کبریا! مجھے آوازیں نہ دو' وہ شیطان تم پر گولی چلائے گا۔"

وہ آگے کی طرف دوڑتا ہوا پھر زمین پر گر کر بولا۔ "تم چھوڑ کر جاؤ گی تو میں اسی طرح آوازیں دیتا ہوا اس کے ہاتھوں مر جاؤں گا۔"

پھر گولی چلی۔ اس بار کبریا نے گولی چلنے کی سمت دو بار فائرنگ کی پھر رینگتے ہوئے جانے لگا۔ جبار جان بھی رینگ رہا تھا۔ ایک دوسرے کی فائرنگ سے بچنے کی یہی صورت رہ گئی تھی۔ وہ کبھی رینگ رہے تھے۔ کبھی اٹھ کر دبے قدموں آگے جا رہے تھے۔ جبار جان اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ وہ شاداں تک پہنچنے کے لئے آگے بڑھتا رہے گا۔ بھٹکتا رہے گا۔

دونوں یہ نہیں جانتے تھے کہ شاداں کدھر ہو گی اور کون اس کے پاس پہلے پہنچے گا۔ اگر کبریا پہلے پہنچتا تو اسے لے کر چپ چاپ کہیں نکل جاتا۔ اگر جبار جان پہنچتا تو شاداں کو گرفت میں لے کر چیلنج کرتا کہ وہ سامنے نہیں آئے گا تو شاداں کو گولی مار دی جائے گی۔

ایسا کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ آگے اور آگے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ کبھی کبھی ایک دوسرے کی آوازوں کی سمت فائرنگ کر رہے تھے۔ گولیاں ضائع ہو رہی تھیں۔ ختم ہو رہی تھیں۔ رات بھی ختم ہو چکی تھی۔ آسمان کا اجالا بتا رہا تھا کہ سورج نکل چکا ہے مگر دھندلایا ہوا ہے۔

اب کچھ فاصلے تک نظر آنے لگا تھا مگر وہ ایک دوسرے کو دکھائی نہیں دے رہا تھے۔ ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔ ایسے ہی وقت چند گز کے فاصلے پر شاداں نظر آئی۔ دوڑتے ہوئے آ کر اس سے لپٹ گئی۔ سسکیاں لینے لگی' رونے لگی۔ کبریا اس کے ساتھ زمین پر لیٹ کر آہستگی سے بولا۔ "کیا رونے کے لئے چھوڑ کر گئی تھیں؟ یوں بھٹکانے سے تمہیں کیا ملا؟ پتا نہیں ہم کہاں آ گئے ہیں۔"

اچانک ایک فائر ہوا۔ وہ اس کے ساتھ لیٹ کر لڑھکتا ہوا دور چلا گیا۔ اسی لئے پہلے

ے لپٹ گیا تھا۔ وہ دونوں اٹھ کر جھکتے ہوئے' دوڑتے ہوئے ایک طرف جانے لگے۔ ادھر وہ بھی جھکتا ہوا' دوڑتا ہوا جا رہا تھا پھر ایک جگہ پہنچ کر ٹھٹک گیا۔ اب دور تک منظر واضح ہو گیا تھا۔ دور ایک چھوٹا سا پاکستانی جھنڈا ایک مدرسے کی دیوار پر لگا لہرا رہا تھا۔

جبار جان بوکھلا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ وہ اندھا دھند تعاقب کرتا ہوا آزاد کشمیر کے کسی علاقے میں پہنچ گیا تھا۔ خیریت اسی میں تھی کہ جدھر سے آیا تھا' اُدھر واپس چلا جائے۔ وہ پلٹ کر بھاگنے لگا۔ گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ہی اس کے قدموں کے پاس برف کے ذرات اڑے۔ وہ اوندھے منہ گر پڑا۔ بہت دور ایک جھاڑی کے پیچھے کبریا دکھائی دیا۔ جبار جان زمین پر لڑھکتا ہوا ایک درخت کے پیچھے چلا گیا۔ وہاں سے اس نے نشانہ لیا۔ ٹریگر کو دبایا' کھٹ کی آواز آئی' گولی نہیں چلی۔ وہ جلدی جلدی اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ کسی جیب میں کارتوس نہیں تھا۔ وہ سہم کر دوسرے کھڑے ہوئے کبریا کی طرف دیکھنے لگا۔

کبریا نے فائر کرنے کے بعد کہا۔ "کب تک گولی چلاؤ گے۔ ہتھیار پھینک کر سامنے آ جاؤ۔"

اس کے پاس ایک بھی گولی نہیں رہی تھی۔ ہتھیار تو پھینکنا ہی تھا۔ وہ رائفل کو پھینکتا ہوا بولا۔ "میں دوستی چاہتا ہوں۔ مجھ سے سمجھوتا کرو۔ مجھ پر گولی نہ چلاؤ۔ میں سامنے آ رہا ہوں۔"

کوئی سمجھوتا نہ ہوتا تب بھی سامنے آنا ہی پڑتا۔ وہ درخت کے پیچھے سے نکل کر سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ کبریا شاداں کے ساتھ جھاڑی سے نکل آیا۔ اس کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ "ایسا مہربان دشمن نہیں دیکھا۔ ہمیں دوڑاتا ہوا ہماری منزل تک لے آیا ہے۔"

بستی کے گھروں کے دروازے بند تھے۔ کچھ عورتیں کھڑکیوں سے جھانک رہی تھیں۔ کچھ مرد چھتوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ کبریا نے ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہ بتا دو اس جگہ کا نام کیا ہے؟"

ایک نے چھت پر سے کہا۔ "یہ سرحدی علاقہ ہے۔ تم مقبوضہ کشمیر کی سرحد سے چھ کلومیٹر دور آ چکے ہو۔ اس جگہ کا نام کھوئی رٹہ ہے۔"

کبریا نے کہا۔ "ہم مسلمان ہیں۔ ہمیں آگے جانے کے لئے تمہاری رہنمائی کی

ضرورت ہو گی۔ ابھی ہم بھارتی فوج کے اس دلال سے نمٹ رہے ہیں پھر تمہارے
تنظیم کے دفتر جائیں گے۔"

جبار جان نے کہا۔ "مجھے بھارتی فوج کا دلال نہ کہو۔ اب میں آزاد کشمیر میں ہوں
آزاد مسلمان ہوں۔ کسی کا دلال یا غلام نہیں ہوں اور نہ رہوں گا۔ اب میں سچا مسلمان
بن کر رہوں گا۔"

شاداں نے کہا۔ "اگر تُو مسلمان ہے تو پہلا کلمہ سنا۔"

"آں........." وہ پریشان ہو کر بولا۔ "کیوں مجھے بچہ سمجھ کر مجھ سے کلمہ سننا چاہتی
ہو؟"

"بچپن سے لے کر بڑھاپے کی آخری سانس تک کلمہ پڑھا جاتا ہے اور پڑھایا جاتا
ہے۔"

کبریا نے کہا۔ "اور اللہ تعالیٰ توفیق دے۔ مسلمان آخری سانس چھوڑنے سے پہلے
کلمہ ضرور پڑھتے ہیں۔ تم مسلمان ہو تو تمہیں بھی پڑھنا چاہئے۔"

وہ سہم کر بولا۔ "کیا مجھے کلمہ پڑھا کر مارو گے؟ مگر نہیں۔ میں تو قدرتی موت مرنے
والا ہوں۔ جیوتشی گرو دیال سنگھ نے کہا تھا۔ میری زندگی تھوڑی رہ گئی ہے۔ میں زیادہ دن
نہیں جیوں گا۔"

"اگر جیوتشی کی پیش گوئی درست ہے تو سمجھو' تمہاری زندگی پوری ہو چکی ہے۔ تم
مرنے والے ہو۔"

"تم .... تم مجھے مارو گے؟ نہیں .... میں کسی کے ہاتھوں مارا نہیں جاؤں
گا۔ میری زندگی پوری ہو چکی ہے۔ تم مجھے قدرتی موت مرنے دو۔ جیوتشی کی بات پوری
ہونے دو۔"

"مجھے یاد آ رہا ہے۔ پہلی ملاقات میں بھی تم نے یہی کہا تھا اور میں نے کہا تھا۔
تمہاری موت کی پیش گوئی ایک جیوتشی نے کی ہے اور میری موت کی پیش گوئی میڈیکل
رپورٹ کر چکی ہے۔ پتا نہیں کس وقت کس لمحے مجھے موت آ جائے۔ اس سے پہلے
تمہیں بھی مرنا چاہئے۔ ورنہ میرے بعد تم پھر شاداں کو پریشان کرو گے۔"

"میں قسم کھاتا ہوں۔ شاداں کو بہن سمجھتا رہوں گا۔ اسے عزت کے ساتھ ماں باپ

کے پاس پہنچا دوں گا۔"

شاداں نے کہا۔ "اے کتے! تُو ایسے کہہ رہا ہے جیسے میں بیوہ ہو گئی ہوں اور تیرے
ساتھ جانے والی ہوں۔ میرا سہاگ سلامت رہے گا۔ میں اپنے بیمار کو مرنے نہیں دوں
گی۔"

"تم میری بہن ہو۔ میں اپنے بہنوئی کی لمبی زندگی کے لئے دعائیں مانگتا رہوں گا۔
مجھے یہاں سے جانے دو۔"

"جسے کلمہ پڑھنا نہیں آتا' میں اس کی بہن کبھی نہیں بنوں گی۔ کبریا' اس کتے کو
گولی مارو اور یہاں سے چلو۔"

کبریا نے کہا۔ "میں سوچتا رہتا تھا کہ پتا نہیں مجھے کس لمحے مرجانا ہے۔ ایسے وقت
تم مجھے مل گئیں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے مرنے والے کی آخری خواہش پوری ہو رہی
ہے۔ تم میری آخری خواہش بن کر میرے ساتھ ہو میں اس کی بھی کوئی آخری خواہش پوری
کرنا چاہتا ہوں۔ بولو جبار! تمہاری خواہش کیا ہے؟"

"آخری خواہش ایک ہی ہے' مجھے قدرتی طور پر مرنے دو' مجھے گولی نہ مارو۔"

شاداں نے کہا۔ "نہیں کبریا! جانے کب اسے موت آئے گی یہ ابھی یہاں سے بچ
نکلنے کے لئے ایسی خواہش بیان کر رہا ہے۔ یہ یہاں سے جائے گا تو پتا نہیں اور کتنی
مسلمان لڑکیوں کی عزت کو کھلونا بنائے گا۔"

کبریا نے کہا۔ "میرے پوچھنے پر اس نے آخری خواہش بیان کی ہے۔ یہ چاہتا ہے
کہ اسے گولی نہ ماروں۔ لہٰذا میں اسے گولی نہیں ماروں گا۔"

شاداں نے پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو' یہ شیطان میری عزت سے کھیلنا چاہتا تھا۔"

جبار جان نے کہا۔ "شاداں کی بات نہ سنو۔ تم مجاہد ہو' سچے مسلمان ہو' زبان سے
نہ پھرنا' مجھے گولی نہ مارنا۔"

"جبار ہم دونوں زندگی اور موت کے درمیان لٹکے ہوئے ہیں۔ میں تمہیں نہیں
ماروں گا مگر زندگی اور موت کے درمیان لٹکا کر چلا جاؤں گا۔"

جبار جان نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے شاداں سے کہا۔ "اس مردود
کو نشانے پر رکھو۔ بھاگنا چاہے تو زخمی کر دینا مگر گولی مار کر ہلاک نہ کرنا۔"

وہ وہاں سے چلتا ہوا ایک درخت کے پاس آیا۔ درخت کے سائے میں ذرا او
تک برف جمی ہوئی تھی۔ وہ برف کی اونچائی تک آ کر رسی کے ایک سرے کو درخت
شاخ سے باندھنے لگا۔ جبار جان نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟ تم نے
تھا مجھے ہلاک نہیں کرو گے۔"

"میں اپنی زبان پر قائم ہوں۔ تمہیں گولی نہیں ماروں گا۔ اپنی طرح تمہیں
زندگی اور موت کے درمیان لٹکا کر چلا جاؤں گا۔ زندگی رہے گی تو تم جیو گے ورنہ اپنے
کی پیش گوئی کے مطابق مر جاؤ گے۔"

اس نے رسے کو مضبوطی سے شاخ کے ساتھ باندھ دیا۔ اس کا گریبان پکڑ کر
لے آیا اور رسے کا پھندا بناتے ہوئے بولا۔ "اگر میں یہ پھندا تمہارے گلے میں ڈالوں
تمہیں پھانسی نہیں لگے گی کیونکہ برف کے تودے پر کھڑے ہوئے ہو۔ تم اس وقت
زندہ رہو گے جب تک تمہارے قدموں کے نیچے سے برف نہیں پگھلے گی۔"

اس نے رسیوں سے پہلے اس کے دونوں ہاتھوں کو پشت پر باندھا پھر گلے میں پھندا
ڈال کر اسے پوری طرح کس دیا۔ وہ پھنسی پھنسی سی آواز میں بولا۔ "میری سانس رک
رہی ہے۔"

"جب تک برف نہیں پگھلے گی تب تک سانس نہیں رکے گی۔ گلے میں پھندا
رہے گا' تم آرام سے کھڑے رہو گے۔"

شاداں اس کے سامنے اسے نشانے پر لئے کھڑی ہوئی تھی۔ اس لئے اس نے
سے بھاگنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ چپ چاپ گلے میں پھندا پہن لیا تھا۔ ایسا نہ کرتا تو
اسے زخمی کر کے پھانسی پر چڑھاتے۔ موت کو کسی طرح بھی آنا تھا لیکن برف پر کھڑے
رہنے سے فوراً آنے والی موت ٹل رہی تھی۔

شاداں اور کبریا اس سے ذرا دور آ کر کھڑے ہو گئے۔ بستی والے یہ منظر دیکھ رہے
تھے۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ وہ برف کے تودے پر سیدھا کھڑا
تھا۔ اگر نجات پانے کی کوشش کرنا چاہتا تو پھندا سخت ہو جاتا۔ وہ خوف سے دیدے
پھیلائے شاداں اور کبریا کو اور بستی والوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھندے کے باعث کچھ بول نہیں
سکتا تھا۔

ایسے وقت تین مجاہدین وہاں آ گئے۔ انہوں نے کبریا کو پہچان لیا۔ اس سے مصافحہ
کرتے ہوئے خیریت سے واپس آنے کی مبارکباد دی۔ کبریا نے اپنے بیگ سے ویڈیو فلم
نکال کر ایک بزرگ مجاہد کو دیتے ہوئے کہا۔ "یہ بہت اہم کیسٹ ہے۔ آپ اسے رکھیں۔
میں آپ کے ساتھ ہی چلوں گا۔"

پھر اس نے جبار جان کے بارے میں انہیں بتایا۔ انہوں نے کہا۔ "اسے ایسی ہی سزا
ملنا چاہئے۔ ایسے شیطان نام کے مسلمان ہوتے ہیں۔" پھر ایک مجاہد نے کہا۔

"اے ساری زندگی مسلمان بن کر رہا۔ آخری وقت کلمہ پڑھ لے' موت آسان ہو
جائے گی۔"

وہ کلمہ کیا پڑھتا' اس کے سر پر تو موت ناچ رہی تھی۔ اس کے سامنے آسمان پر
بادلوں کے پیچھے سے دھوپ نکل رہی تھی۔ قدموں تلے بہت آہستہ آہستہ برف پگھل رہی
تھی۔ جیوتشی کی پیش گوئی کے بعد وہ اب تک زندگی اور موت کے درمیان تھا لیکن خوفزدہ
نہیں تھا لیکن اب اس طرح درمیان میں لٹک رہا تھا کہ پیش گوئی پوری ہونے کا یقین ہو
چکا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ قدموں تلے آہستہ آہستہ برف پگھل رہی ہے اور کہیں
کہیں سے ٹوٹ رہی ہے۔

اچانک کبریا لڑکھڑا گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اس نے
سہارے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ شاداں نے اسے تھام لیا۔ اسے زمین پر بٹھاتے ہوئے بولی۔
"حوصلہ کرو' تم بیماری سے لڑتے آ رہے ہو' اب بھی اس پر غالب آ جاؤ گے۔ میں
تمہارے ساتھ ہوں۔"

وہ بول رہی تھی مگر اسے دنیا کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ آنکھوں کے
سامنے تمام منظر بجھ گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی ریگ مال سے اس کے دماغ کو رگڑ رہا
ہو۔ وہ دانت پر دانت جمائے ایسی تکالیف کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سر پر
موت ناچ رہی تھی اور زندگی بھی ساتھ نہیں چھوڑ رہی تھی۔

"اے رقصِ اجل! ذرا تھم .... ذرا دم میں آئے دم .... خدا را ذرا
تھم........"

ایک کڑاکے کی آواز سے برف ٹوٹی۔ جس طرح پاؤں تلے سے زمین نکل جاتی

ہے۔ اسی طرح برف نکل گئی ادھر دم نکلا۔ ادھر شاداں نے اس کے سر کو اپنے سینے میں
چھپا لیا۔ اپنی دھڑکنیں سنانے لگی۔ زندگی کی سب سے خوبصورت اور سب سے دلکش
آواز دل کی دھڑکن ہے۔

"ربا! بس ایک آخری دعا.......... میری دھڑکنیں میرے یار کو دے دے......"

(کیا دعا قبول ہو گی؟)

☆======☆======☆

بے حس

ان لوگوں کی کہانی جن کی آنکھوں پر حرص و ہوس کی نظر نہ
آنے والی پٹی بندھی ہوتی ہے جو انہیں ہر اچھے جذبے
سے بیگانہ اور ہر قدر سے لاپرواہ کر دیتی ہے۔
محی الدین نواب کے جادو نگار قلم سے ایک تحیر خیز کہانی۔

اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی جیسے وہ دنیا والوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی ہو۔ وہ تقریباً بارہ سال سے یہ آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ جب دس برس کی تھی ایک حادثے میں اس کی آنکھوں کی بینائی ختم ہوگئی تھی۔ اس کے والدین کی مالی حالت ایسی نہیں تھی کہ آنکھوں کی روشنی واپس لانے کے لئے ڈاکٹروں کی بھاری سے بھاری فیس ادا کر سکتے۔ اس لئے وہ دس برس کے بعد سے اب تک یہ آنکھ مچولی کھیلتی آرہی تھی۔

پھر ایسا ہوا کہ اچانک اس کی زندگی میں کامران آگیا۔ اسے ایک بیوی کی اور اپنے چھ ماہ کے بچے کے لئے ایک ماں کی ضرورت تھی۔ اس کی بیوی اس بچے کو پیدا کرنے کے بعد چل بسی تھی۔ اس کے بعد وہ بچہ ایک نرس کے رحم و کرم پر پل رہا تھا۔ ایسے وقت کامران کی نظر صائمہ پر پڑی۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی غریب لڑکی ہو اور ایسی کہ جس پر زیادہ سے زیادہ احسانات کرے اور اس کے بدلے وہ لڑکی اس کی بیوی بن کر اس کے بچے کو ماں کی بھرپور محبت دے۔

اسی خیال سے کامران نے صائمہ کا انتخاب کیا اور اس کے والدین سے وعدہ کیا کہ وہ اس کی آنکھوں کی روشنی واپس لائے گا اور بڑے سے بڑے ڈاکٹروں سے اس سلسلے میں مشورے کرے گا۔ بہرحال مشورے ہوئے اور ڈاکٹروں نے صائمہ کا معائنہ کیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ آپریشن ہو سکتا ہے اور بینائی واپس آسکتی ہے۔ ایک ڈاکٹر نے کہا سردی کے موسم میں آپریشن ہوگا۔ اس کے لئے دسمبر کے مہینے کی ایک تاریخ مقرر کر دی گئی۔

ابھی اس تاریخ کے لئے تقریباً دو ماہ کا وقت تھا۔ کامران نے صائمہ کے والدین سے شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے لئے کہا اور اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ وہ آپریشن سے پہلے صائمہ کو اپنی بیوی بنانا چاہتا ہے۔

اس کے والدین نے کہا۔ "بیٹے' صائمہ تمہاری امانت ہے۔ تم جب چاہو بیاہ کر لے جاؤ' تم اس پر اتنا بڑا احسان کر رہے ہو کہ ہم اس سے آگے کچھ کہہ نہیں سکتے لیکن ایک اندھی لڑکی سے شادی کیوں کر رہے ہو۔ دسمبر کے بعد جب اس کی بینائی آجائے گی تو پھر تم دھوم دھام سے شادی کرکے اسے لے جانا۔"

کامران نے کہا۔ "نہیں جناب' میں اسے اسی حالت میں بیاہ کر لے جانا چاہتا ہوں اور شوہر بن کر اس کا علاج کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی میرا اس سے کوئی ایسا رشتہ نہیں ہے کہ میں علاج کراؤں۔"

یہ ایسی بات تھی کہ اس کے آگے صائمہ کے والدین نے سر جھکا لیا اور بڑی سادگی سے صائمہ کے ساتھ اس کا نکاح پڑھا کر بیٹی کو رخصت کر دیا۔

صائمہ خود کو دلہن کے روپ میں نہ دیکھ سکی۔ وہ شروع سے اندھیرے میں رہتی آئی تھی اور اندھیرے میں ہی دلہن بن کر سہاگ کی سیج پر پہنچ گئی تھی۔ اسے بڑا ارمان تھا کہ اپنے دولہا کو آنکھوں سے دیکھے۔ مگر دل پر جبر کر لیا کہ اب بینائی واپس آئے گی تو اسے دیکھے گی۔ جب دولہا کمرے میں آیا تو اس نے صرف اس کی آہٹ سنی۔ پھر اس کی آواز سنائی دی۔

"دیکھو صائمہ میں نے خوب سوچ سمجھ کر تمہیں اپنی شریکِ حیات بنایا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ تم جوان ہو اور خوبصورت بھی ہو لیکن مجھے اپنی پہلی بیوی سے بہت زیادہ محبت تھی۔ شاید میں اس کی جگہ تمہیں نہ دے سکوں اور شاید تم اس کی جگہ اپنی ذہانت سے اور محبت سے لے سکو۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ کیا حالات ہوں گے بہرحال میں نے اس لئے تم سے شادی کی کہ تمہیں یاد رہے کہ میں نے اس وقت تمہیں شریکِ حیات بنایا جب تم اندھی تھیں۔ آنکھوں والی لڑکیوں کو تو سبھی قبول کر لیتے ہیں مگر تمہاری جیسی لڑکیوں کو صرف مجھ جیسے فراخ دل لوگ ہی قبول کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ میں ہزاروں روپے خرچ کرکے تمہاری بینائی واپس دلاؤں گا۔ اس کے بدلے بس میں اتنا چاہتا ہوں کہ تم میرے بچے کو ایک ماں کا بھرپور پیار دو۔ اگر اس میں کبھی میں نے کمی محسوس کی تو میں تمہارا دشمن بن جاؤں گا۔"

صائمہ گھونگھٹ میں چھپی بیٹھی تھی۔ اس نے سوچا۔ چھپ کر کیا فائدہ ہے۔ اندھی آنکھوں نے اور اس اندھیرے نے تو اسے پہلے ہی چھپا رکھا ہے۔ شرمانے سے کیا

فائدہ' کچھ تو بولنا ہی ہوگا۔ اس لئے وہ بولنے لگی۔

"میں آپ کے قدموں کی دھول ہوں۔ آپ کے پاؤں کی جوتی ہوں۔ آپ جب چاہیں مجھے اتار کر پھینک سکتے ہیں۔ میں آپ کے حکم کی پابند رہوں گی اور آپ کے اس بچے کو اپنی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت دوں گی۔ سوتے جاگتے' اٹھتے بیٹھتے' وہ بچہ ہی میرے لئے سب کچھ ہوگا۔"

کامران کی آواز اور ذرا قریب آئی۔ وہ قریب آکر بول رہا تھا۔

"سہاگ رات دولہا اپنی دلہن کا چہرہ دیکھنے کے لئے یا تو اسے قیمتی انگوٹھی پہناتا ہے یا کوئی اور قیمتی تحفہ دیتا ہے' پھر اس کا گھونگھٹ اُلٹ کر اس کا چہرہ دیکھتا ہے میں ایسی کوئی چیز نہیں دوں گا۔ مگر ہاں جو میرے لئے سب سے زیادہ قیمتی ہے وہی تحفہ میں تمہیں دے رہا ہوں۔ دونوں ہاتھ بڑھاؤ۔"

صائمہ نے اپنے دونوں ہاتھ اندھیرے میں بڑھائے۔ تب اس نے محسوس کیا کہ کوئی بچہ اس کے ہاتھوں میں آگیا ہے۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ کامران کا لخت جگر ہے اس نے اس بچے کو چوم کر سینے سے لگالیا۔

سہاگ رات آدھی سے زیادہ اس بچے کو کھلانے اور سلانے میں گزر گئی۔

دسمبر کی مقررہ تاریخ کو پھر وہ آپریشن تھیٹر پہنچائی گئی۔ اس کا آپریشن ہوا اور ڈاکٹروں نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ آپریشن کامیاب ہوا ہے اور ایک ماہ بعد جب اس کی آنکھوں سے پٹی کھولی جائے گی تو وہ دیکھنے لگے گی۔

پانچ دن کے بعد کامران ہسپتال سے اسے گھر لے آیا۔ وہ بہت خوش تھی۔ کیونکہ کامران اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ہسپتال میں بھی اس نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔ "صائمہ' تم بہت اچھی ہو۔ تم نے اپنی کمی کا احساس دلانا شروع کر دیا ہے۔" گھر لا کر بھی وہ اسی طرح والہانہ محبت سے پیش آتا رہا۔ زندگی بڑے مزے سے گزر رہی تھی۔ صائمہ کو بینائی ملنے سے پہلے ہی زندگی کی بہت ساری مسرتیں حاصل ہو رہی تھیں۔

پھر اچانک ہی جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ ابھی آنکھوں کی پٹی کھلنے کے لئے کوئی چار دن رہ گئے تھے کہ کامران کا لخت جگر کہیں غائب ہوگیا۔ تمام جگہ اسے ڈھونڈا گیا۔ اس کی نگرانی کرنے والی اور اسے پالنے والی نرس سے بھی طرح طرح کے سوالات کئے گئے لیکن وہ یہی کہتی رہی کہ رات کو اس نے بچے کو پالنے میں سلا دیا تھا اور خود سو گئی تھی' لیکن

صبح اٹھ کر دیکھا تو پالنا خالی تھا۔

شام کے وقت کسی نے فون پر کامران سے کہا کہ وہ ایک لاکھ روپے ادا کردے اور اپنے بچے کو واپس لے جائے۔

ایک لاکھ روپے کی رقم بہت زیادہ تھی اور اگرچہ کامران اچھا کھاتا پیتا تھا اور اچھی آمدنی تھی لیکن اس کے اکاؤنٹ میں ایک لاکھ روپے نہیں تھے۔ وہ پریشان ہوگیا۔ اس نے فون کرنے والے کی خوشامدیں کیں۔ اسے بتایا کہ وہ ہرگز اتنا مالدار نہیں ہے۔ اس پر فون کرنے والے نے ہنستے ہوئے کہا۔

"جو شخص اپنے بچے کے لئے ایک نرس رکھ سکتا ہو اور اس کی خاطر اندھی لڑکی سے شادی کرسکتا ہو اور اسی بچے کی خاطر اس اندھی لڑکی کی بینائی واپس لاسکتا ہو اور ان سب باتوں میں اتنی رقمیں خرچ کرسکتا ہو تو کیا اپنی اولاد کی واپسی کے لئے ایک لاکھ روپے نہیں دے سکتا۔ ضرور دے سکتا ہے تم ہمت کرو ہم تمہیں مہلت دیتے ہیں۔ جتنی مہلت چاہتے ہو' لے لو۔ اتنے عرصے میں ایک لاکھ روپے جمع کرلو اور ہمیں ادا کردو لیکن یاد رکھنا اس دوران اگر تم نے پولیس والوں سے رابطہ قائم کیا تو بچہ تمہیں مُردہ ملے گا۔"

کامران بہت پریشان رہنے لگا۔ وہ رقم حاصل کرنے کے لئے بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ دوستوں سے مل رہا تھا۔ بینک سے قرض لینا چاہتا تھا اپنی کوٹھی فروخت کرنا چاہتا تھا ہر ممکن طریقے سے وہ ایک لاکھ روپے جمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا چونکہ بچے کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دی گئی تھی۔ اس لئے پولیس والے مجرم کی تاک میں تھے اور وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ ان دنوں کامران کچھ رقم حاصل کرنے کے لئے اپنی کوٹھی فروخت کرنا چاہتا ہے۔ تب انسپکٹر نے آکر اس سے ملاقات کی اور اس سے کہا۔

"مسٹر کامران' آپ کی حرکتوں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اغوا کرنے والے نے یقیناً آپ سے رابطہ قائم کیا ہے۔ آپ سے کچھ رقم کا مطالبہ کیا ہوگا جسے پورا کرنے کے لئے آپ کوٹھی فروخت کررہے ہیں؟"

کامران نے جواب دیا۔ "انسپکٹر صاحب آپ کا کام مجرم کو تلاش کرنا ہے۔ آپ اپنے طور پر تلاش کریں۔ میرا کام اپنے بچے کی حفاظت ہے۔ اس کی سلامتی ہے۔ میں اس کی سلامتی کے لئے جو کچھ بھی کروں اس پر آپ کو اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔"

"یقیناً اعتراض کرنا چاہئے کیونکہ میں قانون کے نقطہ نظر سے کہتا ہوں۔ مجرم کا

مطالبہ پورا کرنے سے ایسے مجرموں کو شہہ ملتی ہے۔ آپ تعلیم یافتہ ہیں۔ آپ کو ذہانت سے کام لینا چاہئے۔ آپ مرد ہیں۔ آپ کو حوصلے سے کام لیتے ہوئے یہ سوچنا چاہئے کہ بچہ محفوظ رہے گا۔ وہ لوگ بچے کو مار کر کچھ بھی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ آپ ایسا کریں کہ ان سے زیادہ سے زیادہ وقت حاصل کرتے رہیں اور انہیں یہ یقین دلاتے رہیں کہ آپ ان کی مطلوبہ رقم کا انتظام کر رہے ہیں۔ اس عرصے میں ہم انشاء اللہ اس مجرم تک پہنچ جائیں گے۔"

کامران نے یہی کیا۔ قانون کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے اس نے مجرم سے رابطہ ہونے پر مزید مہلت مانگی' لیکن دوسری طرف سے قہقہے کے ساتھ جواب ملا۔

"مسٹر کامران' آپ ہمیں احمق نہ سمجھیں۔ ہم ساری معلومات رکھتے ہیں۔ ہمیں پتہ ہے کہ آپ نے پولیس والوں سے سازباز کی ہے اور ہمیں گرفتار کرانے کے لئے یہ چالیں چل رہے ہیں اور یہ چالیں آپ کو کتنی مہنگی پڑیں گی۔ یہ اب آپ کو پتہ چلے گا۔"

اتنا کہنے کے بعد ریسیور رکھ دیا گیا۔ کامران نے کئی بار کریڈل کو کھٹکھٹا کر آوازیں دیں لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ پھر وہ پریشان ہو کر پولیس والوں کے پیچھے بھاگتا رہا۔ ان سے کہتا رہا کہ وہ کچھ کریں لیکن پولیس والے بھی مجبور تھے کہ مجرم کا کوئی نشان پتہ نہیں مل رہا تھا۔

ایسی ہی پریشانیوں کے عالم میں صائمہ کی آنکھوں کی پٹی کھلنے کا وقت آ گیا۔ دوسری صبح اس کی آنکھوں سے پٹی کھولی جانے والی تھی اور وہ رات وہ اپنی خواب گاہ میں تنہا گزار رہی تھی کیونکہ کامران پچھلے تین چار دن سے اس کے پاس رات کو نہیں آتا تھا دن کو کبھی آتا تو وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن اس کی پریشانیوں کا اندازہ کر سکتی تھی۔ وہ اس عرصے میں چڑچڑا ہو گیا تھا اور اٹھتے بیٹھتے اپنے بچے کی باتیں کرتا تھا۔ اگر وہ بچہ گھر میں موجود ہوتا تو صائمہ کی بینائی ملنے پر کتنی خوشیاں منائی جاتیں۔ وہ رات جو اس کے اندھے پن کی آخری رات تھی۔ گزرنے والی تھی۔ دوسری صبح وہ ساری دنیا کو دیکھ سکتی تھی لیکن اپنے شوہر کا مسکراتا ہوا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

اسی پریشانی کے عالم میں وہ اپنی خواب گاہ میں تنہا جاگ رہی تھی۔ نیند آنکھوں سے اڑ گئی تھی اور وہ کبھی اپنے بستر پر لیٹتی تھی کبھی اٹھ جاتی تھی۔ ایسے ہی وقت وہ ذرا ٹھٹک سی گئی۔ اس نے اپنے کمرے میں آہٹ سنی تھی۔ اس نے آواز کی سمت سر گھما کر پوچھا

"کون کامران' آپ آ گئے۔"

خواب گاہ میں اچھی خاصی روشنی تھی لیکن صائمہ کی دنیا میں ابھی اندھیرا تھا اور وہ اندھیرے میں بیٹھی ہوئی اس آہٹ کو دوبارہ سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے خیال آیا کہ اس کا شبہ بھی ہو سکتا ہے لیکن تقریباً بارہ سال تک اندھی رہنے سے یہ حس اس کی تیز ہو گئی تھی کہ کسی بھی ہلکی سے ہلکی آواز کو وہ سن لیتی تھی اور سمجھ لیتی تھی کہ وہ کمرے میں تنہا ہے یا کوئی اور موجود ہے اور اس کا بارہ سالہ تجربہ کہہ رہا تھا کہ کمرے میں کوئی یقیناً موجود ہے۔

وہ جانتی تھی کہ دروازہ کدھر ہے۔ وہ اُدھر پلٹ کر بولی۔ "کامران میں جانتی ہوں کہ ایک بچے کا دکھ کیا ہوتا ہے۔ پھر ایسا بچہ جسے تم دل و جان سے چاہتے ہو اور جس کے لئے تم بہت کچھ کرتے آئے ہو اور بہت کچھ کرنا چاہتے تھے لیکن بچے کی گمشدگی کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ تم اپنے آپ کو اندر ہی اندر مارنے لگو اور بالکل گونگے' بہرے بن جاؤ۔ خدا کے لئے کچھ بولو۔ خاموشی میں میرا دل گھبرانے لگتا ہے۔ میں جب کسی کو پہچان نہیں سکتی تو کیا کروں مجھے تو آواز سننی پڑتی ہے۔ مجھے اپنی آواز سنا دو۔ کامران۔"

وہ بولتی رہی لیکن کہیں سے کوئی جواب نہ ملا۔ تب اس نے سہمے ہوئے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا اگرچہ وہ دیکھ تو نہیں سکتی تھی لیکن اِدھر اُدھر سر گھمانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ کان لگا کر سن رہی تھی کہ کہیں سے کوئی آہٹ پھر سنائی دے تو یقین ہو کہ کوئی آیا ہے یا کوئی آیا تھا تو اب جا چکا ہے۔

وہ اندھی راستے کو ٹٹولتے ہوئے دروازے تک پہنچ گئی اس نے ہاتھ سے چھو کر دیکھا تو دروازہ بند تھا۔ جیسا کہ اس نے بند کیا تھا۔ اندر سے چٹخنی نہیں چڑھائی تھی کیونکہ کامران کے آنے کی توقع تھی۔ اس نے دروازے کو آہستگی سے کھولا تو وہ کھل گیا۔ اس نے دوبارہ اسے بند کر دیا۔ پھر دروازے سے پیٹھ لگا کر کھڑی ہو گئی۔ پھر سہمے ہوئے انداز میں سوچنے لگی کہ ابھی کیا ہوا تھا۔ کوئی یقیناً آیا تھا اور پھر خاموشی سے چلا گیا ہے۔ اس کے کان دھوکہ نہیں کھا سکتے تھے۔ اس کی سننے کی حس تیز تھی اور اسی حس کی بنا پر وہ سہمی ہوئی تھی کہ کامران اگر آتا تو وہ ضرور اس کے کتنے ہی سوالوں کے جواب میں ایک بات ضرور کہتا لیکن کوئی آیا تھا اور گونگا بن کر چلا گیا۔

وہ دروازے سے ہٹ گئی۔ دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر اندھیرے میں راستہ ٹٹولتے

گزرنے لگا۔ تب صائمہ کو ایسے آثار نظر آئے کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ کامران کے بچے کی ماں۔ اس کے دل میں پھر خوشی کی ایک نئی لہر اٹھی۔ موت انسان کو کھاتی ہے لیکن انسان اس کے مقابلے میں نئی زندگیوں کو جنم دیتا رہتا ہے۔ بے شک کسی ظالم نے کامران کے اس بچے کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا لیکن وہ کامران کے لئے ایک دوسرے بچے کو جنم دینے والی تھی۔ اس کے زخموں پر نیا مرہم رکھنے والی تھی۔ وہ یہ خوشخبری کامران کو سنانا چاہتی تھی مگر کامران کہاں تھا؟

اس کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ جب وہ سوچتی کہ کامران اس سے نفرت کرنے لگا ہے۔ نفرت کی کوئی خاص وجہ تو نہ تھی لیکن وہ پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ وہ محض بچے کی خاطر اسے دلہن بنا کر لایا ہے اب جبکہ وہ بچہ نہیں تھا تو وہ دلہن اس کے لئے کشش کا باعث نہیں تھی لیکن وہ جانے والا کیا جانتا تھا کہ اس نے دوبارہ اپنے اندر کشش پیدا کرلی ہے۔ اس کے بچے کی ماں بنتے ہوئے۔ کاش کہ وہ آکر اسے ایک نظر دیکھ لے۔

وہ تصور میں کامران کا چہرہ دیکھتی تھی کہ وہ کیسا ہوگا۔ گھر میں کوئی تصویر نہیں تھی لیکن وہ اس کے لمس کو سمجھتی تھی اس کی آواز پہچانتی تھی۔ اس کے سانسوں کی گرمی کو سمجھ لیتی تھی لیکن اس کے چہرے سے واقف نہیں تھی۔ اس کا اپنا جیون ساتھی چہرے کے اعتبار سے اس کے لئے اب تک اجنبی تھا۔

اس نے اخبارات کے ذریعے کامران تک اپنی آواز پہنچانے کی کوشش کی۔ کامران لوٹ آؤ۔ گھر میں ایک نیا چراغ روشن ہونے والا ہے۔ ایک خوشی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ دوسری خوشیاں دیتا ہے۔ تم لوٹ آؤ۔"

امید کے سہارے کتنے ہی دن گزرتے چلے گئے۔ ایک شام جب اندھیرا چھا رہا تھا اور وہ اپنے لان میں ٹہل رہی تھی۔ اسی وقت کوئی شخص کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوا۔ وہ اچھا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس نے صائمہ کو دیکھتے ہی مسکرا کر اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے صائمہ کے دل کی دھڑکنیں یکبارگی تیز ہوگئیں۔ دماغ چیخ چیخ کر کہنے لگا کہ اس کا جیون ساتھی واپس آگیا ہے۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر' سوچ سوچ کر اس کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ بھی قریب آرہا تھا۔ پھر وہ ٹھٹک کر بولی۔ "آپ' آپ کون ہیں؟"

"کیا تم مجھے نہیں پہچانتی ہو۔ میں تمہارا کامران ہوں۔"

صائمہ فوراً ہی دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔ اس نے

پوچھا۔ "کیا بات ہے صائمہ۔ کیا تم مجھے نہیں پہچان رہی ہو؟"

صائمہ نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں' میں کامران کی آواز کو ہزاروں لاکھوں میں پہچان سکتی ہوں۔ تم آواز کے اعتبار سے میرے کامران نہیں ہو۔"

"دیکھو' مجھے سردی لگ رہی ہے۔ میں بہت دنوں تک بیمار رہا ہوں۔ اس وجہ سے میری آواز میں فرق پیدا ہوگیا ہے۔"

"اگر ایسی بات ہے تو کوٹھی میں چلو۔ میں اپنے ملازم سے تمہاری شناخت کراؤں گی۔ اگر وہ تمہیں اپنا مالک تسلیم کرلے گا تو میں تمہیں اپنا شوہر تسلیم کرلوں گی۔"

اس نے خوش ہو کر کہا۔ "ٹھیک ہے۔ ایسا ہی کرو۔ مجھے خوشی ہے کہ تم میرے سوا کسی اجنبی کے پاس نہیں جانا چاہتیں۔ آؤ میری جان' میں ابھی ملازم کے سامنے چلتا ہوں۔"

وہ دونوں آگے بڑھ کر کوٹھی کی طرف جانے لگے۔ وہ صائمہ کے قریب آکر اس کا ہاتھ تھام کر چلنا چاہتا تھا لیکن صائمہ اس سے الگ رہی۔ کوٹھی کے اندر پہنچتے ہی ڈرائنگ روم میں ان کا ملازم نظر آیا۔ ملازم نے اجنبی کو دیکھتے ہی سلام کرتے ہوئے کہا۔ "حضور آپ کہاں چلے گئے تھے۔ آپ کے بغیر تو یہ گھر ویران ہوگیا تھا؟"

اس کی بات سنتے ہی صائمہ کو اطمینان ہوا۔ اس شخص نے مسکرا کر کہا۔ "ٹھیک ہے تم باہر جاؤ۔ میں تمہاری بیگم صاحبہ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

ملازم ڈرائنگ روم سے باہر چلا گیا۔ پتہ نہیں کیوں' پھر اس کا دماغ اندر ہی اندر چیخنے لگا۔ یہ وہ نہیں ہے۔ وہ سینہ نہیں ہے جہاں وہ سر رکھا کرتی تھی اور دھڑکنیں سنا کرتی تھی۔ اس نے فوراً ہی الگ ہو کر کہا۔ "ذرا ٹھہریئے میں یہ خوشخبری ابھی اپنے والدین کو سنادوں۔"

یہ کہہ کر وہ ٹیلی فون کی طرف جانے لگی۔ اس اجنبی نے فوراً ہی آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ "ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ کل صبح انہیں خبر پہنچا دی جائے گی۔ میں ابھی گھر میں بھیڑ دیکھنا نہیں چاہتا رشتے دار آئیں گے تو پھر ہمیں آپس میں بیٹھ کر باتیں کرنے اور محبت بھرا وقت گزارنے کا وقت بہت کم ملے گا۔"

"ایسی بات نہ کریں۔ آپ کی غیر موجودگی نے سبھی کو متاثر کیا ہے۔ سب پریشان ہیں اور سبھی آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارے لئے تو ساری زندگی پڑی ہے۔ ہم تنہائی میں

ہوئے صوفے کی طرف آئی۔ اب وہ پلنگ پر جا کر لیٹنا نہیں چاہتی تھی۔ آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ ایک تو صبح کا انتظار تھا کہ آنے والی صبح اس کے لئے روشنی لے کر آئے گی۔ دوسری پریشانی یہ تھی کہ بچہ واپس نہیں مل رہا تھا بچے کی وجہ سے کامران اس کے پاس نہیں آ رہا تھا۔ وہ پریشان ہو کر ایک صوفے کو ٹٹولنے لگی۔ صوفے کے ہتھے پر اس کا ہاتھ گیا۔ پھر اسی کے اندازے سے وہ اس صوفے پر بیٹھ گئی۔

اس پر بیٹھتے ہی یوں لگا جیسے کوئی غیر معمولی بات ہو۔ وہ صوفے کے کشن پر نہیں بلکہ کسی گٹھری پر بیٹھی ہو۔ اس نے ہاتھ لگا کر دیکھا تو اس کے نیچے کشن ہی تھا لیکن وہ بہت اٹھا ہوا تھا۔ بالکل غیر معمولی طریقے سے رکھا ہوا تھا۔ وہ جلدی سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے پلٹ کر صوفے کو ٹٹولا تو ایک کشن اٹھا ہوا سا لگا۔ اس نے اس کشن کو اٹھایا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر ٹٹولا تو ایک دم سے کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

صوفے کے کشن پر ایک ننھا سا بچہ پڑا ہوا تھا۔ اس بچے کے اوپر ایک اور کشن تھا جسے ابھی صائمہ نے ہٹایا تھا۔ گویا کہ ایک کشن اوپر اور ایک کشن نیچے' دونوں کے درمیان اس بچے کو سینڈوچ بنایا گیا تھا اور صائمہ اندھی تھی۔ وہ بے چاری کیا جانتی کہ کیا ہے۔ وہ اس بچے کے اوپر آ کر بیٹھ گئی تھی۔

ایک دم سے اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ وہ سہم کر سوچنے لگی کیا وہ بچے پر بیٹھ گئی تھی اور اس پر بیٹھنے کی وجہ سے بچے کو کوئی نقصان پہنچا ہے۔ اس نے جلدی سے پھر ٹٹول کر بچے کو دیکھنا شروع کیا۔ پتہ چلا کہ وہ بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے۔ اس نے اس کے ننھے سے سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کی دھڑکنوں کو محسوس کیا لیکن وہاں دھڑکنیں خاموش تھیں۔ تب اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔

پھر وہ بے اختیار جنونی انداز میں چیختی چلی گئی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ کوٹھی میں آنے والے کامران کے رشتے دار جو کہ صائمہ کی آنکھوں سے دوسرے دن پٹی کھلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ لوگ مختلف کمروں میں تھے اور کامران بھی کسی کمرے میں تھا۔ چیخیں سنتے ہی سب لوگ اپنے اپنے بستروں سے اٹھ کر بھاگتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ پھر بچے کو دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ کامران نے تو ایک چیخ ماری۔ صائمہ نے بس اس کی ایک چیخ سنی۔ پھر اس نے تصور میں دیکھا کہ وہ بچے کی لاش سے لپٹ گیا ہے اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے۔

پھر یکے بعد دیگرے گھر کے سبھی لوگ صائمہ سے طرح طرح کے سوالات کرنے لگے اور وہ جواب دینے لگی۔ اسے پتہ نہیں چلا کہ کامران کب وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ جب اس نے بہت دیر تک اس کی آواز نہیں سنی تو اس نے آواز دی۔ کسی نے کہا۔ "ارے کامران میاں کہاں چلے گئے۔" دوسرے نے کہا۔ "ابھی تو یہاں تھے۔" تیسرے نے کچھ اور کہا۔ بس یہ پتہ چلا کہ کامران اپنے بچے کی لاش کو چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ دو چار لوگ کمرے سے باہر اسے تلاش کرنے کے لئے گئے۔ صائمہ نے اپنے دھڑکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آنکھوں کی روشنی ملنے سے پہلے وہ بچہ ان سے بچھڑ جائے گا اور کامران کو اس سے دور کر دے گا۔

انتظار کرتے کرتے صبح ہو گئی لیکن کامران واپس نہیں آیا۔ پھر دوپہر بھی ہو گئی۔ وہ ناشتے کے وقت آیا نہ کھانے کے وقت صائمہ اپنے دھڑکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر لوگوں سے کہہ رہی تھی کہ انہیں تلاش کریں۔ ایسا نہ ہو کہ بچے کی موت سے دل برداشتہ ہو کر کوئی غلط قدم اٹھا لیں۔ کامران کو سبھی تلاش کر رہے تھے لیکن پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں غائب ہو گیا ہے۔ سب لوگوں کی متفقہ رائے یہ تھی کہ وہ مجرم کی تلاش میں گیا ہے اور اسے تلاش کئے بغیر شاید واپس نہیں آئے گا۔

شام کو ڈاکٹر ایک نرس کے ساتھ آ گیا۔ اس نے کہا۔

"میں تمام باتیں سن چکا ہوں۔ اب جو کچھ ہو چکا' اس پر آنسو بہانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ آج تمہاری پٹی کھلنے کا وقت ہے۔ لہٰذا اسے آج کھل جانا چاہئے۔ اس کے بعد تم اس دنیا کو دیکھو کہ.......... یہ دنیا جتنی خوبصورت ہے اتنی ہی بدصورت بھی ہے۔ اتنی بدصورت کہ لوگ ننھے سے معصوم بچوں کی جان بھی لینے سے دریغ نہیں کرتے۔ افسوس۔"

پوسٹ مارٹم کے بعد بچے کی لاش واپس آ گئی تھی۔ جب صائمہ کی آنکھوں کی پٹی کھلی تو اس کے اپنوں میں دو ہی ایسے تھے جنہیں وہ دیکھنا چاہتی تھی۔ ایک تو کامران' دوسرا وہ بچہ جس کی وجہ سے وہ کامران کی دلہن بنی تھی اور جسے وہ ماں کی بھرپور محبت دینے والی تھی۔ آنکھوں کو بینائی ملتے ہی اس نے سب سے پہلے بچے کی لاش دیکھی۔ بچے کے باپ کو دیکھنے کا ارمان تھا لیکن وہ نہیں تھا پتہ نہیں کب واپس آنے والا تھا۔ وہ واپس نہیں آیا۔ ایک دن گزر گیا۔ پھر ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس کے بعد ایک مہینہ

تصویر نکل آئے تو وہ اسے دیکھ لے لیکن اسے کہیں سے تصویر نہیں ملی تھی۔

بینائی تو مل گئی تھی لیکن یوں لگتا تھا کہ اب تک آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے اور اس کا محبوب اس کا جیون ساتھی چھپتا پھر رہا ہے اور وہ ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ آنکھوں سے وہ اَن دیکھی پٹی ہٹائی نہیں جاتی۔ جس دن وہ پٹی ہٹائی جائے گی تو اسے اپنے محبوب کا چہرا نظر آجائے گا۔

دوسرے دن ایک ہسپتال سے ٹیلی فون آیا۔ صائمہ نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف سے ایک ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ کے شوہر مسٹر کامران بری طرح زخمی ہیں اور اس وقت ہسپتال کے ایک ایمرجنسی وارڈ میں پڑے ہوئے ہیں۔ آپ فوراً یہاں پہنچیں۔"

یہ بات سنتے ہی اس نے ریسیور کو کریڈل پر پٹخا پھر وہاں سے بھاگتے ہوئے باہر آئی۔ باہر کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے ڈرائیور کو ہسپتال چلنے کے لئے کہا۔ کار اسٹارٹ ہوئی اور تیز رفتاری سے اس ہسپتال کی طرف جانے لگی۔ راستے میں صائمہ عجیب اضطراب میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اس کے اندر ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ آج اپنے شوہر کا چہرہ دیکھنے جا رہی تھی اور ایسی حالت میں کہ وہ بے چارہ زخموں سے چور ہو گا۔

جب وہ ہسپتال پہنچی تو ایمرجنسی وارڈ میں ایک وارڈ بوائے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا کہ مسٹر کامران کہاں ہیں۔ وہ وارڈ بوائے صائمہ کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر پھر اسے لے کر ایک کمرے میں پہنچا۔ وہاں دو لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک بستر پر ایک لاش۔ دوسرے بستر پر دوسری' دونوں چادروں کے نیچے چھپی ہوئی تھیں' انہیں دیکھتے ہی صائمہ کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

ڈاکٹر نے سر جھکا کر آہستگی سے کہا۔ "محترمہ ہمیں افسوس ہے کہ آپ نے پہنچنے میں دیر کی' مریض نے ابھی دم توڑا ہے۔ یہ دیکھئے۔"

اس نے آگے بڑھ کر ایک لاش پر سے چادر کو ہٹایا۔ صائمہ نے سر اٹھا کر دیکھا تو اسے ایک عجیب سا چہرہ نظر آیا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ گال پچکے ہوئے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور سر کے بال کھچڑی ہو رہے تھے وہ کسی کل سے اسے اپنا کامران دکھائی نہیں دیتا تھا۔

صائمہ نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہی میرے شوہر ہیں؟"

ڈاکٹر نے حیرانی سے صائمہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "محترمہ! آپ مجھ سے کیسے سوال کر رہی ہیں۔ یہ آپ کے شوہر ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے اور آپ ہیں کہ مجھ سے پوچھ رہی ہیں۔"

وہ بولی۔ "ڈاکٹر' میری مجبوری یہ ہے کہ میں اپنے شوہر کو چہرے سے پہچان نہیں سکتی کیونکہ جب میری شادی ہوئی تو میں اندھی تھی اور جب مجھے بینائی ملی تو میرا شوہر کھو چکا تھا۔"

"تو پھر آپ اپنے شوہر کے رشتہ داروں کو یہاں بلائیں۔ وہ اس لاش کی شناخت کریں گے۔"

صائمہ ڈاکٹر کے ساتھ اس کے کمرے میں گئی۔ پھر وہاں سے ٹیلیفون کے ذریعے کامران کے دوسرے رشتہ داروں کو اس واردات کی اطلاع دینے لگی۔ سب نے کہا کہ وہ فوراً ہی ہسپتال پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ٹیلی فون کرنے کے بعد وہ پھر اس کمرے میں آئی جہاں دو لاشیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ "ڈاکٹر یہ دوسری لاش کس کی ہے؟"

ڈاکٹر نے اس لاش کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "اسے بھی دیکھ لیجئے۔ شاید آپ پہچانتی ہوں؟" یہ کہہ کر اس نے دوسری لاش پر سے چادر ہٹائی تو اسے دیکھتے ہی صائمہ چونک گئی کیونکہ وہ وہی شخص تھا جو کامران بن کر اس کی عزت سے کھیلنے آیا تھا اور پھر اسے چاقو کے دستے سے مار کر بے ہوش کرنے کے بعد وہاں سے بھاگ گیا تھا۔

ڈاکٹر نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کی آنکھوں سے اور آپ کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اس دوسری لاش کو پہچانتی ہیں۔"

صائمہ نے اثبات میں سر ہلا کر ڈاکٹر کو وہ ساری روداد سنائی کہ وہ شخص کس طرح اس کا شوہر بن کر اسے بیوقوف بنانے آیا تھا لیکن نہ بنا سکا' اور بھاگ گیا۔ ڈاکٹر نے ساری باتیں سننے کے بعد کہا۔

"تمہاری یہ بات مرحوم کے بیان سے ملتی ہے یعنی وہ مرحوم جس نے اپنا نام پولیس والوں کو کامران بتایا اور آخری وقت بیان دیتے وقت یہ بات بھی کہی تھی کہ پچھلی رات یہ شخص کامران بن کر اس کی بیوی کو دھوکا دینے کے لئے کوٹھی میں گیا تھا اور اصلی کامران چھپ کر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ دراصل وہ درمیان میں آکر قاتل کو کھونا نہیں چاہتا تھا

اور نہ اس قاتل کو قانون کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ اس پر جنونی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ وہ اپنے بچے کے قاتل کو اپنے ہاتھوں سے تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہاں سے اسے پکڑنے کی کوشش کرے گا تو قاتل ہوشیار ہوجائے گا اور بھاگ جائے گا یا پھر ہنگامہ ہوگا تو وہ قاتل گرفتار ہوکر قانون کے ہاتھوں میں چلا جائے گا پھر اس کے انتقام لینے کی حسرت پوری نہیں ہوگی۔"

صائمہ نے کہا۔ "ڈاکٹر میں اپنے شوہر کا بیان پڑھنا چاہتی ہوں۔"

"وہ تو پولیس انسپکٹر اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ اسے یہاں رہنا چاہئے تھا لیکن ابھی اطلاع آئی کہ اس علاقے میں ایک واردات ہوگئی ہے جس کی وجہ سے اسے جانا پڑا۔ ویسے وہ کہہ گیا ہے کہ تم آؤ تو تمہیں روکا جائے تاکہ وہ تم سے کچھ باتیں کرسکے۔ لہٰذا تمہیں اس کے یہاں آنے تک رکنا ہوگا۔"

اتنے میں کامران کے رشتے دار وہاں آگئے۔ صائمہ کے والدین بھی پہنچ گئے۔ ان سب نے کامران کی لاش کو دیکھا پھر ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

کامران کے ایک رشتہ دار نے جواب دیا۔ "یہ کامران تو معلوم ہوتا ہے لیکن بہت بدل گیا ہے۔ عجیب سا چہرہ ہوگیا ہے۔ نہ اس کی کبھی داڑھی تھی نہ ایسے گال پچکے ہوئے تھے اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔"

دوسرے رشتہ دار نے کہا۔ "ہمارا خیال ہے کہ یہ یعنی کامران اپنے گھر سے جانے کے بعد فاقے کرتا رہا ہے اور پریشانی کے عالم میں زندگی گزارتا رہا ہے۔ اس لئے ایسا حلیہ ہوگیا ہے۔"

صائمہ کے والدین نے بھی تائید کی۔ انہوں نے کہا۔ "کامران تو یقیناً ہے ہمیں بھی یہ کامران ہی نظر آتا ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ چہرہ بدلا بدلا سا ہے۔"

صائمہ کا ذہن الجھ کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ سامنے جو لاش ہے اسے اپنا شوہر تسلیم کرے یا نہ کرے کیونکہ جتنے آنکھوں والے تھے اور جنہوں نے کامران کو اس کی زندگی میں دیکھا تھا وہ اسے جانتے ہوئے بھی نہیں جان رہے تھے اور شبہ کے دائرے میں رہ کر اعتراف کررہے تھے کہ وہ کامران ہے۔ ایک گھنٹے بعد پولیس انسپکٹر وہاں آگیا۔ پھر وہاں کئی طرح کے سوالات صائمہ سے اور اس کے رشتہ داروں سے کئے گئے۔

پھر پولیس انسپکٹر نے وہ بیان پڑھ کر سنایا جس کا لب لباب یہ تھا کہ وہ دوسری لاش جس کی تھی اس کا نام قیصر تھا۔ کامران نے قیصر کا پیچھا اس وقت سے شروع کیا جب وہ اس کی بیوی کو دھوکہ دینے میں ناکام ہوکر اس کی کوٹھی سے بھاگ رہا تھا۔ بعد میں قیصر کو علم ہوا کہ کوئی اس کا تعاقب کررہا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دونوں صبح تک چوہے اور بلی کا کھیل کھیلتے رہے۔ چھپتے رہے ایک دوسرے کو پکڑتے رہے اور لڑتے رہے۔ ایک دوسرے کو زخمی کرتے رہے۔ صبح کے وقت پھر فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں قیصر مارا گیا لیکن مرتے مرتے اس نے کامران کو اس حد تک زخمی کردیا تھا کہ وہ جانبر نہ ہوسکا۔ ہسپتال پہنچنے کے بعد بیان دیتے ہوئے اس نے دم توڑ دیا۔

اور اس کے بیان کا خاص نکتہ یہ تھا کہ اتنی تگ و دو کے بعد اور قیصر سے طویل جنگ لڑنے کے بعد اس بات کا انکشاف ہوا کہ قیصر اس کے بچے کا قاتل نہیں تھا۔ قیصر نے مرتے مرتے کہا تھا کہ میں نے بچے کو اغوا نہیں کیا اور نہ ہی اس معصوم کی جان لی ہے۔ میری نیت تو صائمہ کے بارے میں شروع سے خراب تھی اور میں اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسی لئے میں نے کامران بن کر اسے دھوکا دینا چاہا جب وہ میرے فریب میں نہیں آئی تو میں نے بچے کا حوالہ دے کر اسے دھمکی دی کہ اس کا ہونے والا بچہ بھی اسی طرح مارا جائے گا۔ یہ اس لئے کہا کہ ایک ماں شاید اپنے ہونے والے بچے کی زندگی کی خاطر سہم جائے اور اس کی خواہشوں کے سامنے جھک جائے لیکن صائمہ نے ایسا نہیں کیا اور قیصر کو فرار ہونا پڑا۔

پولیس انسپکٹر کامران کا بیان پڑھ کر سنا رہا تھا۔ صائمہ نے پریشان ہوکر دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا۔ اس بیان سے یہ نتیجہ نکل رہا تھا کہ کامران کے بچے کو اغوا کرنے والا اور قتل کرنے والا اب تک زندہ سلامت تھا اور قانون کی نظروں میں نہیں آرہا تھا اور وہ بدمعاش جیسے اب بھی صائمہ کو تاک رہا تھا۔ اس کے ہونے والے بچے کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ اندیشہ ایسا تھا کہ صائمہ ایک دم سے کانپ کر رہ گئی۔

☆======☆======☆

آدھی رات گزر چکی تھی۔ بچہ بھوک سے رو رہا تھا۔ اس لئے ماں کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے بچے کو سینے سے لگا کر تھپکنا شروع کیا اور خود بھی اونگھنے لگی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے پاس اس کا شوہر نہیں ہے۔ اس نے ذرا سا سر گھما کر پیچھے کی

طرف دیکھا تو اس کے شوہر کے حصے کا بستر خالی تھا۔ وہ موجود نہیں تھا۔

اس کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی۔ اس نے سامنے دیوار کی طرف دیکھا وہاں اس کے شوہر قربان علی کی ایک تصویر لگی ہوئی تھی۔ اسے پچھلی کچھ باتیں یاد آنے لگیں۔ وہ قربان علی کو چاہتی ضرور تھی لیکن کامران سے شادی کرنا چاہتی تھی کیونکہ اس کے پاس کچھ دولت تھی اور ایسے آثار نظر آ رہے تھے کہ کامران مزید دولت مند بنتا چلا جائے گا۔ اس لئے جب کامران کی پہلی بیوی کا انتقال ہوا تو وہ ہر طرح سے اس پر ڈورے ڈالنے لگی۔ قریبی رشتہ تھا۔ گھر میں آنا جانا تھا لیکن کامران اس کی طرف توجہ نہیں دیتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ کامران نے اچانک صائمہ سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا اور اس فیصلے پر عمل بھی کیا۔ اسے دلہن بنا کر اپنی کوٹھی میں لے آیا۔ یہ بات وہ برداشت نہ کر سکی۔

قربان علی نے اسے مشورہ دیا۔ "رئیسہ میں جانتا ہوں کہ تم مجھے دل و جان سے چاہتی ہو۔ اسی لئے اپنا سب کچھ مجھ پر نچھاور کر چکی ہو۔ جہاں تک کامران کا تعلق ہے تمہیں صرف اس کی دولت سے محبت تھی جو حاصل نہ ہو سکی لیکن اب بھی تم چاہو تو اس کی دولت کا کچھ حصہ حاصل کر سکتی ہو۔"

"وہ کیسے؟"

"ایسے کہ اس نے تمہیں دولت سے محروم کیا ہے۔ تم اسے اس کے بچے سے محروم کر دو۔"

رئیسہ نے پوچھا۔ "اس سے کیا ہو گا؟"

"بہت کچھ ہو گا۔ میں ٹیلی فون پر آواز بدل کر اس سے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے بچے کی خاطر اتنی بڑی رقم ادا کر دے گا۔ ہم دونوں کو شادی کرنے کے لئے اور نئی زندگی کی ابتداء کرنے کے لئے یہ ایک لاکھ روپے کافی ہوں گے۔"

تدبیر بہت اچھی تھی۔ ایک تو ایک لاکھ روپے وصول ہو جاتے۔ دوسرے یہ کہ انتقام کی حسرت بھی پوری ہو جاتی۔ اس لئے رئیسہ نے فوراً ہی اس تدبیر پر عمل کیا اور ایک رات صائمہ کی خوابگاہ میں داخل ہو کر وہ اس کے اندھے پن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بچے کو اٹھا کر لے آئی اور اسے اسی مکان میں رکھا جہاں اس وقت وہ اپنے بچے کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی اور اسے دودھ پلا کر تھپک تھپک کر سلا دینا چاہتی تھی اور اپنے جیون ساتھی

اور جرائم کے ساتھی قربان علی کے متعلق سوچنا چاہتی تھی۔

اسی وقت دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ اس نے اُدھر دیکھا تو دروازہ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ پھر اسے قربان نظر آیا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں کوئی گٹھڑی نما چیز سمیٹے ہوئے تھا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے رئیسہ کی طرف دیکھا پھر دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "لو آج پھر ایک نئی چیز لایا ہوں۔ ہمیں لاکھوں روپے کا منافع ہو گا۔"

رئیسہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے گٹھڑی کی طرف دیکھا تو سمجھ میں آگیا کہ اس کی گود میں بچہ تھا۔ اس نے پوچھا۔ "یہ کس کا بچہ اٹھا لائے ہو؟"

"صائمہ کا۔"

"یہ صائمہ کا بچہ ہے؟" رئیسہ نے پوچھا۔ "اسے یہاں کیوں لائے ہو میں اپنی بچی کے ساتھ اسے نہیں رکھوں گی۔"

"پاگل ہوئی ہو۔ یہ صرف صائمہ کی نہیں بلکہ کامران کی بھی بیٹی ہے اور اس کے ذریعے ہم لاکھوں روپے حاصل کر سکتے ہیں۔ پھر ایک بار صائمہ کو دھمکی دیں گے کہ اگر اس نے ہماری مطلوبہ رقم ادا نہ کی تو ہم اس کی بچی کو ختم کر دیں گے۔"

رئیسہ نے اپنی بچی کو اٹھا کر سینے سے لگایا پھر بولی۔ "نہیں میرے آگے بھی ایک بچی ہے میں کسی دوسری ماں کی گود اجڑتے ہوئے نہیں دیکھ سکوں گی۔"

قربان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "واہ! آج ایک بچی کیا پیدا کی ہے کہ بالکل ہی ماں بن بیٹھی ہو' اس وقت تمہیں کامران کے بچے پر رحم نہیں آیا تھا جب تم نے اسے مار ڈالا تھا۔"

رئیسہ نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ "بکواس مت کرو۔ میں نے اسے جان بوجھ کر ہلاک نہیں کیا تھا اسے سردی لگ گئی تھی۔"

"ہاں' تم نے لاپروائی سے اسے چھوڑ دیا تھا۔ اسے اگر اچھی طرح ڈھانپ کر رکھتیں' اسے سینکتی رہتیں تو وہ بچ جاتا لیکن تم نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔"

"میں مانتی ہوں کہ میری لاپروائی تھی۔ اس وقت میرے اندر ایسی ماما بیدار نہیں ہوئی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ ماں کتنی تکلیفیں اٹھا کر ایک بچے کو جنم دیتی ہے۔ آج میری گود میں ایک بچہ ہے تو میں اس دکھ کو اور ممتا کو سمجھ سکتی ہوں۔ آئندہ میرے گھر

میں ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔"

"کیا تم کامران کی دولت سے اپنا حصہ وصول نہیں کرو گی۔"

"سبھی دولت کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ کہیں سے ڈھیر ساری دولت مجھے مل جائے' اگر اس بچی کے ذریعے مل سکتی ہے تو میں ضرور حاصل کروں گی لیکن اسے نقصان نہیں پہنچانے دوں گی۔"

"چلو ہم اسے نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ صائمہ کو صرف دھمکیاں دیں گے۔"

"اگر وہ دھمکیوں میں نہ آئی اور اس نے ہمارا مطالبہ پورا نہ کیا تو؟"

"کیسی باتیں کرتی ہو۔ کامران کے مرنے کے بعد تو صائمہ اور زیادہ دولت مند ہوگئی ہے۔ کیا تمہیں نہیں معلوم ہے کہ کامران نے اپنا پانچ لاکھ روپے کا انشورنس کرایا ہوا تھا۔ وہ رقم صائمہ کو ملنے والی ہے۔ دوسرے یہ کہ کامران کے ماموں نے اس کا کاروبار سنبھال لیا ہے اور وہ بوڑھا نہایت ایماندار ہے اور بڑی ایمانداری سے اور بڑے منافع سے وہ کاروبار کر رہا ہے۔ اب صائمہ کے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ دولت کی ریل پیل ہے۔ ایسے میں کیا وہ ہمارا مطالبہ پورا نہیں کرے گی جبکہ اس کی یہ پہلی بیٹی ہے اور اسے آخری بیٹی بھی کہنا چاہئے کیونکہ نہ کامران ہے اور نہ ہی وہ دوسری بار ماں بن سکے گی۔ اسی لئے صائمہ کی کل کائنات یہی بچی ہوگی اور اس کائنات کے لئے وہ ہمیں لاکھوں روپے ادا کر سکتی ہے۔"

"ہوں' تمہاری بات دل کو لگتی ہے میں اس بچی کو ضرور رکھوں گی اور تم اپنے ہتھکنڈے آزماؤ اور اسے دھمکیاں دو اور اپنا مطالبہ پیش کرو لیکن دو چار روز میں سب کچھ طے ہو جانا چاہئے۔ میں زیادہ دنوں تک اس بچی کو نہیں رکھوں گی اور نہ ہی اسے کوئی نقصان پہنچنے دوں گی۔"

"تم فکر نہ کرو میں بھی اسے نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔ حالانکہ اس بچی کا باپ مجھے قتل کرنا چاہتا تھا۔ میں نہ ملا تو میرے دھوکے میں قیصر کو قتل کر دیا۔ اگر میں اس کے ہتھے چڑھ جاتا تو کیا ہوتا۔ بہرحال میں پھر بھی تمہارے کہنے پر اس بچی کو معاف کر دوں گا اسے کوئی جانی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

رئیسہ نے اس کی طرف بے یقینی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "قیصر تمہارا جگری دوست تھا۔ بچپن کا لنگوٹیا یار تھا۔ اس کی موت پر تم نے غصے میں کہا تھا کہ اگر کامران زندہ رہتا

تو تم اسے قتل کر دیتے۔ اپنے دوست کا بدلہ ضرور لیتے۔ اب کامران نہیں ہے لیکن اس کی بیٹی تمہارے ہتھے چڑھ گئی ہے۔ کیا تم وہ انتقام بھول گئے ہو یا مجھے بیوقوف بنا رہے ہو۔"

وہ جھنجھلا کر بولا۔ "تم عورتوں سے بات کرنا ہی فضول ہے۔ جب میں کہہ رہا ہوں کہ یہ بچی تمہارے حوالے ہے اور میں اسے نقصان نہیں پہنچاؤں گا پھر یہ کہ تم اسے اپنی نگرانی میں رکھو گی تو بھلا میں اسے کیسے ہلاک کر سکتا ہوں۔ کامران کا انتقام اس ننھی سی بچی سے کیسے لے سکتا ہوں۔"

"اچھی بات ہے میں تم پر بھروسہ کرتی ہوں۔ لاؤ بچی کو مجھ دکھاؤ۔ ذرا دیکھوں تو یہ کیسی ہے؟"

یہ کہہ کر رئیسہ نے اپنی بچی کو اس کے بستر پر لٹا دیا۔ پھر دونوں ہاتھ بڑھا کر صائمہ کی بچی کو گود میں لے لیا۔ پھر اسے مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولی۔ "ماشاء اللہ میری بچی کی طرح خوبصورت ہے۔ دونوں ہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک ماں کی بیٹیاں ہیں۔ جیسے میں نے ایک نہیں دو بیٹیوں کو جنم دیا ہے۔"

قربان نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کیا ارادہ ہے کیا ہمیشہ کے لئے اسے اپنے پاس رکھ لینا چاہتی ہو۔"

"نہیں' میں کسی ماں کی گود نہیں اجاڑوں گی۔ اسے ایک ہفتے کے اندر صائمہ کی گود میں پہنچ جانا چاہئے۔ یاد رکھو تم نے وعدہ کیا ہے کہ ہم صرف دولت حاصل کریں گے کسی کی جان سے نہیں کھیلیں گے۔"

"ہاں بھئی مجھے یاد ہے۔ بار بار ایک ہی بات کو نہ دہراؤ۔"

وہ صائمہ کی بچی کو پیار سے تھپکتے ہوئے بولی۔ "میری بیٹی کا نام تو شائستہ ہے۔ اس بچی کا کیا نام ہے؟"

"کیا نادانوں جیسی باتیں کرتی ہو۔ میں صائمہ کے ہاں بچی کو اٹھانے گیا تھا۔ اس سے بچی کا نام پوچھنے نہیں گیا تھا۔ مجھے کیا معلوم کہ اس کا نام کیا ہے؟"

"میں کوئی نام رکھ لوں۔"

"کیا ہمیشہ رکھنے کا ارادہ ہے کہ نام رکھو گی۔ ارے دو چار روز کی بات ہے۔ اس کے بعد پھر اسے چلتا کریں گے۔"

یہ کہہ کر وہ جانے لگا۔ رئیسہ نے پوچھا۔ "اب اتنی رات کو کہاں جا رہے ہو؟"

"میں ذرا چھت پر جاؤں گا اور وہاں سگریٹ پی کر سوچتا رہوں گا کہ اس بچی کے سلسلے میں کیسے اقدامات کرنے چاہئیں کہ صائمہ.......... فوراً ہی بڑی سے بڑی رقم کی ادائیگی کے لئے تیار ہو جائے۔ بہرحال یہ میرا کام ہے۔ تم آرام سے سو جاؤ میں رات کو کسی وقت آکر سو جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر آگیا۔ پھر سیڑھیاں چڑھتا ہوا چھت پر پہنچا اور ایک سگریٹ سلگا کر اس کے کش لیتے ہوئے ٹہلنے لگا اور پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ پریشانی اس بات کی تھی کہ رئیسہ اس بچی کو ہلاک کرنا نہیں چاہتی تھی اور وہ قیصر کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس کا جگری دوست کامران کے ہاتھوں مارا گیا تھا پھر یہ کہ کامران نے اس کا مطالبہ پورا نہیں کیا تھا۔ تیسری بات یہ تھی کہ کامران اسے قتل کرنے کے لئے تلاش کر رہا تھا۔ قسمت اچھی تھی کہ وہ بچ گیا۔ اتنی باتیں ہونے کے بعد اب وہ کامران کی بیٹی کو یونہی چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ اس سے دولت بھی حاصل کرنا چاہتا تھا اور صائمہ کو اس بچی سے محروم بھی کرنا چاہتا تھا تاکہ انتقام کی آگ کسی طرح بجھے۔

سوچتے سوچتے اسے اپنی بیٹی شائستہ کا خیال آیا۔ وہ پتہ نہیں کیوں بیٹی کے پیدا ہونے کے بعد ہی ذرا سا نرم دل ہو گیا تھا۔ اس حد تک کہ اپنی بیٹی سے محبت کرنے لگا تھا۔ حالانکہ ایسے ہی وقت جبکہ اپنی بیٹی کی محبت سینے میں موجود تھی۔ اسی سینے میں ایسا دل رکھتا تھا کہ دوسرے کی بیٹی کو ہلاک کرنے کی تدبیریں بھی سوچ رہا تھا۔

بہرحال شائستہ جب سے پیدا ہوئی تھی تب سے رئیسہ اسی فکر میں تھی کہ کس طرح اس کے لئے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے لگے۔ اس کے لئے سونے کے زیورات بنوائے تاکہ اس کی شادی میں خوب جہیز دے کر اسے رخصت کر سکے۔ ہر ماں اپنی بیٹی کے پیدا ہوتے ہی یہ سوچنا شروع کر دیتی ہے۔

ابھی پچھلے ہی دن رئیسہ نے اس سے کہا تھا۔ "قربان تم بالکل نکھٹو ہو۔ کبھی محنت مزدوری کرنا تو جانتے ہی نہیں۔ کوئی ایسی تدبیر بھی نہیں سوچتے کہ تھوڑا سا سرمایہ لگا کر زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے والا کوئی کاروبار کر سکو۔ تمہیں یہی سب جرائم والی باتیں اچھی طرح سوجھتی ہیں۔ اگر تمہارا یہی رنگ ڈھنگ رہا تو میں شائستہ کو اس کے نانا کے پاس چھوڑ دوں گی۔ وہاں کم از کم اچھا کھانا پینا اور پہننا اوڑھنا ہے۔ وہاں میری بیٹی

رہے گی تو سکھی رہے گی۔ وہاں یہ فکر تو نہیں ہو گی کہ آج تمہارا کام ہے۔ کل نہیں ہے۔ آج تمہاری آمدنی ہے اور کل دوسروں سے قرض مانگتے پھر رہے ہیں۔ اگر یہی چلن رہا تو میں اپنی بیٹی کو اپنے پاس نہیں رکھوں گی۔ اس کے اچھے مستقبل کے لئے اس کے ننھیال میں ہی چھوڑ دوں گی۔"

رئیسہ کی اتنی ساری باتیں سننے کے بعد وہ بگڑ گیا تھا اور اس نے صاف طور سے کہہ دیا تھا کہ میری بیٹی میری نظروں کے سامنے رہے گی اور تم اسے نانا کے پاس نہیں بھیج سکتیں۔ میں اپنی بیٹی کے لئے زیادہ سے زیادہ کمانے کی کوشش کروں گا اور کوئی اچھا سا کاروبار کروں گا۔ کاروبار کرتے ہی میں یہ سب جرائم والی باتیں سوچنا بھی چھوڑ دوں گا۔

چھت پر سناٹا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں لیکن قربان کا دماغ یہ سوچ کر گرم ہو رہا تھا کہ رئیسہ کتنے ہی معاملات میں اس کی مخالفت کرتی تھی۔ ایک تو یہی کہ صائمہ کی بچی کو ہلاک کرنا نہیں چاہتی تھی اور وہ جانتا تھا کہ وہ ایسا ہونے نہیں دے گی۔ دوسری بات یہ کہ شائستہ کو اپنے ننھیال بھیجنے کی ضد کرتی تھی۔ اس نے کئی بار سوچا کہ رئیسہ کو ٹھوکر مار کر چلا جائے۔ اگر اسے بیٹی کی محبت نہ ہوتی تو شاید وہ صائمہ سے اس کی بچی کے سلسلے میں لاکھوں روپے وصول کرنے کے بعد رئیسہ کو دھوکہ دے کر چلا جاتا لیکن بیٹی کی خاطر وہ وہاں رہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

وہ سوچتے سوچتے تھک گیا۔ نیند بھی آنے لگی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ وہ چھت سے اتر کر نیچے آیا۔ اسی وقت باہر دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی دی۔ اس نے دروازے کے قریب پہنچ کر آہستگی سے پوچھا۔ "کون ہے؟"

دوسری طرف سے بھی سرگوشی میں آواز سنائی دی۔ "میں ہوں فرقان۔ جلدی باہر آؤ۔"

نام سنتے ہی اس نے دروازہ کھول دیا۔ پھر باہر آکر دروازے کو بند کرتا ہوا بولا۔ "کیا بات ہے۔ اس وقت کیوں آئے ہو۔"

آنے والے نے کہا۔ "بس اسی وقت چلو سیٹھ نے تمہیں بلایا ہے۔ بڑا زبردست کام ہے ایک ہی جھٹکے میں تمہیں پچیس ہزار روپے مل جائیں گے۔ بس اِدھر کا مال اُدھر کرنا ہے۔"

قربان نے خوش ہو کر پوچھا۔ "کیا واقعی؟"

"تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ اتنی رات کو مجھے آنے کی کیا ضرورت تھی۔ جلدی چلو ورنہ یہ کام سیٹھ کسی دوسرے کو بھی دے سکتا ہے، مگر پتہ نہیں کیوں تم پر زیادہ بھروسہ کر رہا ہے۔"

قربان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "پچیس ہزار کے لئے تو میں جہنم میں بھی جا سکتا ہوں۔ چلو۔"

☆------☆------☆

صبح ہو گئی لیکن صائمہ جُوں کی تُوں بیٹھی رہی۔ وہ جیسے پتھر کا مجسمہ بن گئی تھی۔ اس کے دیدے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ پلکیں بھی نہیں جھپکا رہی تھی۔ اس کے اور کامران کے رشتے داروں نے اسے رُلانے کی کتنی ہی کوششیں کر ڈالیں لیکن وہ رونا بھی بھول گئی تھی۔ بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے خلا میں اپنی گمشدہ بچی کو دیکھ رہی تھی۔

آخر صبح کے وقت ڈاکٹر نے ایک رشتہ دار سے آہستگی سے کہا کہ اس کے سامنے کسی بچے کو رلایا جائے۔ تب شاید یہ ہوش میں آئے گی اور شاید رونا بھی شروع کر دے۔

ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ایک رشتے دار کی عورت نے اپنے بچے کو چٹکی لے کر اسے رلا دیا۔ بچے کے رونے کی آواز سنتے ہی واقعی صائمہ پر اثر ہوا۔ وہ ایک دم سے چونک گئی۔ اور چیخ کر کہنے لگی۔ "میری بچی، میری بچی رو رہی ہے۔ کہاں ہے میری بچی؟؟"

وہ دیوانہ وار اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس عورت نے قریب آکر کہا۔ "حوصلہ رکھو۔ یہ میری بچی رو رہی ہے۔ تمہاری بچی کو تو پولیس والے تلاش کر رہے ہیں اور ہمارے خاندان کے سارے ہی مرد دوڑے دوڑے پھر رہے ہیں کہ کہیں سے کچھ سراغ مل جائے تم اللہ پر بھروسہ رکھو۔"

ایسے وقت سارے حوصلے ٹوٹ جاتے ہیں۔ صائمہ یک بیک سینے پر دوہتڑ مار کر اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک ایک کے قدموں میں گرنے لگی۔ "خدا کے لئے میری بچی کو کوئی بھی ڈھونڈ کر لے آئے۔ میں اپنی ساری دولت جائیداد کو ٹھی سب کچھ اسے دے دوں گی۔ بس مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ میری بچی چاہئے۔"

کسی نے کہا۔ "ذرا صبر سے کام لو۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر کسی نے بچی کو اغوا کیا ہے تو وہ یقیناً کچھ نہ کچھ مطالبہ پیش کرے گا۔ تم ساری دولت اور جائیداد دینے کی بات کر رہی ہو۔ وہ معمولی رقم لے کر بھی ٹل سکتا ہے مگر تمہاری بچی یقیناً مل جائے گی اور ایسے لوگ اکثر فون کے ذریعے ہی رابطہ قائم کرتے ہیں۔ لہٰذا ٹیلی فون ہمیشہ تمہارے پاس رہنا

چاہئے۔"

یہ مشورہ معقول تھا اور دل کو لگتا تھا' صائمہ دوڑتی ہوئی ڈرائنگ روم میں گئی اور وہاں سے ٹیلی فون اٹھا کر اپنی خواب گاہ میں لے آئی اور اس کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔ گھر والوں نے اس سے کہا کہ وہ منہ ہاتھ دھولے۔ کچھ ناشتہ کرلے یا چائے پی لے لیکن وہ کسی کی بات نہیں سن رہی تھی اور سب سے ہاتھ جوڑ کر کہہ رہی تھی کہ میرے پاس بیٹھنے کی بجائے خدا کے لئے اِدھر اُدھر جائیے۔ کہیں نہ کہیں میری بچی ضرور مل جائے گی۔ اسے تلاش کیجئے۔ میں ٹیلی فون کے پاس اس وقت تک بیٹھی رہوں گی جب تک میری بیٹی کی خبر نہیں ملے گی خواہ مجھے ساری زندگی اس ٹیلی فون کے پاس بیٹھنا پڑے۔

اسے ساری زندگی بیٹھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ پہلے دو چار کالیں اِدھر اُدھر سے آئیں۔ کچھ رشتہ داروں' کچھ جان پہچان والوں نے پوچھا تھا کہ لڑکی ملی یا نہیں۔ اس نے مختصر سا جواب دے کر ریسیور رکھ دیا تھا۔ پھر ایک کال آئی۔ اس نے ریسیور اٹھایا تو کسی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تمہاری بیٹی میرے پاس ہے۔"

یہ سنتے ہی صائمہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور ریسیور پکڑے ہوئے گڑگڑانے لگی۔ "خدا کے لئے میری بچی کو میرے حوالے کردو۔ تم جو چاہو گے وہ میں کروں گی۔ جو مانگو گے دوں گی مگر میری بیٹی کو اسی وقت میرے پاس لے آؤ۔"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "تم تو بے تکان بولے جارہی ہو۔ کچھ مجھے تو بولنے دو۔"

"ہاں ہاں بولو۔ میں سن رہی ہوں۔ میں ساری زندگی تمہاری باتیں سنتی رہوں گی۔ میری بیٹی کو میرے پاس لے آؤ۔"

"میں تمہاری بیٹی کی ہی بات کر رہا ہوں۔ وہ خیریت سے ہے اور خیریت سے رہے گی لیکن اگر تم نے پولیس والوں سے تعاون کیا یا کسی طرح بھی قانون کی مدد لینے کی کوشش کی تو نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ تم کامران کے ایک بچے کا انجام دیکھ ہی چکی ہو۔"

وہ "نہیں۔ نہیں" کہہ کر چیخنے لگی۔ کہنے لگی۔ "میں ہرگز ایسا نہیں کروں گی۔ میں پولیس والوں کو اپنی کوٹھی میں داخل نہیں ہونے دوں گی۔ میں کبھی قانون کا سہارا نہیں لوں گی۔ تم جو کہو گے وہ کروں گی۔"

"تو پھر میری بات کو غور سے سنو اور اسے آنچل میں باندھ لو کہ تمہاری بیٹی چھ ماہ سے پہلے تمہیں نہیں ملے گی۔"

"چھ ماہ؟" صائمہ کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹتے چھوٹتے رہ گیا۔ وہ چیخ کر بولی۔ "نہیں' ایسا ظلم نہ کرو۔ میں یہ ظلم برداشت نہ کرسکوں گی۔ میں چھ ماہ تک تو کیا چھ منٹ کے لئے بھی اپنی بیٹی سے جدا رہنا پسند نہیں کروں گی۔ خدا کے لئے میری بات مان لو۔ میں تمہیں خدا کا واسطہ دے رہی ہوں۔ رسول ﷺ کا واسطہ دے رہی ہوں اور کوئی بڑی قسم ہو تو وہ تمہیں دے سکتی ہوں۔ مگر مجھے معلوم تو ہو کہ تمہارا دل کیسے پگھلے گا۔ تم کیسے موم ہوسکو گے اور میری بیٹی کو مجھ تک پہنچا سکو گے؟"

"میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ مجھے چھ ماہ کے بعد تمہاری بیٹی کو تمہارے حوالے کرنا ہے۔ اس سے پہلے کوئی بات نہیں ہوگی اور اس سے پہلے میں تم سے رابطہ قائم نہیں کروں گا۔ یہ میرا آج کا آخری رابطہ ہے۔ جسے میں ختم کر رہا ہوں۔ چھ ماہ کے لئے۔"

یہ کہتے ہی دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا۔ اِدھر صائمہ چیختی رہی۔ وہ کریڈل کو کھٹکھٹا کر اسے آوازیں دیتی رہی لیکن دوسری طرف خاموشی چھا گئی تھی۔ ایک دم سے اس پر وحشت طاری ہوگئی۔ وہ جنونی انداز میں ریسیور کو پھینکتی ہوئی اِدھر سے اُدھر بھاگنے لگی۔ چیختے ہوئے وہ ڈرائنگ روم کی طرف جانے لگی۔ وہاں سے تمام رشتہ دار اس کی چیخیں سن کر آرہے تھے۔ وہ سب اسے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ وہ اپنے بال نوچ رہی تھی اور چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ "بچی مجھے نہیں ملے گی۔ چھ مہینے تک نہیں ملے گی۔ وہ کہتا ہے کہ میں پولیس والوں کے پاس نہ جاؤں۔ میں قانون کی مدد نہ لوں میں کسی سے بھی سہارا نہ مانگوں۔ اپنی بچی کو تلاش نہ کروں۔ یہ کیسا ظلم ہے کہ میں نے اسے نو ماہ تک پیٹ میں رکھ کر اور دنیا بھر کی تکلیفیں برداشت کرکے اسے جنم دیا اور وہ اس پر حق جتا رہا ہے۔ اور میرے حق سے مجھے محروم کر دیا ہے۔ میری جان میرے اندر سے نکال کر لے گیا ہے اور کہہ رہا ہے کہ چھ ماہ تک میں اپنی جان کے بغیر زندہ رہوں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اپنے اندر جان نہ رہے اور کوئی زندہ رہے۔"

وہ چیخ چیخ کر بولتی جارہی تھی۔ اس کے رشتہ دار اسے خاموش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسے سمجھا رہے تھے اسے تھپک رہے تھے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر بہلا رہے تھے۔ لیکن وہ پاگلوں کی طرح زور زور سے بولتی جارہی تھی حتیٰ کہ بولتے بولتے چکرا کر گری اور

بے ہوش ہوگئی۔

انسان بے ہوش ہوجائے یا مرجائے لیکن تقدیر جو وقت لکھ دیتی ہے۔ اس وقت سے پہلے وہ کام نہیں ہوتا۔ حالانکہ چھ ماہ کی مدت قربان نے دی تھی وہ تقدیر لکھنے والا نہیں تھا لیکن قربان خود نہیں جانتا تھا کہ وہ جو بات کہہ رہا ہے' اس سے پہلے تقدیر یہ فیصلہ کرچکی ہے اور وہ یہ کہ اس نے چھ ماہ کا وقت دیا تھا لیکن تقدیر نے ایک سال کی مدت لکھ دی ہے۔

ہوا یوں کہ رئیسہ پچھلی رات تنہا اپنے بیڈ روم میں رہی اور دونوں بچیوں کو سنبھالتی رہی۔ صبح وہ دیر سے سوکر اٹھی۔ وہ بھی بچوں کے رونے کی آواز نے اٹھادیا تھا۔ اسے حیرانی ہوئی کہ قربان کہاں چلاگیا۔ کیونکہ وہ پچھلی رات چھت پر گیا تھا۔ اس کے بعد واپس نہیں آیا۔

دوپہر کو ایک شخص نے آکر اطلاع دی کہ قربان حوالات میں بند ہے اور اسے بلا رہا ہے۔ یہ سنتے ہی رئیسہ حیران اور پریشان سی ہوکر سوچنے لگی۔ کیا یہ چوری پکڑی گئی ہے کیا معلوم ہوگیا ہے کہ صائمہ کی بچی کو اغوا کیا ہے۔ اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اور اندیشے جنم لینے لگے لیکن حوالات میں پہنچنا ضروری تھا اور یہ معلوم کرنا تھا کہ قربان کیوں بلا رہا ہے اور اسے کس سلسلے میں حوالات میں رکھا گیا ہے۔

لیکن اب ایک بہت بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ دو بچیوں کو کیسے اٹھاکر حوالات میں جاتی۔ اتنی دور جانا اور بچیوں کو لے کر جانا مشکل تھا۔ دوسری بات یہ کہ ان بچیوں کو تنہا گھر میں چھوڑ کر نہیں جاسکتی تھی۔ وہ سوچ میں پڑگئی کہ کیا کرے۔ اس علاقے میں مکانات ایک دوسرے سے دور دور تھے اور انہوں نے کبھی پڑوسیوں سے زیادہ ربط وضبط نہیں رکھا تھا۔ کیونکہ ایک تو ان کی کوئی آمدنی نہیں تھی اور کوئی اچھا رکھ رکھاؤ نہیں تھا۔ ان کے مقابلے میں دوسرے پڑوسی مال دار تھے کسی کے پاس کار تھی کسی کے پاس اسکوٹر تھا اور وہ لوگ اچھی زندگی گزارتے تھے۔ رئیسہ احساسِ کمتری کے باعث کسی سے ملتی نہیں تھی اور یہ نہ ملنا بھی ایک طرح سے اچھا ہی ہوا کیونکہ کسی بھی پڑوسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ رئیسہ اپنے میکے سے ماں بن کر آئی ہے تو اس کی گود میں ایک بچہ ہے یا دو بچے ہیں۔ رئیسہ کسی سے بھی کہہ سکتی تھی کہ اس نے دو بچیوں کو جنم دیا ہے۔ بات یہاں تک بن جاتی لیکن وہ تھانے کیسے جائے۔

ایک ہی راستہ تھا کہ فوری طور پر کوئی ملازمہ رکھی جائے یا پڑوس میں جاکر کہا جائے کہ کوئی بوڑھی عورت اگر گھنٹے دو گھنٹے کے لئے اس کی بچیوں کو سنبھال لے تو وہ ایک ضروری کام سے باہر جاکر آنا چاہتی ہے۔ وہ کئی طرح کی باتیں سوچ رہی تھی لیکن پڑوس میں جانے کے لئے بھی دو بچیوں کو اٹھاکر لے جانا پڑتا۔ دونوں ہی اپنے بچے ہوتے تو وہ ایک ماں کے طور پر بڑے فخر سے انہیں اٹھاکر دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لے جاسکتی تھی لیکن دل میں تو چور تھا اور اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں دوسری بچی کی وجہ سے پکڑی نہ جائے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سوچتی ہی رہ گئی اور حوالات تک نہ جاسکی۔ دوسرے دن اس نے ایک بوڑھی آیا کا بندوبست کیا اور بچیوں کو اس کے حوالے کرکے تھانے پہنچی تو پتہ چلا کہ دیر ہوچکی ہے۔ قربان کو حوالات سے سنٹرل جیل میں منتقل کردیا گیا ہے۔ وہ اس علاقے کے دادا کے پاس گئی۔ قربان اکثر دادا کے اڈے پر بیٹھا رہتا تھا۔ دادا نے بتایا کہ قربان تو بڑا ہی تیز طرار ہے۔ اس نے پچھلی رات مال کو اِدھر سے اُدھر کرکے گودام میں پہنچا دیا تھا لیکن صبح ہوگئی تھی۔ اس لئے ستانے کے لئے وہاں بیٹھ گیا۔ پھر وہاں سے اس نے کسی کو ٹیلی فون بھی کیا تھا۔ اس کے بعد وہ اٹھ کر جانا ہی چاہتا تھا کہ پتہ نہیں کیسے پولیس والوں کو پتہ چل گیا۔ ان لوگوں نے چاروں طرف سے گودام کو گھیرلیا اور تلاشی لی تو سارا مال پکڑا گیا اور اس کے ساتھ ہی قربان بھی گرفتار کرلیا گیا۔ اب اس پر مقدمہ چلے گا۔ دیکھتے ہیں کہ اسے کتنے سال کی سزا ہوتی ہے۔

رئیسہ نے پریشان ہوکر پوچھا۔ "کیا سزا بہت زیادہ ہوگی۔"

"ہاں سال چھ ماہ سے کیا کم ہوسکتی ہے۔ یوں سمجھو کہ وہ سال بھر کے لئے گیا۔"

دادا کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ قربان کو ایک سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ ایک دن رئیسہ اس سے سنٹرل جیل میں ملنے کے لئے گئی۔ قربان نے کہا۔ "میں نے پہلے ہی دن تمہیں حوالات میں بلایا تھا تم کیوں نہیں آئی۔"

رئیسہ نے ناگواری سے کہا۔ "تم کوئی لاٹ صاحب ہو کہ تمہارا حکم مان کر میں چلی آئی۔ سدا کے نکتے رہے ہو۔ الٹے سیدھے دھندے کرتے ہو اور کبھی دو چار روز کے لئے اور کبھی دو چار ماہ کے لئے جیل چلے جاتے ہو۔ اس بار تو پورے ایک سال کے لئے گئے ہو۔ کبھی سوچا ہے کہ میرا اور بچی کا گزارہ کیسے ہوگا اور اب تو دوسری بچی بھی تم نے

میرے سر پر لاکر بوجھ کی طرح رکھ دی ہے اس کا میں کیا کروں؟"

"میں اسی سلسلے میں باتیں کرنے کے لئے تمہیں بلا رہا تھا۔"

"میں نہیں آسکتی تھی۔ دو بچیوں کو لے کر تھانے کیسے پہنچتی۔ کیا جواب دیتی کہ ان بچیوں میں سے ایک بچی کس کی ہے۔ میں بہانہ کرسکتی تھی کہ میں نے دو بچیوں کو جنم دیا ہے' لیکن میرے دل میں تو ڈر بیٹھا ہوا ہے پھر یہ کہ بچیوں کی نگرانی کے لئے کسی آیا کی ضرورت تھی۔ میں نے ایک بوڑھی ملازمہ کا انتظام کیا ہے۔ وہ بچیوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔"

"یہ تم نے ٹھیک کیا۔ اس ملازمہ کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھو تاکہ بچیوں کو پالنے میں تمہیں زیادہ تکلیف نہ ہو۔ اب تو ایک سال تک کے لئے اس بچی کو رکھنا ہوگا اور اس کی حفاظت کرنی ہوگی یوں سمجھو کہ وہ بچی ہمارے لئے لاٹری کا ٹکٹ ہے۔ ایک سال کے بعد اس کے ذریعے ہمیں لاکھوں روپے ملیں گے۔"

"بس تم ایسے ہی خواب دکھاتے جاؤ' میں تو پریشان ہوگئی ہوں۔ اب میرے میکے والے پوچھیں گے کہ دوسری بچی کہاں سے آئی ہے تو میں کیا جواب دوں گی۔"

"یہ کوئی بڑی بات تو نہیں ہے۔ کہہ دینا کہ تمہاری کوئی سہیلی یا کوئی اور عورت تمہارے ہاں ایک رات پناہ لینے کے لئے آئی تھی۔ اس بچی کو چھوڑ کر کہیں چلی گئی۔ اور اس کا کہیں پتہ نہیں مل رہا ہے۔ اس لئے تم نے ماں بن کر اس بچی کو اپنے پاس رکھ لیا ہے اور اسے پال رہی ہو۔ تم چاہو تو اسی طرح کے کئی بہانے کرسکتی ہو اور مال کمانے کے لئے تو ستر ہزار جھوٹ بولنے پڑتے اور میں جانتا ہوں کہ تم بولو گی۔"

"اچھی بات ہے۔ اب وہ بچی آہی گئی ہے تو اسے بھگتنا ہی ہوگا۔ میں اسے سنبھال لوں گی۔ کاش کہ تمہاری سزا کچھ کم ہوتی۔"

"فکر نہ کرو۔ ایک سال تو دیکھتے ہی دیکھتے گزر جائے گا۔ میں جیل میں اپنا ریکارڈ اچھا رکھوں گا تاکہ سال بھر سے پہلے ہی مجھے یہاں سے رہائی مل جائے۔ ویسے ایک بات رکھو کہ کبھی کبھی صائمہ کو فون کرتی رہنا یا بچی کی آواز سناتی رہنا تاکہ اس کے دل میں جاگتی رہے ایسا نہ ہو کہ رفتہ رفتہ صبر کرنے کی عادت ہوجائے۔ جب انسان کو صبر آجاتا تو پھر وہ گمشدہ چیز کو اتنی اہمیت نہیں دیتا۔ دیتا بھی ہے تو اس کے سلسلے میں بڑے بڑے مطالبے تسلیم نہیں کرتا۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس بچی کی محبت ہمیشہ صائمہ کے دل میں

شدت سے پیدا ہوتی رہے اور وہ اس کے لئے تڑپتی رہے۔ اسے تڑپانے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اس سے فون کے ذریعے کبھی کبھی رابطہ قائم کرتی رہنا۔"

تین ماہ گزر گئے۔ ایک دن صائمہ نے ٹیلی فون موصول کیا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر دوسری طرف کی آواز سنی۔ کوئی عورت کہہ رہی تھی۔ "صائمہ جس شخص نے تمہاری بیٹی کو اغوا کیا ہے۔ وہ ایک سال کے لئے جیل جاچکا ہے۔ جس میں سے تین ماہ گزر چکے ہیں اور نو ماہ باقی ہیں۔ جب تک وہ واپس نہیں آئے گا۔ تمہاری بیٹی بھی تمہیں واپس نہیں مل سکے گی۔"

یہ سن کر صائمہ کے ہاتھ پاؤں اور ٹھنڈے پڑ گئے۔ وہ بڑی مشکل سے تین ماہ گزار چکی تھی' اور ایک ایک دن' ایک ایک لمحہ گنتی رہتی تھی کہ باقی تین ماہ کیسے گزریں گے۔ اب چھ ماہ کا وقت بڑھ گیا تھا۔ وہ فون پر التجائیں کرنے لگی۔ گڑگڑانے لگی کہ وہ عورت چاہے تو اس کی بیٹی کو واپس کرسکتی ہے لیکن دوسری طرف سے کہا گیا کہ لڑکی اسی وقت واپس ہوگی جب وہ شخص جیل سے واپس آئے گا اور وہی سمجھے گا کہ تم سے کتنی رقم کا مطالبہ کیا جائے۔ فی الحال مجھے پچیس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ میں تمہیں ایک جگہ بتاتی ہوں۔ رات کو تنہا وہاں پچیس ہزار روپے لے کر آجانا اور مجھے دے دینا۔ اگر تم نے کوئی چالاکی دکھائی۔ کسی کو ساتھ لائیں یا پولیس والوں کو میرے پیچھے لگا دیا تو یاد رکھو تمہاری بچی تمہیں زندہ واپس نہیں ملے گی۔"

صائمہ نے انکار میں سر ہلا ہلا کر کہا۔ "نہیں' میں ایسا نہیں کروں گی۔ میں اپنی بچی کی دشمن نہیں ہوں۔ تم جو مانگو گی میں وہ دوں گی لیکن ایک بار مجھے میری بچی کو دکھا دو۔"

"تمہاری بچی کو میں ساتھ نہیں لاؤں گی۔ یہ اچھی طرح یاد رکھنا ایک سال بعد ہی تم اپنی بچی کو دیکھ سکو گی۔ میں تمہیں جگہ بتا رہی ہوں۔ اچھی طرح اسے ذہن نشین کرلو۔"

صائمہ سنتی رہی اور اس جگہ کو ذہن نشین کرتی رہی۔ اب وہ اپنی کوٹھی میں تنہا رہا کرتی تھی۔ جتنے رشتہ دار تھے وہ سب ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے تھے۔ اس شہر میں جو عزیز و اقارب تھے۔ ان میں سے کبھی کبھی کوئی آجاتا تھا۔ اس کی خیریت دریافت کرتا تھا اسے تسلیاں دیتا تھا کہ اس کی بچی ایک دن ضرور اسے واپس ملے گی۔

رات کو وہ اپنے پرس میں پچیس ہزار روپے رکھ کر اپنی کوٹھی سے نکلی۔ کوٹھی میں صرف ایک ملازمہ تھی جو کہ گھر کا اوپری کام کرتی تھی۔ اس نے ملازمہ سے کہا کہ وہ ایک

ضروری کام سے جارہی ہے۔ اگر ٹیلی فون آئے تو کہہ دینا کہ بیگم صاحبہ سو رہی ہیں۔ بعد میں بات کریں گی۔

وہ اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوئی۔ ڈرائیور نے اسے ایک بہت بڑے سینما ہال کے سامنے پہنچا دیا۔ وہ کار سے اتر کر زینے طے کرتی ہوئی سینما ہال کے ایک باکس میں پہنچی۔ باکس نمبر اسے بتا دیا گیا تھا جب وہ اندر پہنچی تو اس باکس میں دو سیٹیں تھیں۔ ایک سیٹ پر ایک برقع پوش عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے صائمہ کو دیکھتے ہی اٹھ کر کہا "آیئے تشریف لایئے' میں ہی وہ عورت ہوں جس نے آپ کو یہاں بلایا ہے۔ کیا آپ میری مطلوبہ رقم لے آئی ہیں؟"

"ہاں لے آئی ہوں لیکن آرام سے بیٹھو۔ میری باتیں سن لو۔ تم بھی ایک عورت ہو اور ہو سکتا ہے تم بھی ایک آدھ بچے کی ماں ہو تو تمہیں ایک ماں کے درد کا احساس ہو گا۔"

"میں جانتی ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ تم میرے عورت پن کو اور میری ممتا کو جگانا چاہتی ہو۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تمہاری بیٹی کو میں نے امانت کے طور پر رکھا ہوا ہے اور اس کا بہت خیال رکھتی ہوں۔ اسے ذرا بھی تکلیف نہیں ہونے دیتی۔ جب وہ تمہیں ملے گی تو تم اس کی صحت دیکھ کر اندازہ کر لو گی کہ میں نے اسے کتنے لاڈ پیار سے اور محبت سے رکھا ہے۔"

"بہن جب تم اتنی محبت میری بیٹی کو دیتی ہو تو کیا مجھ پر ذرا سا رحم نہیں کر سکتیں؟ ایک نظر مجھے دکھا دو میں اسے دیکھنے کے لئے ترس رہی ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری یہ خواہش پوری نہیں کروں گی۔ میں نے یہ باکس صرف اسی لئے ریزرو کرایا ہے کہ ہم یہاں تنہائی میں بیٹھ کر باتیں کر سکیں گے لیکن باتیں نہ کرو جن پر عمل نہ کر سکوں۔ لاؤ میرے وہ پچیس ہزار روپے مجھے دے دو۔"

صائمہ نے پرس میں سے وہ رقم نکال کر اس کے حوالے کر دی۔ برقع پوش عورت وہاں سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "بس میرا کام ہو گیا تم چاہو تو یہاں بیٹھ کر پوری فلم دیکھ سکتی ہو۔ میں جا رہی ہوں لیکن یاد رکھو کہ میرے جانے کے پندرہ منٹ بعد یہاں سے نکلنا۔ تم فوراً ہی نکلو گی یا میرا پیچھا کرو گی تو بُری طرح پچھتاؤ گی۔"

وہ چلی گئی۔ صائمہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی جب وہ باکس سے نکل کر نظروں

سے اوجھل ہو گئی تب بھی وہ باکس کے دروازے کو تکتی رہی اس کے دماغ میں صرف برقعے والی کی آواز گونج رہی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے یہ آواز کہاں سنی ہے۔

اگر وہ برقعے والی سے یہ فرمائش کرتی کہ وہ اپنا نقاب الٹ کر اپنا چہرہ دکھائے تو وہ کبھی نہ دکھاتی۔ وہ برقع پہن کر اسی لئے آئی تھی کہ صائمہ اسے دیکھ نہ سکے۔ نہ پہچان سکے لیکن وہ اسے اس کی آواز کے ذریعے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

سوچتے سوچتے یہ بات سمجھ میں آئی کہ جب وہ اندھی تھی اور بیاہ کر کامران کی کوٹھی میں آئی تھی تو ایسے ہی وقت اس نے یہ آواز سنی تھی۔ رشتے داروں میں ہی کسی کی ایسی آواز ہے۔ اگر رشتہ داری نہ ہوئی تو قریبی تعلقات ہوں گے۔ یا کوئی ایسی عورت ہے جو کوٹھی میں آیا کرتی تھی۔ اس سے اور کامران سے باتیں کیا کرتی تھی۔

وہ بڑی دیر تک سوچتی رہی لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے وہ آواز کب اور کہاں سنی ہے۔ وہ مایوس ہو کر گھر واپس آ گئی۔ پچیس ہزار بھی گئے اور بیٹی کی صورت بھی دکھائی نہ دی۔ اس کے اندر کیسی تڑپ اور کیسی بے چینی تھی۔ یہ وہ جانتی تھی۔ دوسرے دن سے وہ اپنے تمام رشتہ داروں کے ہاں باری باری جانے لگی اور ہر عورت سے باتیں کرنے لگی۔ باتیں کرنے کے دوران وہ آنکھیں بند کر لیا کرتی تھی اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کیا کرتی تھی کہ سینما ہال کے باکس میں سنائی دینے والی آواز اپنے رشتہ داروں سے ملتی ہے یا نہیں۔ دو تین روز تک وہ مسلسل اپنے رشتے داروں کے ہاں جاتی رہی اور آواز کے ذریعے سراغ لگانے کی کوشش کرتی رہی لیکن اسے ناکامی ہوئی۔

آخر وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ برقع والی رشتہ داروں میں سے نہیں ہے بلکہ کامران کے ایسے شناساؤں میں سے ہے جن سے کبھی کبھی ملاقات ہوا کرتی ہو گی اور ایسی ہی کبھی کبھی ملاقاتوں میں اس نے اس برقعے والی کی آواز سنی تھی۔ جسے اب وہ پہچان نہیں سکتی تھی اور نہ ہی مل سکتی تھی۔ اس سے ملنے کے لئے ایک تدبیر ذہن میں آئی کہ گھر میں کوئی تقریب ہونی چاہئے اور کامران کے دور کے شناساؤں کو بھی اس تقریب میں شامل ہونے کی دعوت دینی چاہئے۔

لیکن یہ خیال اس نے جلد ہی ذہن سے جھٹک دیا۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی تھی کہ جو عورت برقع پہن کر سینما ہال کے باکس میں ملاقات کے لئے آئی تھی وہ اتنی نادان نہیں ہو سکتی کہ اس کے ہاں کسی تقریب میں شریک ہونے کے لئے آئے۔ وہ اس کی بچی

کے ذریعے پتہ نہیں کتنی بڑی رقم حاصل کرنے والی ہے اور وہ ایسی نادانی نہیں کرے گی بلکہ ایسی تقریبات اور خصوصاً صائمہ سے دور ہی رہنے کی کوشش کرتی رہے گی۔

تقریباً دس ماہ کے بعد پھر ایک فون موصول ہوا۔ اس نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے اسی عورت کی آواز سنائی دی۔ اس نے کہا۔ "کیا تم صائمہ بول رہی ہو؟"

"ہاں' میں صائمہ ہوں اور تمہاری آواز سے تمہیں پہچان رہی ہوں۔"

وہ بولی۔ "اب مجھے کیا پہچانو گی۔ اپنی بیٹی کی آواز پہچان لو۔ دیکھو یہ تم سے کچھ بول رہی ہے۔ بیٹی بولو تو۔ جلدی بولو۔"

صائمہ ایک دم سے کان لگا کر دھڑکتے ہوئے دل سے آواز سننے لگی۔ ریسیور سے ننھی سی معصوم سی آواز آرہی تھی۔ "مم.......... مم.......... ماں' ماں' ماں۔"

یہ ایسی آواز تھی۔ ایسی کشش تھی ایسی جان لینے والی معصومیت تھی کہ صائمہ ایک دم سے تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔ بلکنے لگی۔ التجائیں کرنے لگی۔ "خدا کے لئے میری بیٹی سے مجھے ملا دو۔"

آواز آئی۔ "ملا دوں گی۔ اب تو صرف دو ماہ رہ گئے ہیں ایک سال پورا ہوتے ہی وہ شخص جیل سے باہر آئے گا اور پھر تمہاری بیٹی کو کسی شرط کے بعد تمہارے حوالے کر دے گا۔ ابھی تو تمہاری اس معصوم تو تلانے والی بیٹی کے لئے مجھے دس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ آج رات کو اسی سینما ہال کے باکس میں چلی آنا۔ میں نے باکس ریزرو کرا لیا ہے۔"

دوسری طرف سے رابطہ ختم ہوگیا۔ اِدھر صائمہ کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا۔ وہ ایک دم سے بے جان ہو کر فرش پر گر پڑی اور رونے لگی اور اپنے سینے کو فرش سے سختی سے لگا کر اپنی دھڑکنوں کو روکنے لگی۔ وہ کسی کا سہارا چاہتی تھی کہ کوئی اسے سینے سے لگا کر چھپا لے اور تسلیاں دے کہ اس کی بیٹی اب بہت جلد اسے ملنے ہی والی ہے۔

بہرحال وہ رات کو وعدے کے مطابق دس ہزار روپے لے کر گئی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ آج اس عورت کا برقع نوچ لے اور اس کا چہرہ دیکھ لے' لیکن یہ سب خام خیالی تھی۔ وہ چپ چاپ دس ہزار روپے دے کر واپس آگئی۔

☆======☆======☆

ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ قربان کو رہائی ملی تو اپنے گھر میں داخل ہوتے ہی اس

نے رئیسہ کو آواز دی۔ رئیسہ دوڑ کر آئی اور اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ وہ دونوں تھوڑی دیر تک پیار محبت کی باتیں کرتے رہے پھر قربان نے پوچھا۔ "صائمہ کی بیٹی خیریت سے ہے نا؟"

"بالکل خیریت سے ہے۔ میں نے امانت سمجھ کر اسے جی جان سے پالا ہے۔"

"میری بیٹی کیسی ہے۔ پہلے میں اپنی بیٹی کو دیکھوں گا۔ پھر تدبیر سوچی جائے گی کہ اسے صائمہ تک کیسے پہنچایا جائے اور صائمہ سے روپے کیسے حاصل کئے جائیں۔"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے بیڈ روم میں داخل ہوئے' وہاں دو ہم عمر لڑکیاں گڑیا سے کھیل رہی تھیں۔ قربان نے آہستگی سے پوچھا۔ "میری شائستہ کون ہے' جلدی بتاؤ۔ میں اسے گود میں لینا چاہتا ہوں۔"

رئیسہ نے مسکرا کر کہا۔ "مجھ سے کیا پوچھتے ہو تم باپ ہو۔ اپنی بیٹی کو خود پہچان لو کہ ان دونوں میں شائستہ کون ہے؟"

قربان کبھی اس لڑکی کو اور کبھی اس لڑکی کو دیکھنے لگا۔ دونوں ہی اچھی خوبصورت تھیں۔ ہم عمر تھیں اور اچھے لباس پہنے ہوئے تھیں۔ کوئی ایسا فرق نہیں تھا جس کے ذریعے وہ اپنی بیٹی کو پہچان سکتا۔ صورت شکل سے دونوں مختلف تھیں لیکن جب وہ جیل گیا تھا تو اس کی بیٹی تقریباً دو ہفتے کی تھی اور اب ایک سال گزر گیا تھا۔ اس عرصے میں بچوں کے چہرے کسی حد تک بدل جاتے ہیں۔ پیدائش کے وقت کے چہرے ویسے بھی نہیں رہتے۔ یہی وجہ تھی کہ قربان اپنی بیٹی کو پہچاننے میں ناکام ہو رہا تھا۔

آخر رئیسہ نے آگے بڑھ کر ایک بچی کو گود میں اٹھا کر اسے چومتے ہوئے کہا۔ "دیکھو بیٹی تمہارے ابو آگئے ہیں۔ ان کو سلام کرو۔"

شائستہ نے قربان کی طرف دیکھا۔ پھر ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "چھلام۔"

قربان تیزی سے چلتا ہوا اپنی بیٹی کے پاس پہنچا پھر لپک کر اسے گود میں لیتے ہوئے خوب چومنے لگا۔ رئیسہ دوسری بچی کو گود میں لے کر پیار کرنے لگی۔ قربان نے حیرانی سے پوچھا۔ "تم اسے پیار کرتی ہو۔"

"کیوں نہ کروں کیا یہ بچی نہیں ہے۔ انسان کی اولاد نہیں ہے۔ پھر یہ کہ میں نے اسے سال بھر ماں بن کر پالا ہے۔ کچھ تو محبت ضرور آئے گی۔ مجھے تو یہ سوچ کر وحشت سی ہوتی ہے کہ اب تم آئے ہو تو اسے مجھ سے جُدا کر دو گے اور اس کی ماں تک پہنچا دو

کسی ماں کی گود اجاڑنا نہیں آتا۔ میں کسی سے کیوں دشمنی کروں گی اور آج تک تو میں نے ایک چیونٹی نہیں ماری پھر ایک معصوم سی بچی کو کس طرح موت کے منہ میں لے جاؤں گی؟"

"مجھ سے بحث نہ کرو۔ اگر تم اپنی بیٹی کو واپس چاہتی ہو اور اسے ہمیشہ اپنے سینے سے لگا کر رکھنا چاہتی ہو تو اپنی ممتا کی خاطر تمہیں دوسری ماں کی گود کو اجاڑنا ہوگا۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ میں کل صبح پھر کسی وقت فون کروں گا۔"

اس نے جلدی سے کہا۔ "ٹھہرو رابطہ ختم نہ کرنا۔ مجھے بھی کچھ کہنے دو۔"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "تمہارے کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے۔ میں نے جو تدبیر تمہیں بتائی ہے اگر اس پر عمل کرنا ہے تو ابھی ہاں کہہ دو۔ میں اس بچی کو تمہارے ہاں بھیج دوں گا۔ انکار کروگی تو ہمیشہ کے لئے اپنی بچی سے محروم ہو جاؤ گی۔ میں نے کہا کہ اس وقت میں بہت مست ہوں۔ پی رہا ہوں اور میرا موڈ تم خراب نہ کرو۔ کل صبح جب نشہ اترے گا تو میں تم سے باتیں کروں گا۔"

یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا گیا۔ صائمہ گم صم بیٹھی رہی۔ اس کے ہاتھ میں ریسیور اسی طرح رہا۔ پتہ نہیں وہ کتنی دیر سوچتی رہی پریشان ہوتی رہی پھر اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ رہ رہ کر اپنی بچی کی یاد تڑپا رہی تھی اور اپنی بچی کو پانے کے لئے وہ سب کچھ کر سکتی تھی بڑے سے بڑا جرم بھی کر سکتی تھی لیکن اپنی گود آباد کرنے کے لئے دوسرے کی گود اجاڑنا' یہ اس کے بس میں نہیں تھا۔ اس کا مزاج اس کا ضمیر یہ گوارا نہ کرتا۔ وہ آخر عورت تھی اور اس نے واقعی کبھی کسی مرغی کو بھی اپنی آنکھوں کے سامنے ذبح ہوتے نہیں دیکھا تھا پھر کسی انسان کی بچی کا خون ہوتے کیسے دیکھ سکتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ صبح تک اس درندے کو کیا جواب دے۔

یہ اس کے ساتھ بہت بڑا ظلم تھا کہ پہلے اس کی بچی کو لوٹانے کے لئے چھ ماہ کی مدت رکھی گئی۔ پھر وہ مدت ایک سال میں تبدیل ہوگئی۔ جب اللہ اللہ کرکے اس نے ایک سال بھی گزار دیا اور اپنی بیٹی کی آس لگائے بیٹھی تھی کہ پھر اس ظالم نے یہ شرط لگادی کہ کوئی دوسری لڑکی اس کے پاس رہے گی اور اس کی اپنی بیٹی اسی بدمعاش کے پاس امانت کے طور پر رہے گی۔ یعنی سال چھ مہینے تک اور اسے اپنی بیٹی کا انتظار کرنا تھا وہ بھی

اس شرط پر بیٹی ملتی کہ وہ دوسرے کی بیٹی کو جانی نقصان پہنچانے کے لئے اس کی زندگی کا بیمہ کراتی۔ یہ عجیب ہیرا پھیری والی باتیں تھیں۔ ایسی باتیں مجرم ہی سمجھتے ہیں لیکن وہ مجرم بننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ کیا کرے یہ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

ایسی الجھنیں ہوں تو کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے' لیکن انسان غیر شعوری طور پر وہی کرتا ہے جو بات اس کے دل میں پوشیدہ ہوتی ہے اور جسے وہ شعوری طور پر سمجھ نہیں سکتا۔ صائمہ کے دل کی بات بھی یہی تھی کہ اسے اس کی بیٹی مل جائے۔ خواہ کسی صورت میں ملے لیکن بیٹی اپنی گود میں پہنچ جائے۔ اپنے سینے سے لگ جائے اپنی دھڑکنوں کو سکون پہنچادے۔ بس اسے اپنی بیٹی کی ضرورت تھی۔ صبح ہوتے ہوتے اس نے فیصلہ کیا خواہ کچھ ہو۔ وہ بیٹی کو حاصل کرے گی اور دوسری لڑکی جو اس کے پاس بھیجی جائے گی تو ہر ممکن طریقے سے اس بچی کو بچانے کی کوشش کرے گی اور اس دشمن کو اس بات کا موقع نہیں دے گی کہ وہ اس کی بچی کی جان سے کھیل سکے۔ آگے کیا ہونے والا ہے وہ وقت کے مطابق سمجھتی جائے گی اور عمل کرتی جائے گی۔ فی الحال تو اپنی بچی کو حاصل کرنے کے لئے اس ظالم کی بات کو تسلیم کرلینا تھا۔

اس نے ایسا ہی کیا۔ دوسری صبح دس بجے جب اس کا فون آیا تو اس نے ہامی بھرلی اور کہا۔ "میں تمہاری بات مان لیتی ہوں۔ تم جس بچی کو میرے حوالے کروگے میں اسے بیٹی بنا کر رکھوں گی اور اس کی زندگی کا بیمہ کراؤں گی۔ پانچ لاکھ روپے کا بیمہ اور جب یہ رقم ملے گی تو تمہارے حوالے کردوں گی۔"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "شاباش' مجھے امید تھی کہ تم یہی کروگی۔ اب مجھے مزید دو لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔ آج رات کو میں ایک جگہ بتاتا ہوں۔ اس جگہ تم دو لاکھ روپے لے کر آجاؤ۔ میں اس بچی کو تمہارے حوالے کردوں گا۔ پھر اس بچی کے ساتھ جو کچھ کرنا ہوگا۔ وہ میں تمہیں وقتاً فوقتاً بتاتا جاؤں گا۔ تمہیں ہدایات دوں گا تم اس پر عمل کرتی رہنا۔"

صائمہ اس کی ہدایات سنتی رہی پھر اس نے ریسیور کو کریڈل پہ رکھ دیا۔

☆======☆======☆

قربان نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر نقلی داڑھی اور مونچھیں لگا کر اپنے آپ کو دیکھا تو بالکل بدلا ہوا پایا۔ رئیسہ بھی اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم تو بالکل پہچانے نہیں جا

رہے ہو۔"

اس نے کہا۔ "ہاں' میں چاہتا ہوں کہ صائمہ مجھے پہچان نہ سکے۔ میں نے اسے اپنا فون پر حلیہ بتا دیا ہے کہ میری داڑھی اور مونچھیں ہوں گی۔ سر پر فلیٹ ہیٹ ہوگا اور میری گود میں ایک بچی ہوگی جو نیلے رنگ کا فراک پہنے ہوئے ہوگی۔ صائمہ کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہاتھ میں بریف کیس لئے آئے گی۔ اس بریف کیس میں دو لاکھ روپے ہوں گے۔ پھر ہم کارنیوال کے جھولے میں جاکر بیٹھ جائیں گے۔ جھولا چلتا رہے گا اور ہمارا کاروبار ہوتا رہے گا۔ میں بچی کو اس کے حوالے کردوں گا۔ وہ بریف کیس مجھے دے دے گی جب جھولا رکے گا تو وہ اپنے راستے جائے گی میں اپنے راستے واپس آجاؤں گا۔"

رئیسہ نے کہا۔ "مجھے یقین ہے تم کامیابی سے دو لاکھ روپے لے آؤ گے لیکن مجھ سے پھر ایک بار وعدہ کرو کہ اس بچی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔"

قربان نے آئینے میں رئیسہ کا عکس دیکھا۔ وہ صائمہ کی بیٹی کو سینے سے لگائے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے اور چہرے سے اور لب و لہجے سے ممتا پھوٹی پڑ رہی تھی۔ قربان نے حیرانی سے کہا۔ "مجھے یہ دیکھ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ تم صائمہ کی بیٹی کو کس قدر چاہنے لگی ہو۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہی تمہاری بیٹی ہے۔"

"ہاں' ایک سال تک میں نے پرورش کی ہے تو مجھے اس سے بھی محبت ہوگئی ہے۔ میں تم سے بار بار کہتی ہوں کہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچے۔ یاد رکھو اسے اگر کوئی نقصان پہنچا تو تم بھی بہت بڑے نقصان میں رہو گے۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی اور تمہاری دشمن بن جاؤں گی۔"

"تم تو بس یونہی فضول سی باتیں کرتی رہتی ہو۔ جب میں نے کہہ دیا ہے کہ میں اسے نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ یہ صائمہ کی بیٹی ہے اسے صائمہ کے حوالے کردوں گا اور اپنی رقم لے کر واپس آجاؤں گا۔" یہ کہہ کر اس نے فلیٹ ہیٹ سر پر رکھا پھر صائمہ کی بیٹی کو لینے کے لئے اپنے ہاتھ بڑھائے۔ رئیسہ اس بچی کو سینے سے لگائے ذرا پیچھے ہٹ گئی اور اسے بے اختیار اِدھر اُدھر سے چومنے لگی اور اس سے کہنے لگی۔ "بیٹی' تم اپنی دوسری امی کے پاس جارہی ہو۔ مجھے یاد رکھو گی نا۔"

بچی نے ہاں کے انداز میں سرہلایا۔ پھر بولی۔ "امی ٹافی۔"

"تم اپنے ابو کے ساتھ جاؤ۔ وہ تمہیں دوسری امی کے پاس پہنچائیں گے تو وہ امی

تمہیں بہت سی ٹافیاں دیا کرے گی۔"

اس بچی نے کہا۔ "اچھا۔"

قربان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس لڑکی میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ جیسا کہو ویسا کرتی ہے۔ اٹھنے کے لئے کہو۔ اٹھ جائے گی۔ بیٹھنے کے لئے کہو بیٹھ جائے گی۔ یہ بہت بڑی نقال بن سکتی ہے۔ اگر اس پر توجہ دی جائے بہرحال ہمیں اس سے کیا کرنا ہے۔ لاؤ' اسے میرے حوالے کرو۔"

رئیسہ نے پھر اسے خوب پیار کیا اور آنسو بھری آنکھوں سے اسے قربان کے حوالے کرتے ہوئے پھر وہی کہنے لگی کہ اس بچی کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

قربان اس سے وعدہ کرتے ہوئے بچی کو گود میں لے کر وہاں سے چلا گیا۔ وہاں سے کارنیوال تک وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر گیا۔ راستے میں اپنے منصوبے پر غور کرتا رہا اور خوش ہوتا رہا کہ اس طرح ایک پنتھ دو کاج کے مصداق وہ صائمہ سے رقم بھی حاصل کر رہا تھا اور کامران سے انتقام لینے کے لئے اس کی بچی کو موت کے منہ میں دھکیل رہا تھا اور کمال کی بات یہ تھی کہ صائمہ خود اپنی بچی کو پرائی بچی سمجھ کر اس کی زندگی کا بیمہ کرانے کے بعد اسے موت کے حوالے کرنے کے لئے زہر دے دے گی۔

کارنیوال میں مردوں' عورتوں اور بچوں کی اچھی خاصی بھیڑ تھی اور جھولے کی طرف تو لوگ ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ وہاں صائمہ پہلے ہی پہنچ گئی تھی۔ اس نے ایک داڑھی والے شخص کو دیکھا جو فلیٹ ہیٹ لگائے ہوئے تھا اور ایک بچی کو گود میں لئے ہوئے تھا۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے اس کے پاس آئی اور بولی۔ "میں صائمہ ہوں۔"

قربان نے سرہلا کر کہا۔ "تم صحیح آدمی کے پاس پہنچ گئی ہو۔ یہ وہی بچی ہے جس کا میں نے ذکر کیا تھا۔"

صائمہ نے کہا۔ "جھولے میں بڑی بھیڑ ہے۔ ہمیں اتنی جلدی جگہ نہیں ملے گی۔ اگر کوئی بات کرنا ہے تو کیوں نہ ہم کسی ریستوران میں جاکر بیٹھ جائیں۔"

"چلو۔" یہ کہہ کر قربان ایک طرف بڑھ گیا۔ وہ دونوں شانہ بشانہ چلنے لگے۔ وہاں ایک ریستوران تھا۔ کھلے آسمان کے نیچے میزیں اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ وہ ایک گوشے کی میز کے اطراف بیٹھ گئے۔ صائمہ نے بریف کیس کو میز پر رکھ کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ قربان نے اٹھ کر اس کے قریب ہوتے ہوئے بچی کو اس کے حوالے کردیا۔

صائمہ نے بچی کو گود میں لے کر غور سے دیکھا تو اسے اس پر بڑا پیار آیا۔ وہ اسے چوم کر بولی۔ "مجھے بتاؤ یہ تمہارے کس دشمن کی بیٹی ہے۔"

قربان نے سخت لہجے میں کہا۔ "فضول باتیں مجھ سے نہ کرو۔ کام کی بات سنو۔ یہاں اس شہر میں ایک ایسا ڈاکٹر ہے جو مجرمانہ زندگی گزارتا ہے اور مجرموں کے بہت کام آتا ہے۔ میں اس کے ذریعے ایک ایسی دوا حاصل کروں گا جسے تم اس بچی کو روزانہ تھوڑا تھوڑا کھلاتی رہو گی۔ اس طرح اس کا دل کمزور ہوجائے گا اور یہ اندر سے کھوکھلی ہوتی جائے گی اور رفتہ رفتہ موت کے منہ میں چلی جائے گی۔ کسی کو شبہ نہیں ہوگا کہ اسے جان بوجھ کر ہلاک کیا گیا ہے۔ یاد رکھو یہ دوا تم اپنے ہاتھ سے اسے دیا کرو گی اگر یہ زندہ رہے گی تو میں سمجھوں گا کہ تم نے میری ہدایت پر عمل نہیں کیا ہے اور اسے بچانے کے لئے وہ دوا تم نے کہیں پھینک دی ہے۔"

صائمہ نے بچی کو سینے سے لگالیا۔ کچھ دیر تک وہ کچھ بول نہ سکی۔ اس لئے کہ بات ہی ایسی تھی۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک بچی کو قتل کرنے کی ذمہ داری اسے سونپی جائے گی اور محض اپنی بچی کو حاصل کرنے کے لئے اسے ایسا کرنا ہوگا۔ وہ بڑی مشکل سے بولی۔ "میں وہی کروں گی جو تم کہو گے۔ میں اسے وہ دوا کھلایا کروں گی۔ وہ دوا مجھے تم کب دو گے؟"

"پہلے تو تم اس بچی کو اپنے گھر لے جاؤ۔ اس کے بعد اس کا بیمہ کراؤ۔ بیمہ کرانے میں کچھ دن تو لگیں گے۔ جب تم مجھے بیمہ کے کاغذات دکھاؤ گی تو میں تمہیں وہ دوا دوں گا اور تمہیں بتاؤں گا کہ اسے کب سے استعمال کرانا ہے اور کس طرح استعمال کرانا ہے۔"

"میں تو وہی کروں گی لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوگا کہ میں وہ دوا بچی کو کھلا رہی ہوں۔ کیا تم اس بچی کو چیک کرتے رہو گے۔"

"اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہ دوا استعمال کرنے کے بعد ڈاکٹر مجھے بتائے گا کہ کتنی مدت میں موت واقع ہوتی ہے۔ اگر اتنی مدت میں یہ بچی مرجائے گی تو میں سمجھوں گا کہ تم نے میری ہدایت پر عمل کیا ہے۔ اگر اُدھر تمہاری [illegible] زندہ نہیں رہے گی۔"

"باربار میری بچی کو مار ڈالنے کی دھمکی نہ دو۔ میرا کلیجہ کانپنے لگتا ہے۔ یہ بتاؤ کہ اگر

بچی مرجائے گی تو تمہیں کیسے پتہ چلے گا کہ یہ مرچکی ہے۔ میں چاہوں تو تمہیں دھوکا بھی دے سکتی ہوں۔ کسی دوسری بچی کی لاش اس کی جگہ رکھ سکتی ہوں۔ کیا ایسے وقت تم دھوکا نہیں کھاؤ گے۔"

"میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔ جب بچی کی موت واقع ہوگی تو میں اپنی بیوی کو تمہارے ہاں بھیجوں گا۔ وہ اپنی آنکھوں سے اس بچی کی لاش دیکھے گی اور آکر مجھے بتائے گی تب میں مطمئن ہوجاؤں گا اور اس کے بعد جب مجھے بیمہ کی رقم ملے گی تو میں تمہاری بچی کو تمہارے حوالے کردوں گا۔"

ریستوران کے بیرے نے آکر پوچھا۔ "کیا چاہئے؟"

صائمہ فوراً ہی بچی کو گود میں لے کر اٹھ گئی۔ "کچھ نہیں میرا دل کھانے پینے کو نہیں چاہتا۔ میں جاؤں گی۔"

قربان نے بھی اٹھتے ہوئے جیب سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکالا پھر بیرے کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بڑے انداز سے بولا۔ "جاؤ' موج کرو۔"

بیرا چلا گیا۔ اس نے بریف کیس کو اٹھا کر تھپتھپاتے ہوئے فاتحانہ انداز میں صائمہ کو دیکھا۔ پھر مسکراتے ہوئے بریف کیس کو لے کر وہاں سے جانے لگا۔ صائمہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی اور بچی کو سینے سے لگائے ہوئے ہولے سے بے دھیانی میں تھپکتی رہی۔ جب قربان کارنیوال کی بھیڑ میں گم ہوگیا تو وہ آگے بڑھ گئی اور تیزی سے چلتے ہوئے کارنیوال کے احاطے سے باہر کار پارکنگ ایریا کی طرف جانے لگی۔

☆======☆======☆

بچی کی واپسی کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا جارہا تھا۔ بہت سے مہمان آئے ہوئے تھے اور سب یہی پوچھ رہے تھے کہ بچی کیسے واپس ملی اور اب تم نے اس بچی کا نام کیا رکھا ہے۔

صائمہ اس سوال کا جواب دینے سے ہر ایک کے سامنے انکار کررہی تھی کہ بچی اسے کیسے واپس ملی۔ البتہ نام بتا رہی تھی کہ اس کا نام نسیمہ کامران رکھا گیا ہے اور بلانے کے لئے لاڈ پیار کا نام گڑیا ہے۔

"بڑا ہی پیارا نام ہے۔" اچانک ہی ایک پولیس انسپکٹر نے صائمہ کے سامنے پہنچ کر کہا "لیکن میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ گڑیا آپ کو کیسے واپس ملی اور اس سوال کا

جواب حاصل کرنے سے پہلے میں آپ سے اس بات کی معافی چاہوں گا کہ اس دعوت پر بن بلائے مہمان کی طرح آیا ہوں۔ کیا کروں اپنے فرض سے مجبور ہوں۔ میں خوشی اور غم کی محفلوں کو نہیں دیکھتا۔ اپنا فرض ادا کرنے کے لئے پہنچ جاتا ہوں۔ ہاں تو میرے سوال کا جواب دیجئے۔"

صائمہ نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ پھر کہا۔ "میں اس سوال کا جواب نہیں دوں گی۔"

"کیا آپ قانون کی مدد نہیں کرنا چاہتی ہیں؟"

"کیا میرے شوہر نے مدد نہیں کی تھی؟ اور قانون کی مدد کرنے کا جو انجام ہوا یہاں کے سارے مہمان جانتے ہیں۔ آپ پولیس والے خود اپنے رجسٹروں کی خانہ پری کرتے ہیں بیان لکھتے ہیں اور تفتیش کرنے کے لئے دو چار لوگوں سے سوالات کرتے ہیں مگر اصل مجرم تک نہیں پہنچ سکتے۔"

"محترمہ آپ پولیس والوں کو نااہل کہہ رہی ہیں۔"

"میں سارے پولیس والوں کو نہیں کہتی لیکن جن پولیس والوں کے ساتھ تعاون کرنے کی سزا میرے شوہر نے پائی اور میں پا رہی ہوں۔ میں ان سے شکایت کرتی ہوں اور اب آپ پوچھ کر کیا کریں گے میں نے اس بچی کو کہاں سے حاصل کیا ہے؟"

"میں اس لئے پوچھنا چاہتا ہوں کہ مجرم کو گرفتار کرسکوں۔ اگر آپ نے مجرم کا مطالبہ پورا کیا ہے اور اس طرح بچی کو حاصل کیا ہے تو آپ جرائم کو ہوا دے رہی ہیں اس سے جرائم رکتے نہیں پھیلتے ہیں۔ اگر آپ مجرم کا مطالبہ پورا کرنے سے پہلے ہمیں خبر کردیتیں تو.........."

صائمہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تو میں پہلی اولاد کی طرح اپنی اس بچی سے بھی محروم ہوجاتی۔"

"آپ مجرم سے ڈر گئی ہیں۔"

صائمہ نے پوچھا۔ "اگر یہ واقعہ آپ کے ساتھ ہوتا اگر آپ کے ایک بچے کو مجرم قتل کر دیتے۔ پھر دوسرے بچے کو اغوا کر لیتے اور آپ سے مطالبہ کرتے تو آپ ان کا مطالبہ پورا کرتے یا قانون کا سہارا لے کر اور اپنے فرائض سمجھتے ہوئے مجرم کو تلاش کرتے رہتے اور اپنے پہلے بچے کی طرح دوسرے بچے کی زندگی کو بھی خطرے میں ڈال

دیتے۔ کیا آپ کے سینے میں اتنا بڑا اور مضبوط دل ہے؟"

انسپکٹر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ بے چینی سے پہلو بدل کر کوئی جواب سوچتا رہا لیکن کوئی معقول جواب سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر وہاں سے جانے لگا۔ ایک نوجوان نے صائمہ کے پاس آکر پوچھا۔ "بھابی کیا آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

"ہاں فہیم، مجھے تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں، میری خواب گاہ میں آؤ۔"

یہ کہہ کر وہ مختلف مہمانوں سے معذرت چاہتے ہوئے اپنی خواب گاہ کی طرف جانے لگی۔ فہیم بھی اس کے پیچھے چلتا ہوا خواب گاہ میں پہنچ گیا۔ وہاں صائمہ نے دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد کہا۔ "میں تم سے بہت اہم معاملے میں بات کرنا چاہتی ہوں، مجھے تم پر بھروسہ ہے۔ اگر تم نے میرا ساتھ دیا تو میں ایک بہت بڑی الجھن سے نجات پالوں گی۔"

فہیم نے کہا۔ "بھابی آپ حکم دیں۔ آپ جو کہیں گی میں وہی کروں گا۔"

صائمہ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تم نے میرے شوہر کا بیمہ کرایا تھا۔ اب میری گڑیا کا بیمہ بھی کراؤ گے اور یہ بیمہ پانچ لاکھ روپے کا ہوگا۔"

"یہ کون سی بڑی بات ہے.......... کل ہی میں کاغذات تیار کرلوں گا۔"

"بات یہیں ختم نہیں ہوجاتی ہے۔ ایک راز کی بات ہے.......... وہ میں تمہیں بتا رہی ہوں۔ جس بدمعاش نے یہ بچی میرے حوالے کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ میری بچی نہیں ہے۔ وہ اس لڑکی کو قتل کرنا چاہتا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ یہ اس کے دشمن کی بیٹی ہے اور وہ انتقاماً ایسا کر رہا ہے اور میرے ذریعے اسے ہلاک کرنے کا منصوبہ بنا چکا ہے اور اس پر مجھے عمل کرنے کے لئے مجبور کر رہا ہے۔"

فہیم نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا گڑیا آپ کی بیٹی نہیں ہے؟"

صائمہ نے اقرار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ میری بیٹی ہے۔ میں نے اپنی گم شدہ بیٹی کو پہچان لیا ہے اور میں اس بدمعاش کی چال کو سمجھ گئی ہوں۔ اس نے میری بیٹی کو میرے حوالے کیا ہے اور اسے پرائی بیٹی کہہ کر میرے ہی ہاتھ سے میری ہی بچی کو ہلاک کرانا چاہتا ہے لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ اب تم غور سے سنو کہ وہ بدمعاش کیا چاہتا ہے اور میں کیا چاہتی ہوں اور جو کچھ میں چاہتی ہوں وہ تمہاری مدد کے بغیر ممکن نہیں ہوگا۔"

خواب گاہ کے باہر موسیقی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ مہمانوں کے باتیں کرنے کی بھی آوازیں تھیں اور بچوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ خواب گاہ کے اندر فہیم اور صائمہ ایک دوسرے کے قریب جھکے ہوئے آہستہ آہستہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ جب صائمہ نے ساری بات کہہ دی تو فہیم نے سرہلا کر کہا۔ "بھابی آپ اطمینان رکھیں۔ یہ آپ نے اچھا کیا کہ پولیس انسپکٹر کو ایسا جواب دیا۔ آپ کو پولیس والوں سے بالکل رابطہ نہیں رکھنا چاہئے۔ یہ رابطہ میں رکھوں گا۔ میں پولیس انسپکٹر کو اپنے اعتماد میں لوں گا اور اسے مجبور کروں گا کہ وہ وقت آنے سے پہلے ہمارے درمیان میں نہ آئے اور ہم پوری طرح قانون کے ساتھ تعاون کریں گے اور مجرم کو گرفتار کرانے کی کوشش کریں گے انشاء اللہ گڑیا کو نقصان نہیں پہنچے گا۔"

صائمہ نے کہا۔ "میری گڑیا اگرچہ ایک برس ایک مہینے کی ہے اس کے باوجود ابھی سے اس کی ذہانت کا پتہ چلتا ہے اور یہ بڑی سعادت مند ہے۔ اسے جیسا کہا جائے ویسا ہی کرتی ہے۔ میں اس دوران گڑیا کو ٹریننگ دوں گی کہ جب میں اسے چپ چاپ لیٹے رہنے کے لئے کہوں تو وہ لیٹ جائے اور جب میں اسے کہوں کہ وہ بالکل آہستہ آہستہ سانس لے اور خود کو مُردہ ثابت کرے تو یقیناً ایسی مشق کرانے سے وہ ایسا کرنے لگے گی۔ اگر وہ ایسا کرنے لگی تو پھر ہمارا کام آسان ہوجائے گا۔"

"ہاں' بھابی' یقیناً ہم کامیاب ہوں گے۔ گڑیا ایسا کرسکے گی۔ میں نے بھی دیکھا ہے کہ بڑی ذہین بچی ہے۔"

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ صائمہ نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میں یقین سے کہتی ہوں کہ یہ اسی بدمعاش کا فون ہے۔ آؤ تم میرے قریب کان لگا کر سنتے رہو۔"

یہ کہہ کر اس نے ریسیور اٹھایا اور کان سے لگا کر کہا۔

"ہیلو میں صائمہ بول رہی ہوں۔"

دوسری طرف سے ہولے ہولے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ "تم نے تو مجھے پہچان لیا ہوگا۔ میں وہی ہوں اور اس وقت تمہاری محفل میں بھی موجود تھا اور دیکھ رہا تھا کہ تم کیا کر رہی ہو۔ تم نے اپنی بیٹی کا نام گڑیا رکھا ہے۔ بڑا پیارا نام ہے اور ہاں پولیس انسپکٹر کو تم نے بڑا اچھا جواب دیا' میں یہی چاہتا ہوں کہ پولیس والے تم سے دور رہیں۔ یا تم پولیس

والوں سے دور رہو۔ تم نے مجھے مطمئن کردیا ہے میں نے تمہیں یہ بتانے کے لئے فون کیا ہے کہ میں ہر وقت تمہارے پیچھے سائے کی طرح رہتا ہوں اور تمہارے اہم معاملات میں اور اہم تقریبات میں کسی نہ کسی طرح پہنچ جاتا ہوں تاکہ تمہاری تمام مصروفیات سے باخبر رہا کروں۔ اچھا خدا حافظ۔ پھر میں کسی وقت فون کے ذریعے رابطہ قائم کروں گا۔"

اتنا کہنے کے بعد دوسری طرف سے رابطہ ختم کردیا گیا۔ صائمہ نے ریسیور کو کریڈل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے اس کی باتیں سنیں؟"

فہیم نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں' تمام باتیں سن لی ہیں کبھی اس شخص کو آواز کے ذریعے پہچاننے کا موقع ملا تو میں پہچان لوں گا۔ آپ اطمینان رکھیں میں کل ہی سے آپ کے کہنے کے مطابق عمل کرنا شروع کرتا ہوں' چلئے اب مہمانوں میں چلیں۔"

ایک ہفتے کے بعد قربان نے پھر فون پر بات کی اور صائمہ سے پوچھا۔ "کیا بات ہے۔ تم نے اب تک لڑکی کا بیمہ کیوں نہیں کرایا۔"

صائمہ نے جواب دیا۔ "میں نے کام شروع کر دیا ہے میں کسی وقت بھی بیمہ کی ابتدائی رقم جمع کرا سکتی ہوں لیکن انشورنس والے کہتے ہیں کہ کچھ انہیں دفتری مشکلات ہیں اس کے علاوہ گڑیا کا ڈاکٹری معائنہ بھی کرایا جائے گا۔ اس کے بعد بیمہ کے کاغذات مکمل کئے جائیں گے۔"

صائمہ ایسی ہی باتیں کرتے ہوئے قربان کو ایک ماہ تک ٹالتی رہی۔ اس دوران وہ اور اس کا دیور فہیم آپس میں مشورے کرتے رہے اور منصوبے بناتے رہے کہ انہیں اس سلسلے میں کیا کرنا ہے اور کن لوگوں سے رازدارانہ انداز میں تعاون حاصل کرنا ہے۔

ایک ماہ کے بعد صائمہ نے قربان کو بتایا کہ بیمہ کے کاغذات مکمل ہوگئے ہیں اور پانچ لاکھ کا بیمہ کرایا گیا ہے۔ قربان خوش ہوگیا۔ اس نے ایک جگہ ملنے کا وقت مقرر کیا۔ اس نے دوا کی ایک شیشی صائمہ کے حوالے کی۔ پھر اسے طریقہ استعمال بتا کر چلا گیا۔ صائمہ اس دوا کی شیشی کو لے کر فہیم کے پاس آئی۔ فہیم اسے لے کر ایک اپنے ڈاکٹر دوست کے پاس گیا اور اس سے بولا۔ "اس دوا کو دیکھ کر یا اس کا کیمیائی تجزیہ کرکے بتاؤ کہ اس کے استعمال سے کیا اثرات مریض پر ہوتے ہیں اور کس طرح اس کی موت واقع ہوتی ہے اور موت کے بعد پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کیا کہے گی؟"

ڈاکٹر نے اسے دوسرے دن آنے کے لئے کہا۔ فہیم دوسرے دن پہنچا تو ڈاکٹر نے

بتایا کہ یہ بڑی ہی سست رو زہر ہے اور اتنی آہستگی سے اس کا اثر ہوتا ہے کہ کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا کہ زہر دے کر کسی کو ہلاک کیا گیا ہے۔ اس دوا کو استعمال کرانا شروع کیا جائے تو تقریباً چھ ماہ بعد اس کے نتائج برآمد ہوں گے یعنی جسے بھی کھلایا جائے گا وہ رفتہ رفتہ اندر ہی اندر کھوکھلا ہوتا جائے گا اور اس کے دل کی حرکتیں اور دل کا جتنا کام ہے وہ سب سست اور کمزور پڑتے جائیں گے حتیٰ کہ ایک دن حرکتِ قلب بند ہو کر موت واقع ہوجائے گی۔"

فہیم نے پوچھا۔ "ظاہری طور پر چہرے سے یا جسم سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "جو اس دوا کو استعمال کرے گا وہ رفتہ رفتہ زرد پڑتا جائے گا اور اسے سانس لینے میں کبھی کبھی دشواری محسوس ہوگی اور وہ تھوڑی دور چلنے کے بعد تھک کر بیٹھ جایا کرے گا۔"

فہیم وہ دوا لے کر وہاں سے چلا آیا۔ پھر دن گزرنے لگے۔ قربان ہر دو روز' چار روز کے بعد ٹیلی فون کے ذریعے رابطہ قائم کرتا تھا اور صائمہ پر یہ دہشت بٹھاتا تھا کہ وہ اس کے پیچھے سائے کی طرح لگا رہتا ہے اور دونوں ماں بیٹی کو چیک کرتا رہتا ہے۔

دو ماہ کے بعد صائمہ نے جب بھی اپنی گڑیا کو باہر لے جانے کا پروگرام بنایا تو اس سے پہلے وہ گڑیا کے تمام جسم پر اور چہرے پر ابٹن کی مالش کرتی تھی اور اس ابٹن میں ہلدی کی مقدار زیادہ رکھتی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ چہرہ اور بدن بالکل پیلا سا نظر آتا تھا۔ وہ بچی کو غسل نہیں کراتی تھی۔ پہلے کہیں گھمانے پھرانے کے لئے لے جاتی تھی کبھی کسی پارک میں کبھی کہیں سرکس یا کارنیوال وغیرہ میں یا کہیں آئس کریم وغیرہ کھلانے کے لئے وہ باہر اسے لے کر گھومتی تھی اور واپس آجاتی تھی۔ اسی رات کو یا دوسرے دن کو قربان کا ٹیلی فون آتا تھا اور وہ کہتا تھا کہ وہ بچی کو دیکھ رہا ہے اور صائمہ اس کی ہدایات پر واقعی عمل کر رہی ہے کیونکہ بچی زیادہ پیلی پڑتی جارہی ہے اور قربان کو اطمینان ہوتا جارہا ہے۔

صائمہ گڑیا کو جیسی ٹریننگ دے رہی تھی گڑیا اسی کے مطابق عمل کرتی رہتی تھی۔ مثلاً وہ اسے سمجھاتی تھی کہ جب بھی گھر سے باہر نکلو۔ کبھی نہ مسکراؤ۔ چہرہ ہمیشہ سیدھا اور سپاٹ رکھو اور پلکیں تھوڑی سی جھکی رکھو۔ اس سے یہ ظاہر ہوگا کہ بیماری میں کمزوری کے باعث وہ بچی چپ چاپ سی نڈھال سی رہتی ہے پھر چہرے کا پیلا پن بھی اس کی

نشاندہی کرتا ہے۔

گڑیا ایسا ہی کرتی تھی۔ اسے آئس کریم دلائی جاتی یا کھلونے دلائے جاتے۔ وہ باہر ذرا نہیں مسکراتی تھی۔ صائمہ اسے دو قدم چلانے کے بعد گود میں اٹھالیتی تھی جیسے گڑیا تھک گئی ہو اور زیادہ چلنے کے قابل نہ ہو۔

دوسری طرف قربان اور رئیسہ کی ازدواجی زندگی تلخ ہو رہی تھی۔ ادھر چار مہینے کے دوران قربان نے ایک لاکھ روپے کی ہیرا پھیری کردی تھی اور رئیسہ کو ان روپوں کا حساب نہیں بتا رہا تھا۔ رئیسہ نے اپنے طور پر معلومات حاصل کی تھیں کہ وہ روزانہ رات کو اڈے پر بے تحاشہ پیتا ہے اور ساری رات دوسری عورتوں کے ساتھ گزارتا ہے اور ان پر روپے لٹاتا رہتا ہے۔

رئیسہ پہلے ہی جانتی تھی کہ قربان کبھی راہ راست پر نہیں آئے گا۔ کبھی محنت مزدوری یا ایماندارانہ کاروبار کے ذریعے پیسے حاصل نہیں کرے گا۔ ہمیشہ جرائم کی طرف مائل رہے گا اور جو بھی پیسے ملیں گے وہ اسی طرح عیاشی میں لٹاتا رہے گا۔ نہ اس کا خیال کرے گا نہ اپنی بچی کا' یہی سوچ سمجھ کر اس نے ایک لاکھ روپے اپنے اکاؤنٹ میں رکھ لئے تھے اور قربان کے مانگنے کے باوجود وہ اسے دینے سے انکار کر رہی تھی اور اسے صاف صاف سنا دیا تھا کہ اگر وہ آئندہ اس سے وہ ایک لاکھ روپے مانگے گا تو وہ اسے چھوڑ کر اپنی بچی کو لے کر چلی جائے گی۔

قربان نے غصے سے کہا تھا۔ "بچی صرف تمہاری نہیں میری بھی ہے اور تم میری بچی کو مجھ سے جدا نہیں کرسکو گی۔"

رئیسہ نے ناگواری سے کہا۔ "تم دوسروں کے بچوں کو ان کی گود سے جدا کردیتے ہو۔ قدرت تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرسکتی ہے میں جانتی ہوں کہ مجھے اپنی بچی کا مستقبل کس طرح بنانا ہے۔ اس گھر میں اور تمہارے سائے میں رہ کر تو میری بچی پیسے پیسے کو محتاج ہوجائے گی۔ کل جوان ہوگی تو کہیں سے اس کا رشتہ نہیں آئے گا کیونکہ جہیز کے لئے چار پیسے بھی نہیں ہوں گے تم سارا کا سارا لٹا چکے ہوگے۔"

"اچھا۔ تو تم جانتی ہو کہ اپنی بچی کا مستقبل کیسے بناؤ گی۔"

"ہاں' جانتی ہوں اور اس پر عمل بھی کرچکی ہوں' تم مجھ سے بہت سی باتیں چھپاتے ہو۔ میں نے بھی تم سے ایک راز چھپایا ہے اور اپنی بیٹی کے لئے ایسے انتظامات

کئے ہیں کہ جب اس کا انکشاف ہوگا تو تم حیران رہ جاؤ گے۔"

قربان نے حیرانی سے پوچھا۔ "تم نے آخر کیا کیا ہے؟؟"

"میں نے جو کچھ بھی کیا ہے۔ وقت آنے سے پہلے نہیں بتاؤں گی تم اپنی بات چھپاؤ۔ میں اپنی بات چھپاتی رہوں گی۔"

وہ حقارت سے بولا۔ "اونہہ عورت کی عقل کتنی دور تک سوچ سکتی ہے میں جانتا ہوں۔ تم نے جس طرح ایک لاکھ روپے مجھ سے لے کر رکھ لئے ہیں اسی طرح کہیں سے اور بھی رقم جمع کی ہے یا پھر اپنی بیٹی کے لئے.......... ابھی سے زیورات وغیرہ بنوا رہی ہو اور انہیں لاکرز میں رکھ رہی ہو' اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہو۔"

یہ کہہ کر وہ سر کو جھٹکتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ رئیسہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی اور زیرِ لب معنی خیز انداز میں مسکراتی رہی۔

قربان نے ایک ٹیلی فون بوتھ میں پہنچنے کے بعد صائمہ سے رابطہ قائم کیا۔ دوسری طرف صائمہ کی آواز سنائی دی۔ وہ پریشان ہو کر بولی۔ "میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ تم نے کہا تھا کہ دوا کھلانے کے چھ ماہ بعد اس کا اثر ہوگا لیکن پانچویں مہینے میں ہی اثر ہونے لگا ہے۔ بچی کی حالت بہت نازک ہے۔ ابھی شام کو ڈاکٹر آیا تھا۔ اس نے مایوسی سے کہا ہے کہ یہ بچی رات گزار لے تو بہت ہے۔ یہ دوسری صبح نہیں دیکھ سکے گی اور کوئی ڈاکٹر اس کا علاج نہیں کر سکے گا۔"

قربان نے کہا۔ "تعجب ہے کہ بچی کی حالت اتنی جلدی نازک ہوگئی تم نے شاید خوراک سے زیادہ دوا کھلا دی ہوگی۔ بہرحال جو کچھ بھی ہے ایک مہینے کا فرق ہے کوئی بات نہیں۔ میں تم سے ہر گھنٹے دو گھنٹے بعد رابطہ قائم کرتا رہوں گا۔ جب بچی کا دم نکل جائے تو مجھے اطلاع دینا۔ میں اپنی طرف سے ایک عورت کو بھیجوں گا وہ وہاں پہنچ کر بچی کی لاش کو دیکھے گی اور میرے پاس آکر تصدیق کرے گی۔"

ایک معصوم بچی کے قدرتی طور پر مرنے کی خبر سنی جائے تو دل کو بے حد صدمہ ہوتا ہے ہر اچھا انسان ایک معصوم کی موت پر ضرور آنسو بہاتا ہے لیکن ہم انسانوں میں ایسے سفاک اور بے رحم قاتل بھی ہوتے ہیں جنہیں بچوں کی معصومیت پر بھی ترس نہیں آتا اور وہ ایسے ڈرامے کرتے ہیں کہ ان معصوموں کو تڑپا تڑپا کر آہستہ آہستہ سُست اثر کا زہر دے کر مارتے ہیں اور ان کی موت کا تماشہ دیکھتے رہتے ہیں۔ قربان بھی ان میں سے تھا

وہ ہر دو گھنٹے بعد فون کرتا تھا اور صائمہ سے بچی کی خبر معلوم کرتا رہتا تھا۔ صبح چار بجے صائمہ نے بتایا کہ بچی اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ وہ کسی کو بھی بھیج کر اس کی لاش کی شناخت کر سکتا ہے۔

یہ سننے کے بعد قربان نے کہا۔ "ٹھیک ہے میں اپنی طرف سے ایک عورت کو بھیج رہا ہوں لیکن تم اس بات کا خیال رکھنا کہ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ ضرور حاصل کرنا۔ اس کی موت کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے بعد ہی بیمہ کی رقم حاصل کرنے میں آسانی رہے گی۔ اس بات کو نہ بھولنا۔"

یہ کہہ کر اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ پھر وہاں سے چلتا ہوا تیزی سے سڑک پر آیا۔ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ اب اس کے اندر بے چینی پیدا ہوگئی تھی۔ یہ ایک مشکل مرحلہ تھا۔ کیونکہ اب وہ رئیسہ کو وہاں بھیجنے والا تھا یعنی اگر صائمہ کے دل میں ذرا سی بے ایمانی پیدا ہوتی یا وہ پولیس سے تعاون حاصل کرنا چاہتی تو رئیسہ کے پیچھے پولیس والوں کو لگا دیتی۔ اس طرح پولیس والے قربان تک پہنچ جاتے لیکن اسے یقین تھا کہ صائمہ ایسی حماقت نہیں کرے گی۔ اس سے پہلے اس کے خاندان میں اس کے شوہر کے ایک بچے کو ایسی غلطی کی بناء پر ہلاک کیا گیا تھا اب وہ دوسری بار یہ خطرہ مول لے نہیں سکتی تھی۔

وہ کسی حد تک مطمئن تھا۔ گھر پہنچ کر اس نے رئیسہ سے کہا۔ "میں تمہیں ایک خوشخبری سنانے آیا ہوں۔ میری بات غور سے سنو۔ میں نے تم سے یہ بات چھپائی تھی کہ اس بچی کو صائمہ کے حوالے کرتے وقت دو لاکھ روپے تو لئے تھے لیکن اس کے علاوہ پانچ لاکھ روپے کا معاہدہ بھی اس سے ہو چکا تھا اور اب وہ پانچ لاکھ روپے ایک آدھ مہینے کے اندر ہمیں مل جائیں گے۔"

رئیسہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر خوش ہو کر پوچھا۔ "پانچ لاکھ روپے کیسے ملیں گے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "یہ میری ایک چال تھی۔ اگر میں تمہیں پہلے بتا دیتا تو تم کبھی میری اس چال سے متفق نہ ہوتیں کیونکہ تم بچی کو مار ڈالنے کے حق میں نہیں تھیں۔ اسی لئے میں نے تم سے یہ بات چھپائی تھی۔ میں نے صائمہ کو یہ یقین دلایا ہے کہ جو بچی اس کے پاس ہے وہ دراصل اس کی نہیں ہے بلکہ میرے ایک دشمن کی بیٹی ہے جسے میں

ہلاک کرنا چاہتا ہوں اور اس طرح ہلاک کرنا چاہتا ہوں کہ پہلے اس کی زندگی کا بیمہ کرایا جائے اور اسے مار ڈالا جائے۔ اس کے بعد بیمہ کی رقم ہمیں مل جائے گی۔"

رئیسہ یہ سنتے ہی اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے پوچھا۔ "تم کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"صاف بات ہے کہنے کے لئے کیا رہ گیا ہے۔ وہ بچی آج اس طرح مار ڈالی گئی ہے کہ صائمہ قانون کی گرفت میں نہیں آئے گی اور ڈاکٹری سرٹیفکیٹ کے مطابق وہ اس بچی کی طبعی موت ہوگی اور اس کے بعد ہمیں بیمہ کے پانچ لاکھ روپے مل جائیں گے۔"

رئیسہ نے چیخ کر کہا۔ "نہیں' نہیں' یہ نہیں ہوسکتا۔ تم میری بیٹی کو نہیں مار سکتے۔"

"کیا بکواس کر رہی ہو' میں تمہاری نہیں' صائمہ کی بیٹی کی بات کر رہا ہوں۔"

"میں صائمہ کی نہیں' اپنی بیٹی کی بات کر رہی ہوں۔ صائمہ کے پاس جو بیٹی گئی ہے وہ صائمہ کی نہیں ہماری ہے۔"

قربان نے چونک کر اور بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا بکواس کر رہی ہو۔ میری بیٹی تو میرے گھر میں ہے۔"

"نہیں' تم ایک سال بعد جب جیل سے آئے تھے اور ایک سال کے دوران دونوں بچیوں میں کسی قدر تبدیلی ہوگئی تھی۔ تم اپنے طور پر پہچان نہیں سکتے تھے کہ صائمہ کی بیٹی کون ہے اور ہماری بیٹی کون ہے لیکن میں نے تم سے غلط کہا تھا اور صائمہ کی بیٹی کو تمہاری گود میں شائستہ بنا کر دے دیا تھا تاکہ تم اسے اپنی بیٹی سمجھتے رہو اور میں اپنی بیٹی کو صائمہ کے پاس بھیج دوں۔ میرا ارادہ تھا کہ ایک تو ہم اپنی بیٹی کے ذریعے دو لاکھ روپے نقد وصول کریں گے دوسرے یہ کہ میری بیٹی صائمہ کے گھر میں رہے گی اس کے زیر سایہ پلتی رہے گی تو اس کے لاکھوں روپے کی دولت اور جائیداد کی مالک بنے گی' سب کچھ میری بیٹی کا ہو جائے گا۔"

قربان کا سر چکرانے لگا۔ وہ دھپ سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تم نے یہ بات مجھ سے کیوں چھپائی تھی۔"

"اس لئے چھپائی تھی کہ میں نے ایک بار صرف اتنا کہا تھا کہ میں اپنی شائستہ کو اس کے نانا کے ہاں چھوڑ دوں گی۔ اس لئے کہ تم ٹھیک طرح کماتے نہیں ہو۔ اس پر تم نے سختی سے اعتراض کیا تھا اور کہا تھا کہ تم اپنی بیٹی کو اپنی ہی نظروں کے سامنے رکھو گے اور

کسی کے ہاں نہیں بھیجو گے۔ تبھی سے میں نے سمجھ لیا تھا کہ اگر میں تم سے سچ کہوں گی تو تم میری بات سے متفق نہیں ہوگے۔ میرے ساتھ تعاون نہیں کرو گے۔ دوسری بات یہ کہ میں تم پر بھروسہ نہیں کرتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ تم میرا اور میری بچی کا مستقبل نہیں بنا سکو گے۔ میرے مستقبل کا جہاں تک سوال ہے تو وہ ایک لاکھ روپے جو میں نے رکھے ہیں وہ میرے لئے کافی ہیں۔ رہ گئی میری بچی تو صائمہ اسے اپنی بیٹی سمجھ کر اپنی دولت اور جائیداد کی مالکہ بنا دے گی تم مجھ سے کہہ دو کہ ابھی تم نے جو کچھ کہا ہے وہ غلط ہے میری بیٹی کو تم نے ہلاک نہیں کرایا ہے۔"

وہ ایک دم سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور چیخ کر بولا۔ "وہ ہلاک ہو چکی ہے۔ ابھی مجھے خبر ملی ہے۔ میں یہی کہنے آیا تھا کہ تم جا کر وہاں دیکھو کہ اس بچی کی لاش وہاں موجود ہے یا نہیں۔ اگر لاش تم دیکھ کر آؤ گی اور تصدیق کرو گی تو اس کے بعد مجھے یقین آجائے گا کہ صائمہ نے میرے منصوبے کے مطابق عمل کیا ہے اور وہ بچی مر چکی ہے لیکن تم اب مجھے یقین دلاؤ کہ وہ ہماری شائستہ نہیں ہے۔ میرا دل اندر سے ڈوب رہا ہے۔"

"دل کیا ڈوبے گا۔ ہم دونوں کو شرم سے ڈوب مرنا چاہئے۔ میں تمہارے سامنے ایک لمحہ بھی ٹھہر نہیں سکتی۔ میں ابھی اپنی بچی کے پاس جاؤں گی۔"

یہ کہتے ہی وہ پلٹ کر جانے لگی۔ قربان علی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ "دیکھو جو کچھ ہو چکا ہے۔ اس پر مٹی ڈالو۔ یقیناً یہ بہت بڑا المیہ ہے اور بہت عبرت کا مقام ہے کہ ہم نے لالچ میں آکر اپنی ہی بیٹی کو ہلاک کر دیا ہے لیکن یہ بات تمہارے ذریعے کھلے گی یعنی تم وہاں جا کر بچی کی لاش پر رونا شروع کرو گی تو ہم پکڑے جائیں گے مجھے تو پھانسی ہوگی اور تم بھی ایک طویل مدت کے لئے جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلی جاؤ گی۔ میں تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ ہوش و حواس سے کام لو۔"

رئیسہ اسے گھور کر دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے پتہ چل رہا تھا کہ اس کے دل کو زبردست صدمہ پہنچا ہے اور وہ اپنی لاڈلی کی موت پر بڑی مشکل سے صبر کر رہی ہے اور خود کو رونے سے روک رہی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں گئی۔ وہاں وہ دوسری بچی سو رہی تھی۔ وہ قریب جا کر اسے گود میں اٹھانے لگی۔ اس وقت قربان نے آگے بڑھ کر اسے روک دیا اور پوچھا۔ "تم اسے کیوں گود میں لے رہی ہو۔"

"میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔"

"کیا پاگل ہوئی ہو۔ ہم ابھی سے بچی کو صائمہ کے گھر نہیں لے جاسکتے۔ یہ میرے پاس رہے گی۔ جب تک پانچ لاکھ کی رقم نہیں ملے گی۔ اسے واپس نہیں کیا جائے گا۔"

"مجھے پانچ لاکھ روپے نہیں چاہئیں۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے میں اس کی بچی کو اسے واپس کردوں گی۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ اب مجھے سختی سے کام لینا ہوگا۔ یاد رکھو تم اس بچی کو یہاں سے نہیں لے جاسکو گی اور جیسا کہوں گا ویسا ہی کرو گی۔ اگر تم وہاں جاکر اپنی بیٹی کی لاش پر آنسو بہاؤ گی یا واویلا کرو گی تو میں یہاں اس بچی کو ختم کردوں گا۔ پھر تمہارا یہ نیک جذبہ دھرا کا دھرا رہ جائے گا کہ بچی اس کی ماں کے پاس لوٹا دی جائے۔ بولو' کیا منظور ہے۔ اس بچی کی زندگی چاہتی ہو تو میری باتوں پر عمل کرو۔"

وہ تھوڑی دیر تک قربان کو گھورتی رہی اور سوچتی رہی پھر اس نے پوچھا۔ "اگر میں تمہاری باتوں پر عمل کروں اور اپنے دل پر پتھر رکھ کر اپنی بیٹی کی لاش کے سامنے آنسو نہ بہاؤں تو کیا تم اس بچی کو صائمہ کے حوالے کردو گے۔"

"ہاں' پانچ لاکھ لینے کے بعد۔"

"میں ایسی دولت پر تھوکتی ہوں۔ مجھے دولت نہیں چاہئے تم پانچ لاکھ روپے لے کر میری زندگی سے چلے جانا۔ مجھے اب تمہاری بھی پرواہ نہیں ہے۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ یہ بچی صائمہ کے پاس پہنچ جائے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ زندہ سلامت صائمہ کی گود میں پہنچ جائے گی۔ اب تم جاؤ۔ تمہاری واپسی تک یہ بچی میرے پاس رہے گی۔"

رئیسہ وہاں سے پلٹ کر سر جھکائے کمرے سے باہر چلی گئی۔

صائمہ کی کوٹھی میں بڑی ہی غمناک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بہت سے مہمان باہر برآمدے میں اور ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ عورتیں جو بہت زیادہ بولتی ہیں' وہ چپ چپ سی تھیں۔ وہاں کے ٹی وی لاؤنج میں ایک چوکی پر ایک ننھی سی بچی کی لاش پڑی ہوئی تھی اور اس پر سفید چادر ڈال دی گئی تھی۔

دستور یہ ہے کہ جب کسی کے ہاں موت ہوتی ہے تو مردے پر سفید چادر ڈال دی جاتی ہے۔ آنے والے رشتہ دار دور سے دیکھتے ہیں اور خاموشی سے بیٹھ جاتے ہیں اور

مرنے والے کے متعلق باتیں کرنے لگتے ہیں۔ کوئی بہت ہی قریبی رشتہ دار ہو تو مرنے والے کا چہرہ ایک نظر دیکھنا چاہتا ہے۔ وہاں بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ فہیم اس بچی کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ اگر کوئی رشتہ دار خاتون آکر بچی کو دیکھنا چاہتیں تو وہ بچی کے چہرے پر سے ذرا دیر کے لئے چادر ہٹا دیتا اور پھر چادر سے چہرے کو ڈھانپ دیتا تھا۔ اس عرصے میں بچی کی آنکھیں بند رہتی تھیں اور وہ گم صم پڑی رہتی تھی۔ اسے ایسی زبردست ٹریننگ دی گئی تھی کہ وہ کتنی ہی دیر سے چپ چاپ چاروں شانے چت پڑی ہوئی تھی۔ جب اس کے چہرے پر چادر آتی تو وہ آہستہ سے آنکھیں کھول دیتی اور جب چادر ہٹانے کی باری آتی تو وہ آنکھیں بند کرلیتی تھی۔

اس بچی کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں پہنچانے کے لئے یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ جہاں وہ پڑی ہوئی تھی اس کے چاروں طرف دور تک اس طرح پھول بچھا دیئے گئے تھے کہ کوئی انہیں روند کر یا پھلانگ کر نہیں جاسکتا تھا۔ جانے کے لئے ایک مخصوص راستہ تھا جہاں سے گزر کر بچی کے پاس پہنچ سکتے تھے یعنی جتنے بھی رشتہ دار آئے تھے وہ سب دور ہی دور سے اس چادر میں چھپی ہوئی بچی کو دیکھتے تھے۔ دور سے دیکھنے کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ آہستہ آہستہ سانس لینے والی بچی محسوس نہیں ہوتی تھی کہ زندہ ہے۔"

رئیسہ ٹی وی لاؤنج میں پہنچ گئی تھی۔ پہلے وہ دور ہی سے بچی کی طرف دیکھتی رہی۔ بالکل گم صم سی رہی۔ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بچی کی طرف جانے لگی۔ صائمہ بچی سے بہت دور بیٹھی ہوئی تھی کیونکہ عورتیں اسے کبھی کبھی تسلیاں دینے آتی تھیں اور وہ چاہتی تھی کہ بچی کے قریب نہ رہے ورنہ دوسری عورتیں بھی بچی کے قریب پہنچ جائیں گی اسی وجہ سے وہ دور بیٹھی ہوئی تھی اس نے جب رئیسہ کو بچی کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو فہیم کی طرف نظر کی۔ فہیم نے بھی معنی خیز نظروں سے صائمہ کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نگاہوں کا تبادلہ ہوا اور دونوں نے نظروں ہی نظروں میں یہ بھانپ لیا کہ یہی وہ عورت ہے جو تصدیق کرنے کے لئے آئی ہے۔

رئیسہ بچی کے پاس بچھے ہوئے پھولوں کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ اس نے فہیم کی طرف دیکھا۔ فہیم نے آہستگی سے پوچھا۔ "کیا بچی کا چہرہ دیکھنا چاہتی ہو۔"

رئیسہ نے آنکھیں بند کرلیں۔ پھر انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں میں بچی کی

ماں سے ملنا چاہتی ہوں۔"

فہیم نے کہا۔ "وہ دیکھو' ادھر ایک صوفے پر سیاہ ساڑھی پہنے ہوئے جو خاتون بیٹھی ہیں وہی بچی کی ماں ہیں۔"

رئیسہ نے پلٹ کر ادھر دیکھا۔ وہ صائمہ سے پہلے بھی کئی بار مل چکی تھی اور اسے چہرے سے پہچانتی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی اس کی طرف گئی۔ صائمہ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر کھڑی ہوگئی۔ رئیسہ نے قریب آکر کہا۔ "میں تم سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

اس کی آواز سنتے ہی صائمہ نے آنکھیں بند کرکے پوچھا۔ "کیا باتیں کروگی۔ میں تو اس وقت اپنے غم سے نڈھال ہو رہی ہوں۔"

رئیسہ نے کہا۔ "میں تمہارے سارے غم دھو ڈالوں گی میں تمہارے آنسو پونچھنے آئی ہوں۔ تھوڑی دیر کے لئے تنہائی میں باتیں کرلو۔"

صائمہ نے آنکھیں کھول دیں۔ پھر سر ہلا کر کہا۔ "میں تمہیں پہچان گئی ہوں تم وہی خاتون ہو جو دوبار برقع پہن کے سینما ہال کے باکس میں مجھ سے ملاقات کرنے آئی تھیں۔"

رئیسہ نے تائید میں سر ہلایا پھر وہ دونوں وہاں سے چلتے ہوئے ایک بیڈ روم میں آگئیں۔ وہاں رئیسہ نے آہستگی سے کہا۔ "میں تمہیں ایک راز کی بات بتانے آئی ہوں اور وہ یہ کہ جس بیٹی کی موت کا تم ماتم کر رہی ہو وہ تمہاری نہیں میری بیٹی ہے۔"

یہ کہتے ہی وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔

صائمہ نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ "لیکن تم تو اسی بچی کے سلسلے میں دوبار مجھ سے بڑی بڑی رقمیں لے جاچکی ہو۔ پھر یہ بچی تمہاری کیسے ہوئی۔"

رئیسہ نے روتے ہوئے کہا۔ "وہ میں اپنی ضرورت سے مجبور ہو کر رقمیں لے گئی تھی لیکن میں نے اس نیت سے اپنی بیٹی کو یہاں بھیجا تھا کہ یہاں یہ عیش و آرام سے رہے گی اور تمہارے بعد یہی تمہاری دولت اور جائیداد کی مالک بنے گی اور اپنی بیٹی کو تمہارے پاس بھیج کر میں نے تمہاری بیٹی کو اپنے پاس رکھ لیا۔ یہ بات میں نے اپنے شوہر کو بھی نہیں بتائی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرا شوہر مجھ سے چھپ کر دوہری چالیں چل رہا ہے اور لاعلمی میں اپنی بچی کو تمہاری بچی سمجھ کر اسے ہلاک کر رہا ہے بلکہ ہلاک کرچکا ہے۔"

"کیا وہ اب بھی اس حقیقت سے بے خبر ہے۔" صائمہ نے پوچھا۔

"نہیں' جب اس نے مجھے آکر میری بچی کی موت کی خبر سنائی تب میں نے اسے یہ حقیقت بتا دی ہے کہ اس نے نادانستگی میں اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔"

صائمہ نے پوچھا۔ "کیا اسے اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارنے کا یقین ہوچکا ہے۔"

"ہاں' اسے یقین ہوگیا ہے لیکن وہ بے حد لالچی ہے اسے اپنی بچی کی موت کا اتنا غم نہیں ہے جتنا کہ تم سے پانچ لاکھ روپے حاصل کرنے کا لالچ ہے۔ وہ اسی انتظار میں ہے کہ اب جلد سے جلد بیمہ کمپنی والے پانچ لاکھ روپے ادا کردیں اور وہ پانچ لاکھ روپے تم اس کے حوالے کردو۔ اسی لئے اس نے تمہاری بچی کو اب اپنے قبضے میں رکھا ہے۔ مجھ سے بھی چھین لیا ہے اور مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر میں یہاں آکر اپنی بیٹی کی لاش پر روؤں گی اور دوسروں کو شبہ میں مبتلا کروں گی تو وہ ادھر تمہاری بچی کو ہلاک کردے گا۔"

صائمہ اسے گہری ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے یقین کرنے کی کوشش کررہی ہو کہ ابھی اس کی بچی زندہ ہے اور ابھی تک دشمن کے قبضے میں ہے اور یہاں جو بچی ہے وہ رئیسہ کی ہے۔

رئیسہ نے کہا۔ "کیا سوچ رہی ہو۔ جلدی کرو۔ اگر ہم نے دیر کی اور اسے قانون کے حوالے نہ کیا تو میرا شوہر قانون کی گرفت سے دور کہیں چلا جائے گا۔"

صائمہ نے پوچھا۔ "تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں یہ چاہتی ہوں کہ پولیس میرے گھر کا محاصرہ کرلے۔ وہ بچی کے ساتھ گھر کے اندر موجود ہے۔ بڑی آسانی سے پکڑا جائے گا اور اس طرح بچی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔"

صائمہ نے کچھ سوچنے کے بعد فہیم کو کمرے میں بلایا۔ پھر وہ تینوں آپس میں مشورے کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد فہیم ٹیلی فون کے پاس گیا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر پولیس انسپکٹر سے رابطہ قائم کیا۔ ان کی پلاننگ کے مطابق انسپکٹر اسی کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ فہیم نے کہہ دیا تھا کہ وہ کسی وقت بھی اس سے رابطہ قائم کرکے مجرم کی نشان دہی کرسکتا ہے۔ لہٰذا فہیم نے قربان کے گھر کی نشاندہی کردی۔ اس کا پورا پتہ بتا دیا اور حملہ ہو کر محاصرہ کرنے اور قربان کو گرفت میں اس طرح لینے کی التجا کی کہ بچی کو نقصان نہ پہنچے۔

فہیم اپنی بات کہنے کے بعد دوسری طرف سے دیا جانے والا جواب سنتا رہا۔ پھر اس

نے ریسیور رکھ دیا۔

صائمہ نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

فہیم نے جواب دیا۔ "انسپکٹر نے کہا ہے کہ قربان کو گرفتار کر کے اور بچی کو اپنی تحویل میں لے کر وہ لوگ سیدھے اسی طرف آئیں گے۔ ہمیں ان کی آمد تک انتظار کرنا ہو گا۔"

یہ کہہ کر وہ تینوں وہیں کمرے میں بیٹھے رہے۔ صائمہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "یہ دنیا کیسی ہے ایک انسان دوسرے انسان کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر رکھنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ اسے ہمیشہ دھوکا دیتا رہے۔ جب میں اندھی تھی تو قدرتی طور پر میری آنکھوں پر اندھیرے کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جب آنکھیں ملیں تو ایک شخص نے شوہر بن کر مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی۔ میری آنکھوں پر فریب کی پٹی باندھنے کی کوشش کی لیکن میں اس کے فریب سے بچ گئی۔ پھر ایسا وقت آیا کہ تمہارے شوہر نے میری آنکھوں پر پھر فریب کی پٹی باندھی اور ایک ایسی بچی کو میرے حوالے کیا جسے میں دیکھ کر بھی نہیں پہچان سکتی تھی اور اب تم کہہ رہی ہو کہ وہ میری نہیں تمہاری بچی تھی۔"

رئیسہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ فہیم نے کہا۔ "مجھے تو ایسا لگتا ہے بھابی کہ اب بھی ہماری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ جو بچی اب یہاں آنے والی ہے وہ آپ ہی کی ہوگی۔"

صائمہ نے سر کو جھکا لیا۔ سوچنے لگی۔ اسے سوچتے دیکھ کر رئیسہ نے کہا۔ "میں تو نیکی کر رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ جس کی بچی ہے اس کی گود میں پہنچ جائے۔ مجھے اب دولت کا لالچ نہیں رہا۔ اتنا بڑا نقصان اٹھانے کے بعد میں اب کوئی لالچ کبھی نہیں کروں گی، ہاں اگر صائمہ نے اس بچی کو اپنی بچی تسلیم نہیں کیا تو میرے لئے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ میری گود تو اجڑ چکی ہے میں اس بچی کو اب گود لے لوں گی اور ساری زندگی اسے ماں کا پیار دیتی رہوں گی۔"

صائمہ نے کہا۔ "یہ جو ممتا ہوتی ہے یہ بھی عورت کو مجرم بنا دیتی ہے جیسا کہ تم نے اپنی بچی کو میرے پاس بھیج دیا تھا تاکہ وہ میری دولت اور جائیداد کی مالکہ بن جائے۔ یہ لالچ تمہارے اور تمہاری بچی کے لئے بہت مہنگی پڑی، بہرحال یہاں سب سے اہم بات یہ ہے کہ

ماؤں کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی نہیں ہونی چاہئیں۔ اس سے پوری نسل تباہ ہو جاتی ہے۔ ہمیں کھلی آنکھوں سے اپنی اپنی اولاد کو پہچاننا چاہیے۔"

رئیسہ نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "ہاں، ہم مائیں ہیں اور ہمیں اپنی اولاد کو اچھی طرح پہچان کر رکھنا چاہیے تاکہ کبھی وہ اپنی گود سے پرائی گود میں نہ چلی جائے۔"

"رئیسہ تم اپنی بیٹی کو کس طرح پہچان سکتی ہو یا کس طرح یہ کہہ سکتی ہو کہ جو میری بیٹی ہے وہ تمہاری نہیں ہے اور جو تمہاری ہے وہ میری نہیں ہے۔"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ جب میرا شوہر تمہاری بیٹی کو اٹھا کر لایا تو وہ تقریباً کوئی چار مہینے کی ہوگی۔ اتنی ہی عمر میری بیٹی کی تھی۔ میں نے دونوں کو اچھی طرح دیکھا ہے۔ اپنی بیٹی کو تو پیدا ہوتے ہی پہچاننے لگی تھی۔ پھر تمہاری بیٹی کو بھی پہچاننے لگی۔ اس طرح پہچاننے لگی کہ دونوں کی شکلیں الگ الگ تھیں اور وہ اپنی شکلوں سے پہچانی جاتی تھیں کہ کون تمہاری ہے اور کون میری۔"

"اس کے باوجود بھی تو ہم دونوں دھوکا کھا سکتی ہیں۔"

رئیسہ نے پوچھا۔ "میں تمہاری بات نہیں سمجھی۔"

"میں سمجھاتی ہوں۔ جب ایک ماں اولاد کو پیدا کرتی ہے تو اس کی پیدائش کے پہلے لمحے سے وہ اس سے اتنی محبت کرتی ہے کہ جب تنہا بستر پر پڑی ہوتی ہے تو اپنے بچے کو غور سے دیکھتی ہے اس کی انگلیوں کو، ہاتھوں کو، چہرے کے ایک ایک نقش کو سر کے ایک ایک بال سے لے کر پاؤں کے انگوٹھے تک ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتی ہے اور اگر غور سے نہ دیکھے تو صبح شام بچے کی مالش کرتے وقت اس کی نظریں بچے کے جسم کے ایک ایک حصے پر پڑتی ہیں۔ میں تم سے پوچھتی ہوں رئیسہ کیا تم اپنی بچی کی مالش کیا کرتی تھیں یا نہیں؟"

"ہاں، میں بھی صبح و شام مالش کیا کرتی تھی۔"

"کیا تم نے میری بچی کی کبھی مالش کی؟"

رئیسہ ذرا جھجک گئی۔ پھر بولی۔ "ہاں، کبھی کبھی کرتی تھی۔"

"دیکھو رئیسہ جھوٹ نہ بولو۔ تم نے ایک بار بھی میری بچی کے بدن کی مالش نہیں کی ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"ایسے کہہ سکتی ہوں کہ اگر تم میری بچی کے بدن کی مالش کرتیں تو تمہارا ہاتھ اس کے جسم کے ایک ایک حصے پر جاتا۔ تمہاری نظریں بھی ہر جگہ پہنچتیں۔ حتیٰ کہ میری بچی کے دائیں پاؤں کے انگوٹھے اور دوسری انگلی کے درمیان ایک تل چھپا ہوا ہے۔ وہ تل بھی تمہاری نظروں میں آجاتا لیکن تم نے اس بات پر غور نہیں کیا۔ اسی لئے پھر ایک بار یہاں میری آنکھوں پر پٹی باندھنے آئی ہو کہ جو بیٹی یہاں مُردہ پڑی ہے وہ میری نہیں ہے حالانکہ وہ میری بیٹی ہے اور جس بیٹی کو تم میرے حوالے کرنا چاہتی ہو وہ ہرگز میری نہیں ہوسکتی کیونکہ اس کے پاؤں کے انگوٹھے اور انگلی کے درمیان کبھی وہ تل نہیں ہوگا جسے میں نے پیدائش کے بعد ہی اپنی بیٹی کے انگوٹھے اور دوسری انگلی کے درمیان دیکھا تھا۔"

رئیسہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ پھر پریشان ہوکر بولی۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

فہیم نے سختی سے ڈانٹ کر کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔ اگر اس کمرے سے باہر جانے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

فہیم یہ کہتے ہوئے رئیسہ کے سامنے تن کر کھڑا ہوگیا۔ رئیسہ ہچکچاتے ہوئے بیٹھ گئی۔ فہیم نے کہا۔ "اب میری سمجھ میں آیا کہ میری بھابی اتنے اعتماد سے گڑیا کو اپنی بیٹی کیوں کہتی رہی تھیں۔"
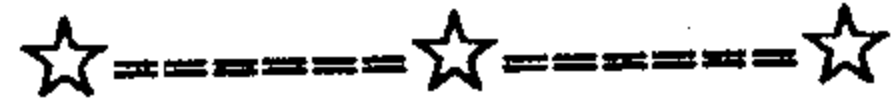
صائمہ نے رئیسہ سے کہا۔ "دیکھو اب کوئی میری آنکھوں پر پٹی نہیں باندھ سکتا۔ اب تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ مجھے سچ سچ بتا دو کہ تم ایک بار پھر کیوں یہ فراڈ کر رہی تھیں اور اپنے ہی شوہر کو گرفتار کرانے کے لئے کیوں اس کا پتہ بتایا ہے۔"

رئیسہ کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلنے لگی۔ فہیم نے اس کے سر کے بالوں کو ایک جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ "اب میں تم لوگوں پر رحم نہیں کروں گا اور نہ ہی مروت سے پیش آؤں گا۔ تم اپنی خیریت چاہتی ہو تو سچ سچ بتا دو کہ کیسی کیسی چالیں چلی گئی ہیں۔"

صائمہ نے کہا۔ "نہیں فہیم یہ بُری بات ہے۔ اس کے بال چھوڑ دو۔ یہ خود ہی بتائے گی۔"

فہیم نے اس کے بال چھوڑ دیئے وہ سر جھکا کر بولنے لگی۔ "پہلے میں چاہتی تھی کہ گڑیا تمہارے پاس نہ آئے۔ میں اپنی بیٹی کو تمہارے پاس بھیج دوں لیکن میں یہ بھی جانتی تھی کہ میرے شوہر کے عزائم اچھے نہیں ہیں۔ وہ کامران سے نفرت کرتا تھا اور اس نے

پہلے مجھ سے کہہ چکا تھا کہ انتقام لینے کے لئے اس کی بیٹی کو بھی ضرور ہلاک کرے گا۔ میں نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کسی کی جان سے نہ کھیلے کسی کی گود نہ اجاڑے۔ اس نے میرے سامنے وعدہ کرلیا تھا لیکن میں اس پر بھروسہ نہیں کرسکتی تھی اس لئے کشمکش میں رہی کہ تمہاری بیٹی کی جگہ اپنی بیٹی کو بھیج دوں یا تمہاری ہی بیٹی کو تمہارے پاس جانا چاہئے۔"

یہ کہہ کر وہ ایک ذرا رُکی۔ کچھ سوچ کر پھر بولی۔ "بہت سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ مجھے اپنی بیٹی کے لئے خطرہ مول لینا نہیں چاہئے۔ پہلے گڑیا کو ہی تمہارے پاس بھیجنا چاہئے اور اس کی طرف سے لاپرواہ رہنا چاہئے وہ یقیناً گڑیا کو ہلاک کرنے کی کوشش کرے گا اور وہ ایسا کرنے میں کامیاب بھی ہوسکتا ہے۔ اگر وہ کامیاب ہوجائے گا اور گڑیا کی موت واقع ہوگی تب میں اپنے شوہر سے کہوں گی کہ وہ دھوکا کھا گیا ہے اور اس نے مجھ سے جھوٹا وعدہ کیا تھا کہ وہ گڑیا کو ہلاک نہیں کرے گا۔ اس لئے میں نے اپنی بیٹی کو بھیج دیا تھا لہٰذا میرے شوہر نے اپنی ہی بیٹی کو ہلاک کر دیا ہے۔

"اور پھر ایسا ہی ہوا۔ جب میرے شوہر نے مجھے آکر بتایا کہ گڑیا کی موت واقع ہوگئی ہے تو میں نے وہی چال چلی۔ اس کے سامنے ایک ماں کی طرح روتے ہوئے کہا کہ ہم اپنی بچی کو اپنے ہاتھوں سے مار چکے ہیں۔ پہلے تو میرا شوہر یقین نہیں کر رہا تھا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ وہ ایک سال کے لئے جیل چلا گیا تھا۔ جب واپس آیا تو دونوں لڑکیوں میں سے یہ نہیں جان سکا کہ کون اس کی بیٹی ہے۔ میں نے ہی اسے بتایا تھا کہ اس کی بیٹی کون ہے۔ دراصل جسے بتایا تھا وہ اس کی بیٹی نہیں تھی اور میرا فراڈ شروع سے ہی چل رہا تھا۔ تب میرے شوہر کو یقین ہوگیا کہ میں نے اپنی بیٹی تمہارے پاس بھیجی تھی جو کہ مرچکی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک سرد آہ بھری۔ پھر بڑی مایوسی سے بولی۔ "میں یہی سوچ کر یہاں آئی تھی کہ اب اپنی بیٹی کو تمہاری بیٹی بنا کر تمہارے حوالے کر دوں گی اور میرا شوہر بھی اب مجبور ہوگا کہ اس بیٹی کو تمہارے حوالے کر دے کیونکہ اسے پانچ لاکھ روپے کا لالچ ہے۔ وہ لالچ کے لئے اپنی بیٹی دے گا اور میں اپنی بیٹی کے مستقبل کے لئے اسے تمہارے حوالے کردوں گی۔ یہی سب کچھ سوچ کر آئی تھی مگر انسان کا سوچا ہوا ہمیشہ پورا نہیں ہوتا۔"

فہیم نے پوچھا "تم اپنے شوہر کو گرفتار کیوں کرا رہی ہو۔ تم نے وہاں کا پتہ کیوں

بتایا؟"

"اس لئے کہ مجھے اس سے نفرت ہے۔ پہلے اس نے دو لاکھ روپے صائمہ سے حاصل کئے جس میں سے ایک لاکھ روپے ایسے غائب کئے کہ مجھے پتہ نہ چلا۔ بس اتنی خبر ملتی رہی کہ وہ بازاری عورتوں میں اور شراب اور جوئے میں پیسے اڑا رہا ہے۔ دوسرا ایک لاکھ روپیہ جو میرے پاس تھا اس پر بھی اس کی نظریں تھیں اور اسی بات پر ہمارا جھگڑا ہوا کرتا تھا۔ میں نے اس عرصے میں اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ یہ نہ تو میری بھلائی کے لئے سوچے گا۔ نہ میری بیٹی کے لئے۔ اس لئے میں اس پر بھروسہ نہیں کروں گی اور اسے چھوڑ دوں گی لیکن جب یہ مرحلہ سامنے آیا کہ اب میری بیٹی صائمہ کے پاس جائے گی تو میں نے سوچا کہ صائمہ پانچ لاکھ روپے میرے شوہر کو ادا کرے گی مگر کیوں ادا کرے۔ وہ پانچ لاکھ روپے بھی تو میری بیٹی کے ہونے والے تھے۔ اب میں ایک پائی بھی صائمہ کی تجوری سے نکلوانا نہیں چاہتی تھی کہ وہ ایک پیسہ بھی میرے شوہر کے پاس نہ پہنچے۔ میں اسے اس کے انجام تک پہنچانا چاہتی تھی تاکہ ہمیشہ کے لئے اس سے نجات مل جائے۔ میں دوسری شادی کرلوں اور میری بیٹی صائمہ کے ہاں راج کرلے۔"

اسی وقت ایک عورت کمرے میں داخل ہوئی اور پریشان ہو کر بولی۔ "صائمہ بیٹی پولیس والے یہاں آئے ہیں اور کسی آدمی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال رکھی ہیں اور ایک چھوٹی سی بچی کو گود میں اٹھائے ہوئے ہیں۔"

یہ سنتے ہی وہ سب کمرے سے باہر آئے اور پھر دوسرے کمرے سے گزرتے ہوئے ٹی وی لاؤنج کی طرف گئے۔ وہاں پولیس والے پہنچ چکے تھے اور قربان ہتھکڑیاں پہنے سر جھکائے کھڑا ہوا تھا۔ ایک پولیس والے کی گود میں چھوٹی سی بچی تھی۔ اس نے رئیسہ کو دیکھتے ہی امی کہہ کر اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے۔ رئیسہ دوڑتی ہوئی گئی اور اسے گود میں لے لیا۔ فہیم نے پولیس انسپکٹر سے کہا۔ "یہ مجرم کی بیوی ہے اور اپنے شوہر کے جرم میں برابر کی شریک رہی ہے اور اس سے بھی زیادہ فراڈ کیا ہے۔ اس کا بیان آپ لے سکتے ہیں۔"

فہیم کی بات ختم ہوتے ہی اچانک کتنی ہی عورتیں چیختی سنائی دیں۔ یک بیک افراتفری مچ گئی۔ بہت سی عورتیں ٹی وی لاؤنج سے نکل کر بھاگ رہی تھیں۔ پتہ چلا کہ لاش کو چھینک آگئی تھی اور گڑیا چھینکتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ ایک لاش کو زندہ ہو

اور اٹھ کر بیٹھتے دیکھ کر بھلا عورتیں کہاں ٹھہر سکتی تھیں سبھی دہشت زدہ ہو کر بھاگنے لگی تھیں۔ صائمہ دوڑتی ہوئی گڑیا کے پاس گئی تو گڑیا نے گھبرا کر دوبارہ لیٹنے کی کوشش کی۔

صائمہ نے اسے کھینچ کر سینے سے لگاتے ہوئے اور خوشی سے روتے ہوئے کہا۔ "کوئی بات نہیں بیٹی، ڈرامہ ختم ہو چکا ہے۔ سبھی کی آنکھوں سے پٹیاں کھل چکی ہیں۔"

☆======☆======☆

چیلنج فنڈ

اسے ایک ایسے شوہر کی تلاش تھی جو بیوقوف اور حکم کا غلام ہو۔
اس سیدھے سادے نوجوان کا قصہ جو چند گھاگ
چالبازوں کے درمیان پھنس گیا تھا۔
ایک انوکھی لڑکی جس سے شادی کرنے والے کو
پندرہ لاکھ روپے کا انعام ملتا۔

سعید بخاری کی دکان صدر کے ایک ایسے کاروباری مرکز میں تھی جہاں سے وہ لاکھوں روپے کا منافع حاصل کر سکتا تھا لیکن کاروبار میں اس کی دلچسپی برائے نام تھی' وہاں کے بڑے بڑے بیوپاری اس دکان کی تاک میں لگے ہوئے تھے۔ سب ہی یہ جانتے تھے کہ نوجوان سعید بخاری عاشق زیادہ ہے اور کاروباری کم۔ جبار احمد بیوپاری اس کھوج میں لگا رہا کہ اس کی محبوبہ کا نام اور پتہ معلوم ہو جائے۔ اس کا تجربہ تھا کہ عاشق مزاج لوگ' خواہ کتنے ہی شہ زور ہوں' عورت کو ان کی کمزوری بنانے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔

جبار احمد بیوپاری نے دو چار دنوں کی علیک سلیک کے بعد سعید بخاری سے دوستی کر لی۔ سعید اٹھائیس برس کا نوجوان تھا اور جبار احمد اڑسٹھ برس کا بوڑھا تھا' اس کے باوجود دونوں کے درمیان بے تکلفی بڑھ گئی۔ رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ سعید توقع سے زیادہ احمق ہے۔ باپ کی چھوڑی ہوئی جائیداد نے اسے حواس باختہ کر دیا تھا' اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دولت کس طرح خرچ کرے وہ کلبوں میں جاتا تھا' تنہائی کا دکھ مٹانے کے لئے پیتا تھا' دولت کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے جُوا کھیلتا تھا اور دھڑکتے ہوئے دل کی تسکین کے لئے حسین عورتوں کو دیکھ کر آہیں بھرتا تھا۔

جبار احمد بیوپاری بیزار ہو جاتا تھا کیونکہ بڑھاپے کی مناسبت سے وہ صرف کاروبار اور منافع کی بات سوچتا تھا' جب بھی وہ کہتا۔ "بھئی سعید' تمہاری وہ صدر کی دکان لاکھوں میں ایک ہے۔" تو جواب میں اسے ایک آہِ سرد سنائی دیتی' کوئی نہ کوئی حسینہ نظروں کے سامنے سے گزرتی' پھر کاروبار کی بات ادھوری رہ جاتی۔ ایک بار جبار احمد نے جھلا کر کہا۔

"یہ کیا بکواس ہے' جسے دیکھتے ہو اس پر ہزار جان سے عاشق ہو جاتے ہو' تمہاری کوئی ایک پسند نہیں ہے؟"

"میری ایک ہی پسند ہے' میں ایک حسین دوشیزہ کو چاہتا ہوں' جب بھی کسی حسین عورت کو دیکھتا ہوں' وہ یاد آ جاتی ہے اس لئے دل سے آہ نکل جاتی ہے۔"

"کون ہے وہ؟"

"میں اس کا نام نہیں جانتا۔" سعید بخاری نے جواب دیا۔

"اس کا پتہ جانتے ہو؟"

"نہیں' ایک بار اس کا پیچھا کیا تو اس نے گھاس نہیں ڈالی۔"

"تم عجیب احمق ہو' کیا تم اسے اپنی دولت سے مرعوب نہیں کر سکتے تھے؟"

مرعوب کیسے کیا جاتا ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا' اس کے حسن و جمال کے آگے میرا دماغ کام نہیں کرتا۔"

"تم اس لڑکی کے بارے میں جو کچھ جانتے ہو' مجھے بتاؤ میں تمہاری مشکل آسان کروں گا۔"

سعید بخاری تھوڑی دیر تک اس کے تصور میں گم رہا' پھر اس نے کہا۔

"جبار صاحب! آپ سے دوستی ہونے سے ایک ہفتہ قبل میں مجسموں کی نمائش میں گیا تھا' وہاں بڑے بڑے مجسمہ سازوں کے فن کے نمونے فروخت کے لئے رکھے گئے تھے۔ فنکاروں کی قدر کرنے والے بے شمار شائقین جدید طرز کے مجسمے دیکھنے آئے تھے۔ میں ایک مجسمے کو دور سے دیکھنے لگا' وہ ایک عام سا مجسمہ تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ اس کے دونوں ہاتھ نہیں تھے۔"

جبار احمد بیوپاری بے چینی سے پہلو بدلنے لگا' ایسا ہی ایک مجسمہ اس کے اپنے گھر میں تھا جس کے دونوں ہاتھ نہیں تھے۔ سعید نے اپنی داستان جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے مجسمے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو اس حسینہ کو دیکھ رہا تھا جو مجسمے سے لگی کھڑی تھی' وہ سفید رنگ کی ساڑھی اور نیلے بلاؤز میں ایسی جاذبِ نظر تھی کہ دل اس جذب ہوتی جارہی تھی۔ بت کا چہرہ حسینہ کی طرف تھا اور حسینہ کا چہرہ اداسی سے جھکا ہوا تھا' مجھے اچھی طرح یاد ہے' حسینہ کا دایاں ہاتھ بت کے سر پر تھا' بائیں ہاتھ پر وہ اپنا ٹیکے ہوئے تھی۔ بکھری ہوئی زلفوں کا کچھ حصہ سینے کے ابھار پر لہرا رہا تھا۔"

جبار احمد نے الجھ کر کہا۔ "بھئی اتنی تفصیل سے باتیں نہ کرو کہ اس کے ہاتھ کہاں تھے اور زلفیں کہاں لہرا رہی تھیں' جلدی سے آگے بیان کرو۔"

"آگے بیان کرنے کے لئے ذرا سی بات رہ گئی ہے' میرے پاس کیمرہ تھا۔ میں اسی وقت اس کی لاعلمی میں تصویر اتار لی' دوسرے دن میں پھر وہاں گیا۔ وہ بت اپنی

نہیں تھا۔ میں نے نمائش کے آرگنائزر سے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ ایک لڑکی اسے خرید کر لے گئی ہے۔"

جبار احمد پھر بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ اس نے پوچھا۔

"بھئی وہ تصویر تو تمہارے پاس ہو گی جو تم نے نمائش میں اتار تھی۔"

"ہاں وہ ہمیشہ میری جیب میں میرے سینے سے لگی رہتی ہے۔"

اس نے جیب سے پوسٹ کارڈ سائز کی ایک تصویر نکالی' اسے دیکھ کر ایک آہ بھری' پھر اسے جبار احمد بیوپاری کی طرف بڑھا دیا' وہ تصویر کو ہاتھ میں لے کر دیکھتے ہی ٹھٹک گیا۔ تصویر میں اس کی سوتیلی بیٹی فرزانہ ایک بت سے لگی کھڑی تھی' اس بت کو فرزانہ ہی خرید کر گھر لائی تھی۔ جبار احمد کو غصہ آنا چاہئے تھا کہ سعید اس کی بیٹی سے عشق کر رہا تھا اور اس کے سامنے عشق کی داستان سنا رہا تھا۔

پہلے تو جبار احمد کو شبہ ہوا کہ سعید بخاری نے خود انجان بن کر ایک باپ کے سامنے اس کی بیٹی سے چاہت کا اظہار کر دیا ہے۔ اس نے کہا۔

"سعید! تم یہ تصویر جیب میں لیے پھرتے ہو' اگر اس لڑکی کے باپ اور بھائیوں نے دیکھ لیا تو تمہارے دشمن بن جائیں گے۔"

"اس بات سے تو میں بھی ڈرتا ہوں اسی لئے تصویر کو جیب میں چھپا کر رکھتا ہوں' آپ پہلے دوست ہیں جسے میں نے یہ راز بتایا ہے۔ دیکھئے آپ نے وعدہ کیا ہے کہ آپ میری مشکل آسان کریں گے۔"

جبار احمد بیوپاری اپنے بیوپار کے نقطۂ نظر سے سوچنے لگا۔ وہ اپنی سوتیلی بیٹی فرزانہ کو جس دولتمند سے بیاہنا چاہتا تھا وہ کینسر کے مرض میں مبتلا تھا' اگلے ماہ فرزانہ سہاگن بن کر جاتی پھر دو ایک ماہ بعد دولت مند بیوہ بن کر اپنے میکے واپس آ جاتی۔ فی الحال سعید بخاری کو داماد بنانے کی گنجائش نہیں تھی' پھر یہ کہ ایسے احمق سے رشتہ جوڑنا ضروری نہیں تھا۔ فرزانہ اتنی چالاک تھی کہ اس احمق کو محبت کا بہلاوا دے کر صدر والی دکان اپنے باپ کے نام کرا سکتی تھی۔

سعید نے پوچھا۔ "آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

"آں؟" جبار احمد نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر کہا۔ "وہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی کے معاملہ میں تمہاری دال نہیں گلے گی۔"

"کیا آپ اسے جانتے ہیں؟" سعید نے امید بھرے لہجہ میں پوچھا۔ "مجھے بتائیے جلدی بتائیے' آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟"

"میں ابھی یہ نہیں بتا سکتا کہ اسے کیسے جانتا ہوں' البتہ اس سے ملا سکتا ہوں۔"

"سچ ابھی ملا سکتے ہیں؟"

"ذرا صبر سے سنو' اس کا نام فرزانہ ہے۔ شام کو اس کا بھائی اپنی دکان پر بیٹھتا ہے' وہ گھر میں تنہا رہتی ہے۔ میں اس کے نام ایک رقعہ لکھ دوں گا کہ سعید صاحب کو مجسموں سے دلچسپی ہے اور یہ تمہارا خریدا ہوا مجسمہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اتنا ہی لکھ دینا کافی ہے۔ ملاقات کا بہانہ بن جائے گا۔ اس کے بعد اس سے دوستی ہونے یا نہ ہونے کا انحصار تمہاری ذہانت پر ہے۔"

سعید نے بوڑھے کا ہاتھ عقیدت سے تھام کر کہا۔ "آپ میرے لئے فرشتہ بن گئے ہیں مگر یہ بتا دیجئے کہ کہیں جوتے تو نہیں پڑیں گے۔"

"عشق بھی کرتے ہو اور جوتوں سے بھی ڈرتے ہو' بہرحال ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ میرا ہاتھ چھوڑو' مجھے لکھنے تو دو۔"

سعید نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ جبار احمد نے فرزانہ کے نام ایک رقعہ لکھنے کے بعد کہا۔

"آج شام کو پانچ بجے کے بعد وہاں جانا' وہ اکیلی ہو گی۔"

اسے اچھی طرح سمجھانے کے بعد وہ سیدھا اپنے گھر آیا۔ فرزانہ اپنے کمرہ میں بیٹھی علمِ نفسیات کی کتاب پڑھ رہی تھی۔ جبار احمد نے پوچھا۔

"کیا تم سعید بخاری کو جانتی ہو؟"

"کون سعید بخاری' کیا وہ جس کی دکان صدر میں ہے اور جو شبانہ کلب کا ممبر ہے؟"

"ہاں وہی' تم اسے کیسے جانتی ہو؟"

فرزانہ نے جواب دیا۔ "موجودہ دور میں مکاریاں اور عیاریاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ ایک آدھ بے وقوف صاف پہچان میں آ جاتے ہیں۔ ابھی میں نفسیات کی ایک کتاب پڑھ رہی ہوں۔ اس میں ایک جگہ لکھا ہے کہ بعض حالات میں ہم احمق بن کر بھی کسی کا دل جیت سکتے ہیں۔"

جبار احمد نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "یہ درست ہے' آج اس نے تمہاری ایک تصویر دکھائی اور میرے سامنے تم سے محبت کا اظہار کیا۔ کوئی شخص ایسی جرأت نہیں کر

سکتا' یا تو وہ سچ مچ یہ نہیں جانتا ہے کہ تم میری بیٹی ہو یا پھر جان بوجھ کر احمق بنتے ہوئے میرے ذریعہ تمہارے پاس پہنچنا چاہتا ہے۔"

"ڈیڈی لوگ دانستہ احمق بنتے ہیں لیکن سعید کی طرح نہیں بنتے' ایک بار میں شبانہ کلب سے باہر آ رہی تھی' اس نے آواز دی۔ "محترمہ ذرا سنئے۔" میں نے پلٹ کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟" اس نے ہیرے کی ایک انگوٹھی میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ انگوٹھی شاید آپ کی ہے' وہاں میز کے نیچے پڑی ہوئی تھی۔"

میں نے ناگواری سے کہا۔ "مسٹر کسی سے لفٹ لینے کا یہ بھونڈا طریقہ ہے۔ اس روز تم نے نمائش گاہ میں میری تصویر کھینچی' میں انجان بن گئی' آج تم یہ نقلی ہیرے کی انگوٹھی اٹھا کر مجھ سے فری ہونے کے لئے آئے ہو۔"

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ نقلی نہیں ہے۔ اصلی ہے اور آپ کی ہے۔"

"ڈیڈی! میں نے انگوٹھی رکھ لی تو وہ بوکھلا گیا۔ بعد میں' میں نے تصدیق کی تو وہ واقعی ہیرے کی انگوٹھی تھی۔ اس احمق کو لفٹ لینا ہی تھا تو بہت سے طریقے تھے' کسی لڑکی کا رومال گر سکتا ہے' پرس کہیں چھوٹ سکتا ہے' حتیٰ کہ بالوں کی وگ کہیں گر سکتی ہے لیکن انگوٹھی انگلی سے نکل کر میز کے نیچے نہیں گر سکتی۔ سعید نے سوچا کہ انگوٹھی میری نہیں ہے اس لئے میں لینے سے انکار کر دوں گی لیکن میں نے اتنی قیمتی انگوٹھی لے لی تو اس کی حالت قابلِ دید تھی بیچارہ میرا منہ تکتا رہ گیا اور میں کار میں بیٹھ کر چلی آئی۔"

جبار احمد نے مسکرا کر کہا۔ "اچھا تو تم نے ہیرے کی انگوٹھی چپکے چپکے ہضم کر لی' مجھے خبر تک نہ ہونے دی۔ دیکھو بیٹی اتنی بڑی دنیا میں صرف میں تمہارا سچا ہمدرد ہوں اور ایک تمہارا بھائی تم سے سچی محبت کرتا ہے۔ میں پہلے بھی سمجھا چکا ہوں کہ جو بھی شخص تمہارا شوہر بن کر آئے گا وہ ہماری جیسی محبت اور اعتماد نہیں دے سکے گا اس لئے......"

فرزانہ نے بات کاٹ کر کہا۔ "اس لئے مجھے ہیرے جواہرات اور سونے کے زیورات اپنے شوہر کے گھر کے لئے نہیں رکھنا چاہئیں' ہیرے کی وہ انگوٹھی مجھے آپ کے حوالے کر دینا چاہئے۔"

"ہاں بیٹی! لڑکیوں کی جمع پونجی میکے میں ہی محفوظ رہتی ہے۔ کہاں ہے وہ انگوٹھی؟"

"میں نہیں دوں گی' میرے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ آپ اور بھائی جان بہلا پھسلا کر

لے لیتے ہیں' کبھی آپ دونوں کو کاروبار میں نقصان ہو جاتا ہے تو میری جمع پونجی سمیٹ کر لے جاتے ہیں۔ کبھی مال کی بلٹی چھڑانے کے لئے میرے زیورات فروخت کر دیتے ہیں۔"

"لڑکیاں اپنے باپ اور بھائیوں کے لئے بڑی قربانیاں دیتی ہیں۔ تم یہاں اپنی مرضی کے مطابق کھاتی پیتی اور پہنتی ہو' جب موڈ ہوتا ہے تفریح کے لئے نکل جاتی ہو' سسرال میں ایسی آزادی نہیں ملتی' ہاشم جیسا ہونے والا شوہر جو کینسر کا مریض ہے' وہ تمہارے لئے مناسب ہے' تم بہت جلد اس کی دولت سمیٹ کر میکے واپس آ جاؤ گی۔ آخر میں ایسے منصوبے تمہاری بھلائی کے لئے ہی بناتا ہوں۔ وہ انگوٹھی مجھے دے دو۔ شاباش!"

"وہ میں نے اپنے بینک کے لاکر میں رکھ دی ہے' وہاں سے نہیں نکالوں گی۔"

جبار احمد تھوڑی کھجاتے ہوئے سوچنے لگا کہ بچوں کو ضدی نہیں بنانا چاہئے' کبھی ان کی بات بھی مان لینی چاہئے۔ وہ انگوٹھی کے سلسلے میں فراخدلی کا ثبوت دے کر فرزانہ سے دوسری باتیں منوا سکتا ہے اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہیرے کی انگوٹھی میری بیٹی کی انگلی میں زیب دے گی۔ ٹھیک ہے' تم اسے رکھ لو مگر وعدہ کرو کہ سعید بخاری کو اُلّو بناؤ گی۔ تمہاری شادی تو ہاشم سے ہو گی' سعید کو صرف بہلانا ہے۔ جب وہ تم سے شادی کرنے کے لئے مجھ سے بات کرے گا تو میں اس سے نمٹ لوں گا۔"

وہ راضی ہو گئی۔ جبار احمد اسے اچھی طرح سمجھا کر چلا گیا کہ اسے شام کو سعید کے ساتھ کس طرح نرمی اور محبت سے پیش آنا چاہئے۔ اس کے جانے کے بعد وہ باہر جانے کے لئے لباس بدلنے لگی۔ سعید دل سے مجبور ہو کر اس پر مرمٹا تھا۔ وہ ایک فتنہ تھی' عمدہ لباس زیبِ تن کرنے اور میک اپ کرنے کے بعد قیامت بن جاتی تھی' وہ تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکلی' پھر ٹی وی لاؤنج سے گزرتے وقت اس مجسمے کے سامنے رک گئی۔

اس مجسمہ میں کیا خوبیاں تھیں یہ صرف وہی سمجھ سکتی تھی' اس بت کے سامنے آ کر اس کی بڑی بڑی خوابیدہ آنکھیں اور خوابیدہ ہو گئیں' یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے خواب کی تعبیر سامنے آ گئی ہو' وہ بت کے چہرے اور ننگے بدن پر ہولے ہولے ہاتھ پھیرنے لگی اور زیرِ لب بڑبڑانے لگی۔

"تم کتنے اچھے ہو' کچھ بولتے نہیں' مجھ سے کچھ مانگتے نہیں' تم کتنے پیارے ہو' مجھے

پیار دیتے ہو۔ میرے دل کی دھڑکنوں کو اپنے سینے پر رکھ لیتے ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے بُت کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اس کا دل بت کے سینے پر دھڑکنے لگا۔ وہ بڑی آسودگی سے بولی۔

"تم راحتِ جان ہو' میری زندگی ہو' میرے مجازی خدا ہو' میں اور کسی سے شادی نہیں کروں گی۔"

☆------☆------☆

فرزانہ آدھ گھنٹے بعد ماہرِ نفسیات لیڈی ڈاکٹر سائرہ خاتون کے چیمبر میں بیٹھی ہوئی تھی' لیڈی ڈاکٹر تھوڑی دیر تک فون پر کسی سے باتیں کرتی رہی' پھر وہ ریسیور رکھ کر بولی۔

"مس فرزانہ! میں پچھلے ایک ماہ سے آپ کا نفسیاتی تجزیہ کر رہی ہوں اور اب میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ جو کچھ میں آپ کے متعلق کہوں گی آپ اسے تسلیم نہیں کریں گی۔"

فرزانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں تسلیم کروں یا نہ کروں' آپ کا فرض میری ذہنی الجھنوں کو سمجھنا اور مفید مشورے دینا ہے۔"

"ایک مشورہ تو یہی ہے کہ جو نتائج میں نے اخذ کئے ہیں آپ انہیں تسلیم کریں' بچپن سے آپ کو ایسی محبت کرنے والی ہستی نہیں ملی جس کی محبت خودغرضی سے پاک ہو۔"

"میں کسی حد تک یہ تسلیم کر لیتی ہوں' ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میرے ڈیڈی اور بھائی جان مجھ سے بے لوث محبت کرتے ہیں۔"

"غلط' آپ ایک بار باتوں کی روانی میں یہ کہہ چکی ہیں کہ ڈیڈی اور بھائی جان بھی آپ سے کچھ نہ کچھ مانگتے رہتے ہیں' دیتے کم ہیں' لیتے زیادہ ہیں' یہ آپ کے الفاظ ہیں۔ ہم نفسیاتی تجزیہ کرنے والے الفاظ کے پیچھے چھپے ہوئے کرب کو' دکھوں کو اور شکایتوں کو پڑھ لیتے ہیں۔ ایک مشرقی عورت اپنے باپ اور بھائی کی شکایتوں کو گھر کی چاردیواری سے باہر کسی کے سامنے نہیں کہتی۔ ان کی زیادتیوں کو پیار کے آنچل میں چھپا لیتی ہے' یہی آپ کر رہی ہیں' میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ آپ تسلیم نہیں کریں گی۔"

فرزانہ نے سر جھکا لیا۔ لیڈی ڈاکٹر سائرہ نے کہا۔ "میری دوسری ریڈنگ یہ ہے کہ آپ کسی مرد پر بھروسہ کرنا نہیں چاہتیں' آپ کو ہر مرد فراڈ نظر آتا ہے' خواہ وہ کتنا ہی

احمق ہو۔"

فرزانہ کی نگاہوں کے سامنے سعید بخاری کا چہرہ طلوع ہو گیا۔ وہ خوبرو جوان اسے اچھا لگتا تھا مگر ڈاکٹر سائرہ کی ریڈنگ کے مطابق وہ سعید جیسے احمق سے بھی کتراتی تھی۔

ڈاکٹر سائرہ خاتون نے کہا۔ "میں نے دانستہ ایک احمق کی بات کی ہے' اس لئے کہ آج کے دور میں احمق وہی ہوتا ہے جو فراڈ کرنا نہیں جانتا اور اتنی بڑی دنیا میں کوئی احمق مشکل ہی سے ملتا ہے۔"

فرزانہ نے پوچھا۔ "میرے کیس سے کسی احمق کا کیا تعلق ہے؟"

"تعلق میں بتاتی ہوں۔ آپ ایک جیون ساتھی کے لئے ایک ایسے مرد کا تصور کرتی ہیں جو آپ کے اشاروں پر ناچتا ہے' جو آپ کی دس باتیں سن لیتا ہے مگر منہ سے اُف نہیں کرتا' آپ کے باپ اور بھائی کے برعکس آپ سے کچھ نہیں لیتا۔ محترمہ! کچھ نہ لینے والا مرد تو وہی ہو گا جس کے دونوں ہاتھ نہ ہوں اور وہ جواب میں کچھ بولتا نہ ہو' ایسا تو آپ کو کوئی پتھر کا مجسمہ ہی مل سکتا ہے.........."

فرزانہ کچھ پریشان ہو گئی جیسے اس کا بھید کھل گیا ہو۔

"مس فرزانہ! آپ تعلیم یافتہ ہیں اور ذہین ہیں' آپ حقیقت کو تسلیم کریں' آپ اتنی حسین ہیں کہ کوئی گونگا بہرہ اور ہاتھوں سے محروم شوہر آپ کی حسین شخصیت کے لئے مذاق بن جائے گا۔ آپ کا ذہنی اضطراب اسی طرح ختم ہو سکتا ہے کہ آپ کسی احمق سے ہی سہی' مگر فوراً شادی کر لیں۔"

فرزانہ نے ڈاکٹر کی فیس کی رقم نکالی۔ پھر آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ "میں آپ کے مشورے پر غور کروں گی۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "ایک بات یاد رکھیں' عورت جب تک زندہ رہتی ہے وہ اپنے باپ بھائی شوہر اور اولاد کو کچھ نہ کچھ دیتی ہی رہتی ہے آپ کو بھی یہی روش اختیار کرنا چاہئے۔"

وہ ڈاکٹر سے رخصت ہو کر اس عمارت سے باہر آئی۔ اس کی کار فٹ پاتھ پر لگی کھڑی تھی۔ وہ قریبی بک اسٹال میں جا کر علمِ نفسیات کی کتابیں طلب کرنے لگی' دکاندار نے اس کے آگے چند کتابیں رکھ دیں' وہ صرف کتابیں پڑھ کر ماہرِ نفسیات نہیں بن سکتی تھی۔ مقصد اتنا ہی تھا کہ وہ اپنے اندر کی انجانی بے چینی کو دور کرنا چاہتی تھی' اب وہ بے

چینی اور اضطراب انجانا نہیں رہا تھا۔ ڈاکٹر سائرہ نے صحیح تشخیص کی تھی کہ وہ کیا چاہتی ہے ایک تابعدار خاوند۔

اسٹال کے کاؤنٹر کے پاس کھڑے ہو کر کتابوں کا انتخاب کرنے کے دوران وہ دماغی طور پر غیر حاضر تھی' اس وقت اس کے دماغ میں ڈاکٹر سائرہ کی باتیں پک رہی تھیں کہ فی زمانہ ایک فرمانبردار شوہر نہیں مل سکتا' اسے پتھر کا ایک مجسمہ ہی مل سکتا ہے۔

ڈاکٹر کی یہ بات ایسی تھی جو اس کے دل میں چبھ رہی تھی' کیونکہ وہ سچ مچ پتھر کے مجسمے سے بہل رہی تھی۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق اب اسے شادی کے متعلق سنجیدگی سے سوچنا چاہئے تھا۔ سہاگ کی اندھی بازی میں ہر عورت کو داؤ لگانا پڑتا ہے۔ شادی کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ مرد کو جیت لے گی یا خود ہار جائے گی۔

بک اسٹال کے کاؤنٹر کے پاس ایک اور حسین عورت آ کر کھڑی ہو گئی تھی' فرزانہ اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی' اسے اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ وہ عورت اس کے ہیرے کی انگوٹھی کو غور سے دیکھے جا رہی ہے۔ فرزانہ نے اپنے باپ سے جھوٹ بولا تھا کہ ہیرے کی انگوٹھی لاکر میں رکھی ہوئی ہے' اسے ڈر تھا کہ باپ یا بھائی وہ یہ انگوٹھی دیکھتے ہی کسی نہ کسی بہانے اس سے مانگ لیں گے لیکن جب باپ نے یقین دلایا کہ انگوٹھی بیٹی کی انگلی میں زیب دیتی ہے تو وہ آزادی سے پہن کر چلی آئی۔

اس عورت نے فرزانہ کو مخاطب کیا۔ "بہن ایک بات پوچھوں؟ تم نے یہ انگوٹھی کہاں سے خریدی ہے؟"

فرزانہ نے اس انگوٹھی کو سہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "صدر میں ہماری اپنی جیولری کی دکان ہے' مجھے خریدنے کی ضرورت نہیں پڑتی تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"میری ایک انگوٹھی بالکل ایسی ہی تھی' پتہ نہیں مجھ سے گم ہو گئی یا کسی نے چرا لی ہے؟"

فرزانہ کے تصور میں اچانک سعید بخاری آ گیا' دماغ نے کہا۔ "اچھا تو وہ جان بوجھ کر احمق بنتا ہے' اس نے انگوٹھی چرائی اور مجھ سے لفٹ لینے کے لئے میرے پاس پہنچ گیا' ایسے مردوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ احمق بن کر عورت کو احمق بناتے ہیں۔"

یہ سوچنے کے بعد اس نے عورت سے پوچھا۔ "تمہیں کسی پر شبہ ہے کہ کون تمہاری انگوٹھی چرا سکتا ہے؟"

"شبہ تو اپنے سگوں پر ہی کیا جا سکتا ہے لیکن میرے گھر والے کہتے ہیں کہ کوئی بھی چور ہاتھ کی انگلی سے انگوٹھی نہیں اتار سکتا۔ میں انگوٹھی بائیں ہاتھ کی انگلی میں پہنتی تھی اس لئے یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ کسی نے مصافحہ کے دوران اتار لی کیونکہ بائیں ہاتھ سے مصافحہ نہیں کیا جاتا۔"

فرزانہ تائید میں سرہلا کر بولی۔ "ہاں پھر یہی ہو سکتا ہے کہ تم وہ انگوٹھی کہیں رکھ کر بھول گئی ہو۔"

ایسے وقت فرزانہ کے ضمیر نے کہا کہ وہی انگوٹھی تمہاری انگلی میں ہے لیکن اس نے فوراً ہی ضمیر کی آواز کو مجسمہ کی طرح خاموش کر دیا۔

اس عورت نے کہا۔ "دراصل وہ انگوٹھی میری انگلی میں ذرا ڈھیلی تھی اس کے باوجود وہ گرتی نہیں تھی' یہ تم میرے ہاتھ دیکھ رہی ہو نا' میری ہتھیلیاں ہمیشہ خشک رہتی ہیں' ان کا روکھا پن دور کرنے کے لئے کریم لگاتی ہوں' اب مجھے خیال آ رہا ہے کہ وہ انگوٹھی شبانہ کلب میں کہیں گر پڑی ہو گی۔"

شبانہ کلب کے نام پر فرزانہ نے اسے چونک کر دیکھا' وہ عورت کہہ رہی تھی۔

"ایک شام میں شبانہ کلب میں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ بیٹھی چائے پی رہی تھی' اس نے میرا ہاتھ پکڑنا چاہا تو میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا' وہ سمجھا میں شرما رہی ہوں' ہاں یہ شرم ہی کی بات تھی کہ میری ہتھیلیوں میں چکناہٹ نہیں تھی' اس وقت میرا پرس میری گود میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے چھپا کر پرس میں سے کریم کا ٹیوب نکالا' پھر میز کے نیچے دونوں ہتھیلیوں پر کریم کی مالش کرنے لگی۔"

فرزانہ کو جانے کیوں خوشی ہوئی۔ یہ بات ثابت ہو رہی تھی کہ سعید بخاری چور نہیں ہے اس نے واقعی وہ انگوٹھی میز کے نیچے سے پائی تھی۔ فرزانہ نے کہا۔

"ہاں اب یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ تمہاری انگوٹھی کریم کی چکناہٹ سے پھسل کر میز کے نیچے گر گئی ہو گی۔"

"میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔"

"لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب انگوٹھی تمہاری انگلی سے پھسل کر گری تو کیا تمہیں خبر نہ ہوئی۔"

وہ فرزانہ کو جواب دینے سے پہلے زیرِ لب مسکرائی۔ پھر ہولے سے بولی۔

"محبت اندھی ہوتی ہے' ہمیں بھی اندھا کر دیتی ہے۔ جب میں ہتھیلیوں پر کریم لگا رہی تھی وہ پیار کے ایسے بول' بول رہا تھا جسے سننے کے لئے عورت کے کان ترستے ہیں۔ میں سر جھکائے اتنی توجہ سے سن رہی تھی کہ انگوٹھی کی موجودگی یا غیر موجودگی کا احساس نہ رہا' بلکہ یہ ساری دنیا بھی اس وقت موجود نہیں تھی' جب مجھے انگوٹھی کے گم ہو جانے کا دکھ ہوتا ہے تو میں محبت کے ان رنگین لمحات میں گم ہو کر بہل جاتی ہوں' میں مسکرانا چاہوں تب بھی مسکرانے لگتی ہوں۔"

محبت کیا ہوتی ہے؟ یہ فرزانہ ایک بے جان مجسمے کو گلے لگا کر نہیں سمجھ سکتی تھی لیکن اس وقت اس عورت کی باتوں سے ایک بات سمجھ میں آئی کہ بے شک وہ مجسمہ ایک باپ اور بھائی کی طرح یا دوسرے شوہروں کی طرح اس سے کچھ نہیں مانگتا' بڑا مہربان مجسمہ ہے لیکن افسوس' وہ اس کے حسن کی تعریف نہیں کر سکتا۔ عورت حسین ہو یا نہ ہو' وہ اپنے مرد کی زبان سے اپنی تعریف سننا چاہتی ہے۔ رومان پرور باتوں سے سحر زدہ ہو کر یوں گم ہو جانا چاہتی ہے کہ ایک ہیرے کی انگوٹھی تو کیا ساری خدائی اس کے ہاتھ سے نکل جائے تب بھی وہ مسکراتی رہے۔

اس عورت نے کہا۔ "بہن ایک بات پوچھتی ہوں' برا نہ ماننا کیا تمہاری جیولری کی دکان میں چوری کا مال خریدا جاتا ہے؟"

"ہرگز نہیں۔" فرزانہ نے جھوٹ کہا۔ "میرے ڈیڈی مال کی پکی رسید دیکھ کر خریدتے ہیں۔"

اس عورت نے حسرت بھری نظروں سے ہیرے کی انگوٹھی کو دیکھا۔ پھر مایوس ہو کر وہاں سے چلی گئی۔ فرزانہ کے سر سے جیسے ایک بوجھ اتر گیا' یہ پتہ چل گیا تھا کہ یہ انگوٹھی کس کی ہے لیکن انگوٹھی والی اپنی انگوٹھی کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی' یہ بھی معلوم ہوا کہ سعید بخاری جھوٹا اور فریبی نہیں ہے مگر احمق ضرور ہے' ہیرے کی اتنی قیمتی انگوٹھی میز کے نیچے سے پانے کے بعد کیا ضروری تھا کہ وہ لفٹ لینے کے لئے اسے فرزانہ کے حوالے کر دیتا۔ اس کے ہاتھ سے انگوٹھی بھی گئی اور فرزانہ سے لفٹ بھی نہ ملی۔

وہ کتابیں خریدنے کے بعد اپنی کار میں آ کر بیٹھ گئی۔ اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھتے ہی عقب نما آئینے میں سعید بخاری نظر آیا' وہ فرزانہ کی کار کے پیچھے بہت دور اپنی کار کے پاس کھڑا ہوا تھا' وہ کچھ گھبرایا ہوا کچھ نروس سا تھا جیسے فرزانہ سے چھپ کر اس کا تعاقب

کرنا چاہتا ہو اور پکڑے جانے کا ڈر بھی ہو۔ فرزانہ نے اس کی حالت پر زیرلب مسکراتے ہوئے کار اسٹارٹ کی' پھر سست رفتاری سے ڈرائیو کرنے لگی' مقصد یہ تھا کہ سعید کو ٹریفک کے ہجوم میں تعاقب کرنے میں آسانی ہو۔

دونوں کاریں آگے پیچھے رینگتی رہیں۔ سپر مارکیٹ کے قریب پہنچ کر فرزانہ نے کار روکی' پھر وہاں سے اتر کر ایک جیولر کی دکان میں داخل ہو گئی۔ سعید تھوڑی دیر تک اپنی کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھا سوچتا رہا کہ اسے بھی دکان کے اندر جانا چاہئے یا نہیں' کہیں فرزانہ ناراض نہ ہو جائے۔ کچھ دیر تک سوچتے رہنے کے بعد وہ ایک چرمی بیگ اٹھا کر کار سے باہر آ گیا۔

جیولر کی دکان کے شوکیس کے پاس آ کر اس نے دیکھا فرزانہ اندر بیٹھی ہوئی زیورات پسند کر رہی تھی' وہ بڑی جرأت سے کام لے کر دکان میں داخل ہوا' فرزانہ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی' پھر دکاندار سے بولی۔

"مجھے یہ چالیس ہزار روپے کا سیٹ پسند ہے' اس وقت میرے پاس کیش نہیں ہے۔ میں شام کو آ کر یہاں سے لے جاؤں گی۔"

سعید نے آگے بڑھ کر اپنی خدمات پیش کرنی چاہیں مگر وہ تیزی سے پلٹ کر باہر چلی گئی۔ سعید نے شو ونڈو کے پار دیکھا' وہ اپنی کار کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی' یعنی بے رخی بھی تھی انتظار بھی تھا۔

فرزانہ کے نقطۂ نظر سے انتظار بھی تھا اور اعتماد بھی تھا کہ سعید اس آزمائش میں پورا اترے گا' تھوڑی دیر کے بعد وہ کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گئی کیونکہ وہ دکان سے باہر آ رہا تھا۔ اس کے کاندھے پر چرمی بیگ لٹک رہا تھا اور دونوں ہاتھوں میں زیورات کے خوبصورت ڈبے ریپر میں چھپے ہوئے تھے۔

وہ کار کی کھڑکی کے پاس آ کر بولا۔ "میں آپ سے ایک ضروری بات........"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے فرزانہ نے گاڑی آگے بڑھا دی' وہ دوڑتا ہوا اپنی کار کی طرف جانے لگا۔ وہ زیر لب مسکرا رہی تھی۔ کچھ آگے جانے کے بعد عقب نما آئینے میں سعید کی کار نظر آئی' اسے کہتے ہیں "کچے دھاگے سے بندھے آئیں گے سرکار میرے........"

اس نے ایک ساڑھی ہاؤس کے سامنے کار روک دی۔ دکان کے سیلز مین کو بلا کر

کہا "اس روز میں نے ساڑھے سات ہزار کی ایک ساڑھی پسند کی تھی' اگر وہ ہے تو اسے پیک کر کے صاحب کو دے دو اور ان سے بل وصول کر لو' وہ دیکھو' وہ نیلے رنگ کی کار آ کر رک رہی ہے' وہی صاحب کی گاڑی ہے۔"

سیلز مین نے سعید کے پاس آ کر کہا۔ "صاحب' صرف ایک منٹ میں' میں ابھی بیگم صاحبہ کی ساڑھی پیک کر کے لاتا ہوں صرف ایک منٹ........"

سعید نے بیگم صاحبہ کے ذکر پر کسی حد تک کچھ سمجھتے ہوئے حیرانی سے منہ کھول دیا' اسے شاید یقین نہیں آ رہا تھا کہ جس کے لئے وہ سڑکیں ناپ رہا ہے' پٹرول پھونک رہا ہے' وہ اتنی جلدی بیگم صاحبہ بن گئی ہے۔ اس کے اندر سے مسرتوں کا طوفان اٹھ رہا تھا۔

سیلز مین نے ساڑھی کا پیکٹ اور بل لا کر دیا تو اس نے فوراً ہی رقم ادا کر دی۔ محبت کی کوئی قیمت نہیں ہوتی' وہ تو صرف ساڑھی اور زیورات کی قیمت ادا کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد پھر دونوں گاڑیاں آگے پیچھے دوڑنے لگیں' ساحل سمندر پر جانے والے راستے پر زیادہ ٹریفک نہیں تھا اس لئے گاڑی کی رفتار تیز تھی۔ اب فرزانہ کو سعید اپنا اپنا سا لگ رہا تھا بالکل اس مجسمہ کی طرح اپنا محسوس ہو رہا تھا' اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اب مجسمے کو توڑ دے اور سعید کے گلے میں بانہیں ڈال دے۔ پھر اس کے زنانہ دماغ نے سمجھایا کہ مرد سے فوراً ہی متاثر نہیں ہونا چاہئے۔ اس طرح عورت کی کمزوری ظاہر ہو جاتی ہے۔

وہ سعید کو ذہن سے نکال کر اپنا نفع نقصان سوچنے لگی' منافع تو گاڑی کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ نقصان یہ ہوتا کہ اگر اس کے باپ جبار احمد بیوپاری کو اس منافع کی بھنک بھی مل جاتی تو صرف ساڑھی اس کے پاس رہ جاتی۔ باپ اور بھائی بہلا پھسلا کر یا ڈانٹ ڈپٹ کر چالیس ہزار کے زیورات اپنے پاس رکھ لیتے کیونکہ عورت کی پونجی میکے ہی میں محفوظ رہتی ہے۔

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی' میں کیا کروں' شام ہو چکی ہے' بینک بند ہو چکا ہو گا ورنہ میں اپنے لاکر میں زیورات رکھ دیتی' کل صبح انہیں لاکر میں رکھ سکوں گی' تب تک میں انہیں کہاں چھپاؤں؟

سوچتے سوچتے وہ سمندر کے ساحل پر پہنچ گئی۔ ساحل پر دور دور تک لکڑی کے تختوں سے بنے ہوئے ہٹس نظر آ رہے تھے' ایک ہٹ کے چوکیدار نے اس کے لئے

دروازہ کھول دیا۔ وہ وہاں کئی بار پہلے بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ آ چکی تھی۔ اس نے چوکیدار کو پچاس کا ایک نوٹ دے کر رخصت کر دیا۔ پھر ایک کمرے میں بستر پر آ کر لیٹ گئی۔

اتنے میں دروازے پر دستک سنائی دی' پھر سعید کی آواز آئی۔

"مم.......... میں' میں اندر آ سکتا ہوں؟"

فرزانہ نے انجان بن کر پوچھا۔ "یہ کون بکرا میں میں کر رہا ہے..........؟"

"جی.......... میں.......... میں سعید ہوں۔"

"اچھا تو تم پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آ گئے ہو۔"

"جی نہیں' میری گاڑی میں آپ کی کچھ امانتیں رکھی ہوئی ہیں' وہ دینے آیا ہوں۔"

"اچھا جاؤ' لے آؤ۔"

وہ اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا۔ فرزانہ کو احساس ہوا کہ وہ سعید کے ساتھ جس طرح پیش آ رہی ہے اس سے تصنع ظاہر ہو رہا ہے۔ ایک احمق بھی اس تجاہلِ عارفانہ کو سمجھ لے گا لہٰذا سوچ سمجھ کر اس سے اچھا یا برا برتاؤ کرنا چاہئے' اتنے میں وہ دروازے کو اپنی پشت کی طرف سے دھکا دے کر کھولتا ہوا اندر آنے لگا کیونکہ اس کے دونوں ہاتھوں میں ساڑھی کے پیکٹ اور زیورات کے ڈبے تھے' وہ سرہانے آ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ اٹھ کر بیٹھتی ہوئی بولی۔ "ارے کیا یہ سب میرے سر پر رکھو گے؟ وہاں میز پر رکھو۔"

وہ میز پر رکھنے لگا۔ فرزانہ نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔ مرد وہ ہے جس کی قربت سے عورت کو پہلے پہل ڈر لگتا ہے اور وہ ڈر اچھا بھی لگتا ہے۔ بس وہ سعید کچھ ایسا ہی لگ رہا تھا۔

"تم میرا پیچھا کیوں کر رہے تھے؟"

وہ ادب سے کھڑا ہوا تھا۔ اب اسے جھوٹ کہنا تھا' وہ ڈرتے ہوئے بولا۔

"مجھے وہ پسند ہیں.......... مجسمے.........."

"اچھا تو تم مجھے مجسمہ سمجھ کر پیچھا کر رہے تھے؟"

"جی' جی نہیں.......... مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ کے پاس ایک خوبصورت بت ہے۔ میں آپ سے ملاقات کر کے اسے دیکھنے کی درخواست کرنا چاہتا تھا۔"

"درخواست کرنا چاہتے تھے' کا کیا مطلب ہوا؟ یعنی ابھی تم نے ملاقات نہیں کی ہے اور درخواست نہیں کر رہے ہو؟"

"جی ہاں' کر رہا ہوں۔ کیا آپ مجھے اس مجسمے کو دیکھنے کی اجازت دیں گی؟"

"اجازت ہے۔ جاؤ میری کوٹھی میں جا کر دیکھ آؤ۔"

فرزانہ نے یہ کہہ کر منہ پھیر لیا۔ سعید الجھن میں پڑ گیا' وہ جسے دیکھنے اور ملنے آیا تھا وہ ہستی سامنے موجود ہے۔ اس جیسا احمق اس حسینہ کو چھوڑ کر بے جان مجسمے کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔

"تم کھڑے کیوں ہو۔ اس مجسمہ کو دیکھنے کیوں نہیں جاتے؟"

اس نے جیب سے جبار احمد کا رقعہ نکال کر بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ جبار صاحب نے آپ کے نام لکھا ہے۔"

وہ محبت کی ابتدا ایسے کر رہا تھا جیسے نوکری کی درخواست دے رہا ہو' فرزانہ نے اس رقعہ پر ایک نظر ڈال کر پوچھا۔

"یہ جبار احمد کون ہیں' مجھے کس رشتہ سے یہ رقعہ لکھا ہے؟"

"جی میں نے یہ نہیں پوچھا۔ میں نے سوچا شاید آپ سے کسی طرح کی واقفیت ہو۔"

"تم عجیب احمق ہو۔ اگر کوئی تمہیں جوتے کھلوانے کے لئے رقعہ دے کر کسی لڑکی کے پاس بھیج دے تو تم کچھ معلومات حاصل کئے بغیر چلے جاتے ہو۔"

"ایسی غلطی پہلی بار ہوئی ہے' آپ کو غصہ تو نہیں آ رہا ہے نا!" وہ گھبرا کر فرزانہ کے سینڈل کی طرف دیکھنے لگا۔

فرزانہ کو ہنسی آ گئی۔ اس نے کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔ میں نے تمہارے جیسا احمق کہیں نہیں دیکھا۔"

وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں احمق نہیں ہوں' آپ میری سادگی اور شرافت کو حماقت نہ سمجھیں۔"

"یہ کیسی سادگی اور شرافت ہے کہ تم اتنا نہیں جانتے کہ رقعہ لکھنے والا میرا باپ ہے۔"

وہ حیرانی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا "جبار صاحب.......... آپ کے والدِ محترم

.... نن .... نہیں' آپ مذاق کر رہی ہیں۔"

"کیا تمہیں ذرا سی بھی عقل نہیں ہے' کیا میں کسی دوسرے کو اپنا باپ کہوں گی۔"

"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں نے غلطی سے ایسا کہہ دیا۔"

"تم اتنی دیر میں کتنی ہی غلطیاں کر چکے ہو جس لڑکی کی قسمت پھوٹے گی وہی تمہاری بیوی بنے گی۔"

"آپ ایسا نہ کہیں' میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ میں اپنی ممی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ کی قسمت کبھی نہیں پھوٹے گی۔"

وہ گھور کر بولی۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو؟ ہوش میں تو ہو؟"

اس نے فوراً ہی گھٹنے ٹیک دیئے۔ "میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں' میں نے اپنے آپ کو بہت سمجھایا کہ آپ بے حد حسین ہیں' آپ کے لاکھوں پرستار ہیں۔ اس بھیڑ میں آپ مجھ سے باتیں کرنا بھی پسند نہیں کریں گی' مجھے آپ کا خیال دل سے نکال دینا چاہئے مگر جب بھی میں نے آپ کو بھلانے کی کوشش کی تو میرا دل رونے لگا۔"

اچانک ہی اس کی آنکھیں بھیگ گئیں' وہ رونے لگا۔ فرزانہ پیچھے ہٹ کر بولی۔

"تم محبت کر رہے ہو یا بھیک مانگ رہے ہو۔ مرد ہو کر روتے ہوئے شرم نہیں آتی۔"

"میں کیا کروں۔ شہر کے کلبوں میں' بڑی بڑی کوٹھیوں میں بڑے بڑے دولت مند آپ کو حاصل کرنے کے لئے لاکھوں روپے کی بازیاں لگا رہے ہیں' میرے پاس بھی دولت ہے مگر عقل کام نہیں کرتی کہ آپ کو کیسے اپنا بنا لوں۔"

وہ درست کہہ رہا تھا کہ شہر کے بڑے بڑے رئیس اس کے آگے دولت کا جال بچھا رہے تھے' فرزانہ سب کچھ جانتی تھی کیونکہ جال بچھانے والوں سے اکثر سامنا ہوتا رہتا تھا۔ مگر جب ہر جگہ آہیں بھرنے والے موجود ہوں تو عورت مغرور ہو جاتی ہے' فرزانہ مغرور تو نہیں تھی مگر کسی کو منہ نہیں لگاتی تھی۔ سنجیدگی سے سوچتی تھی کہ اسے ایک نہ ایک بار کسی سے شادی کرنی ہے لہٰذا وہ مرد بولتا ہو مگر بے زبان ہو' سنتا ہو مگر بہرا ہو' دونوں ہاتھوں سے اس پر اپنی دولت لٹاتا ہو مگر کچھ چھینتے وقت مفلوج ہو جاتا ہو اور طویل انتظار کے بعد ایسا ایک شخص سامنے آ گیا تھا۔

اس نے سعید سے پوچھا۔ "یہ رئیس حضرات میرے متعلق کیسی باتیں کرتے ہیں؟ ذرا مجھے بتاؤ۔"

"میں کیا بتاؤں' وہ ہزار طرح کی باتیں کرتے ہیں' آپ کے حُسن کی تعریفیں کرتے ہیں' کہتے ہیں کہ آپ کو دولت کا لالچ ہے پھر بھی آپ دام میں نہیں آتیں۔ آج کل بڑا چرچا ہے کہ سیٹھ ہاشم بڑی مکاری سے آپ کو اپنی دلہن بنانا چاہتا ہے۔"

"میں اس کی مکاری جانتی ہوں' سیٹھ ہاشم کینسر کا مریض نہیں ہے اس نے منصوبہ بنایا ہے کہ میرے ڈیڈی' اس لالچ میں مجھے اس سے بیاہ دیں گے کہ وہ کینسر کا مریض جلد ہی مر جائے گا' پھر اس کی تمام دولت میری ہو جائے گی لیکن میں احمق نہیں ہوں۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "بخدا آپ واقعی سمجھدار ہیں۔ آپ کو اس کی مکاری کا علم کیسے ہو گیا؟"

وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "سیٹھ ہاشم کا فیملی ڈاکٹر بھی مجھ پر عاشق ہے میں نے اس سے حقیقت اُگلوا لی ہے۔ میں یہ حقیقت ڈیڈی کو بتاؤں گی تو وہ یقین نہیں کریں گے کیونکہ فیملی ڈاکٹر نے سیٹھ ہاشم کے بارے میں کینسر کے جھوٹے کاغذات اور نسخے تیار کئے ہیں۔ ڈیڈی وہ کاغذات اور نسخے دیکھ کر مطمئن ہو گئے ہیں۔"

"پھر تو آپ کے ڈیڈی آپ کی شادی اس سے کر دیں گے۔"

"میں بچی نہیں ہوں کہ وہ زبردستی میری شادی کر دیں گے۔ میں ایسے شخص کو پسند کروں گی جو مجھ پر حکومت نہیں کرے گا۔"

"میں نہیں کروں گا۔"

"پہلے پوری بات سنو' میں ایسے شخص کو پسند نہیں کروں گی جو تمہاری طرح بالکل عورت کا غلام بن جاتا ہو۔"

"میں نہیں بنوں گا۔"

"پہلے پوری بات سنو' فوراً بیچ میں بول پڑتے ہو۔ میرے حاکم بھی نہیں بنو گے' میرے محکوم بھی نہیں رہو گے۔ پھر میرے ساتھ کس طرح زندگی گزارو گے؟"

"جس طرح تم کہو گی۔"

"آخر ہوئی نا وہی عورت کی غلامی والی بات؟ کیا تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ شادی کے بعد دوست بن کر رہو گے؟"

"ہاں' یہی بات میں کہنا چاہتا تھا مگر میرے دماغ میں نہیں آ رہی تھی' ہم دونوں

دوست بن کر رہیں گے۔ آپ نے اتنی امید اور حوصلہ دیا ہے تو یہ بھی بتا دیں کہ میں
بارات لے کر کب آؤں؟"
"خدا کے لئے ذرا تو عقل کی بات کرو۔ بارات لے کر آؤ گے تو ڈیڈی اور بھائی جان
جوتوں سے تمہارا استقبال کریں گے۔"
"کبھی نہیں، جبار صاحب میرے پکے دوست بن گئے ہیں۔"
"صرف تمہاری دکان حاصل کرنے کے لئے۔ کیا تمہیں کبھی عقل نہیں آئے گی؟"
وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "محبت دماغ سے نہیں دل سے کی جاتی ہے۔ میں آپ
کی خاطر دکان ان کے حوالے کر دوں گا۔"
"پھر میں تم سے شادی نہیں کروں گی۔ جو دولت یا جائیداد تمہارے بعد میری ہو
سکتی ہے، انہیں تم ڈیڈی کے حوالے کرنا چاہتے ہو۔"
"اچھا نہیں کروں گا۔ اپنی ممی کی قسم کھا کر کہتا ہوں، جو آپ کہیں گی وہی کروں
گا۔"
"یہ تم کس ممی کی قسم کھا رہے ہو؟ کیا تمہاری والدہ زندہ ہیں؟"
"ہاں زندہ ہیں، مگر ہم ساتھ نہیں رہتے۔ میری ممی کا الگ کاروبار ہے۔ ڈیڈی
انہیں پسند نہیں کرتے تھے' اس لئے دس برس پہلے انہیں طلاق دے دی۔"
"کیا تم اپنی ممی سے ملتے ہو؟"
"کبھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو میں ان سے ملتا ہوں، وہ آپ کی طرح سمجھ
ہیں، جب آپ کی شادی ہو جائے گی تو آپ میرے مسائل حل کریں گی۔"
"کیسے مسائل؟"
"یہی کاروباری یا ذاتی مسائل۔"
"سعید! اچھی طرح کان کھول کر سن لو۔ میں شادی کے بعد تمہاری ماں کی مداخلت
پسند نہیں کروں گی۔"
"جی بہت اچھا۔ میں ممی سے کہہ دوں گا۔"
"ابھی کچھ نہ کہنا۔ شادی کے بعد بہو خود ہی ساس سے نمٹ لیتی ہے۔"
"آپ اتنی دیر سے اتنی باتیں کر رہی ہیں۔ خدا کے لئے اتنا تو بتا دیں کہ
شادی کب ہو گی؟"

"تم میرے ایک منصوبے پر عمل کرو گے تو جلد ہی ہو جائے گی۔"
"میں عمل کروں گا' بتایئے۔"
"دیکھو' یہ جو دولت مند ہوتے ہیں' یہ بات بات پر بازیاں لگاتے ہیں اور پیسوں کا
کھیل کھیلتے ہیں۔ کاٹن ایکسچینج میں لاکھوں کی بولیاں بولتے ہیں' سٹہ کھیلتے ہیں' تاش کے
پتوں پر اپنے گھر اور گھر والی کو بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں' اسی طرح یہاں کے چند دولت مند
میرے نام پر لاکھوں روپے کی بازیاں لگائے بیٹھے ہیں۔"
"آپ کیسے جانتی ہیں؟"
وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ "عورت کو بدنام کیا جاتا ہے' مگر میرا تجربہ ہے کہ مرد عاشق
بن کر پیٹ کے کیسے ہلکے ہو جاتے ہیں۔ میرے ایک عاشق نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر
بتایا ہے کہ سیٹھ ہاشم' عبداللہ دھاگے والا اور ایک اسٹیل مل کا مالک اور نہ جانے کون کون
سے دولت سے کھیلنے والے لوگ ہیں۔ انہوں نے ایک چیلنج فنڈ قائم کیا ہے۔ اس فنڈ میں
سب نے ایک ایک لاکھ روپے جمع کئے ہیں' میری اطلاع کے مطابق اس فنڈ میں بارہ لاکھ
روپے جمع ہو چکے ہیں۔ چیلنج یہ ہے کہ ان میں سے جو شخص بھی مجھ سے شادی کرنے میں
یا مجھے اپنی گرل فرینڈ بنانے میں کامیاب ہو جائے گا وہ بارہ لاکھ روپے جیت لے گا۔"
سعید حیرانی سے منہ کھولے یہ باتیں سن رہا تھا۔ فرزانہ نے کہا۔
"میں چاہتی ہوں کہ تم بھی ایک لاکھ روپے جمع کر کے اس چیلنج کمیٹی کے ممبر بن
جاؤ۔ پھر میں تم سے شادی کروں گی تو ہمیں تیرہ لاکھ روپے مل جائیں گے۔ یہ تم حیرانی سے
منہ کھولے کیوں بیٹھے ہو؟"
"میں سوچ رہا ہوں کہ آپ کتنی دور دور کی خبریں موصول کر لیتی ہیں' کیا آپ کو یہ
نہیں معلوم ہے کہ میں بھی وہاں ممبر بننے گیا تھا۔"
وہ خوش ہو کر بولی۔ "اچھا تو تم ممبر بن گئے ہو؟"
"میں کچھ کہوں گا تو پھر آپ مجھ سے شادی نہیں کریں گی۔"
"سچ کہو گے تو ضرور کروں گی۔"
"سچ یہ ہے کہ علی بھائی ولی بھائی کی سرپرستی میں یہ چیلنج کمیٹی قائم ہوئی ہے۔ میں
وہاں ممبر بننے گیا تو وہ لوگ میرا مذاق اڑانے لگے' کہنے لگے' یہ منہ اور مسور کی دال'
فرزانہ کبھی اس احمق کو گھاس نہیں ڈالے گی۔"

"تم کس امید پر ایک لاکھ روپیہ داؤ پر لگانے گئے تھے جبکہ تمہاری حماقتیں سب پر ظاہر ہیں؟"

"میں اپنی ممی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں احمق نہیں ہوں' میں جان بوجھ کر احمق بنتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" فرزانہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"مطلب یہ ہے کہ میں نے کتابوں میں پڑھا ہے اور لوگوں سے سنا ہے کہ عورتیں بے وقوف مردوں کو پسند کرتی ہیں' اب مجھے ان باتوں کا یقین ہو گیا ہے کیونکہ آپ مجھے پسند کر رہی ہیں۔"

فرزانہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر سوئچ آن کیا۔ پھر تیز روشنی میں سعید کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ "کیا تم جان بوجھ کر احمق بنتے ہو؟"

اس نے فخر سے سینہ تان کر کہا۔ "ہاں جب وہ ہیرے کی انگوٹھی مجھے میز کے نیچے سے ملی تو عقلمندی یہ ہوتی کہ میں اس قیمتی انگوٹھی کو اپنے پاس رکھ لیتا لیکن میں نے آپ سے لفٹ لینے کی خاطر اسے آپ کے حوالے کر دیا تاکہ آپ پہلی ملاقات میں مجھے احمق سمجھ لیں۔"

وہ چڑ کر بولی۔ "واہ بڑی عقلمندی کی۔ یہ نہ سوچا کہ انگوٹھی کی اصل مالکہ سے سامنا ہو گیا تو میں چور کہلاؤں گی۔ جانتے ہو' آج وہ عورت ملی تھی جس کی یہ انگوٹھی ہے۔"

"سچ؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔ "کک .... کیا اس نے چوری کا الزام لگایا؟ آپ پر؟"

"میں نادان نہیں ہوں کہ اسے الزام لگانے کا موقع دیتی۔ مگر تم یہ تسلیم کر لو کہ واقعی احمق ہو۔ عشق مجھ سے کرتے ہو اور داستان میرے باپ کو سناتے ہو؟"

وہ جھینپ کر رہ گیا' خود کو احمق کہنا نہیں چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر سوچ کر بولا۔ "چلو ٹھیک ہے' میں احمق ہوں' اب تو آپ ضرور پسند کریں گی یعنی مجھ سے شادی کریں گی۔"

"میری وہی شرط ہے کہ اس چیلنج کمیٹی کے ممبر بن جاؤ۔ میں وہ تیرہ لاکھ روپے جیتنا چاہتی ہوں۔"

وہ بے بسی سے ذرا سوچنے کے بعد بولا۔ "بڑی مشکل ہے۔ اس چیلنج کمیٹی میں دو شخص ایسے ہیں جو کبھی میرے والد کے دوست تھے' ان دونوں نے ناراض ہو کر کہا۔ شرم

نہیں آتی' بزرگوں کے مقابلہ میں ایک لڑکی کو جیتنے آئے ہو۔ چلے جاؤ' آئندہ اِدھر نہ آنا۔ اب آپ ہی بتائیں' میں دوبارہ وہاں کیسے جا سکتا ہوں؟"

وہ گہری سنجیدگی سے سوچنے لگی' اگر سعید ایک لاکھ روپے دے کر اس چیلنج کمیٹی کا ممبر بن جاتا تو شادی کے بعد وہ تیرہ لاکھ کی رقم حاصل کر لیتی مگر اس چیلنج کمیٹی میں سعید کا داخلہ ممنوع تھا۔ وہ غصہ سے بولی۔

"تم کسی کام کے آدمی نہیں ہو۔ کیا تم وہ چیلنج فنڈ جیتنے کی کوئی تدبیر نہیں سوچ سکتے؟"

"میرا دماغ کام نہیں کرتا۔ پھر یہ کہ ایسی ہیرا پھیری کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میرے پاس ستر لاکھ روپے نقد ہیں اور صدر والی اس دکان کی صرف پگڑی ہی بیس لاکھ روپے ہے کیا اتنی دولت کافی نہیں ہے؟"

"دولت جتنی بھی ہو' وہ کافی نہیں ہوتی۔ پھر بھی یہ سن کر فرزانہ کا دل اندر سے دھڑک رہا تھا کہ نقدی اور جائیداد ملا کر سعید نوے لاکھ روپے کا مالک ہے اور وہ بڑھاپے تک عیش کر سکتی ہے۔ وہ لاپرواہی سے بولی۔

"میں شادی کے متعلق سوچ کر جواب دوں گی۔ ابھی میرے سامنے ایک اور مسئلہ ہے۔ یہ تم جو چالیس ہزار کے زیورات لائے ہو میں ابھی انہیں گھر نہیں لے جا سکتی۔ ڈیڈی اور بھائی جان مجھ سے لے لیں گے۔ کل صبح انہیں بینک کے لاکر میں رکھ سکتی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں' صبح تک میں انہیں اپنے پاس رکھوں گا۔"

وہ ہاتھ آیا ہوا مال واپس نہیں دینا چاہتی تھی۔ چالیس ہزار کا سونا اپنے ہی پاس رہے تو خوشیاں دیتا ہے' کہیں بھی امانت کے طور پر رکھا جائے تو نیند اڑ جاتی ہے۔ وہ ذرا سوچ کر بولی۔

"میں زیورات اپنے ہی پاس رکھوں گی لیکن گھر نہیں جاؤں گی۔ اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو صبح تک یہاں جاگ کر پہرہ دو۔ مجھے چور ڈاکوؤں سے ڈر لگتا ہے۔"

"یعنی کہ آج رات آپ اس ہٹ میں رہیں گی' یعنی کہ میں بھی یہاں رات گزاروں گا۔"

فرزانہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں۔"

"مگر یہ تو شادی سے پہلے نہیں ہو سکتا۔ یہ .... یہ تو نہیں ہو سکتا۔ یہ تو گناہ ہے۔"

فرزانہ حیرانی کی شدت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگی' وہ چھ فٹ کا قد آور نوجوان تھا مگر دماغ بچوں جیسا تھا۔ آج کے دور میں ایسے انسان شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں جو حسین عورت کی قربت کو گناہ سمجھتے ہوں۔

وہ جھلا کر بولی۔ "میں تمہارا منہ توڑ دوں گی بے وقوف کہیں کے' میں نے گناہ کی بات کب کی ہے؟ ایک ہٹ میں شرافت سے رات گزارنا کوئی بری بات تو نہیں ہے؟"

"نہیں ہے مگر ممی کہتی ہیں .... کوئی بات نہیں' انہیں کہنے دو۔ مجھے تو آپ کے کہنے پر چلنا ہے۔"

"شاباش! اب تم یہاں بیٹھے رہو۔ میں ریسٹورنٹ سے کھانے کا آرڈر دے کر آتی ہوں۔"

"نہیں' یہ کام میرا ہے۔ میں آرڈر دے کر آتا ہوں۔"

"نہیں' میں یہاں تنہا رہوں گی تو کوئی یہ زیورات چھین کر لے جائے گا۔"

وہ ہٹ سے باہر آئی' اتفاقاً چوکیدار وہاں سے گزر رہا تھا' اس نے چوکیدار سے کہہ دیا کہ وہ ریسٹورنٹ سے کھانا لے آئے۔ اس کے بعد وہ ہٹ میں واپس آئی۔ سعید آرام سے بستر پر لیٹ گیا تھا۔ فرزانہ نے دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کیا حرکت ہے' کیا تم بستر پر لیٹ کر پہرہ دو گے؟"

وہ جلدی سے بستر سے اٹھ کر الگ جا کر کھڑا ہو گیا۔ فرزانہ بستر پر بیٹھ کر گہری سنجیدگی سے موجودہ حالات کا تجزیہ کرنے لگی۔ سعید اس کے دل میں سمایا جا رہا تھا' وہ آنکھیں بند کر کے سوچتی تو سعید کا بے جان مجسمہ نظر آتا جس کے دونوں ہاتھ نہیں ہوتے تھے اور وہ بڑی فرمانبرداری سے ایک طرف کھڑا رہتا تھا۔

وہ سنجیدگی سے حالات کا تجزیہ کرنا چاہتی تھی مگر سعید بار بار اس کی سوچ میں چلا آتا تھا۔ آخر اس نے سعید کو جبراً دماغ سے نکالا اور اپنے باپ جبار احمد کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ سوچ یہ تھی کہ اس کے ڈیڈی اور بھائی جان سعید سے اس کی شادی نہیں ہونے دیں گے' اس کے ایسے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیں گے جن سے صرف اسے فائدہ پہنچتا ہو اور باپ اور بھائی خالی رہ جاتے ہوں۔

ریسٹورنٹ سے کھانا آ گیا' وہ کھانے کے دوران سعید کو کریدتی رہی اور اس کے خاندانی حالات معلوم کرتی رہی۔ سعید نے کہا۔ "میرے ڈیڈی مجھے احمق سمجھتے تھے' وہ ایک وصیت لکھ کر گئے ہیں کہ ان کی موت کے بعد مجھے اپنے خاندانی وکیل سے ہر ماہ بیس ہزار روپے ملا کریں گے' میری شادی کے بعد میری تمام نقدی اور جائیداد میری بیوی اور ہونے والے بچوں کے نام منتقل کر دی جائیں گی۔ کوئی بھی عقلمند آدمی ایسی وصیت نہیں کر سکتا۔ دراصل میرے ڈیڈی احمق تھے اور خواہ مخواہ مجھے احمق سمجھتے تھے۔"

فرزانہ نے اسی وقت دل میں سوچ لیا کہ سعید کے وکیل سے چپ چاپ ملاقات کر کے اس سے وصیت کے متعلق معلومات حاصل کرے گی۔

سعید نے ہنستے ہوئے کہا۔ "وصیت کے باوجود میں بیس ہزار روپے سے زیادہ رقم حاصل کر لیتا ہوں' آخر میرے پاس بھی دماغ ہے۔ میں وکیل صاحب کو ہر پانچ ہزار پر پانچ سو روپے کی رشوت دیتا ہوں اور ہر ماہ چالیس پچاس ہزار اپنے اخراجات کے لئے حاصل کر لیتا ہوں۔"

فرزانہ نے کہا۔ "یہ تو تم حماقت کا ثبوت دے رہے ہو' ایک تو اپنی ہی دولت سے کچھ رقم حاصل کرنے کے لئے ہزاروں روپے کی رشوت دیتے ہو اور میں نے سنا ہے کہ تم شبانہ کلب کے قمار خانہ میں اکثر ہارتے رہتے ہو یہ کون سی عقلمندی ہے؟"

وہ کوئی جواب نہ دے سکا' انہوں نے کھانے کے بعد چائے پی' پھر فرزانہ بستر پر لیٹ گئی۔ سعید سگریٹ کے کش لگانے لگا۔ رات کے ایک بجے فرزانہ نے کروٹ بدلتے ہوئے زیورات کی جانب دیکھا اور پریشان ہو کر بولی۔

"رات نہیں گزر رہی ہے۔ پتہ نہیں کب صبح ہو گی!"

سعید نے بھی زیورات کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ممی کہتی ہیں کہ جتنی دولت ہوتی ہے اتنا ہی سکون برباد ہوتا ہے۔ راتوں کو جاگنے کی بیماری لگ جاتی ہے۔"

"تم بار بار اپنی ممی کا حوالہ کیوں دیتے ہو؟ کیا تم اپنی ماں سے بہت زیادہ متاثر ہو؟"

"ہاں میں آپ کو کبھی ان سے ملاؤں گا۔"

"میں تمہاری ماں سے ملنا ضروری نہیں سمجھتی۔ تم بالکل بور ہو۔ دلچسپ باتیں کرنا نہیں جانتے ہو' بچوں کی طرح اپنی ماں کا تذکرہ شروع کر دیتے ہو۔"

"اب نہیں کروں گا' مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دلچسپ باتیں کیسے کی جاتی ہیں' یعنی آپ کیا سننا پسند کرتی ہیں؟"

"کیا میں حسین اور جوان نہیں ہوں؟ کیا تم شعر و شاعری' گیت اور سنگیت' گل و بلبل جیسی رومانی گفتگو نہیں کر سکتے؟ تم سے اچھے تو چور بدمعاش ہیں کہ میں سہم کر رہ گئی' مگر ان کے متعلق سوچ رہی ہوں' کہیں یہ زیورات........."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ہٹ کی دیوار لرز گئی جیسے کوئی چور دھکا مار کر دیوار کو توڑ کر کمرے میں آنا چاہتا ہو۔ فرزانہ چیخ مار کر بستر سے اٹھی۔ پھر دوڑتی ہوئی آ کر سعید سے لپٹ گئی۔ دیوار کے ساتھ رکھا ہوا گلدان فرش پر گر پڑا تھا۔ کھانے کے جھوٹے برتن آپس میں ٹکرا رہے تھے اور وہ زندگی میں پہلی بار ایک گوشت پوست کے مجسمے سے ٹکرا گئی تھی۔

وہی منظر تھا جیسا کہ وہ بت کے گلے میں بانہیں ڈال دیتی تھی اور اپنی دھڑکنوں کو پتھر کے سینے پر بچھا دیتی تھی مگر آج وہ پتھر جیسا سینہ جواباً دھڑک رہا تھا۔ اپنی حرارت سے اسے آشنا کر رہا تھا اور اسے بے جان اور جاندار بت کا فرق سمجھا رہا تھا۔

باہر سے چوکیدار کی آواز سنائی دی۔ "بی بی جی! ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ ایک گیدڑ اِدھر آ گیا تھا' ہم نے بھگا دیا ہے۔"

فرزانہ نے سن لیا کہ ڈرنے کی بات نہیں ہے مگر اب اُن بازوؤں کی گرفت میں مرنے کی بات تھی۔ وہ فوراً ہی اس سے دور بھاگ جانا چاہتی تھی مگر ہاتھ پاؤں لرز رہے تھے۔ اپنی مرضی سے ہلنے کی سکت نہ تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ خود ایک بے جان بت کی طرح بے بس ہو گئی تھی۔

☆======☆======☆

جبار احمد بیوپاری تمام رات سو نہ سکا۔ اس کے ساتھ جوان بیٹا بھی جاگتا رہا۔ فرزانہ نے کہیں سے ٹیلیفون کے ذریعہ اطلاع دی کہ وہ بخیریت ہے اور گیارہ بجے تک گھر پہنچ جائے گی۔ فون پر اس کی آواز بتا رہی تھی کہ واقعی اس نے خیریت سے کہیں رات گزاری ہے۔

جبار احمد نے ریسیور رکھ کر اپنے بیٹے سے کہا۔ "ظہیر! جب لڑکی گھر سے باہر رات گزارے اور بڑی بے باکی سے اپنی واپسی کی اطلاع دے تو سمجھ لو کہ وہ میکے سے اڑنے

والی ہے۔ فرزانہ پر تول رہی ہے اس کے اڑنے سے پہلے ہی سیٹھ ہاشم سے اس کی شادی کر دینی چاہئے۔"

"ڈیڈی! ہم اس کی شادی زبردستی کیسے کر سکتے ہیں؟"

"ہاں' نہیں کر سکتے مگر اس شخص کو راستے سے ہٹانے کے لئے ایسا کر سکتے ہیں' جس کی خاطر اس کے پر نکل آئے ہیں۔ ہم فرزانہ سے محبت اور نرمی سے پیش آئیں گے اور اس سے معلوم کریں گے کہ وہ کس بدنصیب کو چاہتی ہے۔"

ان کی گفتگو کے دوران سیٹھ ہاشم وہاں پہنچ گیا۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔ "فرزانہ کہاں ہے؟"

جبار احمد نے کہا۔ "وہ اپنی ایک سہیلی سے ملنے گئی ہے۔ ابھی آ جائے گی۔"

ہاشم نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ "کیا وہ اپنی سہیلی کے ساتھ راتیں گزارتی ہے؟"

جبار احمد اور ظہیر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ہاشم نے کہا۔

"ساحل سمندر پر جو ہٹیں بنی ہوئی ہیں وہاں کے ایک چوکیدار نے پچھلی رات مجھے فون کیا تھا۔ اتفاق سے میں گھر میں نہیں تھا۔ صبح گھر پہنچا تو پھر اس کا فون موصول ہوا۔ اس نے بتایا کہ آپ کی بیٹی وہاں ایک نوجوان کے ساتھ رات گزار کر آج صبح سات بجے شہر کی طرف واپس آئی ہے۔"

ظہیر نے پوچھا۔ "اس نوجوان کا کوئی نام پتہ معلوم ہوا؟"

"نہیں' وہ چوکیدار جاہل ہے۔ اگر کار کا نمبر پڑھ لیتا تو میں اس نوجوان کو ڈھونڈ نکالتا۔ اس کی کار کا رنگ نیلا ہے اور شہر میں ہزاروں نیلے رنگ کی گاڑیاں ہیں۔ بہرحال میں جاسوسی کرنے نہیں' شادی کی تاریخ مقرر کرنے آیا ہوں۔"

جبار احمد نے کہا۔ "میرا بس چلے تو میں آج ہی شادی کر کے فرزانہ کو تمہارے ساتھ رخصت کر دوں مگر لڑکی جوان ہے' سمجھدار ہے اسے بہلا پھسلا کر یہ کام کرنا ہو گا۔"

"جبار صاحب! آپ صاف کیوں نہیں کہتے کہ مجھے بہلا رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے چیلنج کمیٹی کا کوئی دوسرا ممبر بھی آپ کو لاکھوں روپے کا لالچ دے رہا ہے۔"

"تم غلط کہہ رہے ہو میں چیلنج کمیٹی کے کسی دوسرے ممبر کو نہیں جانتا۔ میرا سودا صرف تم سے ہوا ہے۔ تم ہی نے مجھے بتایا تھا کہ فرزانہ سے تمہاری شادی ہو گی تو تمہیں چیلنج فنڈ سے تیرہ لاکھ روپے ملیں گے اور شادی سے پہلے تم مجھے چھ لاکھ روپے دو گے۔"

"ہاں، میں کسی وقت بھی چھ لاکھ روپے نقد دے سکتا ہوں۔ آپ نے مشورہ دیا تھا کہ میں کینسر کا مریض بن جاؤں۔ میں نے فرزانہ کو یقین دلانے کے لئے اپنے فیملی ڈاکٹر سے جعلی کاغذات لکھوا کر آپ کے حوالے کئے اس کے باوجود آپ اپنی بیٹی کو اب تک شادی کے لئے راضی نہیں کر سکے۔ آج مجھے پتہ چل گیا ہے کہ وہ کسی اور کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی رہتی ہے۔"

ظہیر نے غصے سے کہا۔ "اپنی زبان کو لگام دو۔ اگر میری بہن سے تمہیں کوئی شکایت ہے تو جاؤ کوئی دوسرا گھر دیکھو۔"

سیٹھ ہاشم نے کہا۔ "برخوردار! غصہ نہ کرو۔ مجھے تمہاری بہن کے کیریکٹر سے کچھ نہیں لینا ہے۔ وہ جیسی بھی ہو، میں شادی کروں گا کیونکہ ہم سب کاروباری لوگ ہیں۔ کسی کا چال چلن نہیں، صرف منافع دیکھتے ہیں۔ چیلنج فنڈ کے تیرہ لاکھ روپے میں تمہارے ڈیڈی کو چھ لاکھ کا اور مجھے سات لاکھ کا منافع حاصل ہو گا۔"

جبار احمد نے اپنے بیٹے کو سمجھایا۔ "ظہیر! ذرا نرمی سے باتیں کرو۔ سیٹھ ہاشم درست کہہ رہا ہے۔ یہ دولت مندوں کا مشغلہ ہے کہ وہ بازار کے چڑھتے اترتے بھاؤ پر بازیاں لگاتے ہیں۔ فرزانہ ایسی ہی لڑکی ہے جیسی کہ سب ہوتی ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ دولت سے کھیلنے والوں نے اس کا بھاؤ چڑھا دیا ہے۔"

سیٹھ ہاشم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پہلے ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آتا کہ مارکیٹ میں کون سی چیز زیادہ مقبول ہے۔ بھاؤ رفتہ رفتہ چڑھتا ہے۔ رفتہ رفتہ ہماری سوسائٹی میں یہ خبر عام ہوئی کہ فرزانہ کتنے ہی دولت مندوں کی آرزو ہے۔ ہم سب نے سر جوڑ کر سوچا کہ عشق غریب اور نکتے لوگوں کا کام ہے جس فرزانہ کے لئے ہمارے کاروبار کا کچھ قیمتی وقت ضائع ہو جاتا ہے، اس فرزانہ کو بھی منافع کی ایک چیز بنا لینا چاہئے۔

جب ہم کاٹن کے بھاؤ پر لاکھوں روپے داؤ پر لگا سکتے ہیں تو ہم میں سے ہر شخص ایک لاکھ روپے آسانی سے فرزانہ کے حصول پر لگا سکتا تھا اور ہم لگا رہے ہیں۔ چیلنج کمیٹی میں یہ بات راز رکھی جاتی ہے کہ کون کون اس کاروبارِ عشق میں شامل ہو رہا ہے۔ میری معلومات کے مطابق اب تک تیرہ افراد نے اس بازی میں شرکت کی ہے۔ اس حساب سے اگر میں جیت جاؤں تو مجھے تیرہ لاکھ روپے ملیں گے۔ جس میں سے آپ کو چھ لاکھ روپے مل جائیں گے۔ کوئی بات نہیں دو ماہ کے کاروبارِ عشق میں مجھے سات لاکھ روپے کا منافع

مل جائے تو مجھے وقت ضائع ہونے کا افسوس نہیں ہو گا۔"

اتنا کہہ کر وہ ذرا چپ ہو گیا۔ وہ منافع خور عاشق بوڑھا تھا، زیادہ بولتے وقت ہانپنے لگا تھا۔ ذرا سانس لینے کے بعد اس نے کہا۔

"اگر فرزانہ کسی نوجوان کو پسند کر چکی ہے تو سمجھ لیجئے کہ ہمارا منافع خطرے میں پڑ رہا ہے۔ آپ اپنی بیٹی کو سمجھائیں۔ وہ نہ مانے تو پھر میرے ذہن میں ایک تدبیر ہے۔"

"کیسی تدبیر؟" دونوں باپ بیٹے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ "اگر فرزانہ کو اس طرح راضی کر لیں تو میں نکاح سے پہلے طلاق نامہ لکھ دوں گا۔ مہر کی رقم ایک لاکھ روپے۔ فرزانہ کو ادا کر دوں گا۔ پھر تو وہ انکار نہیں کرے گی۔ جس دن مجھے چیلنج فنڈ سے جیت کی رقم ملے گی۔ اس کے دوسرے دن فرزانہ میری زوجیت سے خارج ہو جائے گی۔"

باپ بیٹے نے تائید میں سر ہلایا۔ تدبیر واقعی عمدہ تھی۔ فرزانہ کو بیٹھے بٹھائے دین مہر کے ایک لاکھ روپے مل جائیں تو وہ خوش ہو جائے گی۔ سیٹھ ہاشم اپنے منصوبہ کو اچھی طرح سمجھانے کے بعد وہاں سے چلا گیا۔

گیارہ بجے کے بعد فرزانہ لاکر میں زیورات رکھ کر گھر پہنچی تو باپ اور بھائی کو خلاف توقع مسکراتے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ باپ نے عاجزی سے مسکرا کر کہا۔ "بیٹی! کہیں دیر تک کا پروگرام ہو تو مجھے بتا دیا کرو۔ میں تمہاری فکر میں تمام رات سو نہ سکا۔"

اس کے بھائی ظہیر نے خوشامدانہ انداز میں پوچھا۔ "فرزانہ! تمہارے ہاتھوں میں ساڑھی کا پیکٹ ہے۔ کیا کچھ اور بھی ہے؟"

"نہیں، صرف ساڑھے سات ہزار روپے کی ایک ساڑھی ہے۔"

وہ ان دونوں کے دلوں میں کھلبلی مچا کر اپنے بیڈروم میں چلی گئی۔ دونوں ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔ "ساڑھے سات ہزار کی ایک ساڑھی؟ فرزانہ کے پاس اتنی مہنگی ساڑھی خریدنے کے لئے اتنی رقم نہیں تھی۔ یہ اسی نوجوان نے دلائی ہے۔"

وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے اس کے بیڈروم میں آئے پھر جبار احمد نے کہا۔ "فرزانہ! آج ہم نے فیصلہ کیا کہ جس طرح تم ہماری باتیں مان لیا کرتی ہو، اسی طرح اب ہم بھی تمہاری ہر بات مان لیا کریں گے۔"

فرزانہ نے کہا۔ "ڈیڈی! یہ سب زبانی باتیں ہیں۔ میں جس سے چاہوں گی، اس سے آپ میری شادی نہیں ہونے دیں گے۔"

"میں زبان کا دھنی ہوں۔ جو کہتا ہوں وہ کر کے دکھاتا ہوں۔"

"کیا آپ میری شادی سعید بخاری سے ہونے دیں گے؟"

"سعید بخاری؟" جبار احمد نے حیرانی سے بیٹی کو دیکھا۔ پھر ایک قہقہہ لگانے کے بعد کہا۔ "اچھا تو کل سے تم اس احمق کے ساتھ وقت گزار رہی ہو۔ مگر بیٹی! وہ تو بہت دولت مند ہے۔ کیا اس نے صرف ساڑھے سات ہزار کی ساڑھی دے کر تمہیں ٹرخا دیا ہے؟"

وہ منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ حیا سے سرخ ہو رہا تھا۔ باپ سوتیلا ہی سہی لیکن ڈھکے چھپے انداز میں پوچھ رہا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ ایک رات گزار کر صرف ایک ساڑھی کیوں لائی ہے۔ اس کے جی میں آیا کہ غصہ سے پھٹ پڑے۔ حقارت سے تھوک کر بولی۔ "آپ کو بیٹی سے ایسی باتیں کرتے شرم نہیں آتی۔ اگر ایسی باتیں کرنا ہی ہیں تو پھر مجھے بیٹی نہ کہیں، ورنہ سارے جہان کی بیٹیاں آپ کے منہ پر تھوکیں گی۔"

غصہ کے باوجود دماغ سمجھا رہا تھا کہ ابھی مصلحت سے کام لینا چاہئے۔ باپ اور بھائی اسے سعید سے منسوب کرنے کے لئے تقریباً راضی ہو گئے ہیں۔ اگر وہ غصہ دکھائے گی تو بنا ہوا کام بگڑ جائے گا لہٰذا وہ جواب دینے سے پہلے اپنے غصہ کو برداشت کرنے لگی۔

اگرچہ جبار احمد کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ ساحل سمندر کے ایک ہٹ میں رات گزار آئی ہے۔ تاہم وہ انجان بنا رہا۔ وہ صرف اپنا منافع دیکھتا تھا۔ اس لئے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ سعید نے صرف ساڑھی دلائی ہے یا بھاری نقدی بھی ادا کی ہے۔

اس نے یہ سوال پوچھا، فرزانہ نے کہا۔ "آپ ایسی شرمناک باتیں نہ کریں۔ ہمارے درمیان صرف شادی کا مسئلہ حل ہونا چاہئے۔ آپ سیٹھ ہاشم کو بتا دیں کہ میں ان کے منہ پر تھوکنا بھی نہیں چاہتی۔"

"بیٹی! ایسا نہ کہو، جب میں راضی ہو گیا ہوں کہ تمہاری شادی سعید سے ہو گی تو تمہیں بھی راضی خوشی ہاشم سے شادی کرنی چاہئے۔"

"کیا مطلب ہے؟" وہ حیرانی سے بولی۔ "کیا میں دونوں سے شادی کروں گی؟"

"ہاں، ابھی ہاشم آیا تھا۔ اس سے معاملہ طے ہو گیا ہے۔ وہ نکاح سے پہلے تمہارے نام طلاق نامہ لکھ دے گا اور تمہیں ایک لاکھ روپے دے گا۔ شادی کے دو چار روز بعد تم اسے چھوڑ کر یہاں آ جاؤ گی۔ پھر سعید سے شادی کی تاریخ مقرر کر دی جائے گی۔"

"ڈیڈی! آخر یہ چکر کیا ہے؟"

"یہ چکر نہیں، کاروبار ہے۔ تمہیں ایک لاکھ کا اور ہمیں دو چار لاکھ کا منافع حاصل ہوگا۔"

فرزانہ فوراً ہی سمجھ گئی کہ یہ سب چیلنج کمیٹی کا کھیل ہے۔ ہاشم اس کمیٹی کا ایک ممبر یا جواری ہے۔ اس سے شادی کر کے چیلنج فنڈ جیت لینا چاہتا ہے پھر اس جیت میں سے کچھ حصہ اسے اور اس کے باپ کو دے گا۔ فرزانہ نے یہی پلاننگ سعید کو بتائی تھی لیکن سعید کو اس کمیٹی میں داخلہ نہیں مل سکتا تھا۔

جبار احمد نے کہا۔ "تمہارا کوئی نقصان نہیں ہے۔ ہاشم تمہیں نکاح کے بندھن میں مجبور و محکوم بنا کر نہیں رکھ سکے گا کیونکہ اس کا لکھا ہوا طلاق نامہ تمہارے پاس موجود رہے گا۔ اس کے بعد تم اپنی مرضی سے.........."

وہ سمجھا رہا تھا۔ فرزانہ سمجھ رہی تھی۔ کوئی نقصان اٹھائے بغیر ہاشم سے ایک لاکھ روپے مل سکتے تھے۔ سعید احمق تھا۔ اگر اسے یہ معلوم بھی ہو جاتا کہ فرزانہ نے ہاشم سے شادی کی ہے تو بعد میں وہ اپنی مطلقہ محبوبہ سے شادی کرنے پر راضی ہو جاتا۔ اسے تو چٹکی بجا کر سمجھایا منایا جا سکتا تھا۔ ایسا سوچتے وقت وہ زیرِ لب مسکرانے لگی۔ پچھلی رات کی بات جس کے پیچھے رنگین و سنگین واردات چھپی ہوئی تھی اسے یاد آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ سعید کے خیالی بازوؤں کی گرفت میں وہ ہچکچا رہی تھی کہ کہیں اس کے باپ اور بھائی یہ تماشہ تو نہیں دیکھ رہے ہیں۔

انہیں مطمئن کرنے کے لئے فرزانہ نے ان کی بات مان لی۔ وہ باپ بیٹے ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ اب ان کے سامنے سعید کی صدر والی دکان کا مسئلہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ سعید سے شادی کرنے کے بعد فرزانہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ وہ دکان اور اس کا نفع و نقصان سب فرزانہ کا ہو گا۔ دانشمندی یہی تھی کہ فوراً ہی سعید جیسے احمق کو کسی طرح مزید احمق بنا کر اس سے وہ دکان حاصل کر لی جائے۔ وہ بھی اس طرح کہ فرزانہ کو اس کا علم نہ ہو سکے۔ شادی کے بعد اسے پتہ چلے گا کہ وہ لاکھوں روپے کی دکان ہار چکی ہے۔

وہ تمام دن اور تمام رات منصوبے بناتے رہے اور انہیں رد کرتے رہے۔ آخر یہ بات سمجھ میں آئی کہ سعید بخاری جواری ہے مگر اناڑی ہے۔ شبانہ کلب میں ہر دوسری تیسری رات ہزاروں روپے ہارتا رہتا ہے۔ پھر کیوں نہ تاش کی بازی میں وہ دکان جیت لی

جائے۔ کلب کے قمار خانہ میں سجاد نامی ایک شارپر تھا۔ اتنی مہارت سے پتے لگاتا تھا کہ ہارنے والے کو بے ایمانی کا شبہ نہیں ہوتا تھا۔ سعید اکثر اس کے ہاتھوں ہارتا رہتا تھا اس کے باوجود بار بار کھیلتا تھا کیونکہ سجاد شارپر کبھی کبھی اسے جیتنے کا بھی موقعہ دیتا تھا۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو قمار خانہ میں آنے والے جواری دوسرے ہی دن بھاگ جائیں۔

بہرحال اس سجاد شارپر سے جبار احمد کی اچھی خاصی واقفیت تھی۔ اسے دس ہزار کا لالچ دے کر سعید کے خلاف پتے لگائے جاسکتے تھے۔ اپنے اس منصوبہ پر عمل کرنے کے لئے اس نے سجاد سے ملاقات کی۔ پہلے تو وہ اپنی اصلیت سے انکار کرتا رہا کہ وہ پتے لگانا جانتا ہے لیکن جبار احمد نے دس ہزار کا لالچ دیا تو وہ کھل گیا۔ اس نے کہا۔

"مجھے منظور ہے لیکن میں خودمختار نہیں ہوں۔ کلب کی مالکہ شبانہ بیگم کا ملازم ہوں۔ ان کے حکم پر پتے لگاتا ہوں۔ آپ شبانہ بیگم سے براہ راست معاملات طے کر لیں۔"

"اگر تمہاری مالکہ نے انکار کیا تو؟"

"آپ بازی جیتنے کا معقول کمیشن دیں گے تو وہ انکار نہیں کریں گی۔"

سجاد نے اسے شبانہ بیگم کا فون نمبر بتایا۔ پھر ہدایت کی۔ "آپ بیگم صاحبہ کے پاس اپنا شناختی کارڈ اور انکم ٹیکس کی ادائیگی کے کاغذات لے جائیں تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ آپ ایک معزز شہری ہیں اور پولیس والوں سے کوئی آپ کا تعلق نہیں ہے۔"

جبار احمد نے اسی وقت ریسیور اٹھا کر شبانہ بیگم سے رابطہ قائم کیا۔ دوسری طرف سے ایک عورت نے سخت لہجے میں کہا۔

"ہیلو! شبانہ اسپیکنگ دس اینڈ۔"

بیگم صاحبہ! میں ایک اہم معاملہ میں آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"

"معاملہ کیا ہے؟ کھڑے ہو جاؤ۔"

"لیکن آپ مجھے کھڑا ہونے کے لئے کیوں کہہ رہی ہیں؟"

"کیا تم میرا مذاق اڑا رہے ہو کھڑے ہو جاؤ۔ کیا تم نہیں جانتے یہ میرا تکیہ کلام ہے؟ کھڑے ہو جاؤ۔"

"میں نہیں جانتا تھا۔ معافی چاہتا ہوں۔ بیگم صاحبہ! میں سعید بخاری نامی ایک نوجوان سے تاش کی ایک بازی کھیلنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلہ میں آپ کا تعاون چاہیے۔"

"اس میں تعاون کی کیا بات ہے۔ میرے کلب کے قمار خانے میں جا کر کھڑے ہو جاؤ۔"

"جی وہاں تو میں اکثر جاتا ہوں مگر مجھے خاص قسم کا تعاون درکار ہے۔ میں اس سلسلہ میں آپ کے خاص آدمی سجاد صاحب سے مل چکا ہوں۔ سجاد صاحب مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔ سجاد کو ریسیور دے کر کھڑے ہو جاؤ۔"

وہ سجاد کو ریسیور دے کر اسی طرح کھڑا رہا۔ سجاد باتیں کر رہا تھا' اور اپنی مالکہ کو یقین دلا رہا تھا کہ جبار احمد ایک معزز شہری ہے انٹیلیجنس والوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر اس نے ریسیور رکھ کر کہا۔

"جبار صاحب! آپ کورٹ کا اسٹامپ پیپر لے کر گلشن آباد کی کوٹھی نمبر ایل دو سو دو میں پہنچ جائیں وہاں آپ کا کام بن جائے گا۔ بیگم صاحبہ نے شام چھ بجے کا وقت دیا ہے۔"

جبار احمد ادھر سے مطمئن ہو کر سعید بخاری کی کوٹھی میں پہنچا۔ شبانہ بیگم سے معاملہ طے کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ سعید بخاری کس حد تک احمق ہے۔ وہ تاش کے پتوں پر دکان کو داؤ پر لگانا پسند کرے گا یا نہیں؟ یہ بہت بڑی بازی ہوتی' اگر کھیلی جاتی۔ سمجھدار آدمی یا تو تاش کے پتوں کو ہاتھ نہیں لگاتا یا پھر لگاتا ہے تو جبار احمد کی طرح بے ایمانی کے ہر پہلو سے جیتنے کا یقین کر لیتا ہے۔

دن کا ایک بجا تھا۔ سعید ڈائننگ ٹیبل کے پاس بیٹھا تاش کے پتوں سے کھیل رہا تھا اور بار بار بیگم کا پتہ اٹھا کر اس کی سطح پر فرزانہ کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ مسکرا رہا تھا۔ پھر اسے چوم رہا تھا۔ گھر میں کوئی بزرگ اسے سمجھانے والا نہیں تھا ورنہ اس سے یہ ضرور کہتا۔ "برخوردار! تاش کے پتوں نے صرف بے ایمانوں کا ساتھ دیا ہے۔ باز آ جاؤ۔ جو شخص ذرا بھی سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اسے کوئی احمق نہیں کہتا۔ تمہاری حماقت یہی ہے کہ تم پیش آنے والے حالات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔"

وہ جبار احمد کو دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ "باورچی نے کہا کہ کھانے میں ذرا دیر ہے۔ اس لئے میں پتوں سے جی بہلا رہا تھا۔ آیئے ہو جائے ایک آدھ بازی.........."

جبار احمد کو اپنے مطلب کی بات چھیڑنے کا بہترین موقعہ ملا۔ اس نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تمہارے والد نے تمہارے لئے لاکھوں روپے کی جائیداد چھوڑی ہے ود چار سو کی بازی کیا لگاتے ہو کبھی ایسی بازی بھی جیت لو' جسے ساری عمر یاد رکھ سکو۔"

سعید نے پتوں کو پھینٹتے ہوئے کہا۔ "ایسی بازی میں جیت چکا ہوں۔ شاید فرزانہ نے آپ کو بتا دیا ہو گا۔ وہ مجھ سے شادی کے لئے راضی ہے۔ صرف آپ کی رضامندی باقی ہے۔"

"اچھا تو اس نے بتا دیا ہے کہ وہ میری بیٹی ہے؟"

"جی ہاں! سب کچھ بتا دیا ہے۔ آپ مجھے اُلو بنا رہے تھے وہ مجھے بہت چاہتی ہے۔ اس نے آپ کے بارے میں مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ یہ بھی بتا دیا ہے کہ آپ میری لا صدر والی دکان چالاکی سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

جبار احمد کا منہ لٹک گیا۔ وہ دل ہی دل میں فرزانہ کو گالیاں دے رہا تھا۔ مگر وہ بیوپاری احمق نہیں تھا۔ حالات سے نمٹنا جانتا تھا۔ فوراً ہی اسے عقل آئی کہ وہ گھر جا کر فرزانہ کو غصہ دکھائے گا تو پھر بیٹی باغی ہو جائے گی۔ ہاشم سے جس طرح شادی کا منصوبہ بنایا گیا ہے' اس سے وہ انکار کر کے سیدھی سعید کے پاس چلی آئے گی۔ غصہ دکھانے سے کبھی کام نہیں بنے گا۔ وہ فوراً ہی مسکرا کر بولا۔

"تم احمق نہیں ہو۔ کوئی بھی عورت تمہاری معصومیت کو حماقت سمجھ کر تمہیں اپنی باتوں سے بہلا دیتی ہے۔ فرزانہ بھی اسی طرح تمہیں اُلو بنا رہی ہے۔"

"آپ پہلے شخص ہیں کہ مجھے احمق نہیں سمجھتے ہیں۔ ہاں یہ میں بھی محسوس کرتا ہوں کہ میری شرافت کی وجہ سے دوسرے مجھے احمق بنا دیتے ہیں لیکن میں یہ نہیں مانوں گا کہ فرزانہ بھی ایسا کر رہی ہے۔"

"نہ مانو' کسی پر اندھا اعتماد کرنے کا نام ہی حماقت ہے۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "ہاں' اندھا اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔ مگر میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ کیا آپ ثابت کر سکتے ہیں کہ فرزانہ مجھے بے وقوف بنا رہی ہے؟"

"تم ابھی فرزانہ کو فون کرو' اور اس سے کہو کہ وہ آج ہی تم سے شادی کر لے۔ اگر وہ مجبوری ظاہر کرے تو کہنا کہ ایک ہفتہ کے اندر شادی کر لے۔ اگر وہ کہے کہ باپ اور بھائی راستے کی دیوار بن گئے ہیں تو تم مشورہ دینا کہ وہ بھاگ کر چلی آئے۔ کورٹ میرج ہو جائے گی۔ تم ہر طرح اسے ایک ہفتہ کے اندر شادی کے لئے آمادہ کرو۔ میرا دعویٰ ہے کہ نہیں ٹال دے گی۔"

"اس نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا ہے' پھر وہ کیوں ٹال دے گی؟"

جبار احمد نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ "وہ میری بیٹی ہے جب وہ بالشت بھر کی تھی تب سے میں نے اسے پال پوس کر جوان کیا ہے۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ اسے دنیا میں صرف دولت سے محبت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے جیسے سیدھے سادے جوان سے اس کی شادی کر دوں لیکن وہ کچھ دنوں کے لئے سیٹھ ہاشم کی شریکِ حیات بننا چاہتی ہے۔ اس کے بعد کوئی اور دولت مند نہ ملا تو تم سے شادی کر لے گی ورنہ نہیں ٹالتی رہے گی۔"

وہ حیرانی سے بولا۔ "آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں لیجئے پتے کاٹئے۔"

جبار احمد نے گڈی سے کچھ پتے کاٹ کر الگ رکھتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ تم دولت مند ہو مگر دولت مندوں کے مشاغل کو نہیں سمجھتے ہو۔ یہاں چند سرمایہ داروں نے لاکھوں روپے کا چیلنج فنڈ قائم کیا ہے۔"

سعید بخاری نے اپنا سینہ ٹھونک کر اپنی معلومات کی دھاک جمائی۔ "میں جانتا ہوں۔ چونکہ میں بھی فرزانہ کو حاصل کرنا چاہتا ہوں اس لئے اس کمیٹی کا ممبر بننے گیا تھا مگر وہاں میرے چند بزرگ فرزانہ کے طلب گار بنے بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا۔ اگر میں اس کمیٹی کا ممبر بن جاتا تو تیرہ لاکھ روپے جیت کر فرزانہ کے ہاتھوں میں رکھ دیتا۔"

"ہوں۔" جبار احمد نے سر ہلا کر کہا۔ "تم نے یہ بات فرزانہ کو بتائی ہو گی تب ہی وہ تم سے مایوس ہو گئی ہے۔ سیٹھ ہاشم کو تم پر ترجیح دے رہی ہے کیونکہ وہ چیلنج کمیٹی کا ممبر ہے فرزانہ اس سے شادی کر کے وہ رقم حاصل کرے گی۔"

"آں۔" وہ چونک کر بولا۔ "یہ .... یہ بات فرزانہ مجھ سے کہہ رہی تھی۔ مگر میں تیرہ لاکھ روپے حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اب وہ .... اب وہ سیٹھ ہاشم کے ساتھ .... نن .... نہیں۔ آپ ایسا نہ کہیں۔ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔"

"اسی کو حماقت کہتے ہیں کہ سامنے کی سچائی کو بھی تسلیم نہ کیا جائے۔ سانچ کو آنچ نہیں۔ تم ابھی فرزانہ کو فون کرو۔ اس سے پوچھو کہ تم سے شادی کرنا چاہتی ہے یا نہیں؟ مگر

دیکھو اسے یہ نہ بتانا کہ میں یہاں موجود ہوں۔"

سعید بخاری نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرتے ہوئے پوچھا۔ "جبار صاحب! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ اپنی بیٹی کے خلاف کیوں بول رہے ہیں؟"

"سعید! کوئی غیرت مند باپ یہ نہیں چاہتا کہ اس کی بیٹی دولت کے لالچ میں کسی ایک سے شادی کرے' پھر اس سے طلاق لے کر دوسرے کے گھر چلی جائے۔ سیٹھ ہاشم بوڑھا اور کینسر کا مریض ہے۔ اس کے مقابلہ میں تمہیں اپنا سمجھتا ہوں۔ چونکہ اپنا سمجھتا ہوں اس لئے بیٹی کی اچھائی برائی تمہارے سامنے بیان کر رہا ہوں۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی فون پر رابطہ قائم ہو گیا۔ فرزانہ کی آواز سنائی دی۔ سعید نے کہا۔ "میں سعید بخاری بول رہا ہوں۔ کیا آج ہی ہماری شادی نہیں ہو سکتی؟"

"کیا تم نے بکواس کرنے کے لئے فون کیا ہے۔ شادی کوئی کھیل تو نہیں ہے کہ آج ہی ہو جائے۔"

"اچھا تو کل یا پرسوں یا پھر ایک ہفتہ کے اندر ہو جائے۔"

"نہیں ہو سکتی۔ ڈیڈی اور بھائی جان راضی نہیں ہوں گے۔"

"میری ممی کہتی ہیں۔ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی' ہم دو دنوں کے اندر چپ چاپ کورٹ میرج کر لیں گے۔"

دوسری طرف تھوڑی دیر کے لئے خاموشی رہی۔ کیونکہ وہ ہاشم سے ملنے والی ایک لاکھ کی مہر کی رقم چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے جھلا کر کہا۔

"تم اتنی جلدی شادی کے لئے ضد کیوں کر رہے ہو۔ میں نہیں کروں گی۔"

"فرزانہ! کیا تم ہٹ کی وہ سہانی رات بھول گئیں۔ تم نے میری آغوش میں وعدہ کیا تھا کہ........"

جبار احمد جلدی سے منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔ کیونکہ وہ احمق باتوں کی دھن میں یہ بھول گیا تھا کہ جس سے رومانی باتیں کر رہا ہے اس کا باپ سامنے ہی بیٹھا ہے۔ دوسری طرف فرزانہ بھی ایک رات کی بات میں کھو گئی تھی۔ اگر ہاشم سے ایک لاکھ کی بات نہ ہوتی تو وہ اسی وقت سعید کے پاس دوڑی چلی گئی ہوتی۔ اس نے جذباتی انداز میں کہا۔

"سعید! میں تمہارے سوا کسی کی نہیں بن سکتی۔ اگر تم مجھ پر اعتماد کرو تو میں چالاکی سے سیٹھ ہاشم کے ایک لاکھ روپے حاصل کر لوں گی۔"

"کیسے حاصل کرو گی؟"

"بڑی آسانی سے۔ تمام باتیں طے ہو گئی ہیں۔ سیٹھ ہاشم چیلنج کمیٹی کا ممبر ہے۔ وہ مجھ سے نکاح پڑھانے سے پہلے میرے نام طلاق نامہ لکھ دے گا اور مہر کے ایک لاکھ بھی ادا کر دے گا۔ پھر جس دن اسے چیلنج فنڈ کی رقم ملے گی میں اسی دن اس کے گھر سے آ جاؤں گی۔"

"نہیں نہیں فرزانہ! یہ بڑی بے شرمی کی بات ہے۔ تم بیوی بن کر اس کے ساتھ یعنی کہ اس کے ساتھ یعنی کہ سمجھتی ہو نا' وہ تمہیں ہاتھ لگائے گا۔"

"میں نادان بچی نہیں ہوں۔ طلاق نامہ لکھ دینے کے بعد مجسمہ کی طرح اس کے دونوں ہاتھ ایک طرح سے کٹ جائیں گے یعنی طلاق کے بعد کوئی رشتہ نہیں رہے گا تو پھر وہ کیسے ہاتھ لگائے گا۔ تم اطمینان رکھو' میں صرف تمہاری ہوں۔"

"مجھے تمہاری طرف سے اطمینان ہے' ہاشم کی طرف سے نہیں ہے۔ پھر یہ غیر اخلاقی حرکتیں ہیں۔ تم ایسا نہ کرو۔"

"میں ایسا کروں گی۔ اگر تم دل و جان سے مجھے چاہتے ہو تو تمہیں میری بات ماننی پڑے گی۔"

"دیکھو فرزانہ! فون پر ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ تم آج رات نو بجے شبانہ کلب میں ملو۔ وہاں باتیں ہو جائیں گی۔"

کلب میں ملنے کا وقت مقرر ہو گیا۔ سعید نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا۔ "جبار صاحب! آپ درست فرما رہے تھے۔ فرزانہ گمراہ ہو گئی ہے۔ اگر ہم دونوں مل کر اسے نصیحت کریں تو وہ راہ راست پر آ جائے گی۔"

یہ کہہ کر وہ پتے بانٹنے لگا۔ جبار احمد نے کہا۔ "کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ فرزانہ کو نصیحت سے نہیں' دولت سے سمجھایا جا سکتا ہے میرے ذہن میں ایک تدبیر ہے۔ میں آج رات ہی فرزانہ کی شادی تم سے کر سکتا ہوں۔"

"سچ؟" وہ خوشی سے اچھل پڑا۔

"ہاں' مگر ایک شرط ہے۔ وہ صدر والی دکان میرے نام لکھ کر کاغذات مجھے دے دو۔"

وہ خوشی سے اچھل کر کھڑا ہوا تھا۔ ایسی شرط سن کر مایوسی سے بیٹھ گیا' پھر بولا۔

"آپ سیٹھ ہاشم کے مقابلہ میں مجھے اپنا سمجھتے ہیں' پھر یہ شرط کیوں لگا رہے ہیں؟"

"بھئی ہم کاروباری لوگ ہیں۔ اولاد کی شادیاں بھی اپنا نفع نقصان دیکھ کر کرتے ہیں۔ میری بیٹی لاکھوں میں ایک ہے تمہاری دکان بھی لاکھوں کی ہے۔ دونوں کا تبادلہ ہو سکتا ہے۔"

"نہیں' میں وہ دکان نہیں دے سکتا۔ ممی کہتی ہیں دو چار سال بعد اس دکان کی پگڑی تیس لاکھ ہو جائے گی۔"

"یہ تمہاری ممی کون ہیں؟ اگر وہ یہاں ہیں تو مجھ سے ملاؤ۔ میں ان سے بات کروں گا۔"

"ڈیڈی نے انہیں طلاق دے دی تھی' اس لئے وہ یہاں نہیں رہتیں۔ کسی دن آپ کو ان سے ملاؤں گا۔ آپ شادی کی بات کریں۔"

"کیا بات کروں؟ محبت کرنے والے اپنی جان قربان کر دیتے ہیں۔ تم فرزانہ کی خاطر ایک دکان کی قربانی نہیں دے سکتے۔ اسے گمراہی سے نہیں بچا سکتے۔ وہ سیٹھ ہاشم کے دام میں آ جائے گی۔ کیا تم عشق کی بازی ہارنا چاہتے ہو؟"

سعید نے اپنے پتے دیکھ کر خوشی سے کہا۔ "میں بازی جیت گیا۔ میرے پاس رنگ فلیش ہے۔" اس نے اپنے پتے سیدھے کر دیئے۔ اس کے ہاتھوں میں حکم کی بیگم' غلام اور دہلا تھا۔ جبار احمد نے اپنے پتے دیکھے۔ وہ ہار رہا تھا۔ اس نے جبراً مسکرا کر کہا۔

"تم لکی ہو۔ سنا ہے کل تم نے کلب میں پندرہ ہزار تک کی رقم جیتی ہے۔"

"ہاں' آج کل میرا ستارہ عروج پر ہے۔ اس ہفتہ دوبارہ جیت چکا ہوں۔ میں نے جنتری کی ایک کتاب کا فال کھول کر دیکھا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ اس ہفتہ میرے دل کی مرادیں پوری ہوں گی۔"

"صاحبزادے! جب تقدیر اتنا ساتھ دے رہی ہے تو آؤ تاش کی بازی میں فرزانہ کو جیت کر لے جاؤ۔ اگر ہار جاؤ گے تو دکان میری۔ جیت جاؤ گے تو فرزانہ تمہاری........"

سعید سوچنے لگا۔ ملازم نے آ کر بتایا کہ کھانا تیار ہے۔ وہ دونوں کھانے کی میز پر آ گئے۔ جبار احمد نے کہا۔

"تم اپنے باپ کی موت کے بعد شبانہ کلب میں ہر رات جتنی رقمیں ہارتے آ رہے ہو۔ اس سے اندازہ ہو رہا ہے کہ آئندہ دو ماہ میں تمہارے پاس صرف ایک دکان رہ جائے

گی پھر تم اسے بھی فروخت کر کے اس کی رقم آہستہ آہستہ ہار جاؤ گے۔ کامیاب جواری ستاروں کی چال کے ساتھ چال چلتے ہیں۔ تمہارا ستارہ تمہیں کامیابی کا یقین دلا رہا ہے۔ دل کی مراد پوری ہونے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ تم فرزانہ کو جیت لو گے۔"

سعید کھانے کے دوران بھی سوچتا رہا۔ جبار احمد اسے سنہرے خواب دکھا رہا تھا۔ آخر وہ زیب میں آ گیا' اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں نے حساب لگا لیا ہے' کبھی دکان بیچنے کی نوبت آئے گی تو میں حالات سے مجبور ہو کر اس کی رقم بھی ہارتا جاؤں گا۔ ابھی تقدیر ساتھ دے رہی ہے تو مجھے تاش کے پتوں سے محبت کی بازی جیت لینی چاہئے۔"

"شاباش! تم دانشمندانہ فیصلہ کر رہے ہو۔"

"لیکن فرزانہ آج ہی شادی کے لئے کیسے راضی ہو جائے گی؟"

"سیدھی سی بات ہے۔ وہ سیٹھ ہاشم سے ایک لاکھ روپے حاصل کرنے کے لئے نہیں ٹال رہی ہے۔ میں اسے اپنے اکاؤنٹ سے یہ رقم دے کر تمہارے ساتھ نکاح پڑھا دوں گا۔"

"میں بھی اپنے اکاؤنٹ سے یہ رقم دے کر فرزانہ کو اپنا بنا سکتا ہوں پھر تاش کی بازی کیا ضروری ہے؟"

"ضروری ہے۔ یہ بازی اگر میں جیت لوں گا تو میرا فائدہ ہے۔ تم کھیلنے سے انکار کرو گے اور فرزانہ کو بہکاؤ گے تو میں سیٹھ ہاشم کو بھڑکاؤں گا کہ وہ فرزانہ کو دو لاکھ دے۔ تم تین لاکھ دو گے تو وہ چار لاکھ دے گا۔ اس طرح ضد میں بڑھتی رہنے والی رقم تمہاری دکان کی پگڑی تک پہنچ جائے گی۔ تم ضد میں ہار جاؤ گے۔ بہتر ہے کہ تاش کی بازی جیت لو۔"

سعید پھر تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "اچھی بات ہے۔ آج رات پتے میں بانٹوں گا۔"

"نہیں۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی پتے پھینٹے گا اور بانٹے گا تو ہارنے والے کو شبہ ہوگا۔ ہم قمار خانہ کے سجاد سے ایسی خدمات حاصل کر سکتے ہیں۔ تم وہاں برابر کھیلتے ہو۔ کیا تمہیں سجاد پر بھروسہ نہیں ہے۔"

"ہاں بھروسہ ہے۔ وہ تو بہت ہی بااصول آدمی ہے۔ اچھا تو فیصلہ ہو گیا۔ میں آج رات کلب میں اپنی دکان کے کاغذات لے آؤں گا۔ آپ اپنی بیٹی کو دلہن بنا کر لے

آئیں۔"

"ہیں۔" جبار احمد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے میں اسے دلہن بنا کر لاؤں گا تو بڑی بے عزتی ہو گی کہ میں نے بیٹی کو داؤ پر لگایا ہے۔ اگر تم جیت جاؤ گے تو بارات لے کر میرے گھر آ جانا۔"

"نہیں جناب! یہ قماربازی کے اصول کے خلاف ہے۔ جو چیز داؤ پر لگائی جاتی ہے وہ کھلاڑیوں کے سامنے رکھی جاتی ہے۔"

جبار احمد نے پینترا بدلا۔ "دیکھو سعید! جیتنے کے بعد فرزانہ تمہاری عزت بن جائے گی۔ کیا تم اس کی بے عزتی پسند کرو گے؟"

وہ پھر سوچ میں پڑ گیا۔ آخر اس نے کہا۔ "اچھا تو ایسا کریں فرزانہ کو تو میں نے نو بجے بلایا ہی ہے۔ وہ کلب کی لابی میں میرا انتظار کرتی رہے گی۔ ہم نو بجے تک ہار جیت کا فیصلہ کر لیں۔ کلب کے صرف چند معزز لوگ اس بات کے گواہ رہیں گے کہ بازی کس نوعیت کی ہے۔ اگر آپ جیت لیں گے تو میرے کاغذات لے کر چلے جائیں گے۔ یہ بات قمارخانہ سے باہر نہیں جائے گی کہ آپ نے فرزانہ کو داؤ پر لگایا تھا۔"

جبار احمد نے دل ہی دل میں کہا۔ "کمبخت پہلی بار دانشمندی کی باتیں کر رہا ہے۔"

سعید نے کہا۔ "اگر جیت میری ہو گی تو ہم لابی میں جا کر فرزانہ کو صورت حال سے آگاہ کریں گے۔ آپ بیگم فرزانہ سعید کے نام ایک لاکھ کا چیک لکھ کر دیں گے۔ تاکہ وہ سیٹھ ہاشم پر مٹی ڈالے۔ پھر اچانک اعلان کیا جائے گا کہ اسی کلب میں ہمارا نکاح پڑھایا جا رہا ہے۔"

اب جبار احمد کے سوچنے کی باری تھی۔ جو سعید کہہ رہا تھا' وہ قمارخانہ کے لوگ بھی کہتے کہ داؤ پر لگائی جانے والی چیز کم از کم کلب میں موجود ہو۔ بہرحال کچھ بھی ہو۔ جیت جبار احمد کے مقدر میں تھی کیونکہ وہ تاش کے پتوں پر چال چلنے سے پہلے اپنی جیت کی مکمل ضمانت حاصل کر رہا تھا۔

☆======☆======☆

شبانہ بیگم کا ڈرائنگ روم' قیمتی نمائشی سامان سے آراستہ تھا۔ جبار احمد نے صرف اس ڈرائنگ روم کو دیکھ کر اندازہ کیا کہ وہ عورت ہر رات قمارخانہ سے کتنی دولت سمیٹ کر لاتی ہو گی۔ شبانہ بیگم ٹھیک چھ بجے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ اس کے لباس اور اس کی شخصیت میں ایسا رعب اور دبدبہ تھا کہ اسے دیکھتے ہی جبار احمد نے متاثر ہو کر سلام کیا۔

وہ صوفہ پر بیٹھتی ہوئی بولی۔ "وعلیکم السلام۔ کھڑے ہو جاؤ..........."

وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ غلطی کا احساس ہوتے ہی پھر بیٹھ گیا۔ شبانہ بیگم نے پوچھا۔ "بازی کی نوعیت بتاؤ؟"

جبار احمد بتانے لگا۔ "سعید بخاری اپنی دکان داؤ پر لگا رہا ہے وہ دکان کے کاغذات لے کر کلب میں آئے گا۔ میں ہار جانے کی صورت میں اپنی بیٹی کی شادی اس سے کر دوں گی چونکہ میں ہارنا نہیں چاہتا اس لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔"

"سعید بخاری کی دکان کی مالیت کیا ہے؟"

"دکان صدر میں ہے اور بند پڑی ہے۔ مجھے اس کی پگڑی سے تھوڑی سی رقم مل جائے گی۔"

"میرا واسطہ کاروباری لوگوں سے پڑتا ہے میں جانتی ہوں کہ صدر کی دکانیں کم از کم دس پندرہ لاکھ پگڑی مانگتی ہیں۔ مجھ سے جھوٹ نہ بولو۔ کھڑے ہو جاؤ۔"

"میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ اس دکان سے مجھے دس لاکھ مل جائیں گے۔"

"تمہیں جو کچھ بھی ملے۔ ابھی تم میرے سامنے دو لاکھ روپے رکھ دو اور قمارخانہ میں جا کر دکان جیت لو۔"

"دو لاکھ روپے؟" جبار احمد کا منہ حیرانی سے کھل گیا۔ "یہ رقم تو میرے خواب و خیال سے بھی زیادہ ہے۔"

"رقم زیادہ ہے تو کھڑے ہو جاؤ۔ جو شخص دس لاکھ کے منافع میں سے دو لاکھ نہ دے سکے اس سے میں بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر جانے لگی۔ جبار احمد نے جلدی سے کہا۔ "ذرا سنئے۔ مجھے سوچنے کا موقع دیجئے۔"

"کھڑے ہو جاؤ اور گھر جا کر سوچو۔"

یہ کہہ کر وہ ڈرائنگ روم سے چلی گئی۔ جبار احمد کو اپنی غلطی کا احساس ہوا ایک تو اس نے بیس لاکھ کی دکان کے دس لاکھ بتائے۔ پھر کمیشن کے طور پر دو لاکھ دینے سے انکار کر دیا۔ اب تو وہ سعید سے بازی نہیں جیت سکتا تھا۔ اس نے چیخ کر آواز دی۔

"بیگم صاحبہ! مجھے منظور ہے۔ میں آپ کا مطالبہ پورا کروں گا۔"
جواب میں شبانہ بیگم کا سیکرٹری آیا۔ اس نے کہا۔ "منظور ہے تو رقم نکالو۔"
جبار احمد نے کہا۔ "میرے پاس دو لاکھ نقد نہیں ہیں۔"
"تو پھر اپنی کوٹھی دو لاکھ میں گروی رکھ دو۔ پکے کاغذ پر لکھ دو کہ تم شبانہ بیگم کے پاس اپنی کوٹھی کے کاغذات گروی رکھ کر ان سے دو لاکھ روپے لے رہے ہو۔ اگر ایک ماہ کے اندر یہ رقم تم نے ادا نہ کی تو شبانہ بیگم اس کوٹھی کو نیلام کر کے اپنی رقم وصول کریں گی۔"

"آپ ایک بات بتا دیں۔ اگر میں ہار جاؤں تو اس کی ذمہ داری کس پر ہوگی؟"
"یہاں ہار کا نام نہ لو۔ بیگم صاحبہ نے نقصان اٹھانے کے لئے وہ قمار خانہ نہیں بنایا ہے۔ تاش کے پتے سجاد شارپر کی انگلیوں کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ جس کی تقدیر میں جیت لکھ دی جاتی ہے اس کی جیت لازمی ہوتی ہے۔"
جبار احمد نے پھر کہا۔ "کوٹھی کے کاغذات میرے گھر میں ہیں۔"
سیکرٹری نے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ میں تمہارے ساتھ جا کر وہ کاغذات لے آؤں گا۔ ابھی سات بج کر بیس منٹ ہوئے ہیں۔ پندرہ منٹ میں بیع نامہ لکھ دو۔ پھر یہاں سے ہم پندرہ منٹ میں تمہاری کوٹھی پہنچ جائیں گے۔ وہاں سے ساڑھے آٹھ بجے تک کلب پہنچنا ہوگا۔ ٹھیک نو بجے بازی شروع ہو جائے گی۔"

☆======☆======☆

قمار خانہ کی فضا سگریٹوں کے دھوئیں سے بھری ہوئی تھی اس دھندلی فضا میں انسانوں کے چہرے بڑے پُراسرار نظر آ رہے تھے۔ وہ بار بار سگریٹ پھونکتے جا رہے تھے اور میز کے اطراف بیٹھے ہوئے جبار احمد بیوپاری اور سعید بخاری کو دیکھتے جا رہے تھے' جو شاید آخری بار جوا کھیلنے آئے تھے۔
پہلے کلب کی طرف سے تاش کی ایک گڈی میز پر لا کر رکھی گئی وہ گڈی ایک ٹائم بم کی طرح اپنے مخصوص وقت میں دھماکہ کرنے والی تھی۔ وہ خاموشی سے دونوں جواریوں کو سمجھا رہی تھی کہ اب بھی موقع ہے' باز آ جاؤ۔ ایسے کھیل میں بازی کبھی برابر نہیں ہوتی۔ کسی ایک کو ضرور ہارنا پڑتا ہے۔
نو بج کر پانچ منٹ پر سجاد ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ پھر دونوں کی اجازت سے گڈی

کھول کر پھینٹنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی سعید بخاری نے اپنے سینے پر دل کی جگہ ہاتھ رکھ لیا۔ جیسے اندر ہی اندر کوئی اس کے دل کو بھی پھینٹ رہا ہو۔ جبار احمد کی جیت پکی تھی۔ اس لئے وہ اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔
سجاد کے ہاتھوں میں پورے باون پتے کٹھ پتلیوں کی طرح ناچ رہے تھے۔ نیچے کے پتے اوپر اور اوپر کے پتے نیچے آتے تھے۔ پھر اپنی جگہ بدل دیتے تھے۔ کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ کس طرح اپنے مطلب کے پتے لگا رہا تھا۔ اس نے اچھی طرح پھینٹنے کے بعد دونوں کے درمیان گڈی رکھ کر پوچھا۔ "پتے کون کاٹے گا؟"
جبار احمد نے ایمانداری کا مظاہرہ کرنے کے لئے گڈی کو سعید بخاری کی جانب کھسکا دیا۔ سعید نے پتے کاٹے۔ سجاد گڈی کا باقی حصہ اٹھا کر بانٹنے لگا۔ دونوں کے آگے باری باری ایک ایک پتہ گرتا جا رہا تھا۔ جب دونوں کے پاس تین تین پتے ہو گئے تو سجاد نے گڈی ایک طرف رکھ دی۔
ان کے آگے تین تین پتے اوندھے پڑے ہوئے تھے۔ یہ اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ احمق لوگ اپنی اپنی اوندھی تقدیر کو ان پتوں سے سیدھی کرنے آتے ہیں' جو خود اوندھے پڑے رہتے ہیں۔ سجاد نے کہا۔
"یہاں شہر کے بڑے بڑے رئیس اور معزز حضرات موجود ہیں اس سے پہلے کہ پتے سیدھے کئے جائیں بازی کی وضاحت ہو جانی چاہئے۔"
سعید بخاری نے اپنا بریف کیس کھول کر دکان کے کاغذات نکالے پھر انہیں سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی دکان کو داؤ پر لگا رہا ہوں۔ میں نے اس پکے کاغذ پر یہ بیع نامہ لکھ دیا ہے کہ میں نے جناب جبار احمد بیوپاری سے دس لاکھ روپے لے کر اپنی دکان گروی رکھی ہے۔ اگر ایک ماہ کے اندر میں یہ رقم ادا نہ کروں تو جبار صاحب اس دکان کو فروخت کر کے اپنی رقم وصول کر لیں گے۔"
وہاں بیٹھے ہوئے لوگ باری باری اس بیع نامہ کو اٹھا کر پڑھنے لگے۔ پھر سب نے اطمینان کا اظہار کرنے کے بعد جبار احمد کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے کہا۔ "اگر بازی میرے خلاف ہوئی تو میں ایسی چیز ہار جاؤں گا جس کے لئے تحریری بیان دینا شرمناک بات ہوگی۔ میں آپ سب کے سامنے قسم کھا کر کہتا ہوں کہ.........."
ایک شخص نے قطع کلامی کی۔ "جوئے میں قسموں اور وعدوں کا اعتبار نہیں کیا

جاتا۔"

جبار احمد نے کہا۔ "صاحبان! میں عزت دار آدمی ہوں۔ یہ تحریر نہیں دے سکتا کہ اپنی بیٹی کے مستقبل کو داؤ پر لگایا ہے۔"

ایک صاحب نے فرمایا۔ "کیا خوب! لفظوں کی ہیرا پھیری سے مفہوم بدل جاتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک شخص نے اپنی بیٹی کو داؤ پر لگایا ہے تو یہ بڑی شرمناک بات ہوگی۔ اگر اسی بات کو ذرا بدل کر کہا جائے کہ بیٹی کے مستقبل کو داؤ پر لگایا ہے تو یہ بات شرمناک نہیں رہتی۔ کیونکہ دنیا کے تمام والدین اپنی بیٹی کو سسرال بھیجتے وقت اس کے مستقبل کو داؤ پر لگاتے ہیں۔"

"بے شک' بے شک۔" سعید بخاری نے کہا۔ "تحریر لازمی ہے۔ جبار صاحب یہ لکھ دیں کہ یہ آج رات دس بجے اسی شبانہ کلب میں اپنی صاحبزادی کا نکاح مجھ سے پڑھوا دیں گے۔ اگر ان کی صاحبزادی نے شادی سے انکار کیا تو یہ میری دکان کی مالیت کے برابر رقم ادا کریں گے۔"

جبار احمد اتنی کڑی شرط کبھی تسلیم نہ کرتا لیکن اس کے سامنے جو پتے اوندھے پڑے ہوئے تھے وہ سعید بخاری کو اوندھا کرنے والے تھے۔ اس لئے اس نے تھوڑی سی بحث کے بعد وہی تحریری بیان دے دیا۔ سعید بخاری اور دوسرے لوگ اس تحریر سے مطمئن ہو گئے۔ پھر سجاد نے کہا۔

"تمام معاملات طے ہو چکے ہیں۔ اب آپ دونوں اپنے اپنے پتے الٹ سکتے ہیں۔"

آس پاس کھڑے ہوئے تمام لوگ میز کے قریب آ گئے۔ سعید بخاری کے دونوں ہاتھ میز پر پہنچ گئے تھے۔ پتوں کو سیدھا کرنے سے پہلے اس کی انگلیاں لرز رہی تھیں۔ جبار احمد نے اسے مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "برخوردار! گھبرا رہے ہو۔ یہ لو میں پہل کرتا ہوں۔"

یہ کہتے ہی اس نے اپنے ایک پتے کو سیدھا کیا۔ ایک فاتح کی شان کی طرح پہلے ہی ایک اِکا نکل آیا۔ جو وقت سے پہلے منصوبے بناتے ہیں اور شاطرانہ چالیں چلتے ہیں جیت ان کا مقدر بن جاتی ہے۔

سعید نے ہاتھ آگے بڑھا کر اپنے ایک پتے کو سیدھا کیا۔ بدنصیبی کی پہلی وارننگ کی طرح دگی نکل آئی۔ جو لوگ موجودہ دور کی مکاریوں کو سمجھ کر چالیں نہیں چلتے وہ ہر چال

ہارت کھاتے ہیں۔

جبار احمد نے دوسری بار مسکراتے ہوئے اپنے دوسرے پتے کو سیدھا کیا۔ وہ بھی اِکا تھا صرف دو ہی پتوں سے اسے برتری حاصل ہو رہی تھی۔ کیونکہ سعید کا دوسرا پتا بھی دگی کا تھا۔ جبار احمد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب ہار جیت کا انحصار اس آخری پتے پر ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ تیسرا بھی اِکا ہی ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے تیسرے پتے کو سیدھا کیا۔ وہ غلام تھا۔ جبار احمد کے چہرے کی رونق ایک دم سے اُڑ گئی اور اس وقت تو اس کی آدھی سانس باہر اور آدھی اندر ہی رہ گئی۔ جب سعید نے تیسرے پتے میں بھی دگی نکالی تو وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ چیخ کر بولا۔ "فرزانہ میری ہے۔ اس ہفتے میرا ستارہ عروج پر ہے۔ مجھے فرزانہ مل گئی ہے۔ جبار صاحب! آپ اپنا وعدہ.........."

اس کی بات پوری نہ ہو سکی۔ جبار احمد صدمے کی شدت سے بے ہوش ہو کر کرسی سے لڑھکتا ہوا فرش پر پہنچ گیا تھا۔ خسارہ اٹھانے والے بیوپاری ان حالات میں جان بوجھ کر بھی بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ تاکہ سکون سے آنکھیں بند کر کے اپنے ڈوبتے ہوئے دل کو سنبھالنے اور کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ملے۔ جبار احمد آنکھیں بند کئے سوچ رہا تھا۔ "میری جیت یقینی تھی۔ پھر سعید کیسے جیت گیا؟ کیا اس نے شبانہ بیگم کو مجھ سے زیادہ کمیشن دیا ہے۔ نہیں' سعید کو اتنی عقل ہوتی تو وہ روزانہ ہزاروں روپے ہارنے کے بجائے پہلے ہی شبانہ بیگم سے سمجھوتہ کر لیتا۔ پھر کیا بات ہے؟ کیا پتے لگاتے وقت سجاد سے غلطی ہو گئی ہے؟"

تمام لوگوں نے جبار احمد کو اٹھا کر میز پر لٹا دیا تھا اور اب اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہے تھے۔ وہ آنکھیں کھولنے پر مجبور ہو گیا۔ تمام لوگ اس سے ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے۔ اس کے جی میں آیا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے۔ اگر شبانہ بیگم اور سجاد نے بے ایمانی کی تھی تو وہ خود بے ایمانی کا سودا کر رہا تھا۔ بے ایمان ایک دوسرے کے خلاف شکائتیں نہیں کر سکتے اور نہ ہی ہاری ہوئی بازی کے خلاف اپیل کر سکتے ہیں۔ اسے ابھی بیٹی کو شادی کے لئے راضی کرنا تھا۔ اس لڑکی کے دماغ سے سیٹھ ہاشم کے ایک لاکھ روپے نکالنے کے لئے اپنے اکاؤنٹ سے اس رقم کا چیک لکھ کر دینا ضروری تھا۔ خواہ اکاؤنٹ میں اتنی رقم موجود نہ ہو۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ فرزانہ کو ایک لاکھ کا

فریب دے کر سعید سے بیاہ دے۔

☆======☆======☆

نصف شب سے کچھ پہلے فرزانہ جب سعید کی دلہن بن کر اس کی کوٹھی میں آئی تو وہ کوٹھی رنگ برنگے قمقموں سے جگمگا رہی تھی۔ شادی کی خوشیاں منانے کا اہتمام بہت پہلے ہو چکا تھا۔ بہت سے مہمان کھانے پینے میں مصروف تھے۔ کتنی ہی عورتوں نے دلہن کو ہاتھوں ہاتھ شبِ عروسی کے کمرے میں پہنچایا۔ جب سعید تنہا رہ گیا تو ایک عورت اس کے پاس آئی۔ یہ وہی عورت تھی جس نے ایک بک اسٹال کے کاؤنٹر پر فرزانہ سے کہا تھا کہ اس کی ہیرے کی انگوٹھی انگلی سے پھسل کر کہیں گر پڑی ہے۔

اس عورت نے مسکرا کر کہا۔ "سعید بھائی! اگر میں فرزانہ کو یقین نہ دلاتی کہ وہ انگوٹھی میری تھی تو وہ آپ کو فراڈ سمجھتی۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ شادی کے بعد انعام دیں گے۔"

سعید نے جیب سے دس دس کے دس نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ وہ خوش ہو کر چلی گئی۔ پھر وہ ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ وہاں چیلنج کمیٹی کے معزز ممبران بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ کمیٹی کے صدر نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ "بھئی تم نے اچھا دعوتی رقعہ بھیجا ہے اس میں دلہن کا نام ہی نہیں لکھا ہے۔ بھئی تم نے کس سے شادی کی ہے؟"

سعید نے ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "چیلنج فنڈ سے کی ہے۔"

"کیا.........؟" سب ہی حیرانی سے چیخ پڑے۔ سعید نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا۔ پھر دھواں چھوڑتے ہوئے اپنی جیب سے انسٹینٹ کیمرے کی تصویریں نکال کر ان کی طرف بڑھا دیں۔ وہ نکاح خوانی کے مختلف مراحل کی تصویریں تھیں۔ ایک تصویر میں سعید نکاح نامہ پر دستخط کر رہا تھا دوسری تصویر میں فرزانہ دلہن بنی دستخط کر رہی تھی تیسری تصویر میں سعید اور فرزانہ دولہا دلہن کے روپ میں تھے۔ وہ تصویریں دیکھ کر .... چیلنج کمیٹی کے ممبران کے دلوں پر بجلیاں گر رہی تھیں اور سعید کی آواز ان کے کانوں میں زہر کی طرح ٹپک رہی تھی۔

وہ کہہ رہا تھا۔ "میں پرسوں نکاح نامہ لے کر کمیٹی کے دفتر میں حاضر ہو جاؤں گا۔ مجھے امید ہے آپ تمام حضرات کمیٹی کے قواعد و ضوابط کا احترام کریں گے اور فرزانہ کو

اس بات کا علم نہ ہونے دیں گے کہ میں نے تیرہ لاکھ کی رقم جیت لی ہے۔ آیئے اس خوشی میں وہسکی کا ایک ایک جام ہو جائے۔"

وہ سب شراب کی ٹرالی کے پاس آ گئے۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ سعید نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو۔"

دوسری طرف سے جبار بول رہا تھا۔ "سعید بیٹے! مجھے نیند نہیں آئے گی۔ خدا کے لئے اتنا بتا دو کہ تم بازی کیسے جیت گئے؟ اب تو تم میرے داماد بن چکے ہو۔ پلیز بتا دو........."

سعید نے جواب دیئے بغیر ریسیور رکھ دیا۔

دلہن کے کمرے میں عورتوں کا شور ہوا کہ دولہا میاں کی .... والدہ صاحبہ تشریف لا رہی ہیں۔ فرزانہ صوفے پر گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی۔ ساس کی آمد کے متعلق سن کر گھونگھٹ اور لمبا کر لیا۔ اب اسے صرف فرش کا قالین نظر آ رہا تھا۔ ایک منٹ بعد اسے قریب ہی آواز سنائی دی۔

"بہو! میں سعید کی ممی اور تمہاری ساس ہوں۔ کھڑے ہو جاؤ........."

وہ بے اختیار کھڑی ہو گئی۔

☆======☆======☆

آخری کمرہ

آخری کمرے کا قیدی کون تھا؟

پُراسرار حویلی میں کیا ہو رہا تھا؟

اسے ایک بیٹے کی ضرورت تھی، بیوی کی نہیں

اس ماں کی کہانی جسے بیٹا محبوبہ بنانا چاہتا تھا۔

رات دھیرے دھیرے ڈھلتی جا رہی تھی۔ دریچے کے باہر سمندر کی لہریں طوفانی ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کے دل میں بھی ایک طوفان اٹھ رہا تھا۔ اس طوفان میں وہ ایک تنکے کی طرح بہتی ہوئی فیصلہ کر رہی تھی کہ وہ یہاں نہیں رہے گی۔ اس کے چاروں طرف جتنے چہرے تھے وہ سب ظالم اور سفاک تھے' ان کے ہاتھ انسانی لہو سے آلودہ تھے۔ وہ وحشت زدہ ہو کر بستر پر اٹھ بیٹھی۔

"نہیں' میں ان قاتلوں کی سرپرستی میں نہیں رہ سکتی' میں ابھی یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

آتشدان میں لکڑیاں سلگ رہی تھیں ان کی لہراتی ہوئی سرخ روشنی کا عکس اس کے حسین چہرے پر تھرک رہا تھا۔ وحشت سے پھیلی ہوئی آنکھوں میں آتشدان کے انگارے دہک رہے تھے اس نے باغی ہو کر کبھی گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ آج اچانک ایسا فیصلہ کیا تو بے گھر ہونے کے خیال سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

زندگی نے نوجوانی ہی میں اسے ڈھیر سارے آنسو دے دیئے تھے' چشم تصور میں اس نے ماضی کی طرف مڑ کر دیکھا جہاں اس کے غم سے نا آشنا دل نے درد سے آشنائی سیکھی تھی۔ دل پر ایسی کاری ضرب پڑی کہ روح تک میں شگاف پڑ گیا تھا۔

پہلا مرد جو بڑے غیر محسوس طریقے سے اچانک ہی اس کی زندگی میں داخل ہو گیا تھا وہ نگر نگر کا پانی پینے والا ایک ڈاکٹر پاشا تھا۔ وہ سیلاب سے متاثرہ لوگوں کا علاج کرنے کے لئے سرکاری طور پر اپنے ملک سے یہاں آیا تھا اور نرگس سیلاب سے متاثر ہو کر اس ہسپتال کے اسپیشل وارڈ کے' ایک اسپیشل کمرے میں آ گئی تھی۔ اسی کمرے میں دونوں کا سامنا ہوا تھا۔ یہ بیمار تھی وہ مسیحا تھا۔ اس رشتے کی بنا پر صبح و شام بلا روک ٹوک ملاقات ہوتی تھی۔

نرگس نے ان دنوں جوانی میں نیا نیا قدم رکھا تھا۔ دولت مند باپ کی لاڈلی بیٹی تھی

اس لئے ذرا ذرا سی بات کا اثر لیتی تھی۔ سیلاب میں ڈوبنے اور بہنے والوں کو جب اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تو اس کے ذہن پر بہت بُرا اثر ہوا۔ وہ ایسے دردناک مناظر کے تاثرات کو برداشت نہ کر سکی اور بیمار ہو کر ہسپتال پہنچ گئی۔ ڈاکٹر ہمایوں پاشا نے آ کر پہلی بار اسپیشل کمرے میں اس کا معائنہ کیا تو اس کی نبض دیکھنے کے دوران خود ڈاکٹر کی نبض ڈوبنے لگی۔ وہ ایسی سبک سی خم کھائی ہوئی کلائی تھی کہ اسے تھامتے ہی وہ چشمِ تصور میں اس کی کلائی کے سہارے دور اس کے بدن کی نزاکتوں تک پہنچ گیا۔ اس نے اس کے والدین کو تسلی دی۔

"گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ آپ کی صاحبزادی کا ذہن موجودہ حالت سے بری طرح متاثر ہوا ہے۔ آپ اسے یہاں زیادہ سے زیادہ دیر تنہا رہنے دیں صرف ملاقات کے مقررہ وقت پر آ کر مل لیا کریں۔"

حالانکہ نرگس کو ایسی حالت میں تنہائی کی بجائے اپنے آس پاس لوگوں کی ضرورت تھی تاکہ وہ ہنس بول کر اس کا دل بہلا سکیں، لیکن پہلی ہی ملاقات میں ڈاکٹر نے سوچ لیا تھا کہ وہ خود تنہائی میں اپنی مریضہ کا دل بہلایا کرے گا۔

جس طرح ایک فلم دیکھنے سے پہلے اس کے پوسٹر کو دیکھ کر بہت سی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں اسی طرح جوانی کی آمد سے پہلے نرگس نے اپنے آس پاس جوانی کے چلتے پھرتے پوسٹروں کو دیکھ کر بہت سی خیالی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ یعنی وہ معلومات صرف سوچ کی حد تک محدود تھیں۔ زندگی کی کسی تجربہ گاہ میں وہ آپریشن کے لئے نہیں پہنچی تھی۔ زندگی میں جو پہلا سرجن اس کے قریب آیا وہ بڑا بیباک تھا۔ اس کے اندر کی سانسیں سننے کے لئے اسٹیتھوسکوپ کو اس کے سینے پر رکھ کر ہاتھ اٹھانا بھول جاتا تھا۔ نرگس بھی سب کچھ بھول کر صرف اس ہاتھ کے لمس کو محسوس کرتی رہ جاتی تھی۔ اس ہاتھ والے کی شخصیت اس کے دل و دماغ پر چھا جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ اس کے وجود میں تہہ بہ تہہ اترتا چلا گیا۔ اس کی قربت میں ایسی دیوانگی تھی کہ فاصلوں کا وجود باقی نہ رہا۔

ان دنوں نرگس جاگتی آنکھوں سے بڑے سندر بڑے البیلے سپنے دیکھتی تھی۔ اسے یوں لگتا جیسے پاشا کو پا کر زندگی کو فتح کر لیا ہے۔ فاصلوں کا وجود مٹا تو وقت سے پہلے ہی اس کے اندر کی عورت بالغ ہو گئی۔ مرد اور عورت کے رشتوں کی پہچان اسے ہمایوں پاشا نے کرائی۔ یہ رشتہ دنیا کے سارے رشتوں سے جدا تھا۔ اب سے پہلے نرگس ماں باپ اور

بھائی بہن کے پیار کو ہی سب کچھ سمجھتی تھی لیکن پاشا نے اسے ایسی لذتوں سے آشنا کرایا جن سے جوانی کا مفہوم پوری طرح واضح ہو گیا تھا۔

یہ روز کا معمول ہو گیا۔ ہمایوں پاشا کو جب بھی دوسرے مریضوں سے فرصت ملتی وہ اسپیشل مریضہ کے اسپیشل کمرے میں چلا جاتا اور اسپیشل توجہ سے اس کا علاج کرتا اور تجربوں سے سمجھاتا کہ اس کی سوچ سیلاب سے متاثر ہونے والوں کے لئے نہیں صرف ایک مرد کے لئے ہے جو جوانی میں جسم کے تقاضوں کا احساس دلاتا ہے، اس بھوک کو اجاگر کرتا ہے، جو روٹی سے نہیں مرد کی قربت سے مٹتی ہے اور نرگس کو ان دنوں روٹی کی نہیں ہمایوں پاشا کی بھوک لگتی تھی۔ وہ ایک اُمڈے ہوئے بادل کی طرح اس کے بدن کے آسمان پر چھا جاتا تھا اور اس کے وجود میں اس طرح برستا تھا کہ وہ ہوش و حواس کھو بیٹھتی تھی۔

جب وہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر اپنے والدین کے ساتھ اپنے گھر جانے لگی تو اس سے پہلے ہمایوں پاشا نے اس سے بہت سے وعدے کئے کہ وہ اس کے یہاں آیا کرے گا اور ان رنگین ملاقاتوں کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں دے گا۔ اس کا وعدہ ایک ماہ تک قائم رہا۔ دوسرے ماہ یہ سن کر نرگس کے ہوش اڑ گئے کہ وہ پرائے دیس سے آنے والا پنچھی اڑ گیا اور اسے کچھ بتائے بغیر اپنے وطن واپس چلا گیا ہے۔ سپنوں کے سارے شیش محل چکنا چور ہو گئے۔ ایک تو اس کی بے وفائی کا صدمہ تھا، دوسرا صدمہ اس بات کا تھا کہ اس کا پیار اس کے وجود میں پل رہا تھا۔ وہ بدنامی کے خوف سے کپکپا اٹھی۔ ہمایوں پاشا ذلت اور بدنامیوں کا جو بار اس کے شانے پر ڈال گیا تھا۔ اس کے تلے آ کر اس کا وجود دبا جا رہا تھا۔

جب اس بات کا علم اس کے گھر والوں کو ہوا تو اس کے ماں باپ غصے، توہین اور شرم کے احساس سے تلملانے لگے۔ غصہ اس بات کا تھا کہ جوان بیٹی نے بوڑھے والدین کی عزت کو ٹھیس پہنچائی تھی، توہین اس بات کی تھی کہ ایک عیاش آدمی ان کی حسین بیٹی سے کھلونے کی طرح کھیل گیا تھا اور شرم اس بات کی تھی کہ اب وہ دنیا والوں کے سامنے نہیں سر اٹھا سکتے تھے۔ ایک لڑکی کے غلط قدم اٹھانے سے پورے خاندان کا غرور مٹی میں مل گیا۔

ماں باپ نے فوراً ہی فیصلہ کیا کہ لڑکی کو وہاں سے دور سمندر کے ساحل پر لے

جائیں گے جہاں ان کا ذاتی کاٹیج ہے جب تک بچہ نہیں ہو گا اس وقت تک وہ اسے
چھپا کر رکھیں گے پھر بچے کو سمندر میں پھینک کر بچے والی کو گھر۔ ، آئیں گے۔

سمندر کے کنارے جب وہ کاٹیج میں پہنچی اور اسے اپنے والدین کے بھیانک فیصلے کا
علم ہوا تو وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔

"وہ میرا بچہ ہو گا میں اسے نقصان نہیں پہنچانے دوں گی' میں اسے لے کر کہیں دور
چلی جاؤں گی.........."

لیکن ایسی ممتا کا درد کون سمجھتا ہے' ایسی عورت کے جذبوں کو کون پہچانتا ہے جو [...]
راستے سے ماں بنتی ہے۔ جب وہ ڈاکٹر کی آغوش میں تھی تو جوانی کے طوفان میں ماں بننے
کی کوئی خواہش نہیں تھی مگر جب ماں بننے لگی اس وقت سمجھ میں آیا کہ بچہ چاہے
بلائے آئے مگر ڈائن بن کر اسے نہیں کھا سکتی۔ کوئی اس عورت کے دل سے پوچھے
اپنے وجود کو چھلنی کر کے ایک ننھی سی خوشبو کو چھانتی ہے۔ پھر ایک پھول کی طرح اس
خوشبو کو اپنے سے جدا نہیں ہونے دیتی۔

لیکن نرگس کو اس کے ماں باپ نہ سمجھ سکے۔ بیٹی کتنے ہی طوفانوں سے گزر جائے
ماں باپ تو اسے نادان بچی ہی سمجھتے ہیں۔ اپنے سامنے کھلی ہوئی حقیقت کو تسلیم نہیں
کرتے کہ اب وہ نادان بچی نہیں رہی ہے۔ کلی سے پھول بننے والے تجربات سے گزر رہی
ہے اور اس دنیا کی تخلیق میں ہر ماں کے برابر حصہ لے رہی ہے اس لئے ہر ماں کی طرح
اس کے اپنے جذبات بھی ہوں گے مگر کوئی اسے نہ سمجھ سکا۔

وہ باغیانہ انداز میں سوچنے لگی کہ اس کاٹیج سے نکل بھاگے گی۔ کوئی دن رات اس
پر پہرے نہیں بٹھا سکتا تھا مگر گھر کی چوکھٹ سے نکلنے کے خیال سے ہی ہر سو گھور اندھیرا
نظر آتا تھا۔ اس اندھیرے میں کوئی ایسا راستہ نظر نہیں آتا تھا جس پر چل کر وہ اپنے بچے
کو جنم دینے والی منزل تک پہنچ سکتی۔

عورت گھر سے تنہا نکلے تو چاروں طرف اندھیرے ہی منڈلاتے رہتے ہیں اور
روشنی کی تلاش میں ساری عمر بھٹکتی رہتی ہے۔ کچھ اس طرح کہ روشنی کے لیے بھٹکتی
ہے اور روشنی سے چھپتی بھی ہے اس لیے کہ روشنی میں اس کا گنہگار وجود عریاں ہو جاتا
ہے اور اندھیرے بہت سے عیبوں کی پردہ پوشی کر لیتے ہیں اور اس جیسی عورت جو بچہ
بننے سے پہلے ماں بن رہی ہو اس کے مقدر میں تو سدا اندھیرا ہی ہوتا ہے اور روشنی [...]

ڈراتی رہتی ہے۔

کاٹیج سے بھاگنے کا فیصلہ کمزور پڑ گیا۔ اس نے ایک نئے عزم کے ساتھ سوچا کہ وہ
بچے کو اسی کاٹیج میں جنم دے گی لیکن اسے ظالم ہاتھوں تک پہنچنے نہیں دے گی۔ صرف
ایک دن کی بات ہو گی جس دن بچہ ہو گا اس دن وہ تمام درد اور تکلیف کو برداشت کرتے
ہوئے اسے لے کر وہاں سے نکل جائے گی۔ جب تک وہاں سے نکلے گی اس وقت تک
اپنی ماں کو بھی اپنے بچے کے پاس نہیں آنے دے گی۔

اس فیصلے سے مطمئن ہو کر وہ وقت کا انتظار کرنے لگی اس دوران وہ اپنی ماں کو
سمجھاتی رہی کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد اسے فوراً الگ نہ کیا جائے کم از کم اسے ایک بار
بچے سے لگا کر پیار کرنے کا موقع دیا جائے۔ ماں نے اسے سمجھایا۔

"تم اسے پیار کرو گی تو پیار بڑھتا ہی جائے گا۔ اگر تم آنکھیں بند رکھو گی اور یہ سمجھ
لو گی کہ وہ اس دنیا میں آتے ہی واپس چلا گیا ہے اور اس کی عمر صرف چند گھڑیوں کی تھی تو
تمہیں زیادہ صدمہ نہیں پہنچے گا۔"

اس نے ماں سے پوچھا:

"کیا آپ مجھے پیدا کرتے وقت ایسا سوچ سکتی تھیں کیا آپ مجھے مار سکتی تھیں؟ مجھے
جیتے جی سمندر میں پھینک سکتی تھیں؟ آپ عورت ہو کر کیوں عورت کی فطرت کے
خلاف بات کرتی ہیں؟"

اس کی باتوں سے پریشان ہو کر ماں وہاں سے چلی جاتی تھی۔ قتل کرنا سب سے بڑا
جرم ہے مگر کبھی کبھی عزت اور ناموس کی خاطر ایک عورت دوسری عورت کی ممتا کی قاتل
بن جاتی ہے۔ اسی لئے اس کی ماں بھی مجبور تھی۔ اپنی بیٹی کو نہیں مار سکتی تھی مگر بیٹی کی
ممتا کو قتل کر سکتی تھی۔

نرگس کو زندگی کے سارے نشیب و فراز کا علم نہیں تھا اس نے بڑے عزم سے یہ
فیصلہ تو کر لیا تھا کہ بچے کی پیدائش کے وقت بہت زیادہ محتاط رہے گی لیکن وہ نہیں جانتی
تھی کہ پیدائش کے وقت عورت پر کیسی قیامت ٹوٹنے لگتی ہے۔ جب زچگی کا وقت بالکل
قریب آ گیا تو بچہ وجود میں آنے سے پہلے ہی ماں کے وجود میں زلزلے کے جھٹکے پہنچاتا رہا۔
ایسی اذیتوں میں مبتلا کرتا رہا جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ درد اور
تکلیف سے چیختی رہی تڑپتی رہی اس کے ہوش و حواس ساتھ چھوڑتے رہے۔ جو عزم و

استقلال تھا وہ اس کے وجود کے اندر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گیا تھا بس اسے اتنا ہی ہوش رہا کہ اس نے ایک نوزائیدہ بچے کی چیخ سنی تھی اس کے بعد وہ ہوش کی دنیا سے دُور ہوتی چلی گئی تھی۔

وہ ہوش میں آئی تو اپنے آس پاس کے ماحول کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے اور کس حالت میں ہے پھر اچانک ہی وہ چیخ کر بولی۔

"میرا بچہ کہاں ہے؟"

اس کی ماں نے قریب آ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر تسلی دی۔

"میری بچی اسے بھول جا وہ مُردہ پیدا ہوا تھا۔"

وہ غصے سے چیختی ہوئی اٹھ کر بیٹھنے لگی۔

"آپ جھوٹ بولتی ہیں' میرا بچہ مردہ نہیں تھا' میں نے اس کی چیخ سنی تھی' کہاں ہے وہ۔ ممی تم کیسی عورت ہو؟ کیا تمہارے سینے میں عورت کا دل نہیں ہے؟ میں نے تم سے التجا کی تھی کہ صرف ایک بار مجھے اسے سینے سے لگا لینے دینا۔ مگر تمہیں میری ممتا پر ذرا بھی ترس نہ آیا۔"

اب ماں باپ کو اس پر ترس آ رہا تھا کیونکہ جو کچھ وہ کرنا چاہتے تھے کر چکے تھے۔ اب تو بیٹی سے ہمدردی کرنی تھی۔ اسے تسلیاں دے کر سمجھانا تھا کہ وہ اب نئی زندگی کا آغاز کرے اور ماضی کو بالکل بھول جائے۔ ماضی کہاں بھلایا جاتا ہے اور ماں اپنے بچے کو کیسے بھول سکتی ہے؟ سمجھانے کے باوجود وہ چیختی چلاتی رہی۔ جب تھک گئی تو رونے لگی۔ جب روتے روتے تھک گئی تو اسے نیند آ گئی۔

دوسرے دن اس کی آنکھ کھلی تو پھر اس پر جنون سوار ہوا۔ وہ اپنے بچے کو پکارتی رہی۔ ماں باپ سامنے آتے تو اسے ان کی انگلیوں سے خون ٹپکتا محسوس ہوتا اور وہ انہیں قاتل کہہ کہہ کر پکارنے لگتی۔ پھر یہ جنون بھی آہستہ آہستہ سرد پڑتا گیا۔ اس نے جنون میں آ کر کھانے پینے سے انکار کر دیا۔ مگر انسان کب تک روٹیوں سے منہ موڑ سکتا ہے اسے سمجھا بجھا کر کھلایا پلایا گیا۔ دوسرے تیسرے دن وہ ذرا نارمل ہو گئی اور بستر پر لیٹی چپ چاپ چھت کو گھورتی رہی۔ رات کی خاموشی میں جب سمندر کی لہریں شور مچاتیں تو ان لہروں کے ہجوم میں اسے اپنے بچے کے چیخنے کی آواز سنائی دیتی۔ وہ کہیں انہی لہروں میں

الجھا ہوا تھا۔ وہ کاٹیج سے نکل کر ساحل پر گئی۔ دور دور تک دوڑتی رہی بچے کو پکارتی رہی مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا کیونکہ موت ایک ہی بار چھیننے کے لئے آتی ہے آج تک اس نے چھینی ہوئی زندگی کبھی واپس نہیں کی۔

اب وہ تھک ہار کر اپنے بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کھڑکی کے پٹ کھلے ہوئے تھے۔ چاندنی میں سمندر کی لہریں دور دور تک چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اس کے احساسات بدل گئے تھے۔ ان لہروں کو دیکھ کر اسے یوں لگتا تھا جیسے ساحل پر واپس جاتی لہروں میں دور دور تک اس کے ننھے کے آنسو چمک رہے ہوں۔

رات دھیرے دھیرے ڈھلتی جا رہی تھی۔ سمندر کی لہروں میں طوفان کا سا شور تھا اور وہ ایک نئے طوفان کی زد میں آ کر یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ اب یہاں قاتلوں کی سرپرستی میں نہیں رہے گی۔ کہاں جائے گی وہ خود نہیں جانتی تھی۔ خود مرنے سے گھبراتی تھی اور چاہتی تھی کہ باہر کوئی اسے مار ڈالے۔

پھر وہ بستر سے اٹھ کر اپنے کمرے سے باہر آ گئی۔ اس نے دوسرے کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی سے دیکھا۔ اس کے ماں باپ ابھی تک جاگ رہے تھے' اس کی ماں بستر پر بیٹھی رو رہی تھی اور آنچل سے آنسو خشک کرتی ہوئی بول رہی تھی۔

"میں ایک بیٹے کی تمنا کرتے کرتے بوڑھی ہو گئی۔ اللہ نے اس عمر میں ایک نواسہ دیا تو میں اسے کلیجے سے لگا کر نہ رکھ سکی۔ آپ نے بہت ظلم کیا ہے۔ نہ میری بچی کے جذبات کا خیال کیا نہ ہی میرے ارمانوں کا خیال آیا۔ کیا ہم اسے دنیا والوں سے چھپا کر نہیں رکھ سکتے تھے؟ کیا اس طرح ایک بیٹے کی آرزو پوری نہیں ہو سکتی تھی؟"

اس کے باپ نے بگڑ کر سخت لہجے میں کہا۔

"فضول باتیں نہ کرو' انسان عزت کی خاطر اپنی اولاد کو قربان کر دیتا ہے۔ پھر وہ اولاد ایسی تھی جس پر ہم فخر نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ہماری زندگی میں اور ہمارے بعد ہمیشہ بدنامی کا باعث بنی رہتی۔ میں نے جو کچھ کیا اچھا کیا' تم نرگس کے سامنے صبر سے کام لے رہی ہو۔ یہ بڑی اچھی بات ہے۔ تمہیں اسی طرح صبر کرنا چاہئے۔ کیا تم نہیں دیکھتیں کہ نرگس بھی کس حد تک اس صدمے کو برداشت کرتی جا رہی ہے۔"

نرگس وہاں سے پلٹ کر دبے پاؤں چلتی ہوئی کاٹیج سے باہر آ گئی۔ اس کے دماغ میں ماں کی ایک ہی بات گونج رہی تھی کہ ان کے نواسہ ہوا تھا یعنی اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا

تھا۔ آہ کہاں ہے میرا ننھا منا۔ وہ چاروں طرف دیکھنے لگی۔ تاروں بھرے آسمان کو تکنے لگی۔ سمندر کی لہروں کو فریادی آنکھ سے دیکھنے لگی۔ کہاں ہے میرا ننھا منا؟ ایک بار میرے پاس آ جائے میں اسے پھول کی طرح اٹھاؤں گی اور خوشبو کی طرح گلے لگاؤں گی۔ وہ روتی ہوئی اور دوڑتی ہوئی وہاں سے دور جانے لگی۔

جوان مرد ساری عمر دھکے کھاتے رہتے ہیں مگر کوئی انہیں سہارا نہیں دیتا' ہمدردی کی ایک نظر بھی نہیں ڈالتا۔ اس کے برعکس جوان عورت کو قدم قدم پر سہارا مل جاتا ہے۔ وہ سمندر کے کنارے کنارے ایک میل تک گئی تو پیچھے سے کسی نے آواز دی۔

"رک جاؤ' کون ہو تم؟"

اس کے قدم رک گئے۔ وہ جیسے خیالات سے چونک گئی۔ اسے کچھ ہوش نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے' زمین پر چل رہی ہے یا ہواؤں میں اڑ رہی ہے۔ بس رات کی تاریکی میں اس کی نگاہوں کے سامنے ایک ننھا سا بچہ نظر آتا جا رہا تھا۔ اپنی طرف بلاتا جا رہا تھا اور وہ بڑھتی جا رہی تھی۔ کسی اجنبی کی آواز سن کر وہ ایک دم چونک گئی اور پلٹ کر اسے دیکھنے لگی۔

تاروں کی روشنی میں ایک صحت مند اجنبی کھڑا ہوا تھا۔ جب وہ ماچس کی تیلی جلا کر اپنا سگار سلگانے لگا تو اس کی روشنی میں اس کی صورت واضح ہو گئی۔ اس کے چہرے پر زندگی کی پختگی تھی۔ اچھی خاصی عمر کا آدمی تھا۔ اس کی دونوں انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں تھیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کافی دولت مند ہے' نرگس بس اتنا ہی دیکھ سکی۔ پھر اس کا سر چکرانے لگا کیونکہ وہ زچگی سے اٹھی تھی۔ بہت زیادہ کمزور تھی اور کاٹیج سے ایک میل دور تک کبھی دوڑتی ہوئی کبھی چلتی ہوئی گئی تھی۔ پھر حالات نے اسے اس بری طرح رگیدا تھا کہ وہ چکرا کر ریت کے فرش پر گر پڑی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک بہت ہی خوبصورت بیڈ روم میں پایا جو قیمتی اشیاء سے سجا ہوا تھا۔ اس کا بدن فوم کے نرم ملائم بستر میں دھنسا ہوا تھا اور اوپر سے مخمل کا لحاف اوڑھا ہوا تھا۔ پہلے تو وہ چپ چاپ پڑی اس اجنبی ماحول کو دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ کس کا گھر ہے اور وہ یہاں تک کیسے پہنچ گئی۔

پھر اسے پچھلی رات والا اجنبی یاد آیا جو ماچس کی تیلی جلا کر سگار سلگا رہا تھا۔ چند لمحوں کے لئے اس کی صورت نظر آئی۔ پھر وہ آگے کچھ نہ دیکھ سکی تھی۔ لڑکھڑا کر گر پڑی

تھی۔

اب وہ سوچ رہی تھی کہ شاید وہی اجنبی اسے یہاں لے کر آیا ہے۔ یہ سوچتے ہی اسے محسوس ہوا جیسے وہ لحاف کے اندر بے لباس ہے اس نے جلدی سے خود کو ٹٹولا اپنے آپ کو اِدھر اُدھر سے چھو کر دیکھا۔ واقعی اس کے جسم پر کپڑا نہیں تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یہ خیال اسے پریشان کر رہا تھا کہ کس نے اس کا لباس اتارا ہے' کیا اس اجنبی نے؟

وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگی۔ لحاف کو اپنے اطراف لپیٹ کر کمرے میں نظریں دوڑانے لگی کہ وہاں کوئی موجود تو نہیں مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ کوئی اسے دیکھنے والا نہیں تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سامنے ہی ایک صوفے پر اس کا لباس بکھرا ہوا پڑا تھا۔ وہ چند لمحے تک دروازے کی طرف دیکھتی رہی کہ کوئی آ نہ جائے۔ پھر فوراً ہی لحاف سے الگ ہو کر تیزی سے چلتی ہوئی دروازے تک آئی۔ اندر سے اس کی چٹخنی لگائی پھر اپنا لباس پہننے کے لئے صوفے کی طرف بڑھ گئی۔

لباس پہننے کے دوران وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کہاں ہے اور کس کے مکان میں ہے؟ کہیں سے کسی کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ بڑی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لباس پہننے کے بعد اس نے سرہانے دیکھا دودھ کا گلاس رکھا ہوا تھا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ وہ پلنگ کے سرے پر بیٹھ کر پھر اس گلاس کو اٹھا کر دودھ پینے لگی۔ اس گلاس کے نیچے ہی ایک چھوٹی سی پرچی پڑی ہوئی تھی۔ اس نے اس پرچی کو کھول کر دیکھا۔ اس میں لکھا تھا۔

"تمہارے سرہانے کیسٹ ریکارڈر رکھا ہوا ہے اسے آن کرو۔"

اس نے سوئچ بورڈ کے پاس جا کر ریکارڈر کا پلگ لگا دیا۔ پھر اسے آن کر کے اس کے قریب بیٹھ گئی۔ چند لمحوں بعد اس میں سے ایک اجنبی مرد کی آواز ابھرنے لگی۔

"تم کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟ تمہیں دیکھتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے تم تاروں کی نگری سے اتر کر سمندر کے ساحل پر ٹہلنے کے لئے آ گئی ہو۔ مگر تم بہت پریشان تھیں اور ایک طرح سے دیوانگی کی حالت میں آگے بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ میں بہت دیر سے تمہارا پیچھا کر رہا تھا جب میں نے دیکھا کہ تمہارے آس پاس کوئی نہیں ہے تم بالکل تنہا ہو تو میں نے تمہیں آواز دی۔ تم نے مجھے دیکھا لیکن کچھ پوچھنے کا موقع نہیں دیا۔ اسی وقت چکرا کر ریت پر گر پڑیں۔ میں تمہیں اٹھا کر یہاں لے آیا۔ سمندر کی لہروں نے

تمہارے لباس کو بھگو دیا تھا۔ تمہیں گیلے کپڑوں میں چھوڑ دینا مناسب نہیں تھا لہٰذا میں نے تمہارا لباس اتارنے کی گستاخی کی ہے۔ تم اب بھی ہوش سے بیگانی بستر پر لیٹی ہوئی ہو اور لباس اتارنے کے بعد خود میرے ہوش اڑ گئے ہیں۔ تم ایک بے مثال حسین لڑکی ہو۔ لڑکی نہیں بلکہ عورت ہو کیونکہ میں نے تمہارے سینے سے دودھ کے چشمے ابلتے دیکھے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ تم نے ایک بچے کو جنم دیا ہے۔ وہ بچہ کہاں ہے؟ تم اپنے بچے کو چھوڑ کر کہاں جا رہی تھیں؟ اس وقت میں تمہارے حسین مکھڑے کو دیکھتا جا رہا ہوں اور یہ باتیں ریکارڈر کرتا جا رہا ہوں۔ میں اس کے بعد ایک ضروری کام سے چلا جاؤں گا۔ واپسی کب ہو گی‘ یہ میں خود نہیں جانتا۔ تمہارے سرہانے کی میز پر اس مکان کے ہر کمرے کی چابیاں رکھی ہیں۔ بیڈ روم کے دروازے کو میں نے باہر سے لاک کر دیا ہے۔ تم چاہو تو اس چابی سے دروازے کو کھول سکتی ہو مگر میں تم سے درخواست کروں گا کہ تنہائی‘ بے بسی‘ بے یاری و بے مددگاری کے عالم میں تمہیں اس مکان سے باہر نہیں جانا چاہئے۔ مجھ پر بھروسہ کرو۔ یہاں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ کچن میں کھانے پینے کا تمام سامان موجود ہے۔ جب میں واپس آؤں گا تو تمہارے پہننے کے لئے اور کپڑے لے آؤں گا۔ یہاں تمہیں کسی بات کی تکلیف نہیں ہو گی۔ میں جب یہاں آؤں گا تو پتہ نہیں تم جاگ رہی ہو گی یا سو رہی ہو گی اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے حالات اس کیسٹ میں ریکارڈ کر دو اور ریکارڈ کرنے کے بعد اسے دوسرے کمرے میں رکھ دو۔ میں آ کر تمہارے حالات سنوں گا اور یہ سمجھنے کی کوشش کروں گا کہ کن حالات کے تحت تم گھر سے بے گھر ہو گئی ہو‘ مجھے تم سے دلی ہمدردی ہے اور اگر تم میرے دل کی بات جاننا چاہو گی تو میں سچ کہوں گا کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ تم بُرا نہ ماننا۔ میرے جذبے کو سمجھنے کی کوشش کرنا۔ اگر میں کوئی بُرا آدمی ہوتا تو باہر سے مکان کو اچھی طرح بند کر کے چلا جاتا۔ تمہارے لئے اس مکان کی چابیاں چھوڑ کر نہ جاتا۔ یہاں تمہارے لئے سب کچھ موجود ہے۔ تم اگر بھروسہ نہ کرنا چاہو تو بیرونی دروازہ کھول کر جا سکتی ہو اگر بھروسہ کرو گی تو مجھے اپنا سب سے بڑا اور سب سے مضبوط سہارا پاؤ گی۔ میں تمہارے مقدر کی تاریکی دُور کر سکتا ہوں‘ وعدہ کرتا ہوں۔ میرا نام کنور جمشید ہے۔“

اس کے بعد کیسٹ خاموش ہو گیا۔ نرگس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر سوئچ آف کر دیا۔ اس کے بعد بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ تھکن اور کمزوری سے بُرا حال تھا وہ سب کچھ بھول کر بس آنکھیں بند کر کے سو جانا چاہتی تھی مگر اب اس اجنبی کی آواز دماغ کے گنبد میں گونج رہی تھی۔ بڑی بھاری بھرکم اور متاثر کرنے والی آواز تھی۔ سیدھی دل کو چھو لیتی تھی۔ وہ تھوڑی دیر بعد گھبرا کر سوچنے لگی۔

”میں ایسا کیوں سوچ رہی ہوں؟ اس اجنبی سے میرا کیا رشتہ ہے‘ کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میں نے تو اس کی ایک جھلک دیکھی ہے اور اس وقت دیکھی ہے جب سر چکرا رہا تھا۔ مگر اب دھیمی دھیمی سی روشنی میں وہ چہرہ نظر آ رہا ہے اس کی آواز اس کے چہرے کو اجاگر کر رہی ہے مگر مجھے اس کے چہرے سے بھی کیا لینا ہے‘ میں اس کے بارے میں کیوں سوچ رہی ہوں۔“

اس نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ مگر اس کروٹ میں بھی وہ یاد آتا رہا۔ اس کی باتیں دماغ میں گونجتی رہیں۔ اس میں شبہ نہیں تھا کہ اس نے شرافت کا ثبوت دیا تھا۔ اس کے لئے مکان کے تمام کمروں کی چابیاں چھوڑ کر گیا تھا اور اسے فیصلہ کرنے کی پوری آزادی دے گیا تھا کہ وہ اس پر بھروسہ کرے یا اس کی عدم موجودگی میں وہاں سے چلی جائے۔

مگر وہ کہاں جا سکتی تھی۔ کمزوری نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ننھے سے بچے کی یاد اسے اور کمزور بناتی جا رہی تھی۔ اس مکان سے باہر جاتی تو پھر اس بھری دنیا میں خود کو تنہا پاتی۔ پتہ نہیں کوئی اتنی شرافت سے اسے پناہ دیتا یا نہیں؟

بہت سی سوچیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ یہ سوچ کر تو وہ شرم سے کٹی جا رہی تھی کہ ایک اجنبی نے اس کے کپڑے اتارے ہیں۔ اس نے کچھ اس کا بگاڑا تو نہیں تھا مگر وہ بگڑ کر سوچ رہی تھی۔

”ان مردوں کو تو بس موقع ملنا چاہئے۔ اگر میں گیلے کپڑوں میں رہتی تو کیا فرق پڑ جاتا۔ اسے ہاتھ لگانے کا موقع مل گیا۔ میں بے لباس پڑی تھی‘ پتہ نہیں بے لباسی کے دوران اس کی نگاہیں کہاں کہاں سے گزر گئی ہوں گی۔“

وہ شرم سے دوہری ہو رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو چھپا لیا تھا مگر اب چھپانے کے لئے کیا رہ گیا تھا؟ اس کی زندگی میں دوسرا مرد بِن بلائے آ گیا تھا اور اس کی مرضی جانے بغیر وہاں تک پہنچ گیا جہاں تک پہنچنے کے لئے اس نے صرف ہمایوں پاشا کو اجازت دی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ اجنبی یہاں آئے گا تو وہ کس طرح اس کا سامنا کرے

گی، نہیں وہ اس کا سامنا نہیں کرے گی۔ وہ یہاں سے چلی جائے گی۔

وہ بستر پر لیٹی ہوئی اپنے اندر حوصلہ پیدا کرتی رہی کہ وہ باہر جا کر اتنی بڑی دنیا میں تنہا زندگی گزار لے گی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بستر سے اٹھ گئی، باہر آ کر اس نے اس مکان کے دوسرے تمام کمروں کو دیکھا، اپنے بستر کے سرہانے سے وہ چابیاں لے کر آئی تھی۔ اس نے ایک چابی سے بیرونی دروازے کو کھولا۔ پھر برآمدے میں آ گئی۔ باہر بہت ہی صاف ستھرا علاقہ نظر آ رہا تھا۔ دور دور تک شاندار کوٹھیاں اور باغیچے تھے۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ کون سی جگہ ہو سکتی ہے۔ اپنے شہر میں اس نے یہ علاقہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کہیں بہت دور چلی آئی ہے۔ وہ الجھ کر رہ گئی کہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ یہ جگہ ہی انجانی تھی۔ تمام راستے انجانے تھے اور یہاں سے وہاں تک یعنی جہاں تک وہ جا سکتی تھی کوئی ایسا شناسا نہیں تھا۔ پھر وہ اس کمزوری کی حالت میں کتنی دور تک چل سکتی تھی۔ اس کا سر پھر گھومنے لگا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی دیوار کا سہارا لیتی کمرے میں واپس آ گئی اور پھر وہاں سے جانے کا فیصلہ کمزور پڑ گیا۔

وہ شام تک بستر پر پڑی رہی۔ سوچ ہی سوچ میں کس طرح وقت گزر گیا اسے پتہ ہی نہیں چلا۔ جب بھوک کا احساس ہوا تو وہ وہاں سے اٹھ کر کچن میں گئی۔ وہاں گیس کے چولہے پر دودھ کی دیگچی رکھی تھی۔ فریج میں دنیا بھر کے پھل اور میوے رکھے تھے۔ کچا گوشت بھی تھا اور تازہ سبزیاں بھی تھیں۔ اسٹور میں آٹا چاول دال سب کچھ تھا مگر وہ پکانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے نعمت خانے سے ڈبل روٹی کے چند سلائس لئے پھر اسے جیلی کے ساتھ کھانے لگی۔ چولہے پر پڑی دودھ کی دیگچی کے اوپر ایک چھوٹی سی پرچی رکھی ہوئی تھی۔ کھانے کے بعد اس نے جب اس پرچی کی طرف دھیان دیا تو اسے کھول کر پڑھا۔ اسی اجنبی کی تحریر تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

"تم بے حد کمزور ہو۔ میرا پُرخلوص مشورہ ہے کہ رات کو سونے سے پہلے ایک گلاس دودھ پی لینا۔ مجھے امید ہے کہ تم میرے مشورے پر عمل کرو گی اور اپنی صحت کا خیال رکھو گی، تمہارا کنور جمشید۔"

وہ پرچی پڑھنے کے بعد پھر سوچ میں ڈوب گئی۔ وہ کون ہے اس سے اتنی ہمدردی کا اظہار کیوں کر رہا ہے؟ کسی بھی مقصد کے لئے کر رہا ہو مگر اب تک اسے آرام پہنچانے کے لئے جتنے بھی اقدام کئے تھے ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس کی بھلائی چاہتا ہے اور

سے جلد از جلد صحت مند دیکھنا چاہتا ہے۔ یوں بھی اگر وہ دودھ پینے کا مشورہ نہ دیتا تو وہ ضرور پیتی کیونکہ بچپن ہی سے وہ سوتے وقت دودھ پینے کی عادی ہو گئی تھی۔

اس نے ایک گلاس میں دودھ لیا پھر اسے اٹھا کر اپنی خوابگاہ میں آ گئی۔ دودھ ابھی گرم تھا۔ اس نے اسے سرہانے کی میز پر رکھ دیا۔ وہ اس رات جاگنا چاہتی تھی کیونکہ اسے اجنبی کا انتظار تھا۔ مگر تھکن ابھی نہیں گئی تھی۔ اس لئے کہ اس نے بہت دنوں بعد پیٹ بھر کر کھایا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ بستر پر گر کر سو جائے۔ اس نے خود کو مصروف رکھنے کے لئے کیسٹ ریکارڈر آن کر دیا اور پھر کیسٹ کو از سر نو سیٹ کرنے کے بعد وہ اسے آن کر کے آہستہ آہستہ بولنے لگی۔

"کنور صاحب! آپ کی مہربانیوں کا بہت بہت شکریہ۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کی آمد تک جاگتی رہوں اور آپ سے ایک بار مل کر یہاں سے چلی جاؤں۔ میں آپ جیسے محسن کو ناراض کر کے نہیں جانا چاہتی۔ میں آپ کے انتظار میں جاگنا چاہتی ہوں لیکن ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں زیادہ دیر تک جاگ نہیں سکوں گی۔ اسی خیال سے اپنی آواز ریکارڈ کر رہی ہوں۔ میرا نام نرگس آفتاب ہے۔ بس نام بتا دینا ہی کافی سمجھتی ہوں۔ اپنے ماں باپ کا نام بتا کر میں ماضی کی طرف لوٹنا نہیں چاہتی۔ ہاں آپ نے درست سمجھا ہے میں نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا لیکن میں ایسی بدنصیب ہوں کہ اس کی صورت نہیں دیکھ سکی کیونکہ ...... کیونکہ .... نہیں میں اس کی وجہ نہیں بتاؤں گی جو کچھ بھی مجھ پر گزر چکی ہے میں اسے نہیں دہراؤں گی۔ میں اتنی سی عمر میں اتنے دکھ اٹھا چکی ہوں کہ اب کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہتی۔ میں نے خون کے رشتوں کو بھی چھوڑ دیا ہے۔ آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے یہاں تک پہنچا کر مجھے آرام سے زندگی گزارنے کا موقع دیا ہے لیکن میں سوچتی ہوں کہ کس رشتے سے آپ کا احسان اٹھاؤں؟ ہم اجنبی ہیں۔ بہتر ہے کہ اجنبی بن کر رہیں۔ میں نے اس گھر سے باہر جانے کی کوشش کی تھی لیکن کمزوری اور نقاہت کے باعث نہ جا سکی۔ کل تک طبیعت سنبھل گئی تو چلی جاؤں گی۔ آپ بُرا نہ مانیں، میں یہ کیسٹ ریکارڈر دوسرے کمرے میں رکھ دوں گی اور سونے سے پہلے خوابگاہ کا دروازہ لاک کر دوں گی۔ بس میں اتنا ہی کہنا چاہتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے کیسٹ ریکارڈر آف کر دیا۔ سوئچ بورڈ سے اس کا پلگ علیحدہ کر کے اسے اٹھایا پھر دوسرے کمرے میں رکھ کر واپس آ گئی۔ خوابگاہ کے دروازے کو بند کر

کے لاک کر دیا پھر بستر کے سرے پر بیٹھ کر دودھ کا گلاس اٹھا کر پینے لگی۔

دودھ پینے کے بعد وہ تھوڑی دیر تک بیٹھی رہی پھر اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ وہ تو پہلے سے ہی محسوس کر رہی تھی کہ وہ زیادہ دیر نہیں جاگ سکے گی۔ وہ بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ اسے اطمینان تھا کہ اس نے ایک اجنبی محسن کی گفتگو کے جواب میں اپنی آواز ریکارڈ کر دی ہے اور جو کچھ وہ اپنے اور اس دنیا والوں کی بے وفائیوں کے بارے میں سوچ رہی ہے وہ سب کچھ اسے بتا دیا ہے اور اسے اپنی مجبوری بتا چکی ہے کہ کیوں وہ اس کی پناہ سے نکل کر انجانی منزل کی طرف جانا چاہتی ہے۔ وہ مطمئن ہو کر سو گئی۔

دوسری صبح نو بجے اس کی آنکھ کھلی تو اسے بڑی حیرانی ہوئی کہ وہ کس طرح اتنی گہری نیند سوتی رہی ہے۔ جب وہ لحاف ہٹا کر سامنے والے قد آدم آئینے کے سامنے آئی تو پھر ایک شدید حیرانی کا ذہنی جھٹکا پہنچا۔ سامنے' فرش پر وہ لباس پڑا ہوا تھا جسے پہن کر وہ پچھلی رات سوئی تھی اور اس کے بدن پر ایک بالکل نیا جدید فیشن کا لباس تھا وہ اک دم لڑکھڑا کر بستر کے سرے پر بیٹھ گئی اور آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طلسم کدے میں آ گئی ہے۔ جاگتی ہے تو کچھ اور ہوتی ہے' سوتی ہے تو کچھ اور ہوتی ہے۔ پھر جاگتی ہے تو کچھ اور ہو جاتی ہے' اس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو صوفے پر دور تک بہت سے لباس بکھرے ہوئے تھے۔ عمدہ قیمتی لباس' شلوار کرتے' میکسی' ساڑھیاں سبھی کچھ مختلف ہینگروں میں نظر آ رہے تھے۔ وہ بوکھلائی بوکھلائی سی چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کی نظر میز پر رکھے ہوئے کیسٹ ریکارڈر پر گئی۔ اسے اس بات کی بھی حیرانی تھی کہ اس نے کمرے کو اندر سے لاک کیا تھا پھر وہ اجنبی وہاں کیسے چلا آیا؟ اور آنے کے بعد پھر وہی گستاخی کی۔ اس کے بدن سے پرانا لباس اتار کر نیا لباس پہنا دیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ اسے بڑی شرم آ رہی تھی۔

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے بستر پر گر پڑی۔ آنکھیں بند ہونے کی وجہ سے چاروں طرف اندھیرا ہو گیا تھا۔ ایسے اندھیرے میں تصور کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ اس روشنی میں اس نے دیکھا کہ وہ گہری نیند میں ڈوبی پڑی ہے اور دو اجنبی ہاتھ اس کے بدن سے کپڑے اتار کر نیا لباس پہنا رہے ہیں۔ تصور کے پردے میں وہ منظر دیکھ دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکنیں پاگل ہو رہی تھیں۔ اس نے سوچا تھا کہ اب کسی مرد کو قریب

نہیں آنے دے گی۔ وہ بہت ضدی تھی۔ ضرور ایسا کرتی مگر حالات ایسے تھے کہ اپنے قریب آنے والے اس اجنبی کو وہ روک نہیں سکی۔ اور وہ اتنا قریب آ گیا تھا' اتنا قریب آ گیا تھا کہ اس کے بعد عورت کا انکار کمزور پڑ جاتا ہے۔

اب وہ بند آنکھوں سے اسی اجنبی کو چھپ چھپ کر دیکھتی جا رہی تھی اور یہ سمجھ رہی تھی کہ اب رسمی طور پر ایک مرد سے نفرت کا اظہار کرنا فضول ہو گا جس نے تنہائی میں اسے دور دور تک دیکھ لیا تھا۔ اب وہ اسی کے قریب رہے گی بشرطیکہ وہ ایسا ہی قابلِ اعتماد ہو جیسا کہ اب تک نظر آ رہا ہے۔

سوچنے کے دوران اسے کیسٹ ریکارڈر کا خیال آیا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر سوئچ بورڈ کے پاس گئی اس کا پلگ لگا کر اسے آن کیا۔ جیسے ہی اس اجنبی کی آواز ابھرنے لگی ویسے ہی وہ دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتی ہوئی گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ اب تو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ صدیوں سے اسی آواز کے انتظار میں تھی۔ خواہ مخواہ وہ ہمایوں پاشا کے فریب میں آ گئی تھی اس اجنبی کی آواز اسے کانوں سے لے کر دل تک گدگدا رہی تھی۔

"تمہارے بدن پر جو لباس ہے وہ کیسا ہے؟ میں ایک بار پھر اس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں کیونکہ میں ذوقِ حُسن رکھتا ہوں۔ ایک انمول ہیرے کو چاندی کی انگوٹھی میں نہیں دیکھ سکتا۔ اسی لئے تمہارے بدن کے نگینے کو صحیح لباس میں جڑ دیا ہے۔ تم شاید میری اس حماقت کو نہ سمجھ سکو۔ مگر میرے ذوق کی تسکین ہو رہی ہے۔ میں تمہیں کھلتے ہوئے رنگوں کے لباسوں کے ہجوم میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اسی لئے تمہارے پرانے لباس کو کل رات فیتے سے ناپ کر گیا تھا۔ تاکہ تمہارے لئے یہ تمام ملبوسات تیار کروا سکوں۔ ایک ہی دن میں جو ہو سکا وہ تمہارے سامنے حاضر ہے۔

میں نے ریکارڈر میں تمہاری آواز سنی۔ تمہاری رس بھری آواز ایک مرد کو یہ سوچنے پر مجبور کر رہی ہے کہ تنہائی میں تمہاری مدھم مدھم سی سرگوشیاں کیسی جذبات انگیز ہوتی ہیں لیکن تمہاری سریلی آواز نے یہ کہہ کر مجھے دکھ پہنچایا ہے کہ تم یہاں سے جانا چاہتی ہو۔ کیا ایک انسان کو اس کے خلوص کا یہی بدلہ دیا جاتا ہے۔ میں نے تمہیں ناخن برابر بھی نقصان نہیں پہنچایا۔ اگر تمہیں اس وجہ سے تکلیف پہنچی ہو کہ میں نے تمہارے لباس کو ہاتھ لگایا ہے تو میری التجا ہے کہ اس تکلیف کو خوشی سے برداشت کر لو کیونکہ تمہاری زندگی میں کوئی نہ کوئی مرد ضرور آئے گا اور وہ لباس اتارنے اور لباس پہنانے کا

حقدار ہو گا۔ کیا تم مجھے حقدار نہیں بنا سکتیں؟ میں اسی ریکارڈر میں تمہارے جواب کا انتظار کروں گا اور تمہارا جواب یہی ہونا چاہئے کہ تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گی۔"

نرگس نے ریکارڈر کو آف کر دیا۔ تھوڑی دیر تک اس کے سامنے سر جھکائے اس طرح شرماتی رہی جیسے اس کے سامنے ریکارڈر کی جگہ اجنبی بیٹھا ہو۔ ایسا احساس کیوں نہ ہوتا جبکہ وہ اجنبی کی آواز میں بول رہا تھا اور اجنبی کی شخصیت کو اس کے ذہن میں اس طرح نقش کر رہا تھا کہ اب وہ اجنبی نہیں رہا تھا وہ اس کا اپنا کنور جمشید تھا۔

اس نے کیسٹ کو دوبارہ سیٹ کر کے اپنا جواب ریکارڈ کیا اس کا جواب دو لفظوں میں تھا۔

"نہیں جاؤں گی۔"

اس نے ریکارڈر کو آف کر دیا پھر اسے لے جا کر اسی دوسرے کمرے میں رکھ دیا جہاں پچھلی رات رکھا تھا۔

اس کے بعد وہ سارا دن گنگناتی رہی۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے کھانا پکایا خود کھایا اور جمشید کے لئے بھی بچا کر رکھا۔ رات آئی تو حسبِ معمول ایک گلاس دودھ پی کر بستر پر سو گئی۔

دوسری صبح آنکھ کھلنے سے پہلے جب اس کا ذہن بیدار ہوا تو اسے اپنے کانوں کے قریب خراٹوں کی آواز سنائی دی۔ بڑے ہی مردانہ قسم کے خراٹے تھے۔ سیدھے سینے پر کر بج رہے تھے۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کے سینے پر کسی اور کے دل کی دھڑکنیں بج رہی ہیں۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا تو وہ اجنبی اس کے پہلو میں تھا بلکہ وہ اجنبی کے پہلو میں تھی۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ یہ اس کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ نیند کی حالت میں دونوں شیر و شکر ہو گئے تھے۔ شیر و شکر کی آمیزش سے جو پیار کی شیرینی تیار ہوتی ہے وہ تیار ہو چکی تھی۔

اس نے فوراً ہی پھر سے آنکھیں بند کر لیں کہ یہ خواب ہے تو ٹوٹنے نہ پائے۔ بڑا سہانا اور دو رخا خواب تھا۔ سوتے میں وہی نظر آتا تھا۔ جاگتے میں بھی سانسوں کے قریب ہو جاتا تھا۔ ہر لڑکی ایسے ہی خواب کی آرزو کرتی ہے جو جاگنے پر بھی نہ ٹوٹے۔

وہ نہیں ٹوٹ رہا تھا مگر یہ اندر ہی اندر شرم سے سکڑتی اور سمٹتی جا رہی تھی کہ اجنبی آنکھ کھولے گا تو وہ اس کا سامنا کیسے کرے گی۔ اسے یہی بہتر صورت نظر آئی کہ وہ

چپ چاپ آنکھیں بند کئے پڑی رہے۔ وہ نیند سے بیدار ہو گا تو خود ہی اس سے الگ ہو کر بستر سے اتر جائے گا۔ باتھ روم کی طرف جائے گا تو یہ آنکھ کھول کر اٹھ بیٹھے گی۔ اسے یہی تدبیر مناسب نظر آ رہی تھی۔

مگر سوچی ہوئی باتیں کب پوری ہوتی ہیں۔ ذرا دیر بعد وہ نیند کی حالت میں کسمسانے لگا اور کسمسانے کے دوران اپنے بازوؤں میں آئی ہوئی چیز کو یوں بھینچنے لگا جیسے خواب میں کسی کو گلے لگا رہا ہو۔ وہ تو سچ مچ گلے لگ رہی تھی۔ اس کی سانس الجھ رہی تھی۔ وہ اپنی مرضی سے اس کی آغوش میں نہیں آئی تھی اور اپنی مرضی سے جانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ بڑی مشکل تھی۔ ان بازوؤں میں مر جانے کو جی چاہتا تھا۔ پھر اس کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

"میری نرگس! میں نے پہلی بار تمہیں دیکھتے ہی سمجھ لیا تھا کہ تم صرف میرے لئے سمندر کے ساحل پر بھیجی گئی ہو۔ میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔ وعدہ کرو کہ تم مجھے کبھی چھوڑ کر نہیں جاؤ گی۔"

نرگس نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔

"میں کیا کہوں آپ تو نیند میں ڈوبے ہوئے ہیں خواب میں بول رہے ہیں۔ ورنہ میں آپ کو بتا دیتی۔ بتانا بھی کیا تھا آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ مجھے قریب لانے کے لئے آپ نے جو انداز اختیار کیا ہے اس کے بعد کوئی عورت کسی دوسرے کا تصور نہیں کر سکتی۔ میں آپ کی ہوں آپ کی رہوں گی۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میں آپ کو چھوڑ کر جا بھی کہاں سکتی ہوں۔ کاش کہ آپ میری آواز سن سکتے اور اس طرح نیند میں نہ بڑبڑاتے۔"

اسے اپنے کانوں کے قریب سرگوشی سنائی دی۔

"میری جان! میں نیند میں نہیں ہوں ہوش میں ہوں۔"

اس نے ایک دم سے چونک کر سر اٹھایا تو دو بڑی بڑی آنکھیں اس پر جھکی ہوئی تھیں اس نے جلدی سے سر کو جھکا لیا اور اس کے کشادہ سینے میں منہ کو چھپانے لگی۔

☆======☆======☆

دو ماہ گزر گئے اس عرصے میں سارے حجاب اٹھ گئے۔ اب وہ ایسی زندگی گزار رہی تھی جیسے ایک عورت اپنے خاوند کے ساتھ گزارتی ہے اور گھر کے اور شوہر کے تمام

فرائض ادا کرتی رہتی ہے۔ دو ماہ بعد نرگس نے اس سے کہا۔

"آخر ہم کب تک اس طرح زندگی گزاریں گے، ہمیں نکاح پڑھوا لینا چاہئے۔"

کنور جمشید نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم جلد از جلد قانونی اور مذہبی طور پر میری بیوی بن جاؤ لیکن میں تمہیں بتا دوں کہ میری بیوی کو مرے ہوئے ابھی چھ ماہ گزرے ہیں۔"

"بیوی!"

اس نے پہلے تو بیوی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ عجیب قسم کا انسان تھا اپنی باتیں اپنے پیٹ میں رکھتا ہے کبھی ضرورت محسوس کرتا تو بتا دیتا ورنہ اسی سے اس کی باتیں اُگلواتا رہتا تھا۔

اس دوران نرگس نے اپنے اور اپنے والدین کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ کس طرح اس کے بچے کو سمندر کی لہروں کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے بڑے بڑے راز بتا چکی تھی۔ ہمایوں پاشا سے کس طرح تعلقات ہوئے۔ یہ بھی نہیں چھپایا تھا۔ وہ بہت گہرا انسان تھا۔ چہرے سے بھی پتہ چلتا تھا کہ اندر سے بہت سخت ہے مگر اوپر سے مکھن جیسی ملائم باتیں کرتا تھا۔

اس روز بھی جب نرگس نے نکاح پڑھوانے کی بات چھیڑی تو وہ شادی کی بات یہ کہہ کر ٹالنے لگا کہ اس کی پہلے بھی شادی ہو چکی تھی اور اس کی بیوی کو مرے ہوئے ابھی چھ ماہ گزرے ہیں۔ اتنی جلدی دوسری شادی کرے گا تو اس کے بچے برا مانیں گے۔

تب یہ بات کھلی کہ اس کے بچے بھی ہیں یعنی دو لڑکے ہیں ایک لڑکا تقریباً بیس برس کا اور دوسرا سولہ سال کا ہے۔ نرگس شکایتیں کرنے لگی کہ اس نے پہلے یہ باتیں کیوں نہیں بتائیں۔ اس کی شکایت کے جواب میں اس نے کہا۔

"اگر میں تمہیں یہ باتیں بتا دیتا تو کیا تم میری محبت سے انکار کر دیتیں؟"

نرگس نے سر کو جھکا لیا۔ واقعی وہ بتا بھی دیتا تو کیسے انکار کر دیتی؟ وہ اس کی زندگی میں کچھ ایسے انداز سے آیا تھا کہ وہ انکار کر ہی نہیں سکتی تھی اب اس کے دماغ سے ہلکی سی دھند چھٹنے لگی۔ وہ محسوس کرنے لگی کہ کنور جمشید نے اس سے ایک عاشقانہ انداز میں محبت نہیں کی بلکہ سازش کی ہے۔ اسے اپنی طرف مائل کرنے اسے حاصل کرنے اور اس کے ساتھ رنگین لمحات گزارنے کے لئے بڑے ہی ڈرامائی انداز میں اس

ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے باتیں کرتا رہا۔ پھر یہ کہ اس کی بیہوشی کے دوران اور اس کی گہری نیند سونے کے دوران وہ لباس تبدیل کرنے کے سلسلہ میں جس قدر قریب آ گیا تھا اس کے بعد تو وہ اس کی محبت سے انکار کر ہی نہیں سکتی تھی۔

اس کا دل گھبرانے لگا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ مکھی کی طرح مکڑی کے جال میں پھنس گئی ہے۔ وہ اس کے بازوؤں میں نہیں ہے، کسی شکنجے میں ہے جو اس کے اطراف آہستہ آہستہ سخت ہوتا ہوتا اسے اپنے اندر پیس کر رکھ دے گا۔ پھر وہ اپنے آپ کو تسلیاں دینے لگی۔ اپنے آپ کو سمجھایا کہ گھبرانے کی کیا بات ہے۔ اس نے صرف جھوٹ کہا ہے یعنی اپنی شادی اور بچوں کی بات چھپائی ہے۔ اس نے دھوکہ تو نہیں دیا۔ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر چند ماہ انتظار کرنے کے لئے کہہ رہا ہے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ دو ماہ تو اس کے ساتھ گزار ہی چکی ہے چند ماہ اور گزارے گی۔ اس کے بعد وہ اسے دلہن بنا کر اپنی حویلی میں لے جائے گا۔

ایک ویران سے پہاڑی علاقے میں اس کی حویلی تھی۔ وہ شہر میں تفریحات کی غرض سے آتا تھا۔ اسی مقصد کے لئے اس نے وہ چھوٹا سا مکان خرید رکھا تھا جہاں نرگس ان دنوں اس کی تفریح کا سامان بنی ہوئی تھی۔ اس نے کنور جمشید سے حویلی کے بارے میں کئی بار بہت سے سوالات کئے کہ وہ اس ویران علاقے میں کیوں ہے اور وہاں اس کے خاندان کے کتنے افراد رہتے ہیں؟ وہ بے دلی سے جواب دیتا تھا۔ اس کے رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اپنی حویلی سے اور اپنے بچوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔

اس مکان میں آنے کے چار ماہ بعد ایک دن نرگس نے پریشان ہو کر کہا۔ "آپ مجھ سے فوراً نکاح پڑھوا لیں، میں آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔"

یہ بات سنتے ہی کنور جمشید کا چہرہ خوشی سے کِھل گیا۔ اس نے نرگس کو بازوؤں میں لے کر دیوانہ وار پیار کرتے ہوئے پوچھا۔

"ایک بیٹا پیدا کرو گی نا؟"

بڑا احمقانہ اور بڑا ہی بچگانہ سوال تھا۔ نرگس چند لمحوں تک اس کا منہ تکتی رہی پھر بولی۔

"میں کیسے بتاؤں کہ بیٹا ہی پیدا ہو گا۔"

"کیوں نہیں ہو گا، پہلے بھی تم نے ایک بیٹا پیدا کیا ہے، اسی لئے تو میں نے تمہیں

اپنایا ہے کہ تم میرے لئے بھی بیٹا پیدا کرو گی۔"

"کیا مطلب؟" نرگس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا تمہیں میری ذات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی؟ کیا تم صرف اس لئے میرے قریب آئے تھے کہ میں تمہارے لئے بیٹا پیدا کروں؟"

نرگس کا موڈ بگڑتے دیکھ کر وہ جلدی سے بولا۔

"نن، نہیں .... یہ بات نہیں ہے، میں تو تمہیں چاہتا ہوں۔ تم سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں مگر دیکھو نا، آئندہ نسل چلانے کے لئے ہر شخص بیٹے کی آرزو کرتا ہے۔"

"مگر تمہارے دو بیٹے تو پہلے ہی موجود ہیں پھر یہ کیا ضروری ہے کہ تم ایک بیٹے کی آرزو لے کر میرے پاس آؤ۔ کیا وہ دونوں بیٹے تمہارا نام آگے نہیں بڑھائیں گے؟"

وہ یک بیک جھنجلا کر اسے اپنے بازوؤں سے الگ کرتے ہوئے بولا۔

"فضول بحث نہ کرو، میں ایک بہت ہی خوبصورت بیٹا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری آئندہ نسل کو تمہارا حسن اور بانکپن ملے۔ تم بے حد حسین ہو اسی لئے میں تم سے ایک بیٹا چاہتا ہوں۔"

وہ اپنی تعریف سن کر خوش ہو گئی اور سوچنے لگی کہ وہ ایک بیٹے کے لئے اس کے قریب آیا تھا لیکن اس سلسلے میں اس کے حسن و شباب کی بھی اہمیت ہے۔ وہ آگے بڑھ کر اس کے گلے میں بانہیں ڈالتی ہوئی بولی۔

"میں دعا کروں گی کہ بیٹا ہی ہو مگر اب مجھ سے نکاح پڑھوا لو۔"

"میں تمہیں اپنی مجبوریاں بتا چکا ہوں۔ اتنی جلدی شادی کروں گا تو میرے دونوں جوان بیٹے برا منائیں گے کہ ان کی ماں کے مرتے ہی میں نے دوسری شادی کر لی ہے۔"

"مگر نکاح نہیں پڑھواؤ گے تو میرا بیٹا ناجائز کہلائے گا۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس کی بات سے قائل ہو کر بولا۔

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔ ہم اپنے اس بچے کو بدنام نہیں ہونے دیں گے۔ میں کل صبح ہی کسی قاضی کو پکڑ لاؤں گا۔ گواہ کے طور پر میرے دو دوست ہوں گے۔ پھر ہم میاں بیوی کے رشتے میں منسلک ہو جائیں گے۔"

دوسرے دن کنور جمشید نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ صبح ایک قاضی صاحب اور اس کے دو دوست آئے اور اسے کنور جمشید کی شریکِ حیات بنا کر چلے گئے۔ جمشید نے نکاح نامے

کی ایک کاپی اپنے پاس رکھ لی اور دوسری اسے دے دی۔ نرگس نے اسے بڑی حفاظت سے اپنے پرس میں رکھ لیا کیونکہ اس کے ذریعہ وہ ساری زندگی کے لئے جمشید کو اپنا قیدی بنا چکی تھی۔

مرد کو اپنا پابند بنا لیا جائے تو وہ عورت کی خواہش کے مطابق ہی سوچتا ہے۔ سہاگ کی سیج پر جمشید نے اسے اپنے سینے لگاتے ہوئے کہا۔

"اب میں چاہتا ہوں کہ تمہیں حویلی میں لے جا کر رکھوں تاکہ تم میری ماں کی نظروں کے سامنے رہو اور بچے بھی رفتہ رفتہ تم سے مانوس ہو جائیں۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔

"ہم کب یہاں سے چلیں گے؟"

"کل ہی جائیں گے لیکن وہاں کسی کے سامنے اپنی شادی کا اعلان نہیں کریں گے۔"

نرگس کا خوشی سے کھلا ہوا چہرہ مرجھا گیا۔ کوئی عورت یہ برداشت نہیں کرتی کہ بیوی ہو کر بھی بیوی کے رشتے سے پہچانی نہ جائے۔ اس نے اعتراض کیا۔

"میں آپ کی بیوی بن چکی ہوں، پھر آپ اپنی والدہ اور بچوں کے سامنے اس رشتے سے کیوں انکار کریں گے؟"

"تم نہیں سمجھتیں۔ ہر بات اپنے وقت پر متاثر کرتی ہے۔ جب وقت آئے گا تو ہم اس رشتے کو ظاہر کر دیں گے۔"

وہ جھنجلا کر بولی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کس وقت کا انتظار ہے؟ ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے پھر اسے کیوں چھپایا جائے۔"

کنور جمشید کے تیور بدل گئے۔ اس نے اپنی آغوش سے اسے دھکیل کر کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

"میں عورت سے بحث کرنا پسند نہیں کرتا۔ تم میری بیوی ہو میں جو حکم دوں گا تمہیں اس پر عمل کرنا ہو گا۔"

"میں بھی آپ کی بیوی ہوں، میں بھی یہ پوچھنے کا حق رکھتی ہوں کہ آپ اس شادی کو کیوں چھپانا چاہتے ہیں؟"

"میں اس کا جواب یہی دوں گا کہ تمہیں اس مکان میں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ تم تنہا

یہاں کے در و دیوار سے اپنے حقوق منواتی رہنا۔"

وہ بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور دل برداشتہ ہو کر اس کا منہ تکنے لگی۔ یہ وہی شخص تھا جو کل تک اس کی محبت کا دم بھرتا تھا اور اس کی ہر بات مانتا تھا۔ اب مجازی خدا بن کر صرف اپنی بات منوانا چاہتا تھا۔ عورت اپنے اندر اسی وقت تک کشش رکھتی ہے جب تک وہ بیوی نہ بنے۔ بیوی بننے کے بعد ایک عام استعمال کی چیز بن کر رہ جاتی ہے۔

وہ ایک گہری سانس لے کر حالات سے سمجھوتہ کرنے لگی کہ اب تو بیوی بن چکی ہے اب اس کی بات نہیں مانے گی تو اس کی محبت اور توجہ کی محتاج بن کر رہ جائے گی اس نے آگے کی طرف جھک کر اس کے کشادہ سینے پر اپنا سر رکھ دیا اور اس کی بات ماننے کے لئے اس کے سامنے جھک گئی۔

دوسرے دن وہ جمشید کے ساتھ کار میں بیٹھ کر شہر کے ہنگاموں سے دُور اس پہاڑی علاقے میں آ گئی۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی کی بلندی پر سرخ پتھروں سے بنی ہوئی پرانے طرز کی ایک بہت بڑی حویلی تھی جو اندر سے بڑی خوبصورتی سے آراستہ تھی۔ اس حویلی میں زیادہ افراد نہیں تھے۔ صرف جمشید کی ماں اور اس کے دو جوان بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام شہریار تھا' وہ بیس برس کی عمر میں بھی پچیس برس کا گھبرو جوان نظر آتا تھا جبکہ نرگس سترہ برس کی تھی۔ اگرچہ وہ سترہ برس کی عمر میں دوسرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اس کے باوجود وہ کسی کل سے ایک مکمل عورت نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے چہرے اور اس کے جسم پر دوشیزگی کا تمام نکھار موجود تھا۔ ایسی صورت میں وہ شہریار کے سامنے کھڑی ہو کر اس کی سوتیلی ماں نظر نہیں آتی تھی۔ جمشید نے اس کا تعارف اپنی سیکرٹری کی حیثیت سے کرایا تھا اور شہریار اس تعارف سے کچھ زیادہ خوش نہ ہوا تھا وہ رسمی طور پر خوشی کا اظہار کر کے وہاں سے چلا گیا تھا۔

نرگس نے پہلی ہی ملاقات میں یہ محسوس کیا تھا کہ دونوں جوان بیٹے اپنے باپ سے ڈرتے ہیں اور اس کے سامنے زیادہ دیر تک کھڑے رہ کر باتیں نہیں کرتے۔ باپ کے خوف سے ہی شہریار نے نرگس کو دیکھ کر رسمی طور پر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ دوسرا بیٹا شہباز نرگس سے ایک سال چھوٹا تھا۔ وہ تھوڑی دیر باتیں کرتا رہا۔ پھر اس کی دادی یعنی جمشید کی ماں اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ بڑھیا اب رشتے میں نرگس کی ساس تھی اور ایک روایتی ساس کی طرح اپنی صورت ہی سے ظالم نظر آتی تھی۔ اس نے بڑی ناگواری سے

نرگس کو دیکھا پھر منہ بنا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ نرگس کو اس ماحول سے وحشت سی ہونے لگی' وہ اتنی بڑی حویلی میں ایک بڑے گھر کی بہو بن کر رہنے کا خواب دیکھتی آئی تھی اور یہاں آ کر اس کے خواب ریزہ ریزہ ہو گئے تھے۔

اس حویلی کی اونچی اونچی دیواریں' دیوہیکل دروازے اور بڑے بڑے کمرے سب اس کے لئے اجنبی بن گئے۔ ستم یہ کہ دوسرے دن جمشید کسی کام کے بہانے سے اسے وہاں تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ تمام دن ایک پر کٹے پرندے کی طرح حویلی میں اِدھر اُدھر پھڑپھڑاتی رہی۔ وہ حویلی بارہ کمروں پر مشتمل تھی۔ بڑھیا اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ دو کمرے دو بیٹوں کے لئے مخصوص تھے۔ باقی تمام کمرے خالی پڑے ہوئے تھے۔ اگرچہ ہر کمرے میں ضروریاتِ زندگی کا تمام سامان موجود تھا مگر انہیں استعمال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ وہاں عجیب سی ہولناک ویرانی تھی۔ تمام کمروں کو دیکھتی ہوئی وہ ایک ایسے کمرے میں پہنچی جہاں مجرموں کو اذیتیں پہنچانے والے خوفناک اوزار رکھے ہوئے تھے۔ ایسے ایسے اذیت رساں اوزار تھے کہ انہیں دیکھتے ہی اس کی سانس حلق میں آ کر پھنسنے لگی۔ سارے بدن میں کپکپی سی دوڑنے لگی۔ وہ وہاں سے بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اور بستر پر گر کر رونے لگی۔ حالانکہ ابھی اسے کسی نے اذیت نہیں پہنچائی تھی۔ مگر اس کا دل بُری طرح گھبرا رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ بہت ہی غلط جگہ آ گئی ہے۔ اس کے دل میں آیا کہ وہ وہاں سے بھاگ جائے مگر وہ بھاگ کر کہاں جا سکتی تھی جس نکاح نامے کو اس نے بڑے فخر سے یہ سوچ کر اپنے پرس میں رکھا تھا کہ اس نے کنور جمشید کو ازدواجی رشتے میں قید کر لیا ہے۔ اب وہی نکاح نامہ اسے سمجھا رہا تھا کہ وہ خود ساری زندگی کے لئے اس پُراسرار حویلی کے قید خانے میں آ گئی ہے اور نکاح کے نام پر اپنے پیروں میں زنجیریں ڈال لی تھیں۔

وہ کہیں نہیں جا سکتی تھی کیونکہ وہ اب اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی اور نکاح کے بعد وہ بچہ جائز ہو گیا تھا اب کوئی اس کے بچے کو سمندر میں نہیں پھینک سکتا تھا۔ ایک بچے کا زخم کھا کر وہ دوسرے بچے کی حفاظت کے لئے وہاں رہنے پر مجبور تھی۔

تمام دن اسے کھانے کے لئے کسی نے نہیں پوچھا۔ رات آئی تو چھوٹا لڑکا شہباز ایک کیروسین لیمپ لے کر اس کے کمرے میں آ گیا اور اس کے سرہانے رکھ کر خاموشی سے واپس چلا گیا۔ اس کے بعد شہریار کھانے کی پلیٹیں لے کر آیا۔ اس نے پلیٹوں کو میز پر

رکھتے ہوئے نرگس کو دیکھا جو اسے دیکھتے ہی بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ شہریار چند لمحوں تک بڑی خاموشی سے اس کے سراپا کو گھورتا رہا۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی اس نے انسانوں کو تو دیکھا تھا مگر انسانی آواز نہیں سنی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہاں کوئی بولنا نہیں جانتا تھا۔ سب قوتِ گویائی سے محروم تھے۔ اتنی دیر بعد اس نے پہلی بار شہریار کی آواز سنی۔

"تمہارا نام نرگس ہے نا؟"

"آں' ہاں۔" وہ جواب دیتی ہوئی یوں اندر ہی اندر لرزنے لگی جیسے اس کے سامنے ایک اجنبی نوجوان کھڑا ہو۔ جمشید کے رشتے سے وہ کسی طرح ایک بیٹا نظر نہیں آتا تھا کیونکہ وہ جمشید سے بھی زیادہ قد آور تھا اور وہ اس کے سامنے ایک چھوٹی سی لڑکی نظر آتی تھی۔ شہریار نے کہا۔

"تم اپنے نام کی طرح حسین ہو۔"

وہ اک دم سے چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ اس انداز میں میری تعریف نہ کرو۔ میں تمہارے باپ کی سیکرٹری نہیں' اس کی بیوی ہوں۔ اس رشتے سے تمہاری ماں ہوں لیکن وہ اس رشتے کا اظہار نہیں کر سکی۔ جمشید نے سختی سے منع کیا تھا کہ وہ وقت سے پہلے اس رشتے کا اظہار نہ کرے ورنہ پچھتائے گی۔ وہ جھجکتی ہوئی بولی۔

"شہریار! تم مجھ سے اس انداز میں گفتگو نہ کرو۔"

"کیوں' گلاب کو گلاب کہنا جرم ہے؟"

"نہیں' میں تمہارے باپ کی۔" وہ کہتے کہتے سنبھل گئی پھر بات بدل کر بولی۔ "میں تمہارے باپ کی سیکرٹری ہوں۔"

"میں اپنے ڈیڈی کے حُسنِ ذوق کو خوب سمجھتا ہوں۔ وہ اپنے لئے اکثر خوبصورت لڑکیوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ تم سے پہلے بھی یہاں کئی خوبصورت لڑکیاں آ چکی ہیں مگر تمہاری جیسی حسین لڑکی میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھی ہے اور جب سے تمہیں دیکھا ہے تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا ہوں۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔"

وہ کسی قدر گھبراتی ہوئی بولی۔

"محبت اچھی چیز ہے مگر جس انداز میں تم اپنی محبت کا اظہار کر رہے ہو وہ میرے

لئے پریشانی کا باعث ہے۔ تم میرا خیال دل سے نکال دو۔"

"کیسے نکال دوں؟ مجھے تم سے اتنی محبت ہے' اتنی ہمدردی ہے کہ میں تمہیں ایک بہت بڑے خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا۔"

خطرے کی بات سنتے ہی نرگس اک دم سے سنبھل کر بیٹھ گئی۔ چشم زدن میں نگاہوں کے سامنے اذیت رسانی کے تمام اوزار اِدھر سے اُدھر گھومنے لگے۔ اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کیسا خطرہ؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں جو کچھ بھی کہنا چاہتا ہوں اس سے پہلے تمہارا اعتماد حاصل کرنا ضروری ہے اگر تم نے میری باتیں ڈیڈی تک پہنچا دیں تو پھر ہم دونوں ہی کے سر پر موت منڈلانے لگے گی۔"

نرگس کے سینے میں سانسیں الجھنے لگیں۔ وہ گھبرا کر بولی۔

"میں تمہارے ڈیڈی سے کچھ نہیں کہوں گی۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ جلدی کہو' میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

"میں تم سے بے انتہا محبت کرنے لگا ہوں اس لئے تمہیں ضرور بتاؤں گا۔ ڈیڈی اب تک یہاں سیکرٹری کے نام پر تین عدد عورتوں کو لا چکے ہیں۔ سات برس کے عرصے میں تم چوتھی عورت ہو۔ عورت نہیں بلکہ ایک نادان لڑکی ہو۔ تم سے پہلے آنے والیاں کچھ نہ کچھ تجربہ کار تھیں۔ اس کے باوجود وہ اس حویلی میں آ کر کہاں غائب ہو گئیں' یہ میں نہیں جانتا۔ میرا خیال ہے کہ دادی اماں سب کچھ جانتی ہیں اور اپنے بیٹے کے جرائم کو اپنے سینے میں چھپا کر رکھتی ہیں۔"

نرگس وحشت زدہ نظروں سے شہریار کا منہ تکنے لگی۔ وہ ان تین عورتوں کے متعلق سوچ رہی تھی جو یہاں آنے کے بعد نقش قدم چھوڑے بغیر کہیں پُراسرار طریقے سے غائب ہو گئی تھیں۔ وہ پریشان ہو کر بولی۔

"دیکھو شہریار! مجھے دہشت زدہ نہ کرو۔ میں تمہاری بات پر کیسے یقین کروں؟"

"یقین نہیں کرو گی تو مجھے افسوس ہو گا۔ نہ جانے کیوں ڈیڈی یہ چاہتے ہیں کہ ان کے پاس جو عورت آئے وہ ان کے لئے ایک بیٹا پیدا کرے مگر ان میں سے ایک عورت

بانجھ نکلی۔ باقی دو عورتوں نے لڑکیاں پیدا کیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر ان میں سے کوئی بیٹا پیدا کر لیتی تو شاید وہ ڈیڈی کی دوسری بیوی بن کر رہ جاتی۔"

نرگس کے دماغ میں جمشید کی باتیں گونجنے لگیں۔ جمشید نے بھی اس سے یہی کہا تھا کہ وہ ایک بیٹا پیدا کرے کیونکہ اس کے دونوں بیٹے حسین نہیں ہیں۔ وہ اپنی آئندہ نسل کو خوبصورت دیکھنا چاہتا ہے لیکن اس کے سامنے کھڑا ہوا شہریار اگر خوبصورت نہیں تھا تو بدصورت بھی نہیں تھا۔ ایک اچھا قبول صورت لڑکا تھا لیکن پتہ نہیں جمشید کس قسم کی اسپیشل خوبصورتی' چاہتا تھا۔ نرگس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ شہریار کہہ رہا تھا۔

"ڈیڈی تمہیں سیکرٹری بنا کر یہاں لائے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے تم سے رومانس کی ابتدا کر دی ہو۔ اگر ایسا ہے تو بچ کر رہو۔ میری باتوں پر غور کرو۔ اگر میری باتیں سمجھ میں آ جائیں تو میں تمہیں اس حویلی سے نکال کر لے جانے کی کوشش کروں گا۔ اگرچہ میں بھی ڈیڈی کے حکم کے بغیر حویلی سے قدم نہیں نکال سکتا ہوں۔ جب کبھی مجھے شہر کی طرف جانا ہوتا ہے تو وہ حویلی کے احاطے سے شکاری کتوں کو ہٹا دیتے ہیں۔ وہ کتے صرف ڈیڈی کو جانتے ہیں مگر میں چپکے چپکے اس کوشش میں مصروف ہوں کہ وہ میری بوباس کو بھی سمجھ لیں اور مجھ سے اس طرح مانوس ہو جائیں کہ کبھی ضرورت کے وقت یہاں سے نکلتے وقت وہ میرے لئے رکاوٹ نہ بنیں۔ مجھے یقین ہے کہ بہت جلد مجھے کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ ایسے وقت میں تمہیں یہاں سے نکال لے جاؤں گا' بس میری اتنی سی التجا ہے کہ تم مجھ پر اعتماد کرو اور ڈیڈی کی قربت سے بچ کر رہو۔"

یہ کہہ کر وہ نرگس کو سوچنے کے لئے چھوڑ کر چلا گیا۔ اب سوچنے کے لئے کیا رہ گیا تھا۔ وہ تو جمشید کے قریب جا کر اپنا سب کچھ ہار چکی تھی اور اب اس کے بیٹے کی ماں بننے والی تھی۔ بیٹے کی ماں؟

وہ کیسے کہہ سکتی تھی کہ اس بار بھی ایک بیٹے کو جنم دے گی' اگر بیٹی پیدا ہوتی تو؟

وہ خوف کی شدت سے کانپ گئی۔ عورت نکاح نامے سے نہیں صرف مرد کی خواہش پوری کر کے ہی اس کے سامنے اپنی اہمیت منوا سکتی ہے۔ اسے اپنے سہاگ کی سلامتی کے لئے اور خود اپنی سلامتی کے لئے ایک بیٹا پیدا کرنا تھا ورنہ وہ اس پُراسرار حویلی کی بھول بھلیوں میں ہمیشہ کے لئے نابود ہو جاتی۔

اس کے سامنے میز پر کھانا رکھا ہوا تھا۔ وہ صبح سے بھوکی تھی۔ مگر اب کھانے کو ہاتھ

لگانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بھوک مر چکی تھی اور دہشت پیدا کرنے والی پریشانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ ایسے میں کھانا پینا' سونا بیٹھنا' کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ وہ بڑی پریشانی سے سوچ رہی تھی کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے۔ کیا شہریار کی بات کا یقین کر کے اس کے ساتھ فرار ہو جانا چاہئے؟

اس کے چشمِ تصور میں شہریار اور جمشید آ کر کھڑے ہو گئے' وہ کبھی جمشید کو اور کبھی شہریار کو دیکھنے لگی کہ کس پر بھروسہ کرے۔ جمشید کو وہ آزما چکی تھی۔ وہ بعض حالات میں بعض اوقات اس حد تک پُراسرار نظر آتا تھا کہ وہ اس سے بُری طرح خوف زدہ ہو جاتی تھی۔ اب بھی اس کی یہی حالت تھی۔ جمشید کی پُراسراریت نے اسے بہت سے وسوسوں اور اندیشوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایسی حالت میں شہریار جیسا اجنبی نوجوان اسے مہربان اور ہمدرد نظر آ رہا تھا۔

لیکن عورت جس مرد کے ساتھ تنہائی کے لمحات گزارتی ہے ان لمحات کی ایک ایک محبت اسے یاد آتی ہے۔ اپنا محبوب ہو یا اپنا شوہر ہو' اسے دشمن سمجھنے کو جی نہیں چاہتا۔ گزری ہوئی محبت کی ادائیں اسے اس خوش فہمی میں مبتلا رکھتی ہیں کہ وہ باوفا ہے۔ جمشید کے خلاف اتنا کچھ سننے کے بعد بھی وہ اسے اپنا دشمن نہیں سمجھ رہی تھی۔ اس کا دل نہیں مانتا تھا کہ اس کے ہونے والے بیٹے کا باپ کسی موقع پر اس کی جان کا دشمن بن سکتا ہے۔

پھر وہی بیٹا۔ اگر بیٹا نہ ہوا تو؟ اب وہ ہونے والا بچہ اس کے دماغ میں چبھ رہا تھا۔ اس کی محبت کا' اس کے سہاگ کا اور اس کی زندگی کا انحصار صرف ایک بیٹے پر تھا۔ بیٹا نہ ہوگا تو وہ بھی نہ رہے گی۔

پھر وہی اذیت پہنچانے والے اوزار اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے اور اس کے آس پاس آہنی آوازوں سے بجنے لگے۔ اس کے دماغ میں یہ سوال کلبلانے لگا کہ جمشید میاں بیوی کے رشتے کو کیوں چھپا رہا ہے؟ کیا اس لئے چھپا رہا ہے کہ اسے اپنے بچے کا انتظار ہے؟ ہاں! اس نے کہا تھا کہ اسے وقت کا انتظار ہے' وہ وقت آنے پر شادی کا اعلان کرنا چاہتا ہے۔

وہ تھوڑی دیر تک بے چینی سے ٹہلتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے؟ کسے اپنا سمجھنا چاہئے۔ جسے اپنا سمجھتی آ رہی تھی وہ بڑی حد تک جان کا دشمن نظر آ رہا تھا۔ ایسے وقت شہریار ہی ایک ہلکی سی روشنی کی کرن نظر آ رہا تھا۔ وہ اس

کے مشورے پر عمل کرے گی یا نہیں کرے گی؟ ابھی اس نے یہ فیصلہ نہیں کیا تھا مگر اس سے کچھ دیر باتیں کر کے اس ہولناک تنہائی سے بچنا چاہتی تھی' جو اسے ڈراتی اور رلاتی جا رہی تھی۔

وہ اپنے کمرے سے نکل کر شہریار کے کمرے کی طرف جانے لگی۔ مختلف راہداریوں سے گزرنے کے بعد جب وہ وہاں پہنچی تو شہریار وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ اسے حویلی کے مختلف حصوں میں تلاش کرنے لگی۔ ہر طرف ایسا پُراسرار سناٹا چھایا ہوا تھا جیسے وہاں کسی انسان کا وجود نہ ہو۔ اتنی بڑی حویلی میں قید ہو کر وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کیروسین آئل کا ایک لیمپ تھا جو اس کے سائے کو اس کے پیچھے دور راہداری تک پھیلا رہا تھا۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھتی تو اپنے ہی سائے کو دیکھ کر سہم جاتی۔ وہ بھٹکتی ہوئی حویلی کے آخری حصے میں آ گئی۔ دن کے وقت وہ اس طرف نہیں آئی تھی۔ اس سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ حویلی کا آخری کمرہ ہے۔ کمرے کا بند دروازہ دیکھ کر اس نے ہولے سے شہریار کو آواز دی مگر اسے جواب نہیں ملا۔ وہ پلٹ کر جانے لگی۔ چند قدم جا کر ٹھٹک گئی۔ کسی کی درد بھری کراہ سنائی دے رہی تھی۔ وہ پھر پلٹ گئی اور وحشت زدہ نظروں سے اس آخری کمرے کو دیکھنے لگی۔ وہ آواز ٹھہر ٹھہر کر اسی کمرے سے آ رہی تھی۔

وہ پھر تھر تھر کانپنے لگی۔ اسے اس بھیانک ماحول میں یوں لگ رہا تھا جیسے قبرستان کے سناٹے میں کوئی مُردہ کراہ رہا ہو۔ مُردہ بول نہیں سکتا۔ کراہے گا کیا؟ لیکن وہ آواز مُردہ کی سی تھی۔ وہ کوئی مرد تھا جو سخت اذیت میں مبتلا تھا اور اس کی آواز ایسے گھُٹ گھُٹ کر خاموشی میں ابھر رہی تھی جیسے اس میں کراہنے کی بھی سکت نہ رہی ہو۔

اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس کمرے کے دروازے تک جا سکتی۔ وہ پلٹ کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگنے لگی۔ بھاگتے بھاگتے اس کمرے کے سامنے رُک گئی جہاں اذیت رسانی کے اوزار چاروں طرف دیوار پر سجے ہوئے تھے۔ وہ اس کمرے میں ایک نظر ڈالنے کے لئے رُکی تھی اور دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس کمرے کا ایک پٹ کھُلا ہوا تھا۔ عین نگاہوں کے سامنے دیوار پر جو آہنی شکنجہ لٹک رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس کی سانس اوپر کی اوپر رہ گئی۔ وہ ایسا شکنجہ تھا جو کسی مجرم کے گلے میں ڈالا جاتا ہے۔ پھر ایک کھٹکے سے اس کے ہینڈل کو دباتے ہی گردن تن سے جدا ہو جاتی ہے۔ اس

ہٹ اس آہنی شکنجے پر تازہ انسانی لہو کے دھبے نظر آ رہے تھے۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس آہنی شکنجے کو دیکھ رہی تھی۔ مارے دہشت کے اس کے گھٹنے کانپ رہے تھے۔ اس میں کھڑے ہونے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔ مگر اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ دیوار کا سہارا لے کر اپنے وجود کو گھسیٹتی ہوئی کسی نہ کسی طرح اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچی۔ وہاں دروازے پر شہریار کھڑا ہوا تھا۔ ایک سہارے کو سامنے دیکھتے ہی وہ چکرا کر گرنے لگی۔ شہریار نے فوراً ہی آگے بڑھ کر ایک ہاتھ سے اُسے اور دوسرے ہاتھ سے لیمپ کو تھام لیا۔ وہ بہت دیر اس کے بازو میں کھڑی کانپتی رہی۔ پھر اس کے سہارے ڈگمگاتے قدموں سے چلتی ہوئی بستر پر آ کر گر پڑی۔ شہریار نے پوچھا۔

"تم اس کمرے سے باہر ویران حویلی میں بھٹکنے کیوں گئی تھیں؟"

وہ اپنے بازو میں منہ چھپا کر روتی ہوئی بولی۔

"مجھے یہاں ڈر لگ رہا تھا۔ میں نے سوچا تمہارے پاس جا کر باتیں کروں گی تو خوف کی حد تک کم ہو جائے گا۔ مگر یہاں قدم قدم پر بلائیں نظر آتی ہیں۔ میں نے یہاں حویلی کے آخری کمرے میں کسی کے کراہنے کی آواز سنی ہے' کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس کمرے میں کون ہے؟"

شہریار سر جھکا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا۔

"میں نے اس آخری کمرے کو کبھی اندر سے نہیں دیکھا۔ اس کے دروازے پر ہمیشہ تالا پڑا رہتا ہے۔ رات کی خاموشی میں کبھی کسی کے کراہنے کی آواز آتی ہے تو دروازے پر تالا نظر نہیں آتا۔ وہ اندر سے بند ہوتا ہے۔"

نرگس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں اس وقت بھی دروازے پر تالا نہیں تھا۔ وہ اندر سے بند ہو گا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں دروازے تک جا سکوں۔ تم نے یہاں بچپن گزارہ ہے اور اب جوان ہو چکے ہو۔ تعجب ہے کہ تم اس آخری کمرے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہو؟"

"وہ آخری کمرہ پچھلے ایک سال سے پُراسرار بنا ہوا ہے۔ ایک سال پہلے میری امی...... ان تین عورتوں کی طرح پُراسرار طریقے سے غائب ہو گئی تھیں۔ ڈیڈی الزام لگاتے ہیں کہ وہ اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہیں۔ ایک بیٹا اپنی ماں پر ایسا شرمناک

الزام برداشت نہیں کر سکتا مجھے ڈیڈی سے نفرت ہے۔"

"تو پھر تمہاری امی کہاں ہیں؟ کیا تم نے انہیں تلاش نہیں کیا؟"

"کہاں تلاش کروں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یا تو وہ ڈیڈی کے ظلم سے تنگ آ کر واقعی کہیں چلی گئی ہیں یا پھر یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ ڈیڈی میری امی کے قاتل ہیں۔"

نرگس اس کی باتیں سن رہی تھی اور اس کا منہ تک رہی تھی۔ قتل کا ذکر آیا تو وہ خون آلود شکنجہ سامنے آ گیا۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"ابھی میں نے اس کمرے میں آہنی شکنجہ دیکھا ہے جس پر تازہ خون کے دھبے ہیں۔"

"کیا واقعی؟" شہریار نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا تم نے ابھی دیکھا ہے؟"

"ہاں میں ابھی اسی کمرے کے سامنے سے گزر کر آ رہی ہوں۔"

"میں بھی اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ مگر مجھے یہاں سے یہ لیمپ لے کر چلنا ہو گا۔ کیا تم میرے ساتھ چلو گی؟"

"ہاں' میں اندھیرے میں نہیں رہ سکتی۔ تمہارے ساتھ چلوں گی؟"

شہریار نے لیمپ کو اٹھا لیا۔ نرگس اس کے ساتھ چلتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔ جب وہ ایک راہداری سے گزر کر دوسری راہداری کی طرف مڑے تو اس کمرے کے قریب پہنچتے ہی ٹھٹک گئے۔ جمشید اس کمرے سے باہر آ رہا تھا۔ ان دونوں کو دیکھتے ہی اس نے غرا کر پوچھا۔

"تم یہاں شہریار کے ساتھ کیا کر رہی ہو؟"

وہ جمشید کو دیکھ کر ہچکچاتی ہوئی بولی۔

"آ .... آپ کب آئے؟ کیا آپ کو میری تنہائی کا ذرا بھی خیال نہیں ہے کہ اتنی بڑی حویلی میں مجھے کتنا ڈر لگ رہا ہو گا۔"

جمشید نے آگے بڑھ کر شہریار کے ہاتھ سے لیمپ چھین لیا پھر نرگس کے بازو کو مضبوطی سے پکڑ کر بولا۔

"اچھا تو تم اس چھوکرے کے ساتھ تنہائی دور کر رہی تھیں۔ چلو یہاں سے.........."

وہ اسے بازوؤں سے کھینچتا ہوا کمرے میں لایا۔ پھر اسے پلنگ پر دھکیلتے ہوئے بولا۔

"تم اتنی رات کو شہریار کے ساتھ کیا کر رہی تھیں؟"

وہ جھنجلا کر بولی۔

"میں کہہ چکی ہوں کہ مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ رشتے میں میرا بیٹا ہے کیا میں اس کے ساتھ باتیں نہیں کر سکتی؟"

"بیٹے کی ایسی کی تیسی۔ میں اس کا سر توڑ دوں گا اور آئندہ تمہیں اس کے ساتھ دیکھا تو تمہیں بھی زندہ دفن کر دوں گا۔ جب تک تم ایک بیٹا نہیں پیدا کرو گی اس وقت تک میں تم پر کسی مرد کا سایہ نہیں پڑنے دوں گا۔ خواہ وہ میرا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔"

یہ کہہ کر وہ جواب سنے بغیر کمرے سے باہر گیا اور کمرے کو باہر سے بند کر دیا۔ نرگس دروازے پر تالا ڈالنے کی کھڑکھڑاہٹ سنتی رہی۔

☆======☆======☆

نرگس نے اس حویلی میں ایک ہفتہ گزار دیا۔ اس ایک ہفتے میں وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں قید رہی۔ دن کے وقت وہ کمرے سے نکلتی تھی اور اس وسیع و عریض حویلی میں ایک بھٹکنے والی روح کی طرح گھومتی رہتی تھی۔ وہ اپنی ساس سے کچھ باتیں کرتی تو ادھر کی طرف سے کبھی جواب ملتا ورنہ وہ بڑھیا بھی اس سے کترا کر نکل جاتی تھی۔ شہریار سے صرف دن کے وقت سامنا ہوتا تھا۔ جمشید کی عدم موجودگی میں اس سے کچھ باتیں کرنے کا موقع مل جاتا تھا ورنہ جمشید نے سختی سے تاکید کی تھی کہ رات کے وقت وہ اپنے کمرے کو اندر سے بند رکھے اور شہریار سے نہ ملے ورنہ انجام برا ہو گا۔

اس ایک ہفتے میں ایک اور بات سامنے آئی وہ یہ کہ جمشید کا چھوٹا لڑکا شہباز لاپتہ ہو گیا اس کی گمشدگی سے صرف شہریار پریشان تھا۔ نرگس نے جمشید سے پوچھا۔

"شہباز نظر نہیں آ رہا ہے وہ کہاں چلا گیا؟"

"جہنم میں چلا گیا۔ سب سالے دھوکے باز ہیں جس روز تم یہاں آئی تھیں اس روز شہباز نے مجھ سے باہر جانے کی اجازت مانگی تھی میں نے اس سے کہا کہ رات کو تمہارے کمرے میں لیمپ اور کھانا پہنچانے کے بعد وہ چلا جائے میں حویلی کے کمپاؤنڈ سے کتوں کو ہٹا دوں گا۔"

"ہاں اس رات وہ میرے کمرے میں لیمپ رکھنے آیا تھا اس کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔"

جمشید نے ناگواری سے کہا۔

"میں نے بھی اسے نہیں دیکھا۔ اسی طرح ایک سال پہلے اس کی ماں بھی مجھ سے اجازت لے کر گئی تھی کہ کسی سہیلی سے ملنے جا رہی ہوں وہ بھی اس حویلی سے باہر جا کر دغا دے گئی' پھر لوٹ کر نہیں آئی۔"

نرگس نے اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ نے تو کہا تھا آپ کی بیوی مر چکی ہے۔"

"ہاں جو عورت اپنے شوہر کو دھوکہ دے کر چلی جائے وہ اس کے لئے مر جاتی ہے میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ میرے لئے مر چکی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ پھر اسے کمرے میں تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔ نرگس سمجھتی تھی کہ وہ اس کے سوال و جواب سے گھبراتا ہے اور بحث کو آگے بڑھانے سے پہلے ہی اس سے منہ موڑ کر چلا جاتا ہے۔ اس نے اس آخری کمرے کے بارے میں بھی اس سے سوال کیا تھا۔ اسے جواب ملا۔

"وہ کمرہ آسیب زدہ ہے' تم وہاں نہ جایا کرو۔ میں اسی لئے اسے باہر سے بند رکھتا ہوں۔"

"مگر ایک رات میں نے دیکھا وہ اندر سے بند تھا اور اندر سے کوئی بڑی ہی دردناک آواز میں کراہ رہا تھا۔"

"تم بحث کیوں کرتی ہو۔ اس کمرے میں جو کراہنے والی بلائیں ہیں ان سے تمہاری رشتے داری تو نہیں ہے۔"

بس وہ اسی طرح کا جھنجلا کر جواب دیتا تھا اور منہ پھیر کر چلا جاتا تھا۔ ایک دن شہریار نے اس سے پریشانی کا اظہار کیا۔

"میری امی کی طرح میرا چھوٹا بھائی بھی غائب ہو گیا اور وہ پتہ ہے کب سے غائب ہوا ہے؟"

"ہاں جس دن میں یہاں آئی تھی اسی رات سے وہ لاپتہ ہے۔"

"اور اسی رات تم نے اس آہنی شکنجے میں خون کے دھبے دیکھے تھے۔"

نرگس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر سہمی ہوئی نظروں سے شہریار کو دیکھنے لگی۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ اس آہنی شکنجے پر میرے بھائی کے خون کے دھبے تھے اور اسے ڈیڈی ..."

"نہیں۔" وہ ہذیانی انداز میں چیختی ہوئی بولی۔ "کوئی باپ اپنے بیٹے کی جان نہیں لے سکتا۔ تم جھوٹے ہو۔ تم اپنے ڈیڈی سے نفرت کرتے ہو اور مجھے بھی اپنے ڈیڈی سے نفرت دلانا چاہتے ہو۔"

"بے شک میں ان سے نفرت کرتا ہوں مگر تمہاری محبت کی قسم وہ بہت ہی سنگدل ہیں۔"

"میری محبت کی قسم نہ کھاؤ میں تم سے محبت نہیں کرتی۔"

"میں تو کرتا ہوں۔ جب تمہیں میری سچائی کا یقین آئے گا اور جب تم میرے ڈیڈی کا اصلی چہرہ دیکھو گی تو ان سے نفرت اور مجھ سے محبت کرنے لگو گی۔"

وہ جذبات کی رو میں بہہ کر کہنے لگی۔ "کوئی عورت اپنے مجازی خدا سے نفرت نہیں کر سکتی۔ خواہ وہ کتنا ہی سنگدل ہو۔ وہ جیسے بھی ہیں میرے جسم و جان کے مالک ہیں۔"

شہریار حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگا۔ نرگس کو بھی احساس ہو گیا کہ اس نے میاں بیوی کا رشتہ ظاہر کر دیا ہے۔ شہریار نے دل برداشتہ ہو کر کہا۔

"اچھا تو تم ڈیڈی سے شادی کر چکی ہو۔ اپنی موت کے پروانے پر خود ہی دستخط کر دیا ہے۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔"

وہ شکست خوردہ انداز میں سر جھکا کر اس کے سامنے سے چلا گیا اس کے بعد جب بھی اس حویلی میں سامنا ہوتا تو وہ ہمیشہ کترا کر نکل جاتا مگر دور دور سے اسے دیکھتا رہتا۔ اس کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنی محبت کو ہار کر اپنی اس شکست کو جبراً برداشت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شکست بھی ایسی زبردست ہوئی تھی کہ وہ محبوبہ کی بجائے سوتیلی ماں بن گئی تھی۔ نرگس اسے دیکھتی تو اس پر بڑا ترس آتا لیکن وہ ہمدردی کا اظہار نہیں کرتی تھی وہ چاہتی تھی بس اسی طرح دور ہی رہے تو اچھا ہے۔

وہ دو ماہ اس نے حویلی میں کیسے گزارے یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ ایک دن اس نے گھبرا کر جمشید سے کہا۔

"اس حویلی میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔ مجھے یہاں سے باہر لے چلو' تمہیں ایک بیٹے

کی ضرورت ہے۔ اگر میں ایسے گھٹے ہوئے ماحول میں رہوں گی تو شاید ایک صحت مند بچے کی ماں نہ بن سکوں۔"

جمشید اسے اپنے ساتھ حویلی کے باہر لے آیا۔ وہ دونوں کار میں بیٹھ کر شہر کی طرف جانے لگے۔ پہاڑی راستوں کے نشیب و فراز سے گزرتے وقت نرگس نے کہا۔

"آپ کو مجھ سے ذرا بھی محبت نہیں ہے۔ آپ صرف ایک بیٹے کی آرزو میں مجھے برداشت کر رہے ہیں۔"

"ہاں' میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مجھے ایک خوبصورت بیٹا چاہئے۔ بیٹا پیدا کرو گی تو تمام عمر میرے دل پر حکومت کرتی رہو گی۔"

"اگر بیٹا نہ پیدا ہوا تو؟"

"بکواس مت کرو۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔ "بیٹا ضرور ہو گا جب تم ایک ناجائز بیٹا پیدا کر سکتی ہو تو جائز کیوں نہیں پیدا کر سکتیں؟"

وہ بھی چڑ کر بولی۔

"کوئی ضروری تو نہیں ہر بار بیٹا ہی پیدا ہو۔ آپ کیسی بچوں جیسی باتیں کرتے ہیں کیا بیٹی یا بیٹا پیدا کرنا عورت کے اختیار میں ہوتا ہے؟"

"اگر یہ تمہارے اختیار میں نہیں ہے تو ساری زندگی تم سے محبت کرنا میرے بھی اختیار میں نہیں ہے۔"

"میں نے سنا ہے کہ مجھ سے پہلے بھی آپ تین عورتوں سے ایک بیٹے کے لئے اسی طرح محبت کر چکے ہیں۔ مجھے ابھی بتا دیجئے کہ میرا انجام کیا ہو گا۔ میں آپ کا یہ رویہ برداشت نہیں کر سکتی۔"

وہ غصے میں کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے بولا۔

"کس نے تم سے کہا کہ میں تین عورتوں سے محبت کر چکا ہوں؟"

"یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی آ کر مجھے بتائے۔ میں اس حویلی میں رہتی ہوں۔ کیا وہاں کے حالات کا علم مجھے نہیں ہو گا؟"

"میں سب سمجھتا ہوں۔ شہریار نے تمہیں میرے خلاف بھڑکایا ہے۔ میں اس کی گردن اُڑا دوں گا۔"

"کیا اس آہنی شکنجے سے؟"

"بکواس مت کرو۔" وہ چیخ اٹھا۔ چیختے ہی اس کے ہاتھوں سے اسٹیئرنگ بہک گیا۔ کار سڑک سے اتر کر بالکل بے قابو ہو کر ایک چھوٹے سے ٹیلے سے ٹکرا گئی۔ نرگس کو اتنا ہوش رہا کہ اس نے ایک دھماکے کی آواز سنی۔ اس کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ پھر وہ تاریکیوں میں ڈوبتی چلی گئی۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ حویلی کے اس کمرے میں اپنے بستر پر پڑی تھی۔ اس کے سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس کی بوڑھی ساس بستر کے سرے پر بیٹھی اس کی نبض دیکھ رہی تھی۔ نرگس کو ہوش میں آتا دیکھ کر وہ اس سے دور ہٹ گئی اور مرہم پٹی کا سامان فرسٹ ایڈ بکس میں رکھنے لگی۔ پھر اس نے وہ بکس اٹھا کر جاتے ہوئے کہا۔

"تمہارے سرہانے دودھ اور پھل وغیرہ رکھے ہوئے ہیں انہیں کھا لو' بیماروں کی طرح زیادہ نخرے نہ دکھاؤ۔"

بڑھیا کے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک چپ چاپ پڑی رہی۔ پچھلے تمام واقعات اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ وہ کتنے دولت مند باپ کی بیٹی تھی۔ زندگی میں ایک دھوکا کھانے کے بعد اب اسے ایسی ٹھوکریں ملتی جا رہی تھیں کہ وہ گھر سے بے گھر ہو گئی تھی۔ اس حویلی کو اپنا گھر بنانا چاہا تو یہ بھی اس کا مقبرہ بن رہی تھی۔ وہ سوچ سوچ کر روتی رہی۔ بہت دیر بعد وہ بستر سے اٹھی اور گلاس اٹھا کر دودھ پینے لگی۔

جمشید کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ اس حادثے کو ایک دن گزر گیا۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ مگر وہ نہیں آیا۔ وہ بستر پر لیٹی لیٹی اسے آوازیں دیتی رہی مگر اس کی آواز اتنی بڑی حویلی میں ایک زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا کر رہ جاتی۔ تیسرے دن وہ آیا تو اس کے سر پر بھی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں وہ بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور روتے ہوئے بولی۔

"آپ مجھے اس حال میں چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟"

"تمہارے پاس آ کر میں کرتا بھی کیا؟ امی نے بتایا ہے کہ اس حادثے میں تمہارا حمل ضائع ہو گیا ہے۔ تم نے میری تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ مجھے تمہارے صحت یاب ہونے کا انتظار کرنا ہو گا۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ تم ہی میرے لئے ایک بیٹا پیدا کرو گی۔ اچھی ہو جاؤ پھر ہم ایک بیٹے کی تیاری کریں گے۔"

وہ پھر منہ پھیر کر چلا گیا۔ وہ بیٹے کے سوا کوئی دوسری بات نہیں کرتا تھا۔ اسے عورت کی بجائے ایک مشین سمجھتا تھا جو صرف ایک بیٹا پیدا کرنے کے لئے لائی گئی تھی۔

ایک عورت کی اس سے زیادہ توہین اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسے عورت نہ سمجھا جائے۔ وہ مٹھیاں بھینچ بھینچ کر تلملاتی رہی اور یہ فیصلہ کرتی رہی کہ اب جمشید کے سائے میں نہیں رہے گی۔ اس کا ایک بچہ سمندر کی لہروں کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ دوسرا کار کے حادثے کی نذر ہو گیا۔ اگر تیسری بار لڑکی ہوئی تو جمشید اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ گویا وہ بچے اسی لئے پیدا کر رہی تھی کہ دنیا والے انہیں مارتے چلے جائیں۔

یہ سوچ سوچ کر وہ روتی رہی کہ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ مگر رونے سے مسائل حل نہیں ہو سکتے تھے۔ جو فیصلہ وہ کر رہی تھی اس پر اسے عمل کرنا تھا۔ تبھی اس حویلی کے قید خانے سے آزادی مل سکتی تھی۔ تب اسے شہریار کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اب وہ بہت حد تک سچا نظر آ رہا تھا مگر اب وہ بھی اس کمرے کی طرف نہیں آتا تھا جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کے باپ نے اس سے شادی کر لی ہے تو وہ بیچارہ اس سے کتراتا رہتا تھا اور دور ہی دور سے دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھر کر رہ جاتا تھا۔

نرگس کئی دنوں تک اپنے کمرے کی چاردیواری میں محدود رہی جب ذرا طبیعت سنبھلی اور چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تو اپنے کمرے سے نکلنے کے بعد وہ شہریار کے کمرے میں گئی۔ رات کا وقت تھا حویلی میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس کی ساس اپنے کمرے میں دروازے کو اندر سے بند کئے بیٹھی ہوئی تھی۔ جمشید صبح سے کہیں گیا ہوا تھا اور رات گئے تک اس کی واپسی کی توقع نہیں تھی۔ جب وہ شہریار کے کمرے کے سامنے پہنچی تو اس کا کمرہ کھلا ہوا تھا اور وہ کمرے سے باہر جانے ہی والا تھا اسے دیکھتے ہی ٹھٹک گیا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ نرگس کو اس کی آنکھیں بہت کچھ کہتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ سر جھکا کر بولی۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہاری بات کا یقین نہیں کیا۔ اب میری یہ حالت ہے کہ ہر لمحے ڈر کے مارے میری جان نکلتی جا رہی ہے کہ نہ معلوم میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میں ہمیشہ کے لئے اس حویلی میں دفن ہو جاؤں گی یا یہاں سے نکل بھی سکوں گی۔“

شہریار نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”تم بہت دیر بعد جاگی ہو۔ تم خود سوچو کہ تم نے اپنے آپ کو کس طرح برباد کیا ہے۔ تعجب ہے کہ تم نے کیا سوچ کر کیا سمجھ کر ڈیڈی پر بھروسہ کیا۔ کیا تم انسان کے مزاج

نہیں سمجھ سکتی ہو کیا تمہیں انسانوں کو پرکھنے کا سلیقہ نہیں آتا؟“

وہ ندامت سے بولی۔

”مجھے شرمندہ نہ کرو‘ میں بہت پریشان ہوں تم نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں تم پر بھروسہ کروں گی تو تم مجھے یہاں سے نکال کر لے جاؤ گے لیکن مجھے اس طرح لے جاؤ کہ تمہارے دل میں میرے لئے صرف ایک بیٹے کی محبت کا جذبہ ہو۔“

شہریار نے سر اٹھا کر ناگواری سے پوچھا۔

”کیا اب بھی تم خود کو اس سنگ دل کی شریکِ حیات سمجھتی ہو؟“

اس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ہاں میں اس سے نفرت کر سکتی ہوں۔ اسے چھوڑ کر جا سکتی ہوں لیکن نفرت کرنے اور چھوڑ کر جانے سے وہ رشتہ تو ختم نہیں ہو گا جو قائم ہو چکا ہے۔ تم مجھ سے بحث نہ کرو اور تمہیں واقعی مجھ سے ہمدردی ہے تو خود غرض نہ بنو۔ کسی طرح کا لالچ نہ کرو۔ میری ذات سے تمہیں صرف محبت کی پاکیزگی ملے گی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں پا سکو گے اگر میرے کام آ سکتے ہو تو آ جاؤ۔“

وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ ”اچھی بات ہے‘ میں نے کمپاؤنڈ میں گھومنے والے کتوں سے کسی حد تک دوستی کر لی ہے ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں لیکن حویلی کو چھوڑنے سے پہلے میں اس آخری کمرے تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ ابھی میں اسی ارادے سے اسی طرف جا رہا تھا کہ تم آ گئیں۔ اگر میں نے اس آخری کمرے کے متعلق کچھ معلومات حاصل نہیں کیں تو دل میں ہمیشہ ایک خلش سی رہے گی کہ نامعلوم میں کس انسان کو وہاں سسکتے اور کراہتے چھوڑ آیا ہوں۔ پتہ نہیں کیوں جب وہاں سے کراہنے کی درد بھری آواز آتی ہے تو میرا دل لرز اٹھتا ہے جیسے میرا اپنا کوئی ہے جو بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہے اور مجھے آوازیں دے رہا ہے بہرحال میں ابھی وہاں جا رہا ہوں‘ تمہیں مجھ پر بھروسہ ہے تو میرے ساتھ آؤ ہم دیکھیں گے کہ اس آخری کمرے میں کیا ہے؟ کیا تم میرے ساتھ چلو گی؟“

نرگس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”میں تمہارے ساتھ جانے کے لئے ہی یہاں آئی ہوں۔ اب تم مجھے کہیں بھی لے جاؤ مجھے مکمل یقین ہے کہ تم مجھے ان مصیبتوں سے نجات دلا سکتے ہو؟“

وہ دونوں وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ دبے قدموں سے چلتے ہوئے پہلے تو جمشید کی ماں کے کمرے کی طرف گئے اور وہاں اطمینان کر لیا کہ وہ بڑھیا دروازے کو اندر سے بند

کر کے بیٹھی ہے یا سو رہی ہے اب باہر نہیں نکلے گی۔ پھر وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔ مختلف راہداریوں سے گزرنے کے بعد وہ آخری راہداری میں پہنچے جس کے آخری سرے پر آخری کمرہ تھا۔ اس وقت بھی اس کمرے کے دروازے پر تالا نہیں پڑا ہوا تھا یعنی اس وقت بھی وہ اندر سے بند تھا اور اسی طرح کبھی کبھی کسی کے کراہنے کی دردناک آواز سنائی دیتی تھی۔ پھر سناٹے میں گم ہو جاتی تھی۔ وہ دونوں دبے قدموں سے آگے بڑھتے گئے نرگس سہمی ہوئی تھی اور شہریار کے بازو کو اس نے مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ دروازے کے بالکل قریب پہنچنے کے بعد شہریار نے اس کے پٹ پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا دباؤ ڈالا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ اندر سے بند ہے یا نہیں۔ دروازے پر اس کے ہاتھ کا دباؤ پڑتے ہی دروازہ ذرا سا کھل گیا نرگس نے فوراً ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

"نہیں' میں اس کمرے میں نہیں جاؤں گی۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

شہریار اسے کمرے سے ذرا دور لے گیا پھر اس سے بولا۔

"اچھی بات ہے تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں ابھی دیکھ کر آتا ہوں کہ اس کمرے میں کون ہے؟"

نرگس شہریار کو چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی جب وہ اس کمرے کے سامنے سے گزری جہاں اذیت رسانی کے اوزار دیواروں پر لگے ہوئے تھے تو پھر اس دروازے کے سامنے ٹھٹک گئی۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور کھلے ہوئے دروازے سے جمشید نظر آ رہا تھا جو دیوار کی طرف منہ اٹھائے اوزاروں کی طرف یوں تک رہا تھا جیسے کسی کو اذیت پہنچانے کے لئے کسی ایک ہتھیار کا انتخاب کر رہا ہو۔ دروازے پر آہٹ ہوتے ہی اس نے چونک کر دیکھا پھر نرگس کو سامنے پا کر غرّانے لگا۔

"تم یہاں کیوں آئی ہو' میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ اس طرف نہ آیا کرو۔"

وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

"میں کیوں نہ آؤں۔ آخر مجھ پر کیوں پابندی ہے؟ آپ میرے پاس نہیں آتے پتہ نہیں کہاں چھپتے پھرتے ہیں۔ میں ساری زندگی ایک کمرے میں قید ہو کر نہیں رہ سکتی کیا مجھے اتنی بھی آزادی نہیں ہے کہ میں اس حویلی میں گھوم پھر سکوں۔"

جمشید نے آگے بڑھ کر اس کے بازو کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا۔

"تم اتنی رات کو حویلی میں اِدھر اُدھر بھٹک رہی ہو آخر کیوں؟ میں خوب سمجھتا ہوں۔ تم نے سمجھا تھا میں اس حویلی میں نہیں ہوں کہیں باہر گیا ہوا ہوں اور ابھی واپس نہیں آؤں گا۔ اسی لئے تم شہریار کو تلاش کر رہی ہو؟ کیا یہ بات غلط ہے؟"

نرگس نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ غلط نہیں ہے' میں ابھی شہریار کے ساتھ تھی۔ اس لئے کہ زندگی گزارنے کے لئے اور تنہائی دور کرنے کے لئے ایک انسان کو دوسرے انسان کی ضرورت پڑتی ہے۔ آپ میرے شوہر ہو کر میرا ساتھ نہیں دیتے تو کیا میں اپنے بیٹے کے ساتھ تھوڑا وقت نہیں گزار سکتی؟"

جمشید نے اچانک ہی اس کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ رسید کرتے ہوئے کہا۔

"اسے بیٹا کہہ کر رشتہ بدلنے کی کوشش نہ کرو۔ میں عورتوں کو خوب سمجھتا ہوں کوئی عورت بھروسے کے قابل نہیں ہوتی جب بھی اس کا داؤ چلتا ہے جب بھی اسے موقع ملتا ہے وہ اپنے شوہر کو دھوکہ دے جاتی ہے۔ تم صاف صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تم ابھی شہریار کے ساتھ تنہائی میں وقت گزار کر آ رہی ہو۔ تم نے اس کے ساتھ اپنا منہ کالا کیا ہے۔"

وہ غصے سے چیخنے لگی۔

"نہیں مجھ پر اب الزام نہ لگاؤ۔ تم کیا جانو کہ عورت کیا ہوتی ہے۔ پتہ نہیں تم نے کیسی عورت دیکھی ہے۔ کس نے تمہیں دھوکا دیا ہے۔ تم دنیا کی تمام عورتوں کو فریبی اور مکار سمجھتے ہو؟"

جمشید نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"میری بیوی نے مجھے دھوکا دیا تھا۔ یہ جو شہریار ہے اس کی ماں نے مجھے بے وقوف بنایا تھا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہ کس طرح مجھے دھوکہ دے کر چلی گئی۔ اچھا ہوا وہ چلی گئی۔ اگر وہ نہ جاتی تو میں اسے قتل کر دیتا وہ بہت چالاک تھی۔ اس سے پہلے ہی وہ یہاں سے نکل گئی لیکن اس کا بیٹا یہاں موجود ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ کیا وہ آپ کا بیٹا نہیں ہے کہ اسے قتل کرنا چاہتے ہیں؟"

جمشید نے گرج کر کہا۔

"ہاں وہ میرا نہیں ہے۔ شہریار میرا بیٹا نہیں ہے۔ شہباز میرا بیٹا نہیں ہے' بلکہ نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ جس طرح وہ اس دنیا میں نہیں ہے' جس طرح وہ اس دنیا سے اٹھ چکا ہے اسی طرح شہریار بھی اس دنیا سے اٹھ جائے گا۔ میں اپنی حویلی میں حرامی بچوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔"

نرگس نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ اپنے بچوں کو حرامی کہہ رہے ہیں۔"

"ہاں' اس لئے کہ وہ میرے بچے نہیں ہیں۔ پچھلے سال یہ فریب کھل گیا کہ شہریار کی ماں مجھ سے نہیں بلکہ اپنے پرانے عاشق سے محبت کرتی تھی۔ اس کا وہ عاشق میرا چچازاد بھائی تھا جو اس حویلی میں رہتا تھا۔ میرا کھاتا تھا اور میری بیوی سے عشق کرتا تھا۔ میں اب تک اس خوش فہمی میں رہا کہ دونوں بیٹے میرے ہیں۔ میں انہیں اپنی جائیداد کا وارث سمجھتا تھا' سمجھتا تھا کہ ان سے میرا نام چلے گا لیکن کیسے چلے گا جب کہ وہ میری اولاد نہیں ہیں۔ وہ اتنی بڑی جائیداد کے مالک کیسے بن سکتے ہیں۔ میں نے اس فریب کو کیسے برداشت کیا ہے۔ یہ میں ہی جانتا ہوں۔ سات سال کے عرصے میں' میں نے تین عورتوں سے تعلقات قائم کئے کیونکہ میں سات سال سے اس شبہ میں مبتلا تھا کہ میری بیوی مجھے دھوکہ دے رہی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ایک ایسی عورت ڈھونڈوں جو صرف میری ہو اور صرف میرا بیٹا پیدا کرے جو میری اتنی بڑی جائیداد کا تنہا وارث ہو اور اس سے میرا نام چلے۔ مگر جو تین عورتیں آئیں انہوں نے میرے لئے ایک بھی بیٹا پیدا نہیں کیا۔ اس لئے میں نے انہیں ہمیشہ کے لئے حویلی کی بھول بھلیوں میں گم کر دیا۔ تم نے ایک دن پوچھا تھا کہ تمہارا انجام کیا ہو گا۔ اب تم خود سمجھ لو کہ تمہارا انجام کیا ہو گا۔ اب تم خود سمجھ لو کہ بیٹا پیدا نہیں کرو گی تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ کسی کے سامنے فخر سے گردن اونچی نہیں کر سکوں گا کہ میں بھی ایک بیٹا پیدا کر سکتا ہوں۔ میں اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔ تین عورتوں سے نہ ہو سکا۔ چوتھی تم ہو۔ تم سے بھی نہ ہو سکا تو اس دنیا میں بہت سی عورتیں ہیں لیکن میں شہریار کو اپنی جائیداد کا کبھی وارث نہیں بناؤں گا۔ شہباز کو میں ختم کر چکا ہوں۔ کسی دن شہریار کی بھی باری آئے گی۔ اب تم نے میرا اصلی روپ دیکھ لیا ہے تو اب میں تمہیں اس کمرے سے جہاں' میں نے تمہیں رہنے کے لئے جگہ دی ہے۔ باہر نہیں نکلنے دوں گا اب ہمیشہ اس کمرے کے دروازے پر تالا پڑا

رہے گا چلو میرے ساتھ........."

وہ ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ نرگس مچلنے لگی اور اپنا ہاتھ چھڑانے لگی۔

"میں نہیں جاؤں گی۔ میں نہیں جاؤں گی........."

وہ نہ جانے کے لئے جدوجہد کرتی رہی۔ جمشید طیش میں آ کر اسے مارنے لگا۔ پھر اس نے چھت سے لٹکی ہوئی کنڈی میں رسی ڈال کر اور سختی سے اس کے ہاتھوں کو باندھتے ہوئے کہا۔

"اگر نہیں جانا چاہتی تو یہیں رہو اور اس رسی سے لٹکتی ہوئی ان ہتھیاروں کو دیکھتی رہو اور انتخاب کرتی رہو کہ ان میں سے کس ہتھیار سے مرنا پسند کرو گی۔ میں اب تم پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ یہ بات اب اچھی طرح سمجھ میں آ گئی ہے کہ شہریار کا جادو تمہارے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اسی لئے تم اتنی دلیری سے میرے سامنے گفتگو کر رہی تھیں۔ اب نہیں کر سکو گی۔"

وہ غصے سے چیختی ہوئی بولی۔

"تم میری زبان بند نہیں کر سکتے۔ میں ساری دنیا سے چیخ چیخ کر کہوں گی کہ تم قاتل ہو۔ اپنے ہی بیٹے کے قاتل ہو اور اب اپنے دوسرے بیٹے کو قتل کرنے کے منصوبے بنا رہے ہو۔ میں سچ بات بولنے سے کبھی نہیں ڈروں گی۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی جمشید کا ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر پڑا۔ وہ غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔ اس کے لباس کو نوچ رہا تھا اور اس کے بالوں کو اسی طرح مٹھی میں جکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

"میں جو چاہتا ہوں وہی ہوتا ہے۔ اس حویلی میں میری حکومت ہے۔ بیوقوف عورت میں نے تمہیں کتنی آسانی سے اپنے قابو میں کیا تھا۔ میں تمہیں سمندر کے کنارے سے اٹھا کر اس مکان میں لے گیا تھا اور وہاں ہر رات سونے سے پہلے جو دودھ تم پیا کرتی تھی اس میں خواب آور دوا ملی ہوتی تھی تاکہ تم گہری نیند سو جاؤ اور میں تمہارا لباس بدلتا رہوں اور تمہیں اس طرح اپنے قریب آنے پر مجبور کر دوں۔ ایک عورت تک پہنچنے کے لئے کبھی کبھی برسوں گزر جاتے ہیں۔ میں نے صرف دو دن میں وہ قربت حاصل کر لی۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ تم میرے لئے ایک بیٹا پیدا کرو کیونکہ تم نے اپنی جو رام کہانی سنائی تھی اس میں یہ بھی کہا تھا کہ تم ایک ناجائز بیٹا پیدا کر چکی ہو۔ مجھے امید تھی کہ تم

میرا مقصد پورا کر سکو گی۔ مگر افسوس کہ کار کے حادثے میں تم پھر میرے لئے بیکار ہو گئیں۔ میں انتظار کرنا چاہتا تھا کہ شاید تیسری بار تم میرے کام آ سکو۔ مجھے ایک بیٹا دے سکو لیکن نہیں تم بغاوت پر آمادہ ہو۔ تمہارے تیور بتا رہے ہیں کہ اب مجھے تم پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔ تم چیخ چیخ کر مجھے بدنام کرنا چاہتی ہو اور مجھے قاتل ثابت کرنا چاہتی ہو۔ اس سے پہلے ہی میں تمہیں ختم کر دینا چاہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ ایک دیوار کی طرف بڑھا۔ وہاں وہی آہنی شکنجہ لٹک رہا تھا۔ جس پر وہ خون کے دھبے دیکھ چکی تھی اور یہ ثابت ہو گیا تھا کہ وہ شہباز کے خون کے دھبے تھے۔ جمشید کو اس شکنجہ کی طرف جاتے دیکھ کر وہ دہشت سے چیخنے لگی۔ اس کی چیخیں سن کر جمشید فوراً ہی پلٹ کر اس کی طرف آیا۔ پھر اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کے منہ میں ٹھونس دیا تا کہ وہ آواز نہ نکال سکے۔ پھر اس نے کہا۔

"تم اس طرح قابو میں نہیں آؤ گی۔ میں تمہیں مارنے سے پہلے ذرا تڑپاؤں گا۔ ذرا اذیتیں پہنچاؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ اسے اِدھر سے اُدھر دھکے دے کر جھلانے لگا۔ نرگس کے دونوں ہاتھ رسّی سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ چھت سے لٹک رہی تھی اور اِدھر سے اُدھر جھولتی جا رہی تھی۔ جمشید اتنے زور زور سے پینگیں بڑھا رہا تھا کہ وہ جھولنے کے دوران کبھی سامنے کی دیوار سے ٹکرا رہی تھی کبھی پیچھے کی دیوار سے ٹکرا جاتی تھی۔ چیخنا چاہتی تھی مگر چیخ نہیں سکتی تھی۔ وہ "ہوں ہوں" کہہ کر تڑپ کر رہ جاتی تھی۔

☆======☆======☆

دوسری طرف حویلی کے آخری کمرے کا دروازہ کھل چکا تھا۔ شہریار نے کمرے میں داخل ہو کر دیکھا۔ ایک بہت ہی بوڑھا سا آدمی زنجیروں سے بندھا ایک گوشے میں پڑا ہوا تھا۔ وہ اتنا دبلا پتلا تھا کہ ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آتا تھا۔ اسے دیکھ کر پتہ چلتا تھا کہ اسے کس قدر جسمانی اذیتیں پہنچائی گئی ہیں' وہ فرش پر پڑا ہوا آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ دروازے پر آہٹ سن کر وہ تڑپنے لگا اور پیچھے ہٹتے ہوئے کہنے لگا۔

"نہیں نہیں' مجھے اور نہ مارو۔ مجھے چھوڑ دو۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دو..........."

شہریار اس کے قریب پہنچ کر اس پر جھک گیا اور اس سے کہنے لگا۔

"بابا تم کون ہو؟ مجھ سے کیوں ڈر رہے ہو؟"

بوڑھے نے سر اٹھا کر دیکھا۔ لیمپ کی زرد زرد روشنی میں دھندلا دھندلا سا چہرہ نظر آیا۔ شاید اس کی آنکھیں کمزور ہو گئی تھیں لیکن اس نے اتنا سمجھ لیا کہ اس کے سامنے کوئی ظالم نہیں ہے۔ ایک اجنبی نوجوان ہے۔ اس نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

"بیٹا! مجھے جلدی بتاؤ تم کون ہو اور تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام شہریار ہے۔"

شہریار کا نام سنتے ہی بوڑھا جوش اور جذبے سے کانپنے لگا۔ زنجیریں اس کی کپکپاہٹ کے ساتھ بجنے لگیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھنا چاہتا تھا۔ شہریار نے اسے سہارا دے کر بٹھایا۔ بوڑھے نے اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر کہا۔

"تم ابھی تک زندہ ہو۔ تم' تم اس حویلی میں ابھی تک کیوں ہو۔ یہاں سے بھاگ کیوں نہیں جاتے' تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہیے ورنہ جمشید تمہیں ایک دن ضرور قتل کر دے گا۔"

"بابا تم کون ہو؟ ڈیڈی سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟ اور وہ مجھے کیوں قتل کر دیں گے؟"

بوڑھے نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم اسے ڈیڈی نہ کہو۔ وہ تمہارا باپ نہیں ہے۔"

"تم یہ کیا کہہ رہے ہو بابا۔ کیا وہ میرے ڈیڈی نہیں ہیں؟"

"نہیں' وہ تمہارا دشمن ہے۔ اس حقیقت کو مجھ سے اور تمہاری ماں سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کیونکہ .... کیونکہ میں تمہارا باپ ہوں۔"

شہریار کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ وہ حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بوڑھے کو دیکھنے لگا جو اس بات کا دعویٰ کر رہا تھا کہ وہ اس کا باپ ہے۔ وہ اسے دیکھتا جا رہا تھا اور اس بوڑھے کی آواز کانوں سے ہو کر دل میں اترتی جا رہی تھی۔ بوڑھا اسے بتا رہا تھا کہ شہریار کی ماں نوشابہ اس کے ماموں کی لڑکی تھی۔ وہ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے اور جوانی میں ایک دوسرے کے شریکِ حیات بننے کی تمنا کی تھی لیکن جمشید اپنی دولت کے بل پر نوشابہ کو بیاہ کر حویلی میں لے آیا۔ وہ بوڑھا ایک رشتے سے جمشید کا چچازاد بھائی تھا۔ اس لئے وہ بھی حویلی میں آ کر رہنے لگا لیکن جب نوشابہ کی شادی ہوئی تو اس سے پہلے ہی

اس کے پاؤں بھاری ہو گئے تھے۔ اس نے آٹھویں مہینے میں شہریار کو جنم دیا۔ یہ بات ایک عرصہ تک چھپی رہی کہ شہریار کا باپ کون ہے؟ مگر اب سے سات سال پہلے جمشید کو شبہ ہونے لگا۔ ایک بار اس نے نوشابہ اور شہریار کے باپ کو تنہائی میں ملتے دیکھ لیا۔ اسے ساری حقیقت کا علم ہو گیا کہ جسے وہ اپنا بیٹا سمجھ رہا تھا وہ اس کا بیٹا نہیں ہے۔ وہ خواہ مخواہ اس کی جائیداد کا وارث بننے والا تھا۔ اس نے شہریار کے باپ کو اس حویلی کے آخری کمرے میں قید کر دیا اور نوشابہ کو اس کے سامنے قتل کر دیا۔ باہر وہ دوسروں سے یہ کہتا پھرتا ہے کہ وہ اسے چھوڑ کر اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہے لیکن میں نے اسی کمرے میں اسے تڑپ تڑپ کر مرتے دیکھا ہے۔ پھر کچھ دن پہلے وہ شہباز کو اسی کمرے میں لے کر آیا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ نوشابہ کو' شہباز کو اور شہریار کو اس کی آنکھوں کے سامنے قتل کرے گا اور پھر آخر میں اس بوڑھے کو بھی مار ڈالے گا لیکن شہریار کو قتل کرنے سے پہلے اس بات کا منتظر تھا کہ اس کے یہاں ایک بیٹا پیدا ہو جائے۔ اگرچہ شہریار اس کا بیٹا نہیں تھا مگر دنیا والوں کی نظر میں اس کا بیٹا ضرور تھا۔ وہ اپنا بھرم رکھنا چاہتا تھا کہ وہ اب بھی ایک لڑکے کا باپ ہے۔ جب اس کا اپنا بیٹا پیدا ہو جاتا تو پھر وہ شہریار کو بھی ہمیشہ کے لئے راستے سے ہٹا دیتا۔ نوشابہ قتل ہو چکی تھی۔ شہباز قتل ہو چکا تھا۔ صرف شہریار باقی بچا تھا۔

بوڑھا اسے ماضی کی داستان سناتا جا رہا تھا۔ اسی وقت رات کے سناٹے میں نرگس کی چیخ سنائی دی۔ نرگس نے اسی وقت چیخ ماری تھی جب جمشید آہنی شکنجے کی طرف گیا تھا۔ اس کے بعد اس کی چیخیں گھٹ گئیں کیوں کہ اس نے اس کے منہ میں رومال ٹھونس دیا تھا اور اب اسے اِدھر اُدھر جھولے کی طرح جھلا رہا تھا اور دیواروں سے ٹکرا رہا تھا اس کے سر سے اور جسم کے دوسرے حصوں سے خون بہتا جا رہا تھا۔ ناک سے اور منہ سے بھی لہو رسنے لگا تھا۔ وہ نیم مُردہ سی ہو رہی تھی اس کی آنکھوں کے سامنے دنیا تاریک ہوتی جا رہی تھی۔ ذہن کی تاریکیوں میں اس نے ڈوبتے ڈوبتے دیکھا کہ شہریار دوڑتا ہوا اس کمرے میں آیا ہے اور پھر جمشید سے الجھ گیا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو مار رہے ہیں پھر کیا ہوا............ وہ آگے کچھ نہ دیکھ سکی بے ہوشی کی تاریک دنیا میں گم ہو گئی۔

جب اسے ہوش آیا تو اس وقت بھی اس پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی۔ " دھندلائی ہوئی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد سمجھ میں آیا کہ "

ہسپتال کے کمرہ میں پڑی ہوئی ہے پھر اس پر شہریار نے جھک کر کہا۔

"نرگس خدا کا شکر ہے کہ تم ہوش میں آ گئی ہو۔ دیکھو اب کسی قسم کی فکر نہ کرو۔ جمشید گرفتار ہو گیا ہے۔ میں نے اسے شکست دے کر اس کے ہاتھ پاؤں اچھی طرح رسی سے باندھ دیئے تھے اور اسے ایک کمرے میں بند کرنے کے بعد پولیس والوں کو بلا کر لے آیا تھا پھر جو کچھ ہوا۔ یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ بس اتنا سمجھو کہ جمشید اور اس کی ماں دونوں ہی مجرم ہیں۔ اس کی ماں اپنے بیٹے کا ساتھ دیتی تھی۔ وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ اتنی بڑی حویلی اور جائیداد کا وارث جمشید کا اپنا بیٹا ہو اور اس کا اپنا پوتا ہو۔ وہ اپنے پوتے کے لئے جمشید کے مجرمانہ طریقۂ کار کو پسند کرتی تھی اور اس کا ساتھ دیتی تھی۔ مگر بروں کا انجام برا ہوتا ہے۔ نہ جمشید کو بیٹا ملا' نہ اس بڑھیا کو کوئی پوتا نصیب ہوا۔ دونوں حوالات میں ہیں۔"

نرگس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"شہریار! میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔"

"نرگس! میں نے تم پر احسان نہیں کیا ہے بلکہ اپنی محبت کی حفاظت کی ہے۔ دیکھو اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ میں جمشید کا بیٹا نہیں ہوں تو اس لحاظ سے تم سے اور جمشید سے میرا دور کا رشتہ بھی نہیں ہے۔ اب میں تمہاری تمنا کر سکتا ہوں۔ اب تمہیں اپنی شریکِ حیات بنا سکتا ہوں۔ تم میری محبت کو تسلیم کر لو اور میری بن جاؤ۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں۔"

نرگس کی سانس جیسے رکتی جا رہی تھی۔ وہ دھندلائی ہوئی آنکھوں سے شہریار کو دیکھتی ہوئی بولی۔

"شہریار! میں نے زندگی میں بہت سے گھناؤنے چہرے دیکھے ہیں۔ اتنی عمر گزار کر یہ بات سمجھ میں آئی ہے کہ عورت کسی کو اپنا محبوب بنا کر یا شوہر بنا کر اتنے اعتماد سے زندہ نہیں رہ سکتی جتنا کہ کسی کو اپنا بیٹا بنا کر رہ سکتی ہے۔ افسوس کہ میری زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں لیکن اطمینان سے اور اعتماد سے چند گھڑیاں زندہ رہنے کے لئے اب بھی تمہیں بیٹا کہتی ہوں۔ میرے بیٹے آگے بڑھو اور مجھے ماں کہہ کر میری پیشانی چوم لو۔"

شہریار کا سر جھک گیا۔ وہ چند لمحے تک تذبذب میں رہا۔ پھر وہ ذرا جھجکتے ہوئے آگے کی طرف جھکا اور اس کی پیشانی کو چومنے لگا۔ جب وہ اس کی پیشانی کو بوسہ دے رہا تھا تو

اچانک ہی اندر سے لرز گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ اس کے آنسو بہت گرم تھے اور نرگس کی پیشانی سرد ہو چکی تھی۔

☆======☆======☆

نامعلوم تو صرف خدا ہے۔ وہ معلوم صرف سچے ایمان والوں کے اندر ہوتا ہے۔
اگر کبھی ان کی زبان سے ظاہر ہوتا ہے تو سننے والوں کے شک و شبہے سے اور تذبذب سے نامعلوم رہ جاتا ہے۔

فی زمانہ معلومات کے جدید ترین ذرائع اتنے زیادہ ہیں کہ دنیا کے ایک سرے کی خبریں دوسرے سرے تک چشم زدن میں پہنچ جاتی ہیں۔ اس کے باوجود معلومات ادھوری رہ جاتی ہیں۔ اس کی وجہ تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ جتنے جدید ترین ذرائع ہیں' وہ معلومات میں حسبِ ضرورت کھوٹ پیدا کر دیتے ہیں۔ یا پھر معلومات حاصل کرنے والے اپنے نظریات اور مفادات کے مطابق معلومات کے کچھ حصوں کو توجہ سے سمجھتے ہیں اور باقی معلومات کو جھوٹ یا غیر ضروری سمجھ کر نظرانداز کر دیتے ہیں۔

معلومات کا ایک ذریعہ اخبارات ہیں۔ موجودہ داستان اخبارات سے ہی شروع ہو رہی ہے۔ یہ جو اخبارات ہوتے ہیں' یہ تمام دنیا کی سچی اور جھوٹی خبریں لوگوں کے ڈرائنگ روم' بیڈ روم اور باتھ روم تک پہنچاتے ہیں۔ دنیا کا شاید ہی کوئی اخبار یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ اپنے پہلے صفحے سے آخری صفحے تک سچ ہی سچ لکھتا اور چھاپتا ہے۔ بیچ میں کہیں نہ کہیں جھوٹ کی آمیزش ہوتی ہے یا ایسی ذومعنی باتیں ہوتی ہیں کہ پڑھنے والا اِس معنی سے اُس معنی تک بے چینی سے پہلو بدلتا رہتا ہے اور کسی حتمی معلومات تک پہنچ نہیں پاتا۔

یہ حقیقت ناگزیر ہے کہ ذرا سا جھوٹ' ذرا سی دل فریبی نہ ہو یا اس میں با مسالے کی چاٹ شامل نہ کی جائے تو اخبار صرف سیاستدانوں کے ہاتھوں میں رہ جاتا ہے۔ عوام کے دروازے صرف سنسنی خیز خبروں کے لئے کھلتے ہیں۔ پھر اخبارات کا خریدنا بھی کیا اور بکنا بھی کیا؟ اس کی عمر نہایت ہی مختصر ہوتی ہے۔ یہ صبح پیدا ہوتے ہیں' دوپہر تک ان

کی عمر ڈھلنے لگتی ہے پھر شام ہوتے ہوتے یہ اسٹور روم کی قبر میں دفن ہو جاتے ہیں۔ مرد انہیں پڑھتے ہیں۔ گھریلو عورتیں ان کی لاشیں جمع کرتی ہیں۔ جب پہلی تاریخ سے پہلے مہنگائی بری طرح رلانے لگتی ہے تو انہیں کباڑیوں یا ردی فروش پھیری والوں کے پاس بیچ دیتی ہیں۔ یوں دیکھا جائے تو یہ اخبارات رومال کا کام کرتے ہیں اور گھر گرہستی والی عورتوں کے آنسو پونچھتے ہیں۔

یہ اخبارات بڑے غریب نواز ہوتے ہیں۔ بمبئی کے نصف سے زیادہ فٹ پاتھ بچھونے کا کام کرتے ہیں۔ جن غریبوں کے گھر نہیں ہوتے' وہ پولیس والوں کو بھتا دے کر ان اخبارات پر ہاتھ پاؤں پھیلا کر سوتے ہیں۔ یہ جو سچی خبروں سے عوام کو بیدار کرتے ہیں' یہی بین السطور دوغلی خبروں سے عوام کو سلا بھی دیتے ہیں۔

بمبئی کا ذکر ہوا ور فلم انڈسٹری کی بات نہ ہو تو بمبئی شہر مکمل نہیں ہوتا۔ یہ اخبارات فلموں کے اشتہارات سے بھرے ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ فلم انڈسٹری میں بھی جاتے ہیں اور اکثر چانس لینے والیوں کے بچھونے بن جاتے ہیں۔ انہیں چانس دینے والے چانس کھونا نہیں چاہتے۔ دونوں بڑی جلدی میں ہوتے ہیں۔ دسترخوان کے لئے فوری طور پر اخبارات ہی میسر آتے ہیں۔

یہ سب جانتے ہیں اور سب مانتے ہیں کہ اسلحہ اسمگل ہو کر ساحلی شہروں میں پہلے پہنچتا ہے۔ جب حکومت کی طرف سے سختی ہوتی ہے اور تلاشیاں لی جاتی ہیں تو پولیس اور انٹیلی جنس والے اور بم ڈسپوزل اسکواڈ والے گھر گھر کی تلاشیاں لیتے ہیں۔ ان کے پاس جدید ڈیٹیکٹو آلات ہوتے ہیں' جن کے ذریعے وہ زمین کے اندر چھپائے ہوئے اسلحے کا سراغ لگا لیتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ تمام اسلحہ برآمد نہیں کرپاتے۔ کیونکہ چھپانے والے بڑی ہنرمندی سے کام لیتے ہیں۔ بین الاقوامی اسمگلر جوڑ کا توڑ جانتے ہیں۔ کاربن پیپر سب نے دیکھا ہے' جو ٹائپ رائٹر میں استعمال ہوتا ہے اور دکاندار جسے دوہری رسید بنانے کے کام لاتے ہیں' اگر چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا اسلحہ ایسے کاربن پیپرز میں لپیٹ کر زمین کھود کر چھپا دیا جائے تو دنیا کا کوئی سائنسی آلہ اس کا سراغ نہیں لگا سکتا۔ دنیا کی بڑی پولیس اور بم ڈسپوزل اسکواڈ کے ماہرین ایسے چھپائے گئے ہتھیاروں تک کبھی نہیں پہنچ پاتے۔

ویسے بات اخبارات کی ہو رہی ہے۔ ابتدا میں اسلحہ چھپانے والوں کے لئے یہ مسئلہ درپیش رہتا تھا کہ کاربن پیپرز چھوٹے سائز کے ہوا کرتے ہیں' ان سے بڑے سائز کے ہتھیار چھپائے نہیں جا سکتے تھے۔ بعد میں مسئلے کا حل نکل آیا۔ مجرمانہ ذہن رکھنے والوں نے کاربن پیپرز کا مسالحہ تیار کیا اور ایسے مسالوں کو بڑے سائز کے اخبارات کے دونوں طرف لیپ پوت کر انہیں بڑے سائز کا کاربن پیپر بنا لیا۔ اب وہ بڑے سے بڑے ہتھیار ان اخبارات میں لپیٹ کر زمین کے اندر کامیابی سے چھپا دیتے ہیں۔

جوڑ توڑ کا کمال ذہانت سے حاصل ہوتا ہے اور ذہانت تعلیم سے حاصل ہوتی ہے جن ممالک میں تعلیم یافتہ بے روزگار جوانوں کی تعداد تشویش ناک حد سے بڑھ جاتی ہے پھر ان کی تعلیمی ذہانت اپنے ملک و قوم کی فلاح کے لے استعمال نہیں ہوتی' ان کی ذہانت کو جرائم پیشہ دولت مند خرید لیتے ہیں جس کے نتیجے میں پولیس اور انٹیلی جنس والوں کے معلومات فراہم کرنے والے آلات مجرموں کو نامعلوم بنا دیتے ہیں۔

اخبارات انسان کو علم اور آگہی دینے اور حالات حاضرہ سے باخبر رکھنے کے لئے شائع کئے جاتے ہیں لیکن یہ ایک المیہ ہے کہ جتنے اخبارات' رسائل اور کتب بازاروں میں آتی ہیں' انہیں منفی انداز میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ہندوؤں میں مقدس بھگوت گیتا تقریباً ساڑھے پانچ ہزار سال سے روحانی اپریش (ہدایات) دینے والی مقدس کتاب تسلیم کی جاتی ہے لیکن ایسی مقدس کتاب بھی عدالتوں میں جھوٹی قسمیں کھانے اور جھوٹی گواہیاں دینے کے لئے ہاتھوں میں اٹھائی جاتی ہے۔

دنیا کے تمام لوگوں نے اخبارات کو طرح طرح سے استعمال کیا ہو گا۔ انہیں علم حاصل کرنے کے لئے پڑھا ہو گا اور گمراہی کے لئے بھی جرائم کی خبروں سے کچھ فائدے اٹھائے ہوں گے۔ ان اخبارات کو اوڑھنا اور بچھونا بھی بنایا ہو گا اور ان سے ذہنی اور روحانی طہارت بھی حاصل کی ہو گی اور انہی اخبارات سے اپنے جسم کی غلاظتوں کو پونچھا ہو گا لیکن یہ شاید آج تک کسی نے نہ سنا ہو گا' نہ پڑھا ہو گا اور نہ دیکھا ہو گا کہ کسی نے کسی کے لئے اخبار کا کفن تیار کیا ہو۔

اور وہ کفن تیار کر رہا تھا۔

اس کے سامنے ایک بڑی سی میز پر بہت سے اخبارات بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے

دونوں ہاتھوں میں پتلے سے دستانے چڑھے ہوئے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں قینچی اور دوسرے ہاتھ میں ایک ننھا سا چمٹا تھا اور وہ مختلف اخبارات کو پڑھ پڑھ کر قینچی سے ایک ایک مطلوبہ لفظ کاٹ رہا تھا اور انہیں چمٹے سے پکڑ کر گوند کے ذریعے ایک نہایت خوبصورت سے گلابی کاغذ پر چپکا رہا تھا۔

اس نے ایک ایک لفظ کاٹ کر چسپاں کرنے کے بعد پہلے دو فقرے جو بنائے وہ یہ تھے "محبت میں دل دیتے ہیں اور لیتے بھی ہیں۔ لہٰذا مجھے تمہارا دل چاہئے.........."

یہ تمام الفاظ مختلف اخبارات سے چن چن کر تراشے گئے اور چپکائے گئے تھے تاکہ اپنے ہاتھ سے کچھ نہ لکھا جائے اور نہ ہی ماہرین تحریر کو تفتیش کی زحمت دی جائے۔

اس نے پھر مختلف اخبارات کو پڑھا۔ ان میں سے اگلے فقروں کے لئے چند الفاظ تلاش کئے۔ انہیں قینچی سے کاٹ کر پہلے فقروں کے تسلسل سے چسپاں کیا۔ اس طرح بات یوں بنی۔ "محبت میں دل دیتے ہیں اور لیتے بھی ہیں۔ لہٰذا مجھے تمہارا دل چاہئے۔ فوراً وصیت لکھو کہ تمہاری موت کے بعد امراض قلب کے کسی ضرورت مند کو تمہارا دل دان (عطیہ) کیا جائے.........."

وہ دونوں ہاتھ بڑی محنت کر رہے تھے۔ بڑی سی میز پر بکھرے ہوئے اخبارات میں سے مطلوبہ الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکال رہے تھے۔ انہیں کاٹ کاٹ کر اپنا ایک مطلوبہ مضمون مکمل کر رہے تھے۔ بڑی عرق ریزی ہو رہی تھی اور جب اتنی عرق ریزی ہو تو محنت رائیگاں نہیں جاتی۔ آخر وہ مضمون مکمل ہو گیا۔ اب وہ مکمل تحریر یوں تھی۔

"محبت میں دل دیتے ہیں اور لیتے بھی ہیں۔ لہٰذا مجھے تمہارا دل چاہئے۔ فوراً وصیت لکھو کہ تمہاری موت کے بعد امراض قلب کے کسی ضرورت مند کو تمہارا دل دان کیا جائے۔ تم مرنے کے بعد بھی اس دنیا کو دیکھنا چاہتے ہو اس لئے کسی ضرورت مند کو تمہاری آنکھیں بھی دان کی جائیں۔ کسی کڈنی سینٹر کے ضرورت مند مریض کو اپنے گردے بھی دے دو۔ اس دنیا سے جتنے ہلکے ہو کر جاؤ گے اتنے ہی تمہارے پاپ (گناہ) دھلیں گے۔ آج اٹھارہ تاریخ ہے۔ بیس تاریخ کی رات تمہاری زندگی کی آخری رات ہے۔ اکیس تاریخ کی شام کو تمہاری جوان بیٹی اور جوان بیٹا دونوں خیریت سے تمہاری کوٹھی میں پہنچا دیئے جائیں گے۔"

آخر میں لکھنے والے نے اپنا نام اخبارات کے تراشے سے لکھا تھا۔ "تمہارا پریم پجاری۔"

اور جس کے نام یہ لکھا گیا تھا اس کا نام پتا بھی اخبارات کے شائع شدہ الفاظ کا رہین منت تھا۔ اسے مرنا تھا۔ زندگی بہت تھوڑی سی رہ گئی تھی۔ اس کے مسلح گارڈز اور دیگر سراغرساں اسے پڑھ کر موت کی آہٹیں سن سکتے تھے لیکن اس چیلنج کرنے والے کی گرد تک بھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔

اسے کہتے ہیں آنکھوں پر پٹی باندھنا۔ پٹی کپڑوں کی ہوتی ہے' اس نے ان اخبارات کی پٹی باندھی تھی' جو معلومات فراہم کرتے ہیں اور وہی اخبارات اسے نامعلوم کہہ رہے تھے۔

☆======☆======☆

صمد خان نے بڑی حکمت عملی سے کام لیا تھا۔ مائرہ عرف مایا اس کی غیرت تھی کیونکہ اس کے بھائی اسد خان کی شریک حیات اور اس کے گھرانے کی عزت تھی۔ اسے دشمنوں نے اغوا کیا تھا۔ خان کی عزت اور غیرت کو چیلنج کرنے والا دشمن کون تھا؟ یہ نامعلوم تھا۔

معلوم کرنا تھا۔ اس کی ایجنسی بھارتی حکومت کے خلاف مہاراشٹر کی سیاسی پارٹی شیوسینا کے لئے کام کرتی تھی۔ ایسے میں صاف ظاہر تھا کہ حکومت کے "را" کے ایجنٹوں نے یہ بدمعاشی کی ہے۔

سیاسی دہشت گرد ایجنسیاں وہی کامیاب رہتی ہیں جو وقت اور حالات کے دھارے کا بغور مشاہدہ کرنے کے بعد ایکشن میں آتی ہیں اور وہ ایسا وقت تھا کہ شیوسینا والے بمبئی میں ایک بہت بڑا قتل عام اور تخریب کاری چاہتے تھے۔ اس کے لئے وہ صمد خان کے باس کو پندرہ کروڑ روپے دینا چاہتے تھے لیکن باس نے پچیس کروڑ کا مطالبہ کیا تھا۔ شیوسینا کے لئے یہ رقم بہت زیادہ تھی اس لئے سودا طے نہیں پا رہا تھا۔

صمد خان کی چالبازی اس کے مخالفین کو ذرا دیر سے سمجھ میں آتی تھی اور وہ ہمیشہ خود کو بچا کر چالیں چلتا تھا۔ اس بار اس نے پہلے سے سمجھ لیا کہ آگے چل کر خود کو نہیں بچا سکے گا لیکن چھوٹے بھائی کی محبت اور عزت' مائرہ کو صحیح سلامت واپس لے آئے گا۔

وہ خوب سمجھ رہا تھا کہ حکمران پارٹی نے اسے پھانسنے کے لئے مائرہ کو اغوا کیا ہے۔

لہٰذا اس نے حکمران پارٹی سے معاملات طے کئے۔ اس نے کہا۔ "بمبئی میں بڑے پیمانے پر قتل عام کرنے اور دہشت پھیلانے کے لئے شیوسینا والے ایک مخصوص رقم دے رہے ہیں لیکن اس بار میں نے انکار کر دیا ہے جس کے نتیجے میں انہوں نے میرے بھائی کی بیوی مائرہ کو اغوا کر لیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مائرہ کے اغوا ہونے پر میں طیش میں آ کر حکمران پارٹی پر شبہ کروں اور بمبئی میں آگ اور خون کی ہولی شروع کر دوں۔ آپ بتائیں کیا واقعی مجھے آپ لوگوں پر شبہ کرنا چاہئے؟"

ایک منسٹر نے کہا۔ "خان بھائی! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہم شیوسینا والوں کی طرح ایسے گرے ہوئے نہیں ہیں کہ آپ جیسے مسلمان کو دوست بنا کر اپنا کام بھی نکالیں اور آپ کے بھائی کی عزت پر ہاتھ بھی ڈالیں۔ ہے رام رام' شیوسینا والوں کی مسلم دشمنی تو ساری دنیا جانتی ہے۔"

"میں دنیا کو نہیں جانتا۔ صرف اپنے بھائی کی شریک حیات کی واپسی چاہتا ہوں۔ 1996ء کو الیکشن ہے۔ آپ لوگ مہاراشٹر میں اپنی کمزور پوزیشن کو خوب سمجھتے ہیں۔ آپ کے مقابلے میں شیوسینا کو میں ہی کمزور بنا سکتا ہوں۔ بمبئی میں امن و امان رہے گا کہیں کوئی دھماکا یا قتل نہیں ہو گا۔ صرف چھ گھنٹے کے اندر شیوسینا کے چند بڑے لیڈر بڑی خاموشی سے مارے جائیں گے۔ بڑے لیڈروں کی موت سے شیوسینا کمزور ہو گی۔"

"لیکن وہ لوگ حکومت کو الزام دیں گے کہ ہم نے انہیں قتل کرایا ہے۔"

"میں اپنا کھیل خوب سمجھتا ہوں۔ وہ ایسے مریں گے کہ ان کی موت خودکشی اور حادثات کا نتیجہ معلوم ہو گی۔"

"خان بھائی! آپ پٹڑی بدل رہے ہیں' ہم کس حد تک بھروسا کریں؟"

"ایک پٹھان کی زبان پر بھروسا کرو۔ آدھے گھنٹے کے اندر شیوسینا کے کسی بڑے لیڈر کی خودکشی کی تمہیں خبر ملے گی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے مائرہ کا پتا معلوم نہ ہوا تو پورے مہاراشٹر میں ایسی دہشت گردی شروع ہو گی کہ وہاں کی جنتا تم حکمرانوں کو استعفیٰ دینے کے لئے چیخنے لگے گی۔ الیکشن سے پہلے ہی اس صوبے سے تمہارے قدم اکھڑ جائیں گے۔"

"نہیں خان بھائی! ہم تمہاری ایجنسی کی خدمات حاصل کریں گے۔ میں ایک پٹھان

کی زبان پر بھروسا کر کے مائرہ کا پتا بتا رہا ہوں۔ آپ نوٹ کریں۔"

اس نے پتا نوٹ کرنے کے بعد کہا۔ "تم بھی سنو۔ بال ٹھاکرے کا دست راست اور پونا میں ووٹوں کی اکثریت سے جیتنے والا اٹل بہاری اپنے ساحلی گودام کی طرف گیا ہے۔ اپنے جاسوس بھیج کر معلوم کر لو۔ وہ اپنی دھوتی کا پھندا بنا کر خودکشی کرے گا۔ وہاں کوئی گولی نہیں چلے گی۔ میں بڑی خاموشی سے اپنا پہلا وعدہ پورا کرنے والا ہوں لیکن ایک شرط ہے' تم ابھی کسی بھی پہلی فلائٹ سے اسد خان اور مائرہ کو دبئ بھیجو گے۔"

"میں ابھی ان کی روانگی کا انتظام کرتا ہوں۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ پچھلے باب میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ کس طرح صمد خان اور اس کے چھوٹے بھائی اسد خان نے ایک مکان میں پہنچ کر مائرہ کو حاصل کیا اور مائرہ پر ثابت کیا کہ جس ڈاکٹر ساجد کے ساتھ آئی ہے وہ مسلمان نہیں ہندو ہے اور اس سے پہلے بھی وہ دو مسلمان عورتوں سے فراڈ کر چکا ہے۔

صمد خان نے فراڈ ڈاکٹر ساجد کو زندہ جلا دیا۔ پھر اپنے بھائی اور مائرہ کو بھارت سے دبئ جانے پر مجبور کر دیا۔ اسد خان اپنے بھائی سے دور نہیں جانا چاہتا تھا۔ صمد خان نے اسے تھپک کر کہا۔ "تم مائرہ کو لے کر جاؤ۔ میں جلد ہی تمہارے پاس آ جاؤں گا۔"

حکمران پارٹی صمد خان کا اعتماد حاصل کرنا چاہتی تھی اس لئے مائرہ اور اسد خان کو ایک فلائٹ سے دبئ روانہ کر دیا۔ یہ سارا کام "را" ایجنسی کے زونل افسر نے اپنی نگرانی میں کیا تھا اور دبئ میں صمد خان کے باس کو بھارتی حکومت کی طرف سے دوستی اور خیر سگالی کا پیغام بھیجا تھا۔

دبئ ہیڈ کوارٹر میں یہ اطلاعات پہنچ رہی تھیں کہ شیو سینا کے تین بڑے سیاستدانوں میں سے ایک نے اپنی دھوتی کا پھندا بنا کر خودکشی کی۔ دوسرا کار کے حادثے میں مارا گیا اور تیسرا اپنی ایک داشتہ کے ساتھ موٹر بوٹ میں سمندر کی سیر کے لئے گیا تھا' وہاں موٹر بوٹ اور داشتہ سمیت گہرے پانی میں ڈوب کر مر گیا۔

بال ٹھاکرے نے عارضی طور پر روپوشی اختیار کر لی اور مختلف ذرائع سے دبئ تک صمد خان کے خلاف رپورٹ پہنچانے لگا کہ اس نے صرف اپنے بھائی کی بیوی کو واپس لانے کے لئے پٹڑی بدل لی ہے۔ میری پارٹی کے تین سیاستدانوں کی موت ایسے ہوئی ہے کہ میں

نہیں قتل ثابت نہیں کر سکتا لیکن صمد خان نے یہ اچھا نہیں کیا ہے۔ "را" والوں نے اس کی غیرت اور عزت سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ اب وہ بری طرح پچھتائے گا۔

بال ٹھاکرے اس کے خلاف جو شکایات کر رہا تھا' ان شکایات میں سے ایک بات وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ آگے چل کر اسے پچھتانا ہو گا۔ وہ صرف شیو سینا کی ہی نہیں "را" والوں کی بھی دوغلی پالیسیوں کو خوب سمجھتا تھا۔ اسی لئے اس نے مائرہ کو حاصل کرتے ہی اسے اسد خان کے ساتھ دبئ بھیج دیا تھا اور باس کو خفیہ پیغام دیا تھا کہ ان دونوں کو کبھی واپس نہ آنے دیا جائے۔

چند ہفتوں کے بعد باس کا پیغام آیا۔ "صمد خان! پٹڑی بدل دو۔ شیو سینا نے مطلوبہ رقم ادا کر دی ہے۔ "را" سے دور ہی رہو تو بہتر ہے۔ وہ لوگ بھی پٹڑی بدلنے میں دیر نہیں لگاتے ہیں۔"

سیاست ہے ہی ایسی چیز کہ کوئی کسی پر بھروسا نہیں کرتا ہے۔ اسی لئے ہارس ٹریڈنگ' تھالی کے بینگن اور لوٹا کریسی جیسی اصطلاحات سیاسی کھلاڑیوں کے درمیان پیدا ہو گئی ہیں۔ صمد خان اپنی پالیسی بدلنا چاہتا تھا۔ ایسے ہی وقت "را" کے زونل افسر کی ایک حسین نوجوان اور چنچل سی بہن اس پر عاشق ہو گئی۔ اس کا نام کامنا کانکر تھا۔ وہ صمد خان کو چھیڑ چھیڑ کر اپنی طرف مائل کرتی تھی اور دعوے کرتی تھی کہ وہ کسی دن اس سے ملاقات نہیں کرے گا اور اسے نظرانداز کرے گا تو وہ اپنی جان پر کھیل جائے گی۔

وہ تو تنہا زندگی گزار کر اس دنیا سے جانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں نے کبھی شادی نہ کرنے کی قسم کھائی ہے۔ کیونکہ میں خطرات سے کھیلتا ہوں۔ لہٰذا مجھ سے شادی کی توقع نہ کرو۔ یوں بھی ہمارے درمیان مذہب کی دیوار ہے۔"

کامنا نے کہا۔ "ہونے دو۔ یہ مذہب اور دھرم کا نہیں' دل کا معاملہ ہے۔ نہ ہم نکاح پڑھوائیں گے اور نہ ہی لگن منڈپ میں اگنی کے سات پھیرے لیں گے۔ سیدھے کورٹ جائیں گے اور کورٹ میرج کر لیں گے۔"

"کیا تمہارا زونل افسر بھائی' را ایجنسی اور انتہا پسند ہندو ہماری شادی اور ازدواجی حیثیت کو برداشت کریں گے؟"

"کیوں نہیں۔ جب تم را کے لئے کام کر رہے ہو تو یہ تنظیم ہماری حفاظت کرے

گی۔"

"تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھو۔ انتہا پسند شیوسینا والے ابھی تو اس آسرے میں ہیں کہ شاید میں ان کا ساتھ دینے لگوں۔ ان کی توقع پوری نہیں ہو گی تو وہ ہماری شادی کو بہت بڑا مسئلہ بنا دیں گے۔"

"اس کے باوجود تمہاری ایجنسی مہاراشٹر میں بہت مضبوط ہے۔ اس کے علاوہ تمہیں را کی پشت پناہی حاصل ہو گی۔ شیوسینا والے مشکل میں پڑ جائیں گے۔"

"اور اگر میں مشکل میں پڑ جاؤں گا تو تمہیں کہاں بچاتا پھروں گا؟ اور اگر بچے ہو گئے تو میرے پاؤں کی زنجیر بن جائیں گے۔"

"بچے نہیں ہوں گے۔ ہم خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کریں گے اور کبھی کوئی مشکل آ پڑی تو میری فکر بالکل نہ کرنا۔ میں زونل افسر کی بہن ہوں۔ میری حفاظت کرنے والے بہت ہیں۔"

وہ تو اس کی دیوانی ہو گئی تھی۔ صمد خان نے اس کی محبت اور دیوانگی کو دل سے تسلیم کیا پھر کورٹ میرج کر لی۔ شادی کے دوسرے دن باس کی طرف سے پیغام ملا تھا کہ وہ پٹڑی بدل لے کیونکہ شیوسینا والوں نے مطلوبہ رقم ادا کر دی ہے۔

اس نے جوابی پیغام بھیجا کہ یہاں تو سیاسی ایجنسی کا معاملہ نہیں رہا' اب یہ دل کا معاملہ ہو گیا ہے۔ وہ را کے زونل افسر کی بہن کامنا سے شادی کر چکا ہے۔

ہیڈ کوارٹر میں بعض اوقات صمد خان کی کچھ باتیں ناگوار گزرتی تھیں۔ وہ بعض فوری نوعیت کے کام باس کی اجازت کے بغیر کرتا تھا اور باس اس لئے اسے برداشت کرتا تھا کہ وہ اکثر بڑی کامیابیاں حاصل کرتا تھا۔ کبھی چھوٹا بڑا نقصان ہو جاتا تھا جسے برداشت کر لیا جاتا تھا کیونکہ ایسا سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ کامیابیاں ہمیشہ حاصل نہیں ہوتیں' کبھی کبھی ناکامیوں کو بھی برداشت کرنے کا حوصلہ رکھنا پڑتا ہے۔

پھر یہ کہ صمد خان کا ایک رعب اور دبدبہ تھا۔ اس کی کامیابیوں کا تناسب زیادہ تھا۔ اس لئے باس اسے ذاتی طور پر بہت چاہتا تھا۔ اس نے پیغام بھیجا۔ "صمد خان! مجھے تمہاری چند خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ پسند تھی کہ اپنے ساتھ کوئی کمزوری نہیں پالتے تھے لیکن تم نے یہ شادی کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔"

وہ بولا۔ "شاید آپ یقین نہ کریں کہ میں نے جان بوجھ کر یہ غلطی کی ہے۔"

"تم یہ کون سی عقل مندی کی بات کہہ رہے ہو؟"

"یہ آپ کے لئے اور دنیا والوں کے لئے عقل مندی نہیں بلکہ بہت بڑی حماقت ہے لیکن ہم پٹھانوں کے سامنے جب غیرت اور عقل کا معاملہ الجھتا ہے تو ہم غیرت کے آگے عقل کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ عزت اور غیرت کے بغیر زندگی حرام ہے تو عقل کیا چیز ہے۔ میرے بھائی کی عزت' مائرہ میرے لئے غیرت بن چکی ہے' اس کے لئے میں جان ہار سکتا ہوں۔ پھر میں نے ایسے وقت یہ چال چلی ہے جب شیوسینا والے مطلوبہ رقم دینے سے کترا رہے تھے۔ حکمران پارٹی والے اور "را" کے افسران کو یقین تھا کہ میں غیرت مند پٹھان ہوں۔ مائرہ کو حاصل کرنے کے لئے ان سے معاملات طے کروں گا اور میں نے ان کی پلاننگ کے مطابق یہی کیا۔ انہوں نے مائرہ کو بھی واپس لے جانے دیا اور ڈاکٹر ساجد جیسے فراڈ کرنے والے ایک ہندو ڈاکٹر کو زندہ جلا ڈالنے پر بھی انہوں نے اعتراض نہیں کیا۔"

"انہوں نے یہ سمجھوتا اس لئے کیا ہے کہ تم مہاراشٹر کا زلزلہ سمجھے جاتے ہو اور وہ جانتے ہیں کہ تم ہماری ایجنسی کی بہت بڑی طاقت ہو اسی لئے تمہیں پھانسا گیا ہے۔"

"میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ پھانسا نہیں گیا۔ میں را کا پورا گیم سمجھنے کے بعد خود پھنسنے آیا ہوں۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہارا باس ہو کر تمہاری پولیسی پر عمل کروں۔ شیوسینا کے پچیس کروڑ واپس کر دوں اور حکمران پارٹی اور "را" کا ساتھ دوں۔"

"میں نے آپ سے ایسا کرنے کے لئے نہیں کہا ہے اور نہ ہی میں اس خوش فہمی میں ہوں کہ ایک زلزلہ ہوں اور ایک ایجنسی کی طاقت ہوں۔ آپ کی ایجنسی میں مجھ سے بڑے شیر رہیں۔ آپ پسند کریں تو میں ایک مشورہ دوں۔"

"بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"آپ مہاراشٹر میں میری جگہ مجھ سے زیادہ تجربہ کار ایجنٹ مقرر کریں جب تک وہ نیا ایجنٹ وہاں کے تمام کام اچھی طرح سمجھ کر نہ سنبھال لے اس وقت تک یہی ظاہر کریں کہ ایجنسی کا ایجنٹ صمد خان ہی ہے۔ میں "را" والوں کو یہ تاثر دیتا رہوں گا کہ شیوسینا کو

خوش فہمی میں مبتلا رکھنے کے لئے یہی ظاہر کیا جا رہا ہے کہ میں اور میری ایجنسی ان کے لئے ہی کام کر رہی ہے۔"

"کیا تم بھارت کی سیاسی پارٹیوں کو، ان کی ایجنسیوں اور جاسوسوں کو اتنا نادان سمجھتے ہو کہ تم جو کہو گے اس پر وہ لوگ یقین کر لیں گے۔"

"سیاسی پارٹیاں نادان نہیں ہوتیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی ان سے نادانیاں ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے تو حکومتیں بدلتی رہتی ہیں۔ میں نے ابھی ایک مشورہ دیا ہے اسے قبول کریں یا نہ کریں۔ ویسے یہ بات یقینی ہے کہ اب یہ صمد خان گیا "را" والے مجھے شکنجے میں لے رہے ہیں اگر ایسا نہیں ہے تو آپ کے آدمی مجھے گولی مار دیں گے۔ شیوسینا کی پچیس کروڑ روپے کی رقم کچھ کم نہیں ہے۔"

باس نے کہا۔ "خان! یہ جرائم کی دنیا ایسی ہی ہوتی ہے۔ یہاں اپنے تحفظ کے لئے اپنے ہی محافظ کو گولی مار دی جاتی ہے برسوں سے وفاداری کرنے والے کی ایک غلطی بھی برداشت نہیں کی جاتی لیکن میرا وعدہ ہے کہ تم غیرت میں آ کر جس دلدل میں جا پھنسے ہو، وہاں سے تمہیں صحیح سلامت نکال لانے کی کوشش کروں گا۔"

"آپ میری فکر نہ کریں۔ میری دعا ہے کہ مہاراشٹر میں آپ کی ایجنسی پہلے سے زیادہ اپنا لوہا منواتی رہے۔"

یہ خفیہ رابطے کے ذریعے باس سے صمد خان کی آخری گفتگو تھی۔ ان دنوں وہ اپنی بیوی کامنا کا ٹکر کے ساتھ ایک بڑی شاہانہ طرز کی لانچ میں دن گزار رہا تھا۔ ایسی کئی لانچیں برسراقتدار سیاستدانوں کے عیش و عشرت کے لئے بنائی گئی تھیں۔ وہ لوگ اپنی داشتاؤں کے ساتھ کچھ روز گزارنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک لانچ میں کامنا نے صمد خان سے کہا۔ "ایک ہی ساحل پر رہنے سے بے زاری سی ہونے لگی ہے۔ کیوں نہ لانچ کو دوسرے ساحل پر لے چلیں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بمبئی سے گوا تک جتنے ساحل ہیں، بڑے پُر رونق ہیں۔ تم یہاں سے کنارے کنارے سری لنکا تک چلنے کو کہو گی تو چلوں گا۔ مجھے تو بس تمہارا ساتھ چاہئے۔"

اس نے لانچ کے انچارج سے کہا کہ کسی دوسرے ساحل تک چلے۔ جب لانچ وہاں

سے روانہ ہونے لگی تو رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ فون پر کہا گیا۔ "مسٹر خان! یہ مدھیہ پردیش کے منتری کی لانچ ہے۔ آپ اپنی وائف کے ساتھ موٹر بوٹ میں جس ساحل پر بھی جائیں گے وہاں آپ کو پُر تعیش لانچ یا محل نما کوٹھی رہائش کے لئے مل جائے گی۔"

وہ کامنا کے ساتھ ایک موٹر بوٹ میں روانہ ہوا۔ سمندر کے گہرے پانی سے گزرتے وقت ایک ہیلی کاپٹر فضا میں پرواز کرتا ہوا آیا۔ موبائل فون پر کہا۔ "خان بھائی! آگے نہ جاؤ خطرہ ہے۔ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ بال ٹھاکرے نے تمہاری موت کا سامان کر رکھا ہے۔ ہیلی کاپٹر سے سیڑھی لٹکائی جا رہی ہے۔ وائف کے ساتھ اوپر چلے آؤ۔"

خطرناک کھیلوں میں ایسے حالات کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ کامنا کے ساتھ سیڑھی کے ذریعے ہیلی کاپٹر میں آ گیا۔ وہاں کامنا کا بھائی زونل افسر بھی موجود تھا۔ درمیانی سیٹ خالی تھی۔ پچھلی سیٹ پر تین مسلح فوجی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ کامنا کے ساتھ آ کر درمیانی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پھر نیچے سمندر کی طرف دیکھنے لگا لیکن ہیلی کاپٹر بہت بلند ہو چکا تھا۔ تاریکی میں سمندر نظر نہیں آ رہا تھا۔

ہاں مگر روشنی ملے تو بہت کچھ نظر آ جاتا ہے۔ سمندر کی سطح پر اچانک روشنی کا بہت بڑا جھماکا ہوا پھر آگ کے لپکتے ہوئے شعلے دھیرے دھیرے سمندر میں ڈوبتے ہوئے بجھنے لگے۔ وہ آگ کے شعلے نہیں بلکہ وہ موٹر بوٹ ڈوب رہی تھی جس پر کامنا اور صمد خان سفر کر رہے تھے۔ زونل افسر نے کہا۔ "او گاڈ! ہم وقت سے پہلے نہ پہنچتے تو کیا ہوتا؟ صمد خان، یہ شیوسینا والوں نے تمہیں مار ڈالنے کی ہی پلاننگ کی تھی۔"

صمد خان نے کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ موٹر بوٹ میں پہلے سے بم چھپایا گیا تھا۔ اسے دور کہیں سے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے بلاسٹ کیا گیا ہے۔ میں ان لوگوں سے نمٹ لوں گا۔"

بات ختم ہوتے ہی پیچھے بیٹھے ہوئے فوجیوں میں سے ایک نے صمد خان کی گردن دبوچ لی۔ دوسرے نے گن کی نال اس کی کنپٹی سے لگا لی۔ زونل افسر نے پیچھے پلٹ کر درمیانی سیٹ پر بیٹھے ہوئے صمد خان سے کہا۔ "ایک گولی چلے گی اور مر جاؤ گے۔ ہم تمہیں جانتے ہیں کہ موت کو کھیل سمجھتے ہو۔ اس لئے ہم تمہیں مارنا نہیں چاہتے۔ تمہاری موت سے زیادہ تمہاری زندگی اہم ہے۔ اس لئے ہم تمہیں زندہ رکھیں گے۔"

اسی وقت صمد خان کے ایک بازو میں سوئی کی چبھن محسوس ہوئی۔ دوسرے ہی لمحے میں اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ تیسرے فوجی نے اسے بے ہوشی کا انجکشن لگایا تھا۔

بے ہوشی آدھی موت ہوتی ہے۔ وہ دیکھ نہیں سکتا تھا کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ وہ سن نہیں سکتا تھا کہ کامنا اس بدلتی ہوئی سچویشن پر رو رہی ہے۔ فریاد کر رہی ہے اور رہائی کے لئے گڑگڑا رہی ہے۔

وہ زونل افسر اس کا بھائی نہیں تھا اور نہ ہی وہ را تنظیم سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ راجن پور کی رہنے والی تھی۔ شیوسینا کے لیڈر بال ٹھاکرے کے خاندان کے ایک دور کی عزیزہ تھی۔ چونکہ بال ٹھاکرے سے بہت دور اپنے جوان بھائی اور ایک عمر رسیدہ ماں کے ساتھ رہتی تھی اس لئے ان تینوں کو بڑی آسانی سے اغوا کر کے ناگپور کے ایک خفیہ قید خانے میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں کامنا کے سامنے اس کے جوان بھائی پر تشدد کیا گیا۔ وہ رونے اور گڑگڑانے لگی۔ بھائی پر جو ظلم ہو رہا تھا وہ آنکھوں سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ وہ دیکھنا نہیں چاہتی تھی مگر اسے دیکھنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ بھائی ایسے چیختا تھا جیسے اب تب میں مرنے ہی والا ہو۔ تب اس سے پوچھا گیا کہ بھائی کو زندہ سلامت اور خوش حال زندگی گزارتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہو؟

ماں بیٹی نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ وہ اس کی زندگی بچانے کے لئے کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ ماں نے کہا۔ "میری جان لے لو مگر بیٹے کو چھوڑ دو۔"

کہا گیا کہ بیٹے کے بعد ماں پر بھی تشدد کیا جائے گا اور اسے مار ڈالا جائے گا' ابھی اس لئے ہاتھ نہیں لگایا گیا ہے کہ بوڑھی ہے۔ زیادہ ظلم برداشت نہیں کر سکے گی۔ مارنے سے پہلے ہی مر جائے گی۔

کامنا نے پوچھا۔ "آخر تم لوگ ہم سے چاہتے کیا ہو؟"

ایک نے کہا۔ "ہم صرف تم سے چاہتے ہیں کہ ہمارا کچھ کام کرو۔ کام ہو جائے گا تو تمہارے بھائی کو بہت اونچی سرکاری ملازمت ملے گی۔ رہنے کو بنگلا اور گھومنے کو گاڑی دی جائے گی۔"

"میں اپنی ماں اور بھائی کے لئے جو کہو گے کروں گی۔ مگر ہمیں اس ٹارچر سیل سے نکالو۔"

"نکال دیں گے۔ پہلے معاملات تو طے ہو جانے دو۔"

را کے زونل افسر نے کہا۔ "میرا نام لچھت رائے ہے۔ تمہیں میری سگی بہن بننا ے گا۔"

وہ بولی۔ "یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ میں تمام عمر آپ کی بہن بن کر رہوں گی۔ پ اتنا نیک کام کرنے کے لئے ایسا ظلم کیوں کر رہے ہو؟"

"وہ اس لئے کہ تم ہمارے دشمن بال ٹھاکرے کی دور کے رشتے سے بہن لگتی ہو۔ م نے سوچا کہ تم اپنے بھائی کے دشمن لچھت رائے کی بہن بننے سے انکار کر دو گی۔ اس لئے تمہیں یہ نمونہ دکھا رہے ہیں کہ انکار کی صورت میں یہاں تمہارے بھائی اور تمہاری ماں کو کیسے تڑپا تڑپا کر مارا جائے گا۔"

"میں انکار نہیں کر رہی ہوں' اب کیا چاہتے ہو؟"

"پہلے تو یہ چاہتے ہیں کہ تم کبھی خود کو بال ٹھاکرے کی بہن نہ کہو۔ صرف لچھت رائے کی بہن بن کر ایک شاندار بنگلے میں رہا کرو۔ تمہاری ماں اور بھائی کو ایک الگ مکان ں نظر بند رکھا جائے گا۔ وہاں فوجیوں کا سخت پہرا رہا کرے گا۔ تم اپنی تسلی کے لئے جب ہو گی ماں اور بھائی سے ملنے کے لئے جا سکو گی اور انہیں نہایت آرام سے زندگی گزارتے ہوئے دیکھ سکو گی۔"

"مجھے آپ کی یہ تمام باتیں منظور ہیں لیکن مجھے رائے صاحب کی بہن بنانے کے لئے یہ فوج اور سرکاری لوگ کیوں استعمال کئے جا رہے ہیں؟"

"یہ راز کی باتیں ہیں' صرف تم سے کی جائیں گی۔ پہلے تمہیں رائے صاحب کی کوٹھی میں اور تمہاری ماں اور بھائی کو کسی دوسری جگہ پہنچایا جائے گا۔ یوں سمجھو کہ اس لمحے سے یہ قید اور ظلم و تشدد سب ختم ہو چکا ہے۔"

کامنا کو لچھت رائے کی کوٹھی میں پہنچایا گیا۔ وہاں "را" کے چند اہم افسران تھے۔ اسے بتایا گیا کہ لچھت رائے بمبئی کا زونل افسر ہے۔ فی الحال ناگپور میں اس لئے ہے کہ ادھر بال ٹھاکرے نہ آئے۔ ایک خفیہ ایجنسی کے تحت زبردست جال بچھایا گیا ہے۔ اس ایجنسی کے ایک خطرناک ایجنٹ اور انچارج صمد خان کو دوست بنانے کے منصوبے پر عمل کیا جا رہا ہے۔ وہ دوست بن کر آئے گا تو تم اس سے عشق کرو گی پھر جتنی جلدی ممکن ہو

اس سے شادی کرو گی۔

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”میں اور ایک مسلمان سے شادی کروں؟ آپ لوگ جانتے ہیں کہ ہم کتنے انتہا پسند ہندو ہیں۔ ٹھاکر بھائی کو معلوم ہو گا تو وہ مجھے اور اس مسلمان کو زندہ نہیں چھوڑے گا بلکہ دوسرے مسلمانوں کا بھی قتلِ عام شروع کرا دے گا۔“

”ہم یہی چاہتے ہیں۔ بال ٹھاکرے صمد خان کی ایجنسی سے ہی طاقت حاصل کر رہا ہے‘ اس ایجنسی سے اس کا اتنا گہرا تعلق ہے جسے توڑا نہیں جا سکتا لیکن جب اس کی ایک بہن ایک مسلمان کے بستر پر جائے گی تو ایک بہت بڑی بازی شروع ہو گی۔ ہمیں مہاراشٹر میں ایسی زبردست برتری حاصل ہو گی کہ شیو سینا والے منہ تکتے رہ جائیں گے۔“

”میں سمجھ گئی۔ آپ لوگوں کے اس سیاسی کھیل میں میری جان ضرور جائے گی۔ ٹھاکر بھائی مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا اور شاید میری ماں اور بھائی کا بھی یہی انجام ہو گا۔“

ایک افسر نے کہا۔ ”یہ تم اپنی عقل سے سوچ رہی ہو۔ ہم تمہاری ماں اور بھائی کو دہلی پہنچا دیں گے۔ وہاں شیو سینا کی دال نہیں گلے گی اور تم ہماری نگرانی میں صمد خان کے ساتھ شادی کے بعد بمبئی جاؤ گی۔ تم نہیں جانتی ہو کہ صمد خان کیسا زبردست اور کتنا خطرناک ہے۔ بال ٹھاکرے اس کے سائے سے بھی دور رہتا ہے۔ جب اس سے دور رہے گا تو کبھی تمہارے قریب آنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔“

کامنا کو تو وہی کرنا تھا۔ ورنہ اس کی ماں اور بھائی ٹارچر سیل میں مارے جاتے۔

دوسری طرف بال ٹھاکرے سے بھی یہی اندیشہ تھا لیکن شیو سینا کا زور پورے بھارت میں نہیں تھا۔ بال ٹھاکرے اپنے صوبے سے نکل کر انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اس لحاظ سے کامنا نے یہی طے کیا کہ وہ سرکاری پناہ میں نسبتاً محفوظ رہے گی اور اپنی ماں اور بھائی کو بھی زندہ سلامت رہ کر ایک اچھی زندگی دے سکے گی۔

پھر اسے جو سکھایا وہ سیکھتی گئی۔ جیسی راہنمائی ملتی گئی اس راہ پر چلتے چلتے آخر صمد خان سے کورٹ میرج کر لی۔ جیسا کہ منصوبہ تھا وہ شادی کے بعد اس کے ساتھ بمبئی آ گئی۔ اس عرصے میں اتنا ہوا کہ اسے صمد خان سے دلی لگاؤ پیدا ہو گیا۔ وہ اتنے خلوص اور بے غرضی سے محبت کرتا تھا‘ اس کا اتنا خیال رکھتا تھا کہ وہ اسے اپنے من کا دیوتا بنا کر پوجنے لگی تھی۔

وہ بھلا سیاسی چالوں کو کیا سمجھتی ”را“ تنظیم والے تو کچھ عرصے تک اس انتظار میں رہے کہ صمد خان اب ان کے پاس آنے کے بعد اپنی ایجنسی کے تمام اہم افراد سے رابطہ کرے گا اور اپنے خفیہ اڈوں تک جائے گا لیکن ”را“ والوں کی یہ توقع پوری نہیں ہو رہی تھی۔ پھر ”را“ کے جاسوسوں نے بتایا کہ شیو سینا والوں نے اس ایجنسی کو مطلوبہ رقم ادا کی ہے لہٰذا صمد خان پٹڑی بدل کر پھر ہیڈ کوارٹر کے حکم کے مطابق شیو سینا کی طرف چلا جائے گا۔

ایسی معلومات حاصل کرنے کے بعد انہوں نے وہ گہری چال چلی‘ جو پہلے سوچ رکھی تھی اور جس کے لئے بال ٹھاکرے کے خاندان سے ایک حسینہ کو اغوا کیا تھا۔ ایجنسی کے چھوٹے بڑے لوگ اس بات سے باخبر رہتے تھے کہ ان کا ایجنٹ اور انچارج صمد خان کس طرح جگہ بدل بدل کر کامنا کے ساتھ رہتا ہے اور اب ایک لانچ میں ہے۔ پھر پتا چلا کہ وہ کامنا کے ساتھ ایک موٹر بوٹ میں کہیں جا رہا ہے۔ صمد خان بھی موبائل فون کے ذریعے اپنے خاص ماتحتوں سے رابطہ رکھتا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ موٹر بوٹ سے اتر کر جہاں قیام کرے گا‘ وہاں سے رابطہ کر کے اس جگہ کا نام اور پتا بتائے گا۔

اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ایجنسی کے تمام افراد کو بمبئی سے دبئی تک یہی معلوم ہوا کہ صمد خان کامنا کے ساتھ جس موٹر بوٹ میں جا رہا تھا‘ وہ سمندر میں بلاسٹ ہو گئی ہے اور وہ ایسے ڈوبی ہے کہ صمد خان کی لاش بھی نہیں ملے گی۔

جب سے یہ معلوم ہوا تھا کہ صمد خان نے کسی کامنا ٹھکر سے شادی کی ہے تب سے ایجنسی والے یہ معلوم کر رہے تھے کہ وہ کامنا ٹھکر کون ہے؟ ایک بات تو یہ معلوم ہوئی تھی کہ وہ حکمران پارٹی کے کسی عہدیدار کی بہن ہے اور دوسری اطلاع یہ ملی تھی کہ وہ کامنا بال ٹھاکرے کے رشتے کی ایک بہن تھی اور سچ یہی نکلا کہ وہ بال ٹھاکرے کی بہن تھی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ وہ انتہا پسند ہندو اپنی بہن کو کسی مسلمان کے ساتھ زندگی گزارتے نہ دیکھ سکا اور اس نے بڑی رازداری سے اپنی بے غیرت بہن کو اس مسلمان کے ساتھ سمندر میں ڈبو دیا۔

حکمران پارٹی اور ”را“ تنظیم پر اس لئے شبہ نہیں کیا گیا کہ صمد خان ان کے لئے ہی کام کرنے والا تھا اور اپنے باس سے کہہ چکا تھا کہ اس کی جگہ اب ایجنسی میں دوسرا ایجنٹ

اور انچارج لایا جائے۔ اگر وہ کسی طرح بھارت سے نکل سکا تو کسی دوسرے ملک میں جاکر کامنا کے ساتھ زندگی گزارے گا۔

"را" کے افسران کی یہ چال کامیاب ہو چکی تھی۔ ایجنسی کے ہیڈ کوارٹر کے بگ باس کی طرف سے شیوسینا کا محاسبہ ہو رہا تھا اور بال ٹھاکرے پر الزام عائد کیا جا رہا تھا کہ اس انتہا پسند ہندو نے بڑی رازداری سے صمد خان کو قتل کیا ہے۔ مسلمانوں سے اس کی نفرت اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ وہ اپنی ایک رشتے کی بہن کو اس مسلمان کے ساتھ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے خلاف دلائل ہیں۔ ان دلائل کو غلط ثابت کر کے اس کی بے گناہی کا ثبوت پیش کیا جائے۔ ورنہ یہ ایجنسی پھر حکمران پارٹی کے لئے کام کرے گی۔

☆======☆======☆

صمد خان کی آنکھ کھلی تو اس کے آس پاس نیم تاریکی تھی۔ سامنے اور دائیں بائیں کی دیواریں سیاہ تھیں۔ بیدار ہونے کے بعد چند لمحوں تک سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ جاگ رہا ہے یا یہ سب خواب ہے۔

پھر اسے یاد آ گیا کہ اسے اور کامنا کو ایک ہیلی کاپٹر میں کیسے لایا گیا تھا۔ ایک انجکشن کے ذریعے اسے بے ہوش کر دیا گیا تھا اور اب ہوش میں آنے کے بعد وہ ایک اونچے ٹرالی بیڈ پر چاروں شانے چت لیٹا ہوا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں آہنی ہتھکڑیوں اور زنجیروں سے بندھے ہوئے ہیں۔

وہ جرائم کی دنیا میں رہنے والا سمجھ گیا کہ کسی ٹارچر سیل میں پڑا ہوا ہے۔ اس کے جسم سے تمام لباس اتار دیا گیا تھا اور اسے وہاں تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہ سوچا گیا ہو گا کہ اس کے ہوش میں آنے کے بعد دشمنی کی وجہ بھی بتائی جائے گی اور بڑی درندگی سے تشدد کیا جائے گا۔

تب اسے کامنا کی آواز اپنے سرہانے سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "تم حرکت کر رہے ہو۔ کیا ہوش میں آ گئے ہو؟"

اس نے سر کی طرف دیدے گھما کر دیکھنا چاہا مگر وہ نظر نہیں آئی۔ اس نے پوچھا۔ "تم کہاں ہو؟"

"تمہارے سرہانے ہوں۔ دوسرے ٹرالی بیڈ پر بندھی ہوئی ہوں۔"

پھر وہ رونے لگی۔ صمد خان نے کہا۔ "آنسو اور زیادہ کمزور بنا دیتے ہیں۔ حوصلہ کرو۔"

"اب حوصلہ کرنے کے لئے کیا رہ گیا ہے۔ انہوں نے میرے بدن پر ایک لباس بھی نہیں چھوڑا ہے۔"

وہ پھر رونے لگی۔ روتے روتے کہنے لگی۔ "وہ زونل افسر جو میرا بھائی بنا ہوا تھا اور مجھے بہن کہا کرتا تھا اسی نے میرے بدن سے لباس کو پھاڑ پھاڑ کر الگ کر دیا۔ پھر.......... پھر.........."

وہ رو رہی تھی۔ ایک دم سے چیخ کر بولی۔ "میں تمہارے قابل نہیں رہی۔ صمد خان! میں تمہیں منہ دکھانا بھی نہیں چاہتی۔ میں مرنا چاہتی ہوں۔ تمہارا سامنا نہیں کرنا چاہتی.........."

وہ بول رہی تھی۔ صمد خان جوش اور جنون میں اپنے ہاتھوں اور پیروں کو یوں جھٹکے دے رہا تھا جیسے ہتھکڑیوں اور زنجیروں کو توڑ ڈالے گا لیکن اس کے ہاتھ اور پاؤں زخمی ہو رہے تھے۔ چاروں ہاتھ پاؤں سے لہو بہنے لگا تھا۔ کامنا اس کی عزت تھی۔ غیرت کے مارے اپنے زخموں کی تکلیف کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ گرج گرج کر کہہ رہا تھا۔ "بے غیرتو! بزدلو! میں تم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مرد کے بچے ہو تو میرے ہاتھ پاؤں کھول دو۔ پھر میں رہوں گا یا تم لوگ اس دنیا میں رہو گے۔ کہاں ہو؟ میرے سامنے آؤ۔ اپنی ماں کا دودھ پیا ہے تو ایک بار مجھے کھول دو۔ مجھے کھول دو۔ مجھے کھول دو۔"

اس پر جنون طاری ہو گیا۔ وہ اتنی قوت سے اپنے جسم کو جھٹکے دے رہا تھا کہ وہ ٹرالی بیڈ اپنے پہیوں پر سرکتا جا رہا تھا اور یوں ڈگمگا رہا تھا جیسے کسی طرف فرش پر گر پڑے گا۔

کامنا نے رو رو کر کہا۔ "نہیں، نہیں صمد خان! خاموش ہو جاؤ۔ میں دیکھ رہی ہوں تم بری طرح زخمی ہو رہے ہو۔ ایسی جنونی حرکتیں کرو گے تو تمہیں کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ تمہارا ہاتھ کسی دشمن کے گریبان تک نہیں پہنچے گا۔ وہ جانتے ہیں کہ تم کتنے خطرناک ہو اور کیا کر سکتے ہو۔ اسی لئے انہوں نے تمہیں اس طرح جکڑ دیا ہے۔ میری بات مان لو۔ شانت ہو جاؤ۔"

پہیوں والا ٹرالی بیڈ گھومتے اور ڈگمگاتے ہوئے کامنا کے ٹرالی بیڈ کی طرف آگیا تھا۔ اپنی عزت کو بے لباس دیکھ کر وہ آنکھیں بند کر کے پھر گرجنے لگا۔ "کہاں ہو خنزیر کے بچو! اپنی زندگی چاہتے ہو تو میری بیوی پر کپڑا ڈالو۔ اسے لباس دو۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہاں سے بچ نکلا تو یہاں کے کسی لیڈر کو اور "را" کے کسی کتے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہوں مگر اس شرم والی پر کپڑا ڈالو۔ یہ تمہارے ہی دیس کی، تمہارے ہی دھرم کی عزت ہے.........."

وہ ٹارچر سیل ایک عمارت کے تہہ خانے میں تھا اور ساؤنڈ پروف تھا۔ چیخنے اور گرجنے والوں کی آوازیں اس سیل سے باہر عمارت کے گراؤنڈ فلور تک بھی نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ اس گراؤنڈ فلور میں "را" کا ایک بہت وسیع و عریض دفتر تھا۔ وہاں "را" کے چند اعلیٰ افسران بیٹھے ہوئے ایک دیوار کی طرف ایک بڑے ٹی وی کے ایکسٹرا اسکرین پر ٹارچر سیل کا منظر دیکھ رہے تھے۔ وہ ایکسٹرا اسکرین چھ فٹ کا تھا اور ٹارچر سیل کا ایک ایک منظر انہیں دکھا رہا تھا۔

صمد خان کا غصہ، جوش اور جنون اور غضب ناک انداز دیکھ کر ایک افسر نے رومال سے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "یہ تو بالکل درندہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ لوہے کی ہتھکڑیاں اور زنجیریں بھی توڑ ڈالے گا۔"

"را" کے ایس ایس بی یعنی اسپیشل سروسز بیورو کے افسر نے کہا۔ "یہ کوئی فلمی سین نہیں ہے کہ ہیرو لوہے کی ہتھکڑیاں اور فولادی سلاخیں توڑ کر رہائی پالے۔ ویسے یہ درندہ ہے۔ چاروں ہاتھ پاؤں زخموں سے لہولہان ہو رہے ہیں اور اسے تکلیف کا احساس تک نہیں ہو رہا ہے۔"

"را" کے جوائنٹ ڈائریکٹر نے کہا۔ "یہ بڑا غیرت مند ہے۔ یہ اپنے لئے نہیں کامنا کی عزت ڈھانپنے کے لئے گرج رہا ہے جب تک وہ بے لباس رہے گی، وہ گرجتے گرجتے پاگل ہو جائے گا۔"

افسر ایس ایس بی نے کہا۔ "ہم یہی چاہتے ہیں۔ یہ خان اتنا سخت جان ہے کہ اسے لوہے کی سلاخوں سے بھی مارا جائے، انگاروں سے بھی داغا جائے تو ایسی ذہنی تکلیف میں مبتلا نہیں ہو گا، جیسا کہ اب ہو رہا ہے۔ اسے کپڑے سے ڈھانپنے کے لئے وہ چیخ چیخ کر کہہ

کہ ہماری ہر بات ماننے کو تیار ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے ریموٹ کنٹرولر کے ایک بڑے سیٹ کا ایک بٹن دبایا۔ ٹارچر سیل وسیع ہال میں افسر ایس ایس بی کی گونجتی ہوئی آواز کہہ رہی تھی۔ "کیوں اپنی انرجی ضائع کرتے ہو۔ عقل سے کام لو اور سمجھو کہ یونہی گرجتے رہو گے مگر برس نہیں سکو گے۔ تمہارے اس قدر جوش اور جنون میں ایک بات پسند آئی کہ تم ہماری ہر بات مانو گے۔ ہماری باتیں اتنی معمولی ہیں کہ تم اپنی اور کامنا کی عزت اور آبرو سلامت رکھ کر ہر نے والی حکومت کی پناہ میں رہ سکتے ہو۔ کوئی دشمن کبھی تمہاری ازدواجی زندگی میں مداخلت نہیں کر سکے گا۔"

وہ گرج کر بولا۔ "مجھے کچھ کہنے سے پہلے اس کے بدن کو ڈھانپ دو۔ اس سے پہلے تمہاری کوئی بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔"

وہ سب جانتے تھے جب تک اپنی شریک حیات کی عزت کو پردے میں نہیں رکھے گا تب تک وہ کوئی بات نہ سنے گا اور نہ ہی ان کی کوئی بات مانے گا۔ تھوڑی دیر بعد دو عورتوں نے آکر پہلے کامنا کے جسم کو چادر سے ڈھانپ دیا۔ وہ گرج کر بولا۔ "نہیں صرف نہیں۔ اسے لباس پہناؤ۔"

اس کی ضد پر دونوں عورتوں نے کامنا کو لباس پہنایا۔ ایس ایس بی افسر نے کہا۔ "اب تمہارے جوش و جنون کو سرد پڑ جانا چاہئے اور تمہیں ہمارے سوالوں کے جواب دینا ہے۔"

"ضرور دوں گا۔ پہلے اس زونل افسر کو میرے سامنے لاؤ اور میرا ایک ہاتھ آزاد کرو۔ اس نے میری کامنا کو بہن بنا کر اس کا لباس اتارا۔ پہلے میں اسے ننگا کر کے جلاؤں گا۔"

ٹارچر سیل میں اسپیکر کے ذریعے آواز آئی۔ "وہ ہمارا ایک اہم اور ذمے دار افسر ہے۔ سوری "را" کا کوئی افسر تمہارے سامنے نہیں آئے گا۔"

وہ چیخ کر بولا۔ "پھر تمہاری کسی بات کا جواب نہیں ملے گا۔"

"سنو خان! عقل سے کام لو۔ ہمارے سوالات بالکل سیدھے سادے ہیں۔ تم آسانی سے جواب دے کر "را" کی پناہ میں اپنی کامنا کے ساتھ ایک محفوظ اور خوش حال زندگی

گزار سکتے ہو۔"

وہ بولا۔ "پہلے اس بے غیرت بھائی کی موت میرے ہاتھوں سے ہو گی۔ اگر تم سب سچے ہندو ہو تو پہلے راکھی کے تقدس کو اہمیت دو۔ جو راکھی زونل افسر کی کلائی پر باندھی ہو گی اگر اس راکھی کا کوئی احترام نہیں ہے اور بہن بھائی کا کوئی رشتہ نہیں ہے تو اپنے اس راکھی کے تہوار کو ختم کر دو۔"

"سیاست اور جنگ میں سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ چلو یوں سمجھ لو کہ یہ تہوار ختم ہو چکا ہے۔ تم کام کی باتیں کرو اور اس قید سے خود کو اور کامنا کو آزاد کراؤ۔"

"نہیں، پہلے میری کامنا کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والا میرے سامنے آئے۔ میں اسے جہنم میں پہنچاؤں گا۔ پھر کوئی دوسری بات ہو گی۔"

اس عمارت کے فرسٹ فلور پر بیٹھے ہوئے زونل افسر کو پسینے آ رہے تھے۔ افسر ایس بی نے کہا۔ "یہ پٹھان کا بچہ پہلے انتقام لے گا پھر ہم سے ہمارے مطلب کی بات کرے گا لیکن زونل افسر لچیت رائے ہم تمہیں اس کے سامنے پیش نہیں کریں گے۔ اس خردماغ کا ایک ہی علاج ہے کہ اسے وقفے وقفے سے ذہنی اذیتوں میں مبتلا کریں اور اسے نیم پاگل بنا دیں یا مجبور کر دیں کہ ہمارے سوالات کا جواب دیتا رہے۔"

انہوں نے آپس میں سر جوڑ کر فیصلے کئے۔ پھر ان کے ایک فیصلے کے مطابق چار ہٹے کٹے پہلوان اس ٹارچر سیل میں آئے۔ وہ چاروں بے لباس تھے۔ اسپیکر سے آواز آئی۔ "خان! تمہارے جیسا بددماغ اور خردماغ کوئی نہ ہو گا۔ تم ایک زونل افسر کی حرام کاری پر گرج رہے تھے اب یہاں چار پہلوان آئے ہیں۔ انہیں کیسے روکو گے؟ یہ ایک کے بعد ایک تمہاری عزت اور غیرت کی دھجیاں اڑاتے رہیں گے اور تم چیخ چیخ کر غیرت کے جوش میں پاگل ہو جاؤ گے۔"

صمد خان نے ذرا اٹھ کر ان چاروں کو بے شرمی سے بے لباس دیکھا تو غصے سے پاگل ہو گیا۔ ان چاروں میں سے ایک کامنا کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ وہ اپنی تمام تر غیرت مندانہ قوتوں سے ایسے تڑپنے لگا کہ ٹرالی بیڈ ڈگمگاتے ہوئے کامنا کے بیڈ سے ٹکرایا۔ آگے ایک پتھریلی رکاوٹ تھی جس کے باعث دونوں بیڈ ٹکرا کر اس طرح گرے کہ دونوں آمنے سامنے آ گئے۔

صمد خان کچھ ایسا تڑپتا رہا تھا اور ٹرالی بیڈ پر ایسی قوت کا مظاہرہ کرتا رہا تھا کہ آگے بڑھنے والا ایک پہلوان رک گیا تھا۔ شاید آہنی ہتھکڑیوں اور زنجیروں سے بندھے ہوئے قیدی کی قوت کا اندازہ کر رہا تھا۔

وہ دونوں گرنے کے بعد ایک دوسرے کے روبرو اس طرح ہو گئے کہ چہرے آمنے سامنے ہو گئے۔ وہ بندھے ہوئے تھے مگر گردن تک چہروں کو حرکت دے سکتے تھے اس لئے ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

"را" کے تمام افسران انہیں اسکرین پر دیکھ رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ "بڑا زبردست ہے، کیسے ٹکرا کر گرا ہے کہ کامنا کے گلے آ کر لگ گیا ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ "ابھی وہ چاروں پہلوان انہیں الگ کر دیں گے اور اسی کے سامنے کامنا کے گلے لگتے رہیں گے۔ پھر اس کے گرجنے اور جنون میں آنے کا تماشا قابل دید ہو گا۔"

صمد خان نے اتنی دیر میں سمجھ لیا تھا کہ ان کی آواز دوسری طرف سنی جا رہی ہے۔ اس نے کامنا کو چوم کر اس کے گلے لگتے ہی کہا۔ "وقت بہت کم ہے۔ ہم فوراً ہی الگ کر دیئے جائیں گے۔ فوراً اپنا فیصلہ سناؤ۔ عزت ہار کر زندہ رہنا چاہتی ہو یا.......... موت کو گلے لگا کر میری غیرت مند بیوی کہلانا چاہتی ہو؟"

"میں بے عزتی کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتی ہوں۔ خدا کے لئے عزت کی موت مرنے کا راستہ نکالو۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی صمد خان نے کامنا کے حلق کی طرف منہ لا کر اس کے نرخرے کو دانتوں سے دبوچ لیا۔ کامنا کے دیدے پھیل گئے تھے۔ تکلیف شدید تھی۔ سانس آخری مرحلے پر تھی مگر اس کی آنکھیں بدکاروں کی ذلت آمیز دنیا سے رخصت ہوتے وقت مسکرا رہی تھیں۔

اسپیکر سے غصہ بھری آواز ابھری۔ وہ آواز ان چار پہلوانوں کو مخاطب کر کے کہہ رہی تھی۔ "گدھے کے بچو! تماشا کیا دیکھ رہے ہو؟ وہ کامنا کو قتل کر رہا ہے۔ اپنی کمزوری کو اپنے ہاتھوں سے ختم کر رہا ہے۔ دونوں کو فوراً الگ کرو۔"

وہ سب دوڑتے ہوئے آئے۔ انہیں الگ کرنے کے لئے ٹرالی بیڈ کو ایک دوسرے

سے دور کرنا تھا۔ انہوں نے یہی کیا مگر دیر ہو چکی تھی۔ کامنا کے حلق سے خون کی دھار بہہ رہی تھی۔ نرخرے کا کچھ حصہ کٹ کر صمد خان کے دانتوں میں رہ گیا تھا۔ کامنا کے دیدے پھیل کر ساکت ہو گئے تھے۔ ہمیشہ کے لئے جسم ساکت ہو گیا تھا۔ اب دنیا کے تمام بدکار اس کے جسم تک تو پہنچ سکتے تھے اس کی آبرو تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

ان سب کی نگاہیں بڑی اسکرین پر تھیں۔ وہ چاروں پہلوان صمد خان کو لاتوں اور گھونسوں سے مار رہے تھے۔ پھر اس کے ٹرالی بیڈ کو سیدھا کر کے کوئی اسے بید سے مار رہا تھا' کوئی اس کے گھٹنوں پر ڈنڈے برسا رہا تھا۔ کوئی لوہے کے سریے سے اس کے پیروں کے تلوؤں پر ضربیں لگا رہا تھا۔ ان سب کے تشدد کے نتیجے میں صمد خان قہقہے لگا رہا تھا۔ کیونکہ اب اس کی کوئی کمزوری نہیں رہ گئی تھی۔ فولاد کو جتنا مارو اثر نہیں ہوتا۔ اب وہ موم نہیں رہا تھا کہ ٹوٹ جاتا یا پگھل جاتا۔

اسپیکر کے ذریعے حکم دیا گیا۔ "رک جاؤ۔ پانی میں لاٹھی اور پہاڑ پر پتھر مار رہے ہو۔ بے وقوفو! انہیں ایک دوسرے کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی الگ کر دینا چاہئے تھا۔ واپس آ جاؤ اور کامنا کی لاش لے آؤ۔"

وہ خردماغ پہلوان تھے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ گلے لگانے والا اپنی ہی جانِ حیات کا گلا نوچ کر لے جائے گا۔ وہ چاروں کامنا کی لاش ٹرالی بیڈ پر دھکیلتے ہوئے لے گئے۔

اسپیکر سے آواز آئی۔ "خان! تم بہت ہی گھناؤنے درندے ہو۔ تم نے اپنی بیوی کو بھی نہیں چھوڑا۔"

صمد خان نے کہا۔ "تم لوگ اس بے چاری کو کب چھوڑنے والے تھے۔ کیا یہ عقوبت خانہ تم نے پوجا کے لئے بنا رکھا ہے۔ اسے تو مرنا ہی تھا۔ عزت سے مر گئی ہے۔ اب کام کی بات کرو۔"

"تم شاید یقین نہ کرو۔ ہم تمہیں مان گئے ہیں۔ تم بہت کام کے آدمی ہو۔ اب ہم پوری سچائی سے تمہیں اپنا بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ تم ہماری پارٹی میں آ جاؤ۔"

"اپنی پارٹی میں شریک کرنے کے لئے میرے ہاتھ پاؤں کھولنے پڑیں گے۔ میں کھل جاؤں گا تو تم میں سے کون پہلے میرے سامنے آئے گا؟"

وہ سب ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے یوں دیکھنے لگے جیسے ایک دوسرے سے

پوچھ رہے ہوں کہ کون معاملات طے کرنے کے لئے پہلے اس درندے کے پاس جائے گا۔ ایڈیشنل ڈائریکٹر نے کہا۔ "ہم میں سے کوئی بھی اہم افسر تم سے ملاقات کرے گا بلکہ ہم سب تمہیں اپنا بنائیں گے لیکن پہلے ہمارے دلوں میں اپنا اعتماد قائم کرو۔"

"اب تو جو کہو گے' کروں گا۔ دل خوش کر دوں گا۔ ذرا مجھے بلا کر گلے تو لگاؤ۔"

اس کے بولنے کے انداز میں بڑی سفاکی تھی۔ ایک درندے کی غراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ پھر افسر ایس ایس پی نے کہا۔ "ابھی تمہارے اندر لاوا پک رہا ہے کیونکہ تم نے غیرت میں آ کر اپنی ہی وائف کو قتل کیا ہے تو اس کے نتیجے میں تمہیں ہم پر غصہ آنا چاہئے۔ ان حالات میں ہم ایک دوسرے کا اعتماد حاصل کرنے والی معقول باتیں نہیں کر سکیں گے۔ بہتر ہے کچھ وقت گزارو تاکہ تمہارے اندر غصہ کم ہوتا رہے۔"

"چنگاری جب بھڑکتی ہے تو وہ وقت کے ساتھ ساتھ شعلہ بن جاتی ہے۔ تم جتنا بھی وقت گزارنے کو کہو۔ شعلے بھڑکتے ہی رہیں گے۔ اپنا قیمتی وقت ضائع نہ کرو۔ جو کہنا ہے ابھی کہہ دو۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں مطمئن کرنے اور ہمارا اعتماد حاصل کرنے کے لئے صرف ہمارے بن کر یورپ کے کسی ملک میں "را" کے ایک افسر بن کر چلے جاؤ۔"

"مجھ پر جو اتنی بڑی مہربانی کی جا رہی ہے اس کی قیمت مجھے کیا ادا کرنی ہو گی؟"

"تمہیں بہت معمولی سا کام کرنا پڑے گا۔ مہاراشٹر میں جو تمہارا دست راست ہے اور جتنے اہم مخبر اور دہشت گرد ہیں' ان کے نام اور پتے بتا دو۔ اس کے بعد ہم بڑی رازداری سے تمہیں یورپ کے کسی ملک میں پہنچا دیں گے۔ پھر تمہاری ایجنسی اور شیوسینا والے تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔"

"مجھے تمہاری آفر پر ہنسی آنا چاہئے۔ مگر ابھی اپنی کامنا کا دکھ بھاری ہے۔ تم ہمارے باس کو عقل سے خالی سمجھتے ہو۔ باس میرے دست راست اور اہم لوگوں کو ان کی جگہ سے ہٹا چکا ہو گا اور اگر ایسا نہ بھی کیا ہو تو کیا میں اپنی وفاداری بدل دوں گا؟ کیا تمہیں پتا ہے کہ کتا بہت وفادار ہوتا ہے لیکن دین ایمان والے مسلمان اسے اپنے گھر میں نہیں پالتے۔"

ایک افسر نے کہا۔ "شاید اس لئے کہ کتے کو ناپاک سمجھتے ہیں۔"

"کتا نجس و ناپاک تو ہے ہی لیکن وہ وفادار جانور دوسروں کی وفاداری میں اپنی ہی قوم پر بھونکتا ہے۔ اپنی ہی ذات کے کتوں کو اس گھر کی طرف نہیں آنے دیتا جس کے دروازے پر دم ہلاتا ہے۔ میں کتا نہیں انسان ہوں اور مسلمان ہوں۔ اپنے ہی مسلمان باس سے غداری نہیں کروں گا۔"

پھر خاموشی چھا گئی۔ اس ٹارچر سیل میں پھر کسی افسر کے سوال کرنے کی آواز نہیں ابھری۔ وہ سب اپنی جگہ بیٹھے اسکرین پر اسے دیکھ رہے تھے اور انہوں نے مائیک کے بٹن کو آف کر دیا تھا تاکہ ان کی باتیں صمد خان نہ سن سکے۔

ایک افسر نے کہا۔ "یہ درست ہے کہ اس خان کے تمام اہم ماتحت اپنی رہائش گاہیں بدل چکے ہوں گے۔"

"اور خان جانتا ہو گا کہ اس کے اہم ماتحت کہاں جا سکتے ہیں۔ اپنے دوسرے اڈے کہاں بنا سکتے ہیں اور یہ ایسا سخت جان ہے کہ تشدد برداشت کرتا رہے گا۔ اپنی جان بھی دے دے گا لیکن ہمیں اس سلسلے میں کچھ نہیں بتائے گا۔"

افسر ایس ایس پی نے کہا۔ "اسے کل تک بھوکا پیاسا رہنے دو۔ پھر ایسے انجکشن لگائے جائیں کہ یہ جسمانی اور ذہنی طور پر بے حد کمزور ہو جائے۔ یہ کمزوری کے بعد اپنی ضد پر قائم نہیں رہے گا۔"

یہ طے پایا کہ دوسرے دن را کے افسران پھر وہاں حاضر ہوں گے اور صمد خان کے متعلق اپنے اپنے طور پر کچھ سوچ کر آئیں گے کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ انہوں نے چوبیس گھنٹوں کے لئے اسے نیم تاریک سیل میں چھوڑ دیا۔ ایک بٹن دبا کر ٹی وی کا بڑا اسکرین آف کر دیا۔ صمد خان نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ سب وہاں سے اٹھ کر جانے لگے۔

سیاسی جماعتیں ہوں یا جرائم پیشہ تنظیمیں ہوں ان کے اندر تھوڑا بہت انتشار ہوتا ہے اور اندر ہی اندر گروہ بندی ہوتی ہے۔ بھارت کا جو وزیراعظم ہوتا ہے وہ "را" کا ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ہوتا ہے اور جوائنٹ انٹیلی جنس کمیٹی کے عہدے پر رہتا ہے۔ فی الوقت برسوں تک حکومت کرنے والی کانگریس پارٹی میں ایسا انتشار پیدا ہوا تھا کہ "را" کے چند افسران بھی درپردہ ایک دوسرے سے نظریاتی اختلاف رکھنے لگے تھے۔

مہاراشٹر' اڑیسہ اور گجرات میں کانگریس نے بری طرح شکست کھائی تھی۔ اس شکست کی بنیادی وجہ مسلمان تھے۔ اس بار مسلمانوں نے ریاستی انتخابات میں کانگریس کو ووٹ نہیں دیا تھا۔ یہ ایک نمونہ تھا۔ اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ 1996ء میں جو راج بنتی کے انتخابات ہوں گے اس میں بھی مسلمان اس لئے ووٹ نہیں دیں گے کہ کانگریس کی حکومت میں ہی بابری مسجد کو شہید کیا گیا تھا اور کانگریس نے مسلمانوں کے حق میں کوئی ٹھوس قانونی کارروائی نہیں کی تھی کیونکہ وہ ہندوؤں کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایک مسجد کی دیواریں گراتے وقت یہ یاد نہیں رہا تھا کہ آئندہ الیکشن میں مسلمانوں کی اکثریت نے ساتھ نہ دیا تو کانگریس کے مضبوط قلعے کی دیواریں گرنے لگیں گی اور یہ آثار ابھی سے ریاستی انتخابات سے ظاہر ہو رہے تھے۔

اس کے نتیجے میں کانگریس کے اندر پھوٹ پڑ گئی تھی۔ آئندہ وزیراعظم نرسیما راؤ کی کامیابی مشکوک ہو گئی تھی۔ جو لوگ آئندہ وزیراعظم بننا چاہتے تھے وہ نرسیما راؤ کے خلاف بول رہے تھے۔ اس کی ٹکر کے لیڈروں میں این ڈی تیواڑی اور شرد پوار ایسی چالیں چل رہے تھے جس کے نتیجے میں نرسیما راؤ بالکل زوال کی طرف چلا جائے۔

نرسیما راؤ اب بار بار سونیا گاندھی سے ملاقاتیں کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو سونیا گاندھی ہی پار لگا سکتی ہے۔ وقت اور ستاروں کی چالیں بتا رہی تھیں کہ ایشیا کے کئی ممالک میں عورتیں حکومت کر رہی ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ پاکستان کی وزیراعظم کے والد کے ساتھ ماضی میں جو زیادتی ہوئی تھی اس کے باعث پاکستانی عوام نے ان کی صاحبزادی کی بھرپور حمایت کر کے انہیں اور ان کی پارٹی کو کامیاب بنایا تھا۔ اسی طرح راجیو گاندھی کو بم کے دھماکے سے اڑا دیا گیا تھا۔ اس لئے بھارتی جنتا کو راجیو گاندھی کی بیوہ سونیا گاندھی سے بہت ہمدردی تھی۔ اگر سونیا نرسیما راؤ کا ساتھ دے تو ان کے ووٹ بینک میں توقع سے بھی زیادہ اضافہ ہو گا۔ ماضی قریب میں بندرا نائیکے نے سری لنکا میں حکومت کی تھی۔ بنگلہ دیش میں بھی ایک خاتون کی حکمرانی تھی۔ ان تمام ممالک کے گواہی فیصلے ثابت کر رہے تھے کہ وہ سیاست میں خواتین پر اعتماد کرتے ہیں۔ اس لئے نرسیما راؤ نے سونیا گاندھی کی رہائش گاہ کو محض ایک گھر نہیں' مندر سمجھ لیا تھا اور جیسے وہاں پوجا کرنے کے لئے جانے آنے لگا تھا۔

اجنبی کے باس نے شیوسینا پر یہ الزام لگایا تھا کہ انہوں نے کامنا اور صمد خان کو موٹربوٹ میں بم کے دھماکے سے ہلاک کیا ہے اگر انہوں نے اصلی قاتلوں کو پیش نہیں کیا تو آئندہ الیکشن میں ان کی ایسی کی تیسی ہو جائے گی۔ انہوں نے اڑیسہ کے ریاستی انتخاب میں یہ نمونہ دکھایا تھا جہاں کانگریس ہارتی نہیں تھی' وہاں مسلمانوں نے بھارتیہ جنتا پارٹی کو ووٹ دے کر کانگریس کو شرم ناک شکست دی تھی۔

کانگریس کے ایک لیڈر نے شیوسینا سے خفیہ رابطہ کیا اور کہا کہ وہ اور بھارتیہ جنتا پارٹی اور جنتا دل متحد ہو کر مرکز میں کانگریس کو کامیاب کریں اور اس لیڈر کو پردھان منتری (وزیراعظم) بنانے کا معاہدہ کریں تو وہ ثابت کر دے گا کہ شیوسینا والوں نے صمد خان اور اس کی بیوی کو ہلاک نہیں کیا ہے۔ وہ دونوں زندہ ہیں اور انہیں کسی ٹارچر سیل میں رکھا گیا ہے۔

یہ بات بال ٹھاکرے کو معلوم ہوئی تو اس نے وعدہ کیا اور ایک اتحادی پارٹی بنا کر اس سے معاہدہ کیا کہ آئندہ اسے وزیراعظم بنایا جائے گا۔ وہ فوراً صمد خان کی نشاندہی کرے۔

"را" میں ایک ایوی ایشن ریسرچ سینٹر ہے۔ اس کا افسر اے آر سی کہلاتا ہے۔ وہ افسر اس لیڈر کا سالا تھا۔ اس نے اپنے بہنوئی کو بتایا تھا کہ کانگریسی حکومت نے اس بار ایسی چال چلی ہے کہ آئندہ الیکشن میں شیوسینا اور بی جے پی {بھارتیہ جنتا پارٹی} کو اپنے اپنے علاقوں میں سیاسی پوزشن حاصل کرنے کی فرصت ہی نہیں ملے گی۔ وہ سب صمد خان کی موت کا نتیجہ بھگتنے کے لئے اس خطرناک اجنبی کی انتقامی کارروائیوں میں الجھے رہیں گے۔

دونوں سالے بہنوئی میں یہ طے پایا کہ وہ صمد خان کو زندہ اس ٹارچر سیل سے نکال کر اجنبی والوں کے حوالے کر دیں گے تو آئندہ بہنوئی پردھان منتری بن جائے گا اور اپنے سالے کو اے آر سی کے عہدہ سے ترقی دے کر ڈائریکٹر "را" بنا دے گا۔ اتحادی گروپ نے ان سے جو معاہدہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ اجنبی کے باس نے بھی وعدہ کیا تھا کہ اس پر ضرور عمل کیا جائے گا۔ ورنہ وہ باس اتحادی گروپ کو سیاسی میدان سے اکھاڑ پھینکے گا۔

دوسرے دن "را" کے وہ تمام افسران اس گراؤنڈ فلور کے دفتر میں آئے جس کے تہ خانے کے ٹارچر سیل میں صمد خان کو قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔ انہوں نے بٹن آن کر کے بڑے سے اسکرین پر دیکھا۔ اس ٹرالی بیڈ پر صمد خان اسی طرح ہتھکڑیوں اور زنجیروں سے

بندھا ہوا لیٹا تھا۔

ایک افسر نے دو بھنگیوں کو بلا کر حکم دیا کہ وہ تہ خانے میں جائیں اور ٹرالی بیڈ سے تمام غلاظتیں صاف کر کے آئیں۔ دونوں بھنگی وہاں سے چلے گئے۔ افسران نے مائیک کو آن نہیں کیا۔ اسے آن کرنے سے صمد خان تک ان کی آوازیں ایک اسپیکر کے ذریعے پہنچتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے اسے آن نہیں کیا۔ پہلے وہ سب ایک فیصلے پر متفق ہو کر صمد خان کو سزائیں دینا چاہتے تھے۔

ایک نے کہا۔ "یہ تو یقینی بات ہے کہ یہ اپنی اجنبی کے باس سے غداری نہیں کرے گا۔ اپنے اہم ماتحتوں کے پتے ٹھکانے نہیں بتائے گا۔ میں تو کہتا ہوں اسے پہلی فرصت میں مار ڈالو۔"

زونل افسر نے کہا۔ "ہم نے کامنا اور اس کی موت کا الزام شیوسینا پر لگایا ہے۔ اجنبی والے سمجھتے ہیں کہ یہ مرچکا ہے' اگر کسی طرح یہ خبر یہاں سے باہر جائے گی کہ یہ درندہ ابھی زندہ ہے تو اس اجنبی کے تمام دہشت گرد بمبئی اور مہاراشٹر کو چھوڑ کر دہلی اور یوپی کا امن و امان تباہ کر دیں گے۔ ایک تو مرکز میں کانگریس کی پوزیشن یونہی خراب ہو رہی ہے۔ وہ اجنبی والے تو اپوزیشن کو مضبوط بنا دیں گے۔"

ڈائریکٹر "را" نے کہا۔ "بے شک اس کی موت لازمی ہے لیکن ہم اس کی موت سے پُن (نیکی) کما سکتے ہیں۔"

اے آر سی اپنے بہنوئی کو پردھان منتری بنانے اور خود ڈائریکٹر کے عہدے تک پہنچنے کے لئے اس کی موت نہیں چاہتا تھا لیکن وہاں تمام افسران موت کا ہی فیصلہ سنا رہے تھے۔ اس نے ڈائریکٹر سے پوچھا۔ "ہم صمد خان کی موت سے کیسے پُن کما سکتے ہیں۔"

ڈائریکٹر "را" نے کہا۔ "میرا بھائی کڈنی ہسپتال میں ہے۔ اس کے دونوں گردے خراب ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ جلد سے جلد کسی سے ایک گردہ خریدا جائے۔ یا دان (عطیہ) کے طور پر حاصل کیا جائے۔ آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟ صمد خان کے گردے مفت حاصل ہو سکتے ہیں اور میرے بھائی کو ایک نئی زندگی مل سکتی ہے۔"

ایک نے کہا۔ "وہاٹ اے فنٹاسٹک آئیڈیا۔ ہم اب تک قاتلوں کو اور خطرناک مجرموں کو سزائے موت دیتے آئے ہیں۔ ان کی موت کے ساتھ ان کے وہ گردے' وہ دل

اور وہ آنکھیں بھی ضائع کر دیتے ہیں جن سے دوسرے کئی مریضوں کو نئی زندگیاں دی جا سکتی ہیں۔"

ڈائریکٹر "را" ان سب کا اعلیٰ افسر تھا اور اس نے پُن کمانے کی بات کی تھی۔ لہٰذا سب ہی اس کی تائید میں کہنے لگے کہ صمد خان کے ایک نہیں دونوں گردے ڈائریکٹر "را" کے بھائی کو دیئے جا سکتے ہیں۔

انہوں نے "را" تنظیم کے' ایک ڈاکٹر اور ایک ماہر سرجن کو بلا کر اپنے پاس بٹھایا اور انہیں پن کمانے والی بات بتائی۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "اب تک تو ایسا نہیں کیا گیا ہے۔ یہ میڈیکل لاء کے خلاف ہے لیکن کسی درندے کو درندے کی طرح ہی مارا جا سکتا ہے۔ جب اسے سزائے موت دینا ہی ہے تو پھر آپریشن تھیٹر میں اس کے دونوں گردے نکال دیئے جائیں۔ وہ خود ہی مر جائے گا۔"

ماہر سرجن نے کہا۔ "جب نیکی کمانا ہو تو پوری طرح کمائی جائے۔ آنکھوں کے ہسپتال میں کتنے ہی مریض عطیہ چشم کے منتظر ہیں۔ صمد خان کی آنکھیں بھی کسی کو دی جا سکتی ہیں۔ پھر امراضِ قلب کے ہسپتال سے رابطہ کیا جائے۔ کسی دل کے مریض کے سینے میں صمد خان کے دل کی پیوندکاری کی جا سکتی ہے۔"

ایک نے کہا۔ "یہ بات کتنی درست ہے کہ جو لوگ ایک بار نیکی کا راستہ اپنا لیتے ہیں پھر انہیں آگے بھی نیکیوں کے راستے ملتے جاتے ہیں۔ ہم صرف گردوں کی بات سوچ رہے تھے۔ اب تو آنکھوں کے اور دل کے مریضوں کو بھی اس درندے کی موت سے فائدہ پہنچے گا۔ مجرم کو سزا بھی ملے گی اور بے گناہوں کو نئی زندگیاں بھی مل جائیں گی۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "اس قیدی کو اچھی طرح کھلاؤ پلاؤ۔ اس کی توانائی کو بحال رکھا جائے۔"

سرجن نے کہا۔ "میں آنکھوں کے اور دل کے ماہر سرجن سے رابطہ کرتا ہوں۔ کوشش یہی ہو گی کہ کل تک ہمارے تمام مقاصد پورے ہو جائیں۔ ویسے اس قیدی کو امراضِ قلب کے ہسپتال لے جانا ہو گا۔ تبدیلی قلب کے آپریشن کے لئے لازمی ہے کہ ایک دل کو دوسرے کے سینے میں فوراً منتقل کر دیا جائے۔ ایسے وقت اس کی موت واقع ہوتے ہی اس کی آنکھیں اور گردے نکال کر دوسرے مطلوبہ ہسپتالوں میں پہنچا دیئے

جائیں گے۔"

ڈاکٹر اور سرجن چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ڈائریکٹر "را" نے کہا۔ "یہاں ہم پانچ افسران ہیں' ہمارے علاوہ ایک ڈاکٹر اور سرجن ہمارے رازدار ہیں۔ شاید کل کسی وقت صمد خان کو امراضِ قلب کے آپریشن تھیٹر میں لے جانا ہو گا۔ وہ ہسپتال یہاں سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ اس درندے کو وہاں تک بڑی رازداری سے لے جانا ہو گا۔"

دوسرے افسر نے کہا۔ "اس کے لئے لازمی ہے کہ صمد خان کے چہرے پر میک اپ کر کے ذرا سی تبدیلی کر دی جائے۔ پھر اسے بے ہوشی کا انجکشن لگایا جائے۔ اس طرح وہ بڑی خاموشی سے امراضِ قلب کے ہسپتال پہنچا دیا جائے گا پھر اسے چہرے سے بھی کوئی نہیں پہچانے گا اور سکیورٹی کے انتظامات بھی بڑے سخت ہوں گے۔"

وہ منصوبے بناتے رہے۔ اس دوران "را" کے دوسرے کارکن ٹارچر سیل میں جا کر اسے اچھی طرح کھلاتے اور پلاتے رہے۔ اسے دودھ اور پھل بھی کھلائے گئے اور اس کے بے لباس جسم کو بھی کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا۔

وہ سب اپنی دانست میں بڑی رازداری سے کام لے رہے تھے لیکن اے آر سی گھر کا بھیدی تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس لنکا کو کیسے ڈھایا جائے؟ اس نے اپنے لیڈر بہنوئی کو بتایا کہ کل تک کیا ہونے والا ہے لیکن یہ بات "را" کے کسی بھی شخص کو معلوم ہو گی تو سالے بہنوئی پورے خاندان سمیت تباہ و برباد کر دیئے جائیں گے۔

اس لیڈر نے بھی بڑی رازداری سے اتحادی گروپ تک یہ بات پہنچائی پھر "را" کا یہ کھیل ایجنسی کے باس تک پہنچ گیا۔ پہلے تو باس کو اسی دھوکے میں رکھا گیا تھا کہ صمد خان کامنا کے ساتھ سمندر میں مارا گیا ہے۔ اس طرح وہ یہی سمجھتا رہا کہ بھارت میں کام کرنے والی ایجنسی اب کسی لیڈر کے بغیر رہ گئی ہے۔ لہٰذا صمد خان کی جگہ پُر کرنے کے لئے دوسرا ایجنٹ اور انچارج آ گیا تھا۔ اس کا نام سجاد حیدر تھا۔

جب یہ بھید کھلا کہ صمد خان زندہ ہے تو باس نے کہا۔ "آفرین ہے۔ صمد خان اتنے دنوں سے "را" کی قید میں ہے۔ پتا نہیں اس پر کیسے کیسے مظالم ڈھائے گئے ہوں گے لیکن اس نے اپنی ایجنسی کے ایک فرد کا بھی پتا ٹھکانا اور دوسرے اہم اڈے نہیں بتائے۔ اگر وہ بتا دیتا تو ان تمام مقامات پر چھاپے پڑتے۔ ہمارے اہم لوگ پکڑے جاتے اور خفیہ اڈوں

سے کرنسی اور اسلحہ برآمد ہوتا۔ مگر صمد خان ایک سچا وفادار ہے۔"

"را" والوں نے سمندر میں موٹربوٹ کو بلاسٹ کر کے یہی ظاہر کیا تھا کہ صمد خان مار ڈالا گیا ہے اور چونکہ مرچکا ہے اس لئے اب ایجنسی کا کوئی راز نہیں کھلے گا۔ صمد خان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو راز کھل چکا ہوتا اور بھارت میں باس کی ایجنسی بری طرح ناکام ہو جاتی۔ پچیس کروڑ ادا کرنے والی شیوسینا سے بھی باس کی دشمنی ہو جاتی۔ بلکہ شروع ہو چکی تھی۔ باس نے وارننگ دی تھی کہ شیوسینا والے اپنی بے گناہی ثابت کر دیں ورنہ بری طرح پچھتائیں گے۔

اب حقیقت معلوم ہوئی تو ایجنسی کے نئے ایجنٹ اور انچارج سجاد حیدر نے شیوسینا والوں سے کہا۔ "ابھی ظاہر نہ ہونے دو کہ ہمارے باس کو حقیقت معلوم ہو گئی ہے اور ہم پھر تمہارے لئے کام کریں گے۔ "را" والوں کو خوش فہمی میں رہنے دو کہ ہمارے تمہارے درمیان بدستور اختلافات قائم ہیں۔"

"را" کے دفاتر کے لئے جو عمارت مخصوص تھی اس کے سامنے امراض قلب کے ہسپتال سے ایک ایمبولینس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس عمارت کے تہہ خانے میں صمد خان بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ چہرے پر عارضی میک اپ کیا گیا تھا۔ اسے ایک اسٹریچر پر ڈال کر ایمبولینس کے اندر پہنچایا گیا۔ اس ایمبولینس کے آگے پیچھے ایک ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ بظاہر یہی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ عام پبلک کے استعمال کی کاریں ہیں لیکن ان کے اندر مسلح افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی کو شبہ ہو کہ ایمبولینس میں کسی خاص مریض کو لے جایا جا رہا ہے۔

لیکن گھر کے بھیدی نے لنکا ڈھایا تھا۔ یہ بتا چکا تھا کہ صمد خان کو کس طرح، کن راستوں سے لے جایا جائے گا۔ تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد سجاد حیدر کے خاص ماتحتوں نے ان دو کاروں میں صبح چار بجے دن کی روشنی پھیلنے سے پہلے ہی ایسے بم چھپا کر رکھ دیئے تھے، جو ریموٹ کنٹرول سے بلاسٹ ہوتے ہیں۔ سجاد حیدر خود اس مہم میں شریک تھا۔ جب امراضِ قلب کے ہسپتال سے ایک ایمبولینس صمد خان کو لانے گئی تو اس نے اسی ہسپتال کی دوسری ایمبولینس چرائی۔ اس میں اپنے آدمیوں کو ڈرائیور اور ہسپتال کے وارڈ بوائز کی وردی پہنا کر بٹھایا۔ پھر ایک ایسے راستے کے موڑ پر اس ایمبولینس کو

روک کر انتظار کرنے لگا جہاں سے وہ لوگ صمد خان کو لے کر گزرنے والے تھے۔

اس نے موبائل فون کے ذریعے اپنے جاسوسوں سے رابطہ رکھا تھا۔ وہ بتا رہے تھے کہ اس عمارت میں سے ایک اسٹریچر باہر لایا گیا ہے، اس پر ایک شخص لیٹا ہوا ہے، اس پر چادر پڑی ہوئی ہے۔ اسے ایمبولینس کے پچھلے حصے میں رکھ کر دروازے کو بند کر دیا گیا ہے۔ اب ایمبولینس اس طرح جا رہی ہے کہ اس کے آگے پیچھے وہ دونوں کاریں بھی چل رہی ہیں۔ ان تین گاڑیوں کا قافلہ جن راستوں سے گزر رہا تھا ان راستوں کا علم اسے ہوتا جا رہا تھا۔ پھر یہ بتایا گیا کہ سجاد حیدر جس موڑ پر ان کا منتظر ہے وہاں سے وہ تینوں گاڑیاں گزرنے والی ہیں تو اس نے حکم دیا "پہلے پیچھے والی کار کو بلاسٹ کرو۔"

حکم کی تعمیل کی گئی۔ یک بارگی پچھلی کار ایک زوردار دھماکے سے پھٹ گئی۔ یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا کہ پچھلی کار کے شعلوں سے بچنے کے لئے آگے والی کار اور ایمبولینس نے اپنی رفتار بڑھائی۔ وہ ذرا آگے گئے تو ایک کار نے ایمبولینس کے سامنے آ کر راستہ روک دیا۔ ایمبولینس کے ڈرائیور نے فوراً بریک لگا کر روکا۔ اس کے رکنے سے آگے والی کار کچھ دور نکل گئی تب پتا چلا کہ ایمبولینس پیچھے رہ گئی ہے۔ انہوں نے کار روک کر اسے واپس موڑنا چاہا۔ ایسے ہی وقت اس کار کے بھی بم کے دھماکے سے چیتھڑے اڑ گئے۔

اس راستے میں زیادہ ٹریفک نہیں ہوتی تھی۔ پھر بھی جتنی پبلک اور گاڑیاں تھیں وہ سب بھاگنے لگیں۔ دکانیں بند ہونے لگیں۔ سجاد حیدر کے ماتحت بڑی پھرتی دکھا رہے تھے۔ انہوں نے ایمبولینس کے ڈرائیور اور سکیورٹی گارڈ کو گن پوائنٹ پر رکھا تھا۔ اس کے پچھلے حصے سے صمد خان کو نکال کر موڑ پر کھڑی ہوئی ایمبولینس میں لے آئے تھے اور اپنی چوری کی ہوئی ایمبولینس میں جو دشمن اسٹریچر پر بندھا پڑا تھا، اسے اٹھا کر صمد خان والی ایمبولینس میں ڈال دیا۔ اس کے پچھلے دروازے کو بند کر دیا۔ پھر اپنی ایمبولینس کو ڈرائیو کر کے لے جاتے وقت انہوں نے ایک ہینڈ گرینیڈ کی "کی" نکال کر اسے دوسری ایمبولینس کے نیچے پھینک دیا اور اپنی ایمبولینس کی رفتار تیز کر دی۔ ان کے ذرا دور جاتے ہی پھر ایک بار قیامت خیز دھماکہ ہوا۔ اس طرح بات یوں بنی کہ جو ایمبولینس اور سکیورٹی گارڈز صمد خان کو لے جا رہے تھے وہ سب کے سب صمد خان کے ساتھ فنا ہو گئے ہیں۔

شہر سے باہر ایک ویگن کھڑی ہوئی تھی۔ ایمبولینس وہاں آ کر رک گئی۔ صمد خان کا

اسٹریچر اٹھا کر اس ویگن میں رکھ کر ایمبولینس کو وہیں چھوڑ دیا گیا۔ تفتیش کرنے والے یہی رائے قائم کرتے کہ ایمبولینس چرانے والے ایک بینک میں ڈکیتی کرنے کے بعد ایمبولینس کو وہاں چھوڑ کر کسی دوسری گاڑی میں شہر سے باہر گئے ہیں۔

سجاد حیدر نے یہ بھی انتظام کر رکھا تھا کہ جس وقت یہ کارروائی ہوتی رہے اس کے چار ماتحت کسی چھوٹے سے بینک میں ڈاکہ ڈالیں۔ ایسی چالیں چلنے کے بعد اسے اب صمد خان کو لے کر اس شہر سے نکل جانا چاہئے تھا لیکن اس نے الٹی چال چلی۔ ویگن کو موڑ کر پھر شہر میں آگیا۔ آخر ڈائریکٹر "را" بننے والے اور پردھان منتری بننے والے سالے بہنوئی کس دن کام آتے؟

اگر ایک دو دنوں کے لئے صمد خان کو کانگریس کے ایک بہت بڑے لیڈر کے مکان میں چھپایا جاتا تو وہ آئندہ پردھان منتری بننے والا کبھی اپنی زبان نہ کھولتا۔ حکمران پارٹی اور "را" تنظیم کے افسران کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ صمد خان کو ان کے اپنے ہی پُراعتماد لوگوں کے درمیان چھپایا گیا ہے۔

پھر ایک اور چال چلی گئی۔ ایجنسی کے باس نے بال ٹھاکرے سے رابطہ کر کے کہا۔ "ہمیں صمد خان مل گیا ہے اب تم اپنا کام کرو۔"

ٹھاکرے نے دہلی کے راج بھون میں پردھان منتری سے رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے سیکرٹری کی آواز سنائی دی۔ وہ بولا۔ "میں مہا ٹھاکروں کا ٹھاکر' بال ٹھاکرے ہوں۔ منتری صاحب کو صرف میرا نام بتا دو۔"

سیکرٹری نے کہا۔ "پائے لاگوں ٹھاکر صاحب! میں آپ کا سیوک ہوں۔ ابھی صاحب ایک بہت ضروری میٹنگ میں بیٹھے ہیں۔ میرے کو بولے ہیں ایک گھنٹے تک کوئی پھون اٹینڈ نہیں کریں گے۔"

"تمہارے صاحب اور ڈائریکٹر "را" جس سمسیا (مسئلہ) میں ہیں اس کا سلجھاؤ میرے پاس ہے۔ ایک بار پوچھ تو لو کہ وہ سلجھاؤ چاہتے ہیں یا اور جیادہ الجھاؤ۔"

اسے ہولڈ آن کرنے کو کہا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈائریکٹر "را" کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ "ہیلو مسٹر ٹھاکرے! میں دیوان پرساد بول رہا ہوں۔"

"اپنا نام بتا رہے ہو۔ عہدہ چھپا رہے ہو۔ کچھ معلوم تو ہو کہ "را" کے ڈائریکٹر ہو!

بھئی؟"

وہ حلق پھاڑ کر چیختے ہوئے بولا۔ "یو شٹ اپ۔ شرم کرو۔ مسلمان ووٹروں نے تمہیں گھاس نہیں ڈالی۔ بی جے پی نے مہاراشٹر میں تمہاری بولتی بند کر دی ہے۔ اب کہاں ہے تمہاری شیوسینا؟"

"مہاراشٹر میں صرف شیوسینا ہی نہیں' تمہاری کانگریس بھی تھی۔ ہم دونوں ہارے ہوئے جواری ہیں۔ میں تو یہ سمجھانے آیا ہوں کہ کامنا اور صمد خان تین ہفتے پہلے سمندر میں ڈوب کر مر گئے تھے۔ تم اور پردھان منتری ان بے چاروں کا ماتم آج کیوں کر رہے ہو؟"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اور تمہارے آدمیوں نے آج وہ تمام بموں کے دھماکے کئے ہیں اور صمد خان کو ہلاک کیا ہے؟"

"ہاں میں چاہتا تھا جس طرح سمندر میں ڈوبنے والے پہچانے نہ جا سکے اور ان کی لاشیں بھی نہیں ملیں۔ اسی طرح آج کے دھماکوں سے بھی تین گاڑیوں والوں کے ایسے چیتھڑے اڑ گئے کہ کسی کی بھی لاش پہچاننے کے قابل نہیں رہی ہے۔ تم لوگوں نے میری ایک دور پار کی بہن کو اٹھوا کر صمد خان کی گود میں سلا کر ایجنسی کے باس کو یہ سمجھا دیا کہ میں نے بہن کو ایک مسلمان کے ساتھ برداشت نہیں کیا اور ان دونوں کو سمندر میں ڈبو دیا۔"

"جو سچ تھا۔ وہی ایجنسی کے باس نے سمجھا۔ اب تم لاکھ سمجھاؤ کہ صمد خان ہماری قید میں تھا۔ تب بھی وہ باس یقین نہیں کرے گا۔ پھر تم نے آج صمد خان کو ہلاک کر کے ہماری چال کو کامیاب بنا دیا ہے۔"

"مسٹر دیوان پرساد ڈائریکٹر "را" اس وقت تمہاری یہ باتیں ٹیپ ہو رہی ہیں اور اب ایجنسی میں صمد خان کی جگہ جو ایجنٹ اور انچارج آیا ہے وہ ابھی میرے پاس بیٹھا میرے ٹیلی فون کے وائڈ اسپیکر سے تمہاری کمینی چال بازیوں کی رام کتھا سن رہا ہے اور جو باتیں ٹیپ ہو رہی ہیں ان کا کیسٹ ایجنسی کے باس تک پہنچا دیا جائے گا۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر ڈائریکٹر "را" نے کہا۔ "اور تم نے اس گفتگو کے دوران خود کہا ہے کہ آج تم نے صمد خان کو ہلاک کیا ہے۔"

"ہاں' میں نے جو سچ ہے وہ کہا ہے۔ میرے سچ کہنے سے تمہارا جھوٹ اور فریب کھل گیا ہے۔ اب یہ ایجنسی کا باس فیصلہ کرے گا کہ اس کی ایجنسی کو کس کے لئے کام کرنا چاہئے۔ تمہارے جیسے جھوٹے فریبی کا ساتھ دینا چاہئے یا میری عجت اور گیرت کو سمجھنا چاہئے۔ اگلے برس الیکشن میں کانگریس کا کیا حال ہونے والا ہے یہ تو آنے والا وقت بتائے گا۔ ابھی تو میرے کو یہ کھبر ملی ہے کہ باس کی ایجنسی بمبئی سے اب دہلی پہنچ رہی ہے۔ اب تمہاری راجدھانی میں شانتی کیسے رہے گی؟"

یہ کہہ کر بال ٹھاکرے نے ریسیور رکھ دیا۔ راج بھون میں ڈائریکٹر "را" اور پردھان منتری کے علاوہ دوسرے منتری بھی تھے۔ وہ لوگ بھی ٹیلی فون کے وائڈ اسپیکر سے وہ تمام باتیں سنتے رہے تھے۔ ڈائریکٹر "را" نے ریسیور رکھ کر بڑی پریشانی سے کہا۔ "ہمارے پرائیویٹ چیمبر میں صرف چند اعلیٰ افسران آتے ہیں۔ جب ہم نے صمد خان کو ہسپتال پہنچانے کی پلاننگ کی تو ایک ڈاکٹر دوسرا سرجن ہمارے رزدار بن گئے۔ اگرچہ ان کا تعلق بھی ہماری "را" تنظیم سے ہے لیکن اتنے بڑے اہم معاملے میں ہم نے ان دونوں کو پہلی بار رازدار بنایا تھا۔ اب ہمیں ان دونوں کا محاسبہ کرنا ہوگا۔ صمد خان کے قیدی بن کر رہنے کی بات کل تک چھپی ہوئی تھی کل اور آج کے درمیان اچانک ظاہر ہوگئی اور یہ راز بال ٹھاکرے تک پہنچ گیا؟"

ایک منتری نے کہا۔ "اس کا پتا چلانا آپ کی ذمے داری ہے۔ میں تو یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ہماری سرکاری ایجنسیاں کیا کر رہی ہیں؟ یہ صمد خان جو مر گیا اور جو ایجنسی دبئی میں رہ کر ریموٹ کنٹرولر سے یہاں سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کر رہی ہے۔ یہ سو فیصد پاکستانی دہشت گردوں کی ایجنسی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ "را" کی مصروفیت باہر ملکوں میں اور پاکستان میں زیادہ ہے لیکن ہماری انٹیلی جنس اور ہماری سرکاری ایجنسیاں جو ماہانہ کروڑوں روپے خرچ کرتی ہیں بلکہ عیش کرتی ہیں وہ کیا ایک بھی پاکستانی دہشت گرد کو یہاں گرفتار نہیں کر سکتیں؟"

ڈائریکٹر "را" نے کہا "ہم تو اپنے میڈیا سے تمام دنیا میں یہی واویلا مچا رہے ہیں کہ پاکستان کو ایک دہشت گرد ملک قرار دیا جائے۔ جبکہ ہم بمبئی اسٹاک ایکسچینج کے دھماکے میں بھی کسی گرفتار ہونے والے مجرم کو پاکستانی ثابت نہیں کر سکے۔"

ایک منتری نے کہا۔ "دنیا کے ہر جاسوسی ادارے' ہر سرکاری ایجنسی میں حسین عورتیں استعمال ہوتی ہیں۔ ان حسیناؤں کے ذریعے کسی بھی ملک کی اہم شخصیات کو پھانسا جاتا ہے لیکن پاکستانی اسے بے غیرتی اور گناہ سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دبئی سے جو پاکستانی دہشت گرد کنٹرول کئے جاتے ہیں ان میں ایک بھی عورت نہیں ہے۔"
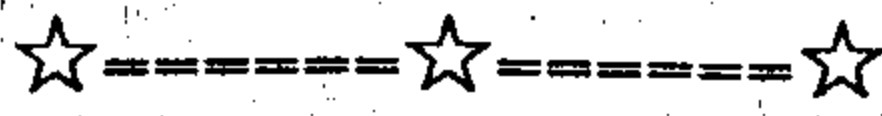
"آپ کی یہ دلیل تسلیم کی جا سکتی ہے لیکن یہ ایک چھوٹی سی بات ہے۔ پہلے یہ کوششیں کی جا رہی ہیں کہ پاکستان میں عورتوں کی آزادی کے نام پر بہت ہی غیر محسوس طریقوں سے بے حیائی کی وبا عام ہوتی رہے جب خاندانی منصوبہ بندی شادی شدہ جوڑوں کے لئے ہوگی تو اس منصوبہ بندی کے طور طریقے غیر شادی شدہ جوڑے بھی اپنائیں گے۔"

یہ وضاحت ضروری ہے کہ دنیا کی آبادی کم ہونا چاہئے۔ یہ مسلم اور غیر مسلم کے تمام بچوں کے بہتر مستقبل کے لئے لازمی ہے۔ بچے دو ہی اچھے ہوتے ہیں ان پر والدین بھرپور توجہ دیتے ہیں اور انہیں اپنے معاشرے کا' اپنی دنیا کا باشعور انسان بناتے ہیں لیکن جب ہنود' عیسائی اور یہودی تمام مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے پریشان ہوں اور قاہرہ کانفرنس میں اسلامی ممالک کو بلا کر خاندانی منصوبہ بندی کی تشہیر کریں۔ وہ قاہرہ جہاں دنیائے اسلام کی سب سے بڑی الازہر یونیورسٹی ہے اور اس یونیورسٹی کے علمائے دین کے اعتراضات کو بھی نظرانداز کیا جائے تو پھر ہنود' یہود و نصاریٰ کی چالبازیاں واضح ہو جاتی ہیں۔ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ غیر مسلموں کی آبادی کتنی کم ہوگی۔ زور اس بات پر ہے کہ اسلامی ممالک میں بڑھتی ہوئی آبادی کو کم کیا جائے۔ فی الوقت بھارت' اسرائیل اور امریکہ کے لئے پوری دنیا میں ایک ارب پچیس کروڑ مسلمانوں کی تعداد بے حد تشویش کا باعث بنی ہوئی ہے۔

ڈائریکٹر "را" نے کہا۔ "ہم پچھلی بار یہ ثابت کرنے میں ناکام رہے تھے کہ بمبئی کے حملے میں پاکستانی دہشت گردوں کا ہاتھ ہے لیکن اب بڑی حکمت عملی سے اور امریکہ کے تعاون سے کسی وقت بھی پاکستان کو دہشت گرد ملک ثابت کر سکتے ہیں۔"

ایک منتری نے پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

اس نے پوچھا۔ "آپ لوگوں نے پہلے کسی یوسف رمزی کا نام سنا تھا؟ نہیں سنا تھا

لیکن اس کے بارے میں ایک پوری ہسٹری تیار ہو چکی ہے کہ وہ کس قدر خطرناک ہے اور امریکی سی آئی اے کی آنکھوں میں دھول جھونکنے والا دہشت گرد ہے۔ اس کے خلاف الزام ہے کہ نیویارک ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں اس نے بم کے دھماکے کئے تھے۔ بموں کے لئے جو آتش گیر مادہ تھا وہ "چیک آر ڈی ریکس" کہلاتا ہے۔ یہی آتش گیر مادہ بمبئی کے اسٹاک ایکسچینج کے دھماکے میں استعمال ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یوسف رمزی نے دونوں جگہ ایک ہی قسم کی بارود استعمال کی ہے۔ اب اس کا ڈرامائی مرحلہ یہ ہے کہ یوسف رمزی کو دنیا کے کسی بھی ملک سے گرفتار کیا جا سکتا تھا لیکن اسے ڈرامائی انداز میں پاکستان کے دارالسلطنت اسلام آباد سے گرفتار کیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ پاکستانی دہشت گرد ہے۔ پھر اس سے پہلے کہ اس کے پاکستانی دہشت گرد ہونے سے انکار کیا جائے اس مجرم کو فوراً امریکہ کے حوالے کر دیا گیا۔"

ڈائریکٹر "را" نے ایک ذرا توقف سے کہا۔ "آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہماری "را" تنظیم پاکستان میں اور امریکہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہے۔ آپ دیکھتے جائیں کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ ہماری توجہ باہر زیادہ ہے۔ ہم اپنے دیس کے اندرونی معاملات پر زیادہ توجہ نہیں دے سکتے۔ صمد خان اتفاق سے ہمارے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس لئے ہم اس کا قصہ ہی ختم کر دینا چاہتے تھے لیکن بال ٹھاکرے نے اس کا کام تمام کر دیا۔ اگر کانگریس پارٹی کچھ کمزور ہو رہی ہے تو مجھے افسوس ہے۔ یہاں آپ کی پارٹی کو مضبوط بنانے کے لئے آپ کی سرکاری ایجنسیوں کو کارنامہ انجام دینا چاہئے۔ اب تو صمد خان مرچکا ہے اس کی جگہ جو نیا ایجنٹ اور انچارج آئے گا اس سے اگر آپ کی سرکاری ایجنسیاں پوری ذہانت اور چالاکی سے دو دو ہاتھ کریں گی تو مرکز میں پھر سے کانگریس کا بول بالا ہو گا۔"

سب ہی اس بات پر متفق ہوئے کہ شمالی ہند میں کانگریس کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے لئے دہلی میں سخت حفاظتی انتظامات کئے جائیں۔ بھارت کے دوسرے صوبوں سے آنے والوں کی شناخت اور نگرانی کی جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ صمد خان کے بعد ایجنسی میں نیا آنے والا ایجنٹ اور انچارج کون ہے اور اس کا نام کیا ہے۔ ابھی تو وہ نامعلوم تھا۔

☆======☆======☆

معلوم کیسے ہوتا ہے؟ اور نامعلوم کیسے رہ جاتا ہے؟ یہ سب کچھ سیاسی قلابازیوں سے ہوتا رہتا ہے۔

وہاں کی انٹیلی جنس والے اور دوسری سرکاری ایجنسیوں والے زیادہ سے زیادہ یہ معلوم کر سکتے تھے کہ ایجنسی کا نیا ایجنٹ اور انچارج سجاد حیدر ہے لیکن جو مر چکا تھا' وہ معلوم تھا اور مرنے کے بعد زندہ ہو گیا تھا یہ نامعلوم تھا۔ صرف ایک بال ٹھاکرے کو معلوم تھا کہ وہ زندہ ہے لیکن وہ بھی اسے "معلوم" نہیں کہہ سکتا تھا۔ آئندہ صمد خان اس کے گلے میں بھی ہڈی کی طرح اٹکنے والا تھا۔ گلے سے ہڈی نکالنے' اقتدار اور اختیارات کو مضبوطی سے تھامے رکھنے کے لئے معلوم بھی ہو تو بیان دینا پڑتا ہے کہ دہشت گرد اور تخریب کار نامعلوم ہیں۔

ہر مذہب کی اور مذہب کے ماننے والوں کی ایک تہذیب اور ثقافت ہوتی ہے۔ ہندو دھرم میں گیت اور رقص لازمی ہیں۔ پوجا کے وقت بھجن گانا اور بھگوان کی مورتی کے سامنے ناچنا ان کے دھرم کا ایک دستور ہے۔

زمانہ قدیم سے نرتکی (رقاصہ) یا تو راج دربار میں ہوتی تھی یا پھر مندروں میں۔ مہادیو شیو شنکر جب کرودھ (غصے) میں آتے تو ڈمرو بجا کر رقص کرنے لگتے تھے اور اتنا زیادہ رقص کرتے تھے کہ ان کے اندر کا غبار نکل جاتا تھا۔ غصہ ختم ہو جاتا تھا۔ عام طور پر خوشی سے ناچا جاتا ہے لیکن ہندو دھرم میں خوشی ہو یا کوئی صدمات سے چور ہو یا بھگوان کو دعائیہ انداز میں منانا ہو تو رقص کیا جاتا ہے۔

رقص کے لئے بدن میں لوچ اور لچک کا ہونا' آنکھوں میں مٹک' ابروؤں کی تھرک' چلتے وقت پورے بدن کی چلت پھرت کا متناسب رہنا لازمی ہے۔ یہ تناسب جس میں ہو' اس کا بدن شاہکار اور قابل دید ہوتا ہے۔ زمانہ قدیم میں ایسی بے مثال حسیناؤں کی رنگین تصاویر شائع کرنے کی اور انہیں ملکۂ حسن کے خطاب سے نوازنے کی کوئی سہولت نہیں تھی۔ لہٰذا اس زمانے کے فنکاروں نے ان کے حسن و شباب کو' راجاؤں مہاراجاؤں سے گلے ملنے اور بہت کچھ کر گزرنے کے مناظر کو اجنتا اور ایلورا کے غاروں میں بڑی خوبی سے کندہ کیا ہے۔ ساری دنیا کے سیاح جب جنوبی ہند کا سفر کرتے ہیں تو یہ مناظر دیکھنے کے

لئے اجنتا اور ایلورا کے مشہور غاروں میں ضرور جاتے ہیں۔

اب زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ دھرم کے حوالے سے جو ثقافت چلی' وہ مقابلہ حسن تک جا پہنچی۔ جہاں رقص ہو' وہاں بدن کا بھاؤ بڑھتا ہے۔ پورے ایشیا میں بھارت کی حسیناؤں نے اپنے حسن کا جادو جگایا ہے۔ کئی دوشیزائیں حسینہ عالم ہونے کا ایوارڈ حاصل کر چکی ہیں جن میں شمیتا سین اور موجودہ حسینہ عالم ایشوریا رائے قابل ذکر ہیں۔ مقابلہ حسن میں مس انڈیا کہلانے والیوں کی کمی نہیں ہے۔ اس میں ایک گونگی حسینہ سونو آنند بھی ہے۔ کبھی زینت امان بھی مس انڈیا کہلاتی تھی۔ موجودہ فلموں میں ہیروئن بن کر آنے والی ممتا کلکرنی کا دعویٰ ہے کہ وہ سیکسی کہلانے کے سلسلے میں زینت امان سے کم نہیں ہے۔ پتا نہیں بے چاری کو مس انڈیا کا ٹائٹل کیوں نہیں دیا گیا۔

بات پوجا کی ہو' رقص کی ہو' یا حسن کا جادو جگانے کی ہو' اس کی اجازت مذہب' تہذیب یا ثقافت سے ملتی ہے۔ بھارت کی میڈیا کی جنگ میں حسینہ ہونا یا حسینہ عالم ہونا ایک بہت بڑا حربہ ہے۔ جیسے ہی ایشوریا رائے حسینہ عالم منتخب ہوئی تو بھارت سرکار نے اسے مبارکباد دی اور یہ اعلان کیا کہ مس ایشوریا رائے سفارتی سطح پر دنیا کے اہم ممالک کا دورہ کرے گی اور بھارت کی امن پرستی اور دوست نوازی کا پرچار کرے گی۔ ظاہر ہے' یہ میڈم میڈیا جس ملک کے دربار میں پہنچے گی' وہاں کے تمام ایٹم بم سرد پڑ جائیں گے۔ ان حالات میں پاکستان کی کیا مجال ہے کہ وہ بھارت سے میڈیا کی جنگ لڑے۔ ایسے میں انیتا ایوب نے بڑی کوششیں کیں۔ مقابلہ حسن میں شریک ہونے کے لئے حکومت پاکستان سے اجازت چاہی۔ مگر اجازت نہیں ملی۔ پھر پتا نہیں کیسے کیسے پاپڑ بیل کر انڈین فلم انڈسٹری میں پہنچی تو دیو آنند نے اسے ایک لنگوٹی پہنا کر فلم کی ہیروئن بنایا۔ اس کے بعد پھر وہ کبھی ہیروئن کی حیثیت سے قابل قبول نہ ہو سکی۔ ویسے انیتا ایوب بہت اچھی ہے۔ بہت پیاری ہے مگر وہ ہندو سیاست کو نہیں سمجھتی ہے اور اسلامی تاریخ کا علم نہیں رکھتی ہے۔ اگر اسے سمجھایا جاتا کہ اسلام کبھی تلوار سے اور حسن و جمال کی کاٹ سے نہیں پھیلا۔ یہ دنیا کا آخری مذہب صرف محبت' خلوص اور نیک ہدایات سے پھیلتا جا رہا ہے۔ پاکستان میڈیا کی ہر جنگ لڑے گا لیکن جنگ جیتنے کے لئے بہن اور بیٹی کو کبھی حربہ نہیں بنائے گا۔

سجاد حیدر نے ہسپتال کی ایمبولینس وہیں چھوڑ دی تھی۔ صمد خان کو ایک ویگن کار میں لے کر "را" کے افسر اے آر سی کے سیاستدان بہنوئی کی کوٹھی میں پہنچا۔ وہ کانگریس کا سیاستدان خوش تھا کہ ان سے ایسی ہی دوستی رہی تو وہ آئندہ الیکشن کے بعد ضرور پردھان منتری بنے گا۔

صمد خان کو بے ہوشی کا انجکشن لگایا گیا تھا۔ وہ ٹارچر سیل سے ہی بے ہوشی کی حالت میں تھا اور یہ نہیں جانتا تھا کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ اس سیاستدان کی فیملی شملہ گئی ہوئی تھی۔ یہ اندیشہ نہیں تھا کہ عورتوں اور بچوں کو ایسے سیاسی کھیل کا علم ہو گا۔ سجاد حیدر نے اس کے ہاتھوں اور پیروں کے زخموں کی مرہم پٹی کی۔ سہ پہر تین بجے کے بعد اسے ہوش آیا۔ وہ حیرانی سے نئے ماحول کو دیکھنے لگا۔ سجاد حیدر نے کوڈ ورڈز سنا کر کہا۔ "باس نے مجھے آپ کی جگہ بھیجا ہے۔ آج وہ دشمن آپ کو مار ڈالنے کے لئے ہسپتال لے جا رہے تھے۔ ان سے ملیں۔ یہ کانگریسی لیڈر جی این تیواڑی ہیں۔ انہوں نے اور ان کے سالے نے آپ کو ٹارچر سیل سے نکالنے میں ہماری مدد کی ہے۔"

صمد خان نے جی این تیواڑی سے مصافحہ کیا اور شکریہ ادا کیا۔ تیواڑی اسے بتانے لگا کہ اس کا سالا "را" میں ایوی ایشن ریسرچ سینٹر کا افسر ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ "را" والے آج آپ کو امراض قلب کے ہسپتال میں لے جا کر اس طرح قتل کریں گے کہ آپ کے دونوں گردے ڈائریکٹر "را" کے ایک بھائی کے کام آئیں گے اور آپ کا دل اور آپ کی دونوں آنکھیں دوسرے مریضوں کے کام آ جاتیں۔"

صمد خان نے کہا۔ "واہ' کتنے نیک ارادوں کے ساتھ مجھے سزائے موت دی جا رہی تھی۔ مجھے سزا بھی ملتی اور عاقبت میں میرے تمام گناہ بھی دھل جاتے۔ میرے جسمانی اعضاء سے کتنے ہی مریضوں کو نئی زندگیاں مل جاتیں۔ میں جرائم سے بھرپور دنیا میں رہتا ہوں۔ ایک دن مجھے حرام موت مرنا ہے۔ اسی حرام سے میں تھوڑی سی نیکی کما لوں تو شاید تھوڑی سی رحمت خداوندی مجھے مل جائے۔"

سجاد حیدر نے کہا۔ "یہ درست ہے کہ ہمیں اس دنیا سے نیکی کما کر جانا چاہئے لیکن قدرت کو ابھی آپ کی موت منظور نہیں ہے۔ پھر ہماری ایجنسی کو آپ جیسے ذہین اور جی دار شخص کی ضرورت ہے۔"

"اب تم آ گئے ہو تو میری جگہ تم ہی سنبھالو گے۔ میں بھی ایجنسی کے ہی کام آؤں گا لیکن تم سب سے الگ رہوں گا۔ تم کسی وقت باس سے بات کرو۔ میری رہائش کا انتظام ایسا ہو کہ تمہارے سوا کسی کو میری نئی زندگی کا علم نہ ہو۔"

سیاستدان تیواڑی نے اپنی بتیسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور کھان بھائی! میرے معاملے کا کیا ہو گا؟"

سجاد حیدر نے کہا۔ "خان بھائی سے نہ پوچھو۔ یہ وعدہ ہم نے کیا ہے کہ اس علاقے میں تمہاری کانگریس پارٹی کی جیت ہو گی لیکن کانگریس کے اندر نرسیما راؤ' شرد پوار اور تمہارے درمیان پردھان منتری کی کرسی کے لئے رسہ کشی ہوتی رہے گی۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم کتنے کانگریسی لیڈروں کو خرید کر اپنا حامی بنا سکتے ہو۔ یہ تمہارا اور کانگریس کا اندرونی معاملہ ہے اور جو بیرونی معاملہ ہے اس سلسلے میں کیا ہوا وعدہ ہم ضرور پورا کریں گے۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "آپ میرے اندرونی معاملے کی چنتا نہ کریں۔ میں کانگریس کے جیتنے والے بڑے بڑے سیاستدانوں کو خریدنے کے لئے تجوری کا منہ کھول دوں گا اور انہیں بڑے بڑے منتری کی کرسیاں بھی پیش کرنے کا لالچ دوں گا۔ آپ نے جو وعدہ کیا ہے' وہ میرے لئے بہت بڑی شکتی ہے۔ بس کانگریس کو جیتنا چاہئے۔ اچھا میں کھان بھائی کے لئے تاجا پھلوں کا جوس لے کر آتا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ سجاد حیدر نے صمد خان کے قریب آ کر کہا۔ "ہم نے آپ کی رہائش کا انتظام ایک اونچی سوسائٹی کی فیملی میں کیا ہے۔ آج شام تک آپ کے نئے شناختی کارڈ اور دیگر ضروری کاغذات یعنی پاسپورٹ اور راشن کارڈز وغیرہ تیار ہو جائیں گے۔ آپ ایک گھنٹے بعد یہاں سے چلیں گے۔ ایک جگہ آپ کے چہرے پر پلاسٹک سرجری کر کے آپ کو صمد خان کی حیثیت سے ناقابل شناخت بنایا جائے گا۔"

صمد خان نے کہا۔ "یقیناً باس نے میری بہتری کے لئے عمدہ انتظامات کئے ہوں گے لیکن مجھے ایک وکیل کی ضرورت ہے۔ میں وصیت لکھنا چاہتا ہوں کہ میری موت کے بعد میرا دل' آنکھیں اور گردے ضرورت مند مریضوں کو عطیہ کے طور پر دیئے جائیں۔"

☆======☆======☆

اس فیملی کے بزرگ کا نام ثناء الرحمان تھا۔ ان کے دو جوان بیٹے تھے۔ ایک بڑا بیٹا عطاء الرحمان جرمنی میں تھا۔ دوسرا بیٹا ضیاء الرحمان بھارتی فوج میں کپتان کے عہدے پر تھا۔ ان دو بھائیوں سے بڑی ایک بیوہ بہن تھی' جس کا ایک اٹھارہ برس کا بیٹا تھا۔ وہ کاروباری لوگ تھے۔ جرمن کی ایک دواساز کمپنی میں تیار ہونے والی دواؤں کے وہ بھارت میں سول ایجنٹ تھے۔ عطاء الرحمان اس کاروبار کے سلسلے میں بھارت سے جرمنی آتا جاتا رہتا تھا۔ ضیاء الرحمان جنگجو طبیعت کا حامل تھا' کاروبار میں جی نہیں لگتا تھا۔ اس لئے فوج میں چلا گیا تھا۔

ماں نے بیٹے کو رو رو کر سمجھایا تھا کہ وہ خون خرابے والی زندگی نہ گزارے اور شادی کر کے ماں کی آنکھوں کے سامنے رہے۔ اس نے ماں کی ایک بات مانی ایک نہیں مانی۔ فوج میں چلا گیا۔ ٹریننگ پوری کر کے آیا تو ماں کا دل رکھنے کے لئے شادی کر لی۔ ہندوستان کے تقریباً تمام مسلمان محب وطن ہوتے ہیں۔ یہ بات اس طرح بھی سمجھ آتی ہے کہ دنیا کے ہر شخص کو اپنی پیدائشی جگہ سے' وہاں کے ماحول سے اور وہاں کی مٹی سے محبت ہوتی ہے۔ 1947ء سے پہلے جن مسلمانوں نے پاکستان کے حق میں آواز اٹھائی وہ پاکستان چلے گئے اور جو نہیں گئے اور اپنی مٹی کی محبت میں بھارت سے' بھارت کے اپنے شہروں سے' اپنے آباؤاجداد کے بنائے ہوئے گھروں سے اور خاندانی پیشوں سے چپکے رہے ان کی یہ محبت ایک ٹھوس گواہی ہے کہ وہ مسلمان اپنے دیس بھارت سے محبت کرتے ہیں اور مذہب سے قطع نظر اپنے بھارتی ہونے پر فخر کرتے ہیں۔

لیکن ہندو ان پر اعتماد نہیں کرتے ہیں اس لئے آج بھی ہندو مسلم فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ جب تک خالصتان کی تحریک نہیں ابھری تھی تب تک ہندو سکھوں سے فسادات نہیں کرتے تھے۔ عیسائیوں اور بنگالیوں سے وہ نہیں لڑتے۔ مسلمانوں سے اس

لئے لڑتے اور انہیں کچل کر رکھنا چاہتے ہیں کہ ان کے دوسرے مسلمان عزیزوں نے بھارت کے ٹکڑے کیوں کئے۔ کیوں پاکستان بنایا؟

اس کے باوجود مسلمان بھارت کی سیاست میں اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ وہاں کی فلم انڈسٹری میں رہ کر پوری دنیا میں بھارت کا نام روشن کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ بھارت کے نہایت ہی خفیہ ایٹمی پلانٹ کا سب سے بڑا سائنس دان ایک مسلمان ہے۔ بھارتی فوج میں مسلمانوں کی کارکردگی ان کی حب الوطنی کا ثبوت ہے۔ 1965ء کی جنگ ہو یا 1971ء کی۔ بھارتی فوج کے مسلمانوں نے پاکستان آرمی سے اپنے بھارت کے لئے جنگ کی ہے اور یہ محض اس لئے کہ کوئی بھی سپاہی فوجی قوانین اور فوجی اصولوں کے مطابق اور اپنے وطن کے دلی جذبات سے سرشار ہو کر جنگ کرتا ہے۔

ضیاء الرحمان بھی یہی کہتا تھا کہ سپاہی صرف اپنے وطن کی خاطر لڑتا ہے۔ مذہب کی خاطر جو جنگیں لڑی جاتی ہیں وہ مختلف حالات میں لڑی جاتی ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے بھی آپس میں جنگیں لڑی ہیں۔ لہٰذا ہم لڑتے ہیں تو مذہبی نہیں ملکی جنگ لڑتے ہیں۔ ان دنوں وہ بھارتی سینا کے شانہ بہ شانہ کشمیری مجاہدین کے خلاف لڑ رہا تھا۔ پتا نہیں اس کے ہاتھوں کتنے مجاہدین شہید ہو چکے تھے۔

اس کے والدین کہتے تھے' تم پوری دیانت داری سے اپنے فرائض ادا کر رہے ہو پھر بھی تم مجاہدین کی زندگیوں سے کھیل رہے ہو۔ کتنے ہی گھر جلا رہے ہو اور کتنی ہی ماؤں اور بہنوں کو بیوہ کر رہے ہو۔ بہتر ہے فوج کی ملازمت چھوڑ دو۔

کبھی ملک و قوم کے حوالے سے' کبھی خودغرضی اور ذاتی مفادات کے باعث ایک ہی بات کے مختلف مفہوم ہو جاتے ہیں۔ بھارتی فوج کے ملکی قوانین کے مطابق کشمیری مسلمان باغی اور غدار تھے۔ کیونکہ وہ کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ نہیں کہتے تھے۔ کشمیری مسلمانوں کی حریت پسندی اور جذبۂ آزادی کے حوالے سے وہ باغی نہیں مجاہد تھے۔ پاکستان میں کشمیر کا جو حصہ تھا اسے تمام پاکستانی آزاد کشمیر کہتے ہیں جبکہ ہندوستانی اسے غلام کشمیر کہا کرتے ہیں۔ اسی طرح کشمیری مسلمان جہاں اپنی آزادی کے لئے جانوں کی قربانیاں دے رہے ہیں اس کشمیر کے حصے کو پاکستانی مقبوضہ کشمیر کہتے ہیں کیونکہ ہندوستان نے کشمیر کے حصے پر جبراً قبضہ جما رکھا ہے۔

اسی طرح اگر "را" کے حکم سے صمد خان کے گردے' دل اور آنکھیں نکال کر اسے مار ڈالا جاتا تو یہ سراسر ظلم ہوتا لیکن "را" والوں کے حساب سے وہ نیکی ہوتی۔ کیونکہ سزائے موت پانے والے کے جسم کے تین حصوں سے تین مریضوں کو نئی زندگیاں مل جاتیں۔

پھر ایک دن کیپٹن ضیاء الرحمان کی لاش آئی۔ ایک کشمیری مجاہد نے اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔ اس کی لاش کو پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفنایا گیا۔ وہ اپنے پیچھے ایک بیوہ اور آٹھ برس کی بچی رضیہ بانو عرف راضی کو چھوڑ گیا تھا۔ بچی بہت خوبصورت تھی۔ فوج کے سینئر افسر نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بچی تو بہت ہی خوبصورت ہے۔ بیٹی! کیا نام ہے تمہارا؟"

"یوں تو میرا نام رضیہ بانو ہے مگر سب مجھے پیار سے راضی بلاتے ہیں۔ میں کلاس سکس میں ہوں اور ہر سال فرسٹ آتی ہوں۔"

افسر نے اس کے دادا سید ثناء الرحمان سے کہا۔ "آپ کی پوتی خوبصورت بھی ہے' ذہین بھی ہے اور بولتی بھی خوب ہے۔ ہماری سینا کے اعلیٰ افسران جو دیس کی خاطر جان کی قربانیاں دیتے ہیں ان کے وارثوں کو پنشن بھی دی جاتی ہے اور ان کی اولاد کو سرکار کی طرف سے ہاسٹل میں رکھ کر تعلیم دلائی جاتی ہے اگر یہ بچی ہر سال امتحانات میں ٹاپ لسٹ پر رہے گی تو اسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے یو کے یا امریکہ بھیجا جائے گا۔"

سید ثناء الرحمان ذرا کنجوس واقع ہوئے تھے۔ ان کے لئے یہ فائدے کی بات تھی۔ ایک تو پنشن کی خاصی رقم ملتی پھر ایک بچی کو بیرون ملک تک اعلیٰ تعلیم دلانے میں لاکھوں روپے خرچ ہوتے۔ وہ تو راضی ہو گئے لیکن بڑے بیٹے عطاء الرحمان نے اعلیٰ افسر سے کہا۔ "سر! اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں سے اور آپ لوگوں کی کرپا سے ہم اچھا کماتے کھاتے ہیں' کسی کی محتاجی نہیں ہے۔ راضی میری بھتیجی ہے۔ اس کی پرورش' تعلیم و تربیت کی ذمے داری میری ہے۔ پھر ہمارا اتنا بڑا گھر ہے اسے ہاسٹل میں رہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ آپ نے ہمارے لئے ہماری بچی کے لئے اتنا سوچا' اس کے لئے ہم آپ کے بہت ممنون ہیں۔"

اعلیٰ افسر نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ ہماری کوشش یہ

ہو گی کہ آپ لوگ ہمیشہ اچھا کماتے کھاتے رہیں اور کبھی کسی کے محتاج نہ رہیں۔ وش یو گڈلک۔"

اس افسر کے جانے کے بعد سید ثناء الرحمان نے بیٹے کو گھور کر پوچھا۔ "یہ تم نے کیا کیا؟ یہاں کے انتہا پسند ہندو' مسلمان طلبا و طالبات کے راستے میں یوں بھی رکاوٹیں بنے رہتے ہیں۔ معروف انگلش میڈیم اسکولوں' کالجوں اور یونیورسٹی وغیرہ میں مسلمان اچھوت سمجھے جاتے ہیں۔ وہاں داخلہ ہی نہیں ملتا اور تم نے سوچے سمجھے بغیر راضی کے آئندہ تعلیمی کیریئر کو برباد کر دیا۔"

عطا نے کہا۔ "راضی کی جگہ کوئی رضا ہوتا۔ میری اس بھتیجی کی جگہ کوئی بھتیجا ہوتا تو میں کبھی انکار نہ کرتا لیکن یہ بڑے شرم کی بات ہو گی کہ ہمارے خاندان کی ایک لڑکی ہاسٹل میں رہ کر تعلیم حاصل کرے۔"

"آخر اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ کیا ہاسٹل میں شریف زادیاں نہیں رہتیں۔ کیا وہاں بے شرمی ہوتی ہے؟"

"ابا جان! میں ہاسٹل میں رہنے والیوں کو بے شرم نہیں کہہ رہا ہوں لیکن ہماری روایات کے مطابق راضی آئندہ تین چار برس میں پردہ کرے گی۔ برقع پہن کر اسکول اور کالج جائے گی اور ہاسٹل میں تمام لڑکیاں اپنی ہندو تہذیب کے مطابق بے پردہ رہتی ہیں۔ مخلوط تعلیم کے باعث لڑکوں سے میل جول بڑھنے کے بھی امکانات ہیں۔ پھر ہاسٹل میں بعض لڑکیاں بڑی بے باک ہوتی ہیں' اپنی بے باکی اور بے حیائی دوسری لڑکیوں میں منتقل کرتی رہتی ہیں۔"

"جب ہم اپنی راضی کو نگرانی میں رکھیں گے اور اپنی تہذیبی روایات سے روشناس کراتے رہیں گے تو پھر کیا اعتراض ہے؟"

"ابا جان! آپ بھول رہے ہیں کہ ہاسٹل میں ہماری آپ کی نگرانی نہیں چلے گی' لڑکی صرف گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر آئے گی تو کیا ہم خاک اسے اپنی تہذیب سکھائیں گے۔"

انہوں نے جھنجلا کر کہا۔ "جہنم میں گئی تعلیم۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ لڑکیوں کو زیادہ پڑھایا جائے۔ بس اسے دسویں پاس کرانے کے بعد پردے میں بٹھاؤ۔"

کیپٹن ضیاء الرحمان کی موت کے بعد اس کی پنشن وغیرہ کے سلسلے میں فائل تیار ہو گئی تھی۔ مرحوم کیپٹن کے سینئر افسر نے ملٹری ہیڈ کوارٹر میں وہ فائل پیش کی۔ وہاں ایک دفتر میں فوج کے اعلیٰ افسران کے علاوہ ڈائریکٹر "را" اور ایڈیشنل ڈائریکٹر "را" بھی موجود تھے۔ ایک اعلیٰ افسر نے میز پر سے راضی کی ایک تصویر اٹھا کر کہا۔ "میں نے آپ کی رپورٹ پڑھی۔ آپ نے اپنی ذمے داری نباہتے ہوئے اس کی تصویریں اور تعلیمی ریکارڈ اسکول سے حاصل کیا ہے۔ یہ بچی یقیناً ایکسٹرا آرڈنری بیوٹی فل (غیر معمولی حسین) ہے۔ اس عمر میں اس کے چہرے کے نقوش ایسے تیکھے اور ایسے جاذب نظر ہیں تو آگے چل کر یہ ہماری میڈیا کی جنگ میں نمبرون رہے گی۔"

ڈائریکٹر "را" نے کہا۔ "آپ نے رپورٹ میں لکھا ہے کہ سورگ باسی کیپٹن ضیاء الرحمان کے بڑے بھائی نے اس بچی کو ہاسٹل میں بھیجنے سے انکار کیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ وہ اچھا کماتے کھاتے ہیں اور بچی کے سلسلے میں کسی کے محتاج نہیں ہیں۔ کیا اس کے علاوہ اس کے انکار کی اور کوئی وجہ ہے؟"

"ہو سکتا ہے سر! لیکن میری جتنی معلومات تھیں اس کے مطابق میں نے رپورٹ لکھی ہے۔"

"ٹھیک ہے آپ جائیں۔ باقی معلومات ہم حاصل کر لیں گے۔"

وہ افسر چلا گیا۔ ڈائریکٹر "را" نے کہا۔ "یہ ملٹری انٹیلی جنس کا کیس ہے۔ میں انٹیلی جنس کے چیف کو گائیڈ لائن دوں گا۔ اگر اس کے مطابق عمل کیا گیا تو یہ لڑکی ہاسٹل میں پہنچ جائے گی۔"

جس ہاسٹل کی بات ہو رہی تھی' وہ ایک وسیع و عریض عمارت میں تھا۔ اس عمارت میں صرف حسین ترین لڑکیوں کا داخلہ ہوتا تھا۔ سکول کی تعلیم سے لے کر لڑکیوں کو گریجویٹ بنانے کے دوران رقص' گائیکی اور کسی کا دل لبھانے' کسی کو اپنے مقاصد کے لئے شیشے میں اتارنے کے علاوہ جاسوس بننے کی تربیت دی جاتی تھی۔

ایسے ٹریننگ سینٹر کئی مغربی ممالک میں ہیں لیکن بھارت کے ٹریننگ سینٹر ایک دو صدی سے نہیں بلکہ کئی ہزار سال پہلے سے ہندو تہذیب اور ثقافت کا ایک حصہ ہیں۔ یہ کوئی مبالغہ آرائی نہیں' بلکہ اس کا ذکر ہندو دھرم کی سنسکرت اور ہندی کتابوں میں اب

بھی موجود ہے۔ آج کے دور میں جو حسن و شباب کی مورتیاں ہوتی ہیں' وہ زمانہ قدیم میں مندروں کی دیوداسیاں ہوا کرتی تھیں۔ حسین ترین دوشیزاؤں کو بھگوان کی مورتی اور مندر کی صفائی کے لئے اسی مندر کے اطراف یا تہہ خانوں میں رکھا جاتا تھا۔ بچپن سے ان کی پرورش کی جاتی تھی اور دھارمک کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ ان میں جو سب سے زیادہ حسین دیوداسی ہوتی تھی' اسے دیوتا کے لئے وقف کر دیا جاتا تھا اور بچپن سے اس کی خوراک میں زہر کے معمولی سے ذرات حل کئے جاتے تھے۔ ایسی خوراک کے ردعمل سے بچی کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی تو جڑی بوٹیوں سے اس کا توڑ کیا جاتا تھا۔ پھر وہ بچی رفتہ رفتہ ایسی خوراک کی عادی ہو کر وش کنیا (زہریلی دوشیزہ) بن جاتی تھی۔

چونکہ مندر کی دیوداسیاں ایک کھلی حقیقت ہیں اس لئے کتابوں میں ان کا ذکر ہے اور ان کی زندگیوں پر کئی فلمیں بن چکی ہیں۔ جو سنسکرت اور ہندی نہیں جانتے' وہ کسی ویڈیو لائبریری سے ایسی کوئی فلم لے کر دیکھ سکتے ہیں۔ اپنے دور کی مشہور رقاصہ سادھنابوس نے فلم وش کنیا میں ایسی ایک دیوداسی کا رول ادا کیا تھا۔ مندر کے پجاری اور پنڈت نے اسے زہریلی لڑکی اس لئے بنایا تھا کہ وہ بے حد خوبصورت تھی۔ رقص کرتی تھی تو آنکھیں اس کے بدن پر ٹھہرتی نہیں تھیں۔ ایسی حسین دیوداسی پر کسی راجا مہاراجا کا دل آ جاتا تو ساری بھگتی اور پوجا نشٹ ہو جاتی۔ کیونکہ اس حسین دیوداسی کو ایک دیوتا کے لئے وقف کر دیا گیا تھا۔

جب کسی راجا مہاراجا کو معلوم ہوتا کہ فلاں دیوداسی دیوتا کے لئے وقف کر دی گئی ہے تو وہ اسے ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا۔ اسے زبردستی حاصل بھی نہیں کرتا تھا۔ جانتا تھا کہ اس کو چومتے ہی اس کے ہونٹوں کے زہر سے مر جائے گا۔

اس سے قبل شائع ہونے والے جاسوسی ڈائجسٹ کے سلور جوبلی نمبر کی کہانی "طاعون" میں "را" تنظیم کی مختصر سی ہسٹری پیش کی گئی تھی کہ یہ تنظیم ہندوستان کے کس تاریخی دور سے شروع ہوئی تھی۔ اس کی مکمل ہسٹری سمراٹ چندر گپت موریا اور سمراٹ اشوک کے دور سے پڑھی جا سکتی ہے۔

جاسوسی ڈائجسٹ' سسپنس ڈائجسٹ اور سرگزشت میں جو داستانیں پیش کی جاتی ہیں' ان میں دلچسپی اور تجسس برقرار رکھنے کے لئے ایسا تانا بانا بنا جاتا ہے کہ وہ تفریح کے

لئے پڑھنے والوں کو محض کہانیاں معلوم ہوتی ہیں لیکن بغور مطالعہ کرنے والے' اپنے طور پر معلومات رکھنے والے اور درست تنقید و تبصرہ کرنے والے قارئین خوب سمجھتے ہیں کہ کون سا نکتہ کہاں سے اٹھایا گیا ہے۔

بھارت کی موجودہ سیاست کی بنیاد ان کے اپنے دھرم پر اور اپنے ہزاروں برس کی تہذیب و ثقافت پر رکھی گئی ہے۔ پہلے حسین ترین دیوداسیاں اپنے کسی نہ کسی دیوتا کے لئے وقف کی جاتی تھیں۔ آج حسینہ عالم بننے والی کو میڈیا کی جنگ کے لئے سفارتی سطح پر ایسے ممالک میں بھیجا جاتا ہے جہاں سے بھارت کے سیاسی مقاصد بہ آسانی پورے ہو جاتے ہیں اور ٹریننگ سینٹر کی جو حسینائیں مقابلہ حسن میں کامیاب نہیں ہوتیں انہیں سیکرٹ ایجنٹ بنا کر بیرون ممالک میں بھیجا جاتا ہے۔

ایک روز اخبارات میں خبر شائع ہوئی کہ اس بینک میں کروڑوں روپے کا ڈاکہ پڑا ہے جہاں سید ثناء الرحمان کا اکاؤنٹ تھا اور جس بینک سے جرمنی کی دواساز کمپنی کو ایک کروڑ روپے کی ضمانت دی گئی تھی۔ ایک ہفتے کے اندر جرمنی سے دواؤں کی نئی کھیپ آنے والی تھی۔ بینک والوں نے کہا تھا کہ اتنی بڑی ڈکیتی کے بعد انہیں سنبھلنے کے لئے ایک ماہ درکار ہے۔ پھر بھی جس کا اکاؤنٹ پچاس لاکھ تک کا ہو گا' وہ ہفتے میں ایک بار پچاس ہزار بینک سے حاصل کر سکے گا۔ بینک دیوالیہ نہیں ہوا ہے۔ یہ صرف ایک آدھ ماہ کا بحران ہے۔

دوسرے دن نوٹس آیا کہ سید ثناء الرحمان نے انکم ٹیکس کے بائیس لاکھ روپے ادا نہیں کئے ہیں۔ اس لئے ان کا امپورٹ لائسنس منسوخ کیا جاتا ہے۔ یہ نوٹس تو ایک زلزلہ تھا۔ ایک ہفتے کے اندر جرمنی سے مال آنے والا تھا اور امپورٹ لائسنس کے منسوخ ہونے سے مال واپس چلا جاتا۔

سید ثناء الرحمان اور عطاء الرحمان نے بینک جا کر وہ نوٹس دکھایا اور کہا۔ "کسی طرح ہمارے اکاؤنٹ سے بائیس لاکھ دے دیں۔ ورنہ ہمارا ڈیڑھ کروڑ کا مال واپس چلا جائے گا۔"

بینک والوں نے روپے دینے اور مزید ضمانت دینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ انکار کرنے کے لئے اوپر سے حکم آیا تھا۔ وہ دونوں باپ بیٹے دوڑے دوڑے اوپر والوں تک

گئے۔ وہاں وہ فوجی افسر بھی بیٹھا ہوا تھا جس نے راضی کو ہاسٹل بھیجنے کا مشورہ دیا تھا۔ انہوں نے اس سے کہا۔ "آپ گواہ ہیں کہ ہمارے بیٹے نے دیس کی خاطر کشمیری مجاہدین سے لڑتے ہوئے جان دی ہے۔ ہمارے پاس یوں تو بہت کچھ ہے مگر کچھ نہ ہونے کے برابر ہے۔ بینک والے تعاون نہیں کر رہے ہیں۔ ہماری کوٹھی اور دوسری جائیداد تو ایک ہفتے کے اندر فروخت نہیں ہو سکے گی۔ اونے پونے فروخت ہو گی تو بائیس لاکھ پورے نہیں ہو سکیں گے۔"

فوجی افسر نے کہا۔ "آپ لوگ بڑی مصیبت میں ہیں۔ مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ یہ انکم ٹیکس اور امپورٹ لائسنس وغیرہ کا معاملہ سرکاری ہے اور ہم فوجی ہیں۔ ہم سرکاری معاملات میں مداخلت نہیں کرتے ہیں۔"

عطاء الرحمان نے کہا۔ "مگر میرے فوجی بھائی کی قربانیوں کا اتنا صلہ تو ملنا چاہئے کہ ہمیں انکم ٹیکس کی ادائیگی کے لئے دو تین ماہ کی مہلت مل جائے اور ہمارا لائسنس کینسل نہ ہو۔"

سیکریٹریٹ کے ایک افسر نے کہا۔ "اگر ایک بار لائسنس کینسل ہو گا تو پھر آپ کو نہیں ملے گا۔ کوئی سیاستدان اپنے کسی رشتے دار کے لئے اسے حاصل کر لے گا۔ نوٹس کے مطابق چوبیس گھنٹوں کے اندر ٹیکس کے بائیس لاکھ ادا کر دیں۔ ورنہ سمجھ لیں کہ لائسنس ہمیشہ کے لئے گیا۔"

فوجی افسر نے مسکرا کر عطا کو دیکھا اور کہا۔ "اس روز میں نے کہا تھا کہ راضی بڑی پیاری بچی ہے۔ اسے سرکاری اخراجات پر اعلیٰ تعلیم دلائی جائے گی لیکن مسٹر عطا! آپ نے بڑے فخر سے کہا تھا کہ آپ کسی کے محتاج نہیں ہیں۔ یہ محتاجی نہیں تو اور کیا ہے۔ سب کے سامنے ہاتھ پھیلائے پھر رہے ہیں۔"

عطا نے کہا۔ "جناب! آپ کہاں کی بات لے بیٹھے ہیں۔ اس کا کاروبار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"تعلق ہو بھی سکتا ہے۔ آپ نے جو کہا تھا' وہ رپورٹ میں نے اوپر لکھ بھیجی تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ جب سیاستدان اقتدار میں رہتے ہیں تو کتنے نازک مزاج بن جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے انہیں آپ کی بات ناگوار گزری ہو اور انہوں نے آپ کو محتاج بنا دیا

ہو۔"

سید ثناء الرحمان نے اپنے بیٹے عطا کو گھور کر دیکھا۔ پھر کہا۔ "میرا یہ بیٹا بڑا جذباتی ہے۔ اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ کس کے سامنے کون سی بات کہنا چاہئے۔ پھر آپ تو ہمارے فائدے کی باتیں کر رہے تھے۔ ہماری بچی کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے لئے ملک سے باہر بھی بھیجنے والے تھے۔ ہم سے بڑی غلطی ہوئی۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ آپ میرے اس بیٹے کی بات پر نہ جائیں۔ میری طرف سے دوسری رپورٹ لکھ دیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری بچی ہند سرکار کے سائے میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔"

بڑے میاں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگے۔ فوجی افسر نے ان کے ہاتھوں کو تھام کر کہا۔ "آپ ہاتھ نہ جوڑیئے۔ آپ میرے باپ کی جگہ ہیں۔ میں ابھی دوسری رپورٹ لکھ کر اوپر بھیج دوں گا۔ میں آپ کو اس مشکل سے ضرور نکالوں گا۔ آپ اطمینان سے گھر جا کر آرام کریں اور یقین رکھیں کہ آپ کا فوجی بیٹا زندہ ہے۔ آپ کا سب کام آسانی سے ہو جائے گا۔"

اس افسر نے بڑے میاں سے سارے کاغذات لے لئے۔ عطا کا سر جھکا ہوا تھا۔ بڑے میاں اس افسر کا شکریہ ادا کر کے بیٹے کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ پھر اس نے کہا۔ "دیکھا تم نے' کتنا اچھا افسر ہے۔ مجھے باپ کی جگہ سمجھتا ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ ہمیں اس مشکل سے ضرور نکالے گا۔ اس کے سوا تو اور کوئی ذریعہ بھی ہمارے پاس نہیں ہے۔"

عطا خاموش رہا۔ جب وہ مشکل آسان نہیں کر سکتا تھا تو باپ کے آگے کچھ بول بھی نہیں سکتا تھا۔ دوسرے دن اس افسر کا ایک ماتحت افسر کوٹھی میں آیا۔ اس کے ہاتھوں میں فائلیں تھیں۔ ان باپ بیٹے نے اس سے ڈرائنگ روم میں ملاقات کی۔ اس نے اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا۔ "ہمارے افسر صاحب نے آپ کا کام کر دیا ہے۔ منتری جی آپ لوگوں سے سخت ناراض تھے۔ بھلا منتری کی آفر کو کوئی ٹھکراتا ہے؟ یہ تو گویا سرکار کو ٹھکرانے والی بات ہو جاتی ہے۔ بہرحال ہمارے افسر صاحب نے انہیں منا لیا ہے۔ آپ انکم ٹیکس چھ مہینے میں بھی ادا کر سکتے ہیں۔ لائسنس بھی کینسل نہیں ہو گا۔ آپ صرف اتنا کریں کہ یہ گورنمنٹ ایجوکیشن اور ٹریننگ اسکول اور ہاسٹل کے فارم ہیں' انہیں اپنی پوتی

رضیہ بانو عرف راضی کے نام سے پُر کر کے اپنے دستخط کر دیں۔ کل سینٹر کی گاڑی آ کر آپ کی پوتی کو لے جائے گی۔ چنتا کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ یہاں ایک ماہ کے لئے آیا کرے گی۔ دو مہینے کی چھٹیاں ہوتی ہیں۔ وہ دوسرا مہینہ شملہ میں گزارا کرے گی۔"

سید ثناء الرحمان نے دو عدد فارم کو اپنی پوتی کے نام اور دیگر کوائف سے پُر کر کے اپنے دستخط کئے۔ اس کے بعد ساری مشکلیں آسان ہو گئیں۔ امپورٹ لائسنس بحال ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی انکم ٹیکس کا عذاب بھی ٹل گیا۔ باپ نے کہا۔ "بیٹے! تم ایک اچھے بزنس مین ہو مگر اتنی عقل رکھو کہ جس ملک میں رہتے ہو' وہاں کی حکومت کو ناراض نہیں کرنا چاہئے۔"

عطا نے کہا۔ "میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا ہے کہ صرف راضی کے ہاسٹل نہ جانے سے سرکار ناراض کیوں ہو گئی اور اب اس کی ناراضگی دور کیوں ہو گئی؟"

"بس اتنا سمجھ لو کہ یہ سب حکمرانوں کے نخرے ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں فرنگیوں کے زمانے میں ایک انگریز بہادر نے اپنے گھوڑے کو اس لئے گولی مار دی تھی کہ اس گھوڑے پر ایک ہندوستانی سوار ہو گیا تھا۔ یہ جو حکمران ہوتے ہیں' یہ معمولی سی بات کو بھی اپنی انسلٹ سمجھ لیتے ہیں۔ ان کو ہر طرح سے خوش رکھنا چاہئے۔"

باپ کی باتوں سے عطا کو اطمینان نہیں ہوا۔ اس کی بھتیجی راضی انسان کی بچی تھی' کسی انگریز بہادر کی گھوڑی نہیں تھی۔ اتنی بڑی بھارت سرکار نے صرف ایک بچی کے لئے چوبیس گھنٹوں تک ہلچل مچا دی تھی۔ دو دنوں تک باپ بیٹے کو صبح سے شام کتنے ہی دفتروں میں دوڑا کر یقین دلا دیا تھا کہ لاکھوں کروڑوں کا کاروبار ہاتھ سے نکل چکا ہے اور پھر اسی سرکار نے پلک جھپکتے ہی ساری مشکلیں آسان کر دی تھیں۔ دیکھا جائے تو سرکار نے نہیں راضی نے آسان کر دی تھیں۔

راضی چلی گئی۔ دس ماہ کے بعد گرمیوں کی چھٹی میں آئی تو اپنی عمر سے زیادہ تیز طرار لگی۔ ایسی اسمارٹ اور نکھری ہوئی تھی جیسے انگریز نسل کی ہندوستانی لڑکی ہو۔ ایک سید گھرانے کی لگتی ہی نہیں تھی۔ اس نے جانے سے پہلے کہہ دیا کہ اگلے گیارہ ماہ بعد آئے گی تو اس کا کمرہ الگ ہونا چاہئے اور یہ جو دوسرے بچے ہیں' انہیں مینرز (سلیقہ) سکھایا

جائے۔

گویا وہ کہہ گئی تھی کہ اس کے تمام خاندان والے دقیانوسی ہیں۔ وہ پھر گیارہ ماہ بعد آئی تو دس برس کی ہو چکی تھی۔ اپنے ساتھ ایک ملازمہ کو لے کر آئی تھی' جو اس کے احکامات کی تعمیل کرتی تھی۔ اپنے دادا سے صاف کہہ دیا تھا کہ آپ کے گھر کے ملازم بھی بیک ورڈ ہیں۔ گیارہ برس کی ہو کر آئی تو اس کے کمرے سے موسیقی کی آوازیں ابھرتی تھیں اور وہ ان کی دھن پر رقص کرتی تھی۔ عطا نے اپنے بیوی بچوں کے لئے ایک دوسرا مکان خرید لیا۔ اپنے والد سے کہا۔ "ہماری جو خاندانی روایات ہیں میں انہیں برقرار رکھنا چاہتا ہوں۔ آپ کی لاڈلی پوتی جو ہر سال ایک نئے انداز میں آتی ہے' وہ میرے بچوں پر اثرانداز ہو گی۔"

سید ثناء الرحمان بھی پریشان تھے۔ اسے سرکار کے سائے میں اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ ویسے تعلیم میں تو کمی نہیں تھی۔ ان کی توقع سے زیادہ وہ انگریزی اور فرانسیسی زبان ایسے بولتی تھی جیسے وہ اس کی مادری زبان ہوں۔ علم حاصل کرنا اور زیادہ زبانیں سیکھنا اچھی بات ہے مگر دادا کو جو بات پریشان کرتی تھی' وہ یہ تھی کہ وہ سید زادی نہیں رہی تھی۔ یہ پتا نہیں تھا کہ وہ کیا سے کیا بن رہی تھی۔ بس کچھ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی ہاسٹل میں نہیں' ایٹمی پلانٹ میں جا کر رہا کرتی ہے اور سال بہ سال ایٹم بم بنتی جا رہی ہے۔

اسی سال راضی کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ سید ثناء الرحمان نے بیٹے سے کہا۔ "عطا! ابھی نہ جاؤ۔ ایک بیوہ بہو تھی' وہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ تم بہو اور بچوں کو لے جاؤ گے تو میں اتنی بڑی کوٹھی میں تنہا رہ جاؤں گا۔"

اس نے کہا۔ "میں آپ کو تنہا چھوڑنا نہیں چاہتا۔ اس لئے رہ جاتا ہوں لیکن ہر سال راضی یہاں آپ کے پاس ایک ماہ کے لئے آئے گی تو میں اس ایک ماہ کے لئے اپنے بیوی بچوں کو لے کر اپنے سسرال چلا جایا کروں گا۔"

آٹھ ماہ گزر گئے۔ جرمنی سے دواؤں کی ایک اور کھیپ آنے والی تھی۔ پتا چلا کہ جہاز ایندھن لینے کے لئے دبئی میں رکا تھا۔ وہاں سے پھر آگے نہیں آ رہا تھا۔ انہیں اطلاع ملی کہ دبئی کسٹم سے اپنا مال چھڑانا چاہتے ہو تو دونوں باپ بیٹے یہاں آؤ۔

باپ بیٹے وہاں پہنچے تو پتا چلا معاملہ کسٹم کا نہیں ہے۔ ایجنسی کے باس نے انہیں اپنا

مہمان بنایا تھا۔ عطا نے حیرانی سے پوچھا۔ "آپ ہمارے یہ تمام حالات، کیسے جانتے ہیں؟"

باس نے کہا۔ "میں مشرق وسطیٰ سے مشرق بعید تک ایک انسائیکلوپیڈیا ہوں۔ جہاں جس قسم کی معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں' کرلیتا ہوں۔ میں سب کو جانتا ہوں لیکن میں اور میرے خاص بندے دوسروں کے لئے نامعلوم رہتے ہیں۔ بہتر ہے میرے متعلق کوئی سوال نہ کرو۔ صرف یہ فیصلہ کرو کہ سید خاندان کی عزت بحال رکھنا چاہتے ہو یا نہیں؟"

سید ثناء الرحمان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے کہا۔ "میں تو نیکی' شرافت اور دیس بھگتی کے جذبے سے کام کرتا رہا لیکن کس طرح دلدل میں دھنس رہا ہوں' یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔"

"اور آپ سمجھ بھی نہیں پائیں گے۔ آپ کا ایک بیٹا کشمیر کی جنگ میں کام آگیا۔ آئندہ آپ کی پوتی بھارتی میڈیا کی جنگ میں کام آتی رہے گی۔ اب میں تفصیل میں جاؤں گا تو آپ شرم سے ڈوب مریں گے۔"

عطا نے شرم سے سر جھکا کر کہا۔ "میرا تو جی چاہتا ہے بھارت چھوڑ کر کسی دوسرے ملک میں چلا جاؤں۔"

"کس ملک میں جاؤ گے؟ کس ملک میں سیاسی بے حیائی نہیں ہے؟ ایسی بے حیائی سے کوئی روکتا ہے تو وہ دین اسلام ہے لیکن اسلامی ممالک کو بے حس بنایا جا رہا ہے۔ سلمان رشدی کا قصہ پرانا ہو گیا۔ اس سلسلے میں صرف ایران کو غیرت آئی اور اسے واجب القتل قرار دیا۔ دوسرے تمام اسلامی ممالک نے صرف رسمی طور پر اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس سے زیادہ کہتے تو امریکہ اور مغربی ممالک کی نظروں میں انتہا پسند مسلمان کہلاتے۔ تسلیمہ نسرین نے حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لکھا تو بنگلہ دیش کی اسلامی حکومت نے امریکہ کو خوش کرنے کے لئے اسے مغربی ملک میں پناہ لینے بھیج دیا۔ یہ سب علماء دین کو غصہ دلانے اور مسلمانوں کو بنیاد پرست ثابت کرنے کے لئے ایسا کیا جا رہا ہے۔ پاکستان میں رحمت مسیح اور سلامت مسیح آرام سے زندگی گزار رہے تھے۔ یہاں بھی علماء کرام کو مشتعل کرنے کے لئے ان کی زبان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرائی گئی۔ پھر انہیں فوراً ہی امریکہ کے حوالے کر دیا گیا۔ پاکستانی عدالت کا فیصلہ قابل قبول سمجھا نہیں گیا۔ یہ مسلمانوں کو مشتعل کر کے انہیں انتہا پسند اور بنیاد

پرست ثابت کرنے والی شرارت تھی۔ آج کے دور میں شرارت کا دوسرا نام سیاست ہے۔ تم جس ملک میں جاؤ گے وہاں تمہیں ایسی شرارت ملے گی۔ اگر تم اعتراض کرو گے کہ میڈیا کی جنگ میں ایک مسلمان رضیہ کو کیوں استعمال کیا جا رہا ہے۔ ان سے جواب ملے گا۔ ہندو لڑکیوں کو بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔ وہ یہ نہیں کہیں گے کہ ان کی ثقافت میں ایسا ہے' وہ کہیں گے کہ مسلمان انتہا پسند ہیں اور اپنے بھارتی کلچر کے مطابق رہنا نہیں چاہتے ہیں۔"

"ہم پُرامن زندگی گزارنے والے شہری ہیں۔ ہم عالمی سیاست میں الجھنا نہیں چاہتے۔ ہم میں اتنا دم خم نہیں ہے کہ امریکہ' اسرائیل اور بھارت کی سیاسی چالوں کے خلاف کچھ بول سکیں۔ آپ نے ہمیں بلایا ہے' آپ ہی مشورہ دیں کہ ہم اپنے خاندان کی عزت کو اس ہاسٹل سے کس طرح لا سکتے ہیں۔"

باس نے کہا۔ "اپنی ڈوبتی ہوئی کشتی میرے حوالے کر دو۔ ایک ماہ کے لئے یہیں رہ جاؤ۔ تمہارے والد تمہارا پاسپورٹ اور ضروری کاغذات لے کر جائیں گے۔ تمہارے پاسپورٹ سے یہی ثابت ہو گا کہ تم والد کے ساتھ بھارت واپس گئے ہو۔"

"یہ کیسے ہو گا؟"

"یہ ہم جانتے ہیں کہ کس طرح تمہارے پاسپورٹ وغیرہ میں مہر لگے گی۔ بھارت پہنچ کر تمہارے والد تمہاری بیوی اور بچوں کو تمہارے سسرال بھیج دیں گے۔ ہمارے ایک خاص آدمی کو پلاسٹک سرجری کے ذریعے عطاء الرحمان بنایا گیا ہے' وہ ایک ماہ تک عطا بن کر تمہارے والد کے ساتھ رہے گا۔"

سید ثناء الرحمان نے پوچھا۔ "میری پوتی کا کیا بنے گا؟ میں تو شرم سے مر جاؤں گا۔"

"آپ اس کی فکر نہ کریں۔ ہم سے تعاون کرتے رہیں۔ انشاء اللہ وہ واپس سید گھرانے میں آئے گی۔"

☆======☆======☆

"را" کے تمام اہم افسران ایک بڑی سی میز کے اطراف بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان میز پر وہ کھلا ہوا خط پڑا تھا۔ ایسا خط آج تک کسی نے لکھا نہیں ہو گا۔ خط لکھنے کے

لئے نہ سادہ کاغذ استعمال ہوا تھا۔ نہ روشنائی استعمال کی گئی تھی اور نہ ہی کسی نے اپنے ہاتھ سے تحریر لکھی تھی۔ اگر کوئی لکھتا تو کاغذ قلم ضرور استعمال کرتا۔ وہ خط جو سب کی آنکھوں کے سامنے پڑا ہوا تھا' اسے اخبارات کے الفاظ کو تراش کر ترتیب دیا گیا تھا اور اس خط کی ترتیب یوں تھی۔

"محبت میں دل دیتے ہیں اور لیتے بھی ہیں۔ لہٰذا مجھے تمہارا دل چاہئے۔ فوراً وصیت لکھو کہ تمہاری موت کے بعد امراض قلب کے کسی ضرورت مند کو تمہارا دل دان کیا جائے۔ تم مرنے کے بعد بھی اس دنیا کو دیکھنا چاہتے ہو۔ اس لئے کسی ضرورت مند کو تمہاری آنکھیں بھی دان کی جائیں۔ کسی کڈنی سنٹر کے ضرورت مند مریض کو اپنے گردے بھی دے دو۔ اس دنیا سے جتنے ہلکے ہو کر جاؤ گے اتنے ہی تمہارے پاپ دھلیں گے۔ آج اٹھارہ تاریخ ہے۔ بیس تاریخ کی رات تمہاری زندگی کی آخری رات ہے۔ اکیس تاریخ کی شام کو تمہاری جوان بیٹی اور جوان بیٹا دونوں خیریت سے تمہاری کوٹھی میں پہنچا دیئے جائیں گے۔"

آخر میں لکھنے والے نے اپنا نام اخبارات کے تراشے سے لکھا تھا۔ "تمہارا پریم پجاری"۔

اس کھلے ہوئے خط کے ساتھ جو لفافہ رکھا ہوا تھا' اس پر اس کا نام لکھا ہوا تھا جسے لکھا گیا تھا کہ اس دنیا سے جتنے ہلکے ہو کر جاؤ گے' اتنے ہی تمہارے پاپ دھلیں گے۔ اس کا نام بھی اخباری الفاظ کو تراش کر چسپاں کیا گیا تھا اور وہ نام تھا "دھن راج ورما' ڈائریکٹر "را"۔

ایٹم بم کے متعلق سنا ہے کہ صرف ایک بم سے قیامت خیز تباہی ہوتی ہے۔ تصاویر میں ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی سے اس بم کی ہلاکت خیزی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہاں سننے اور دور سے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے۔ ذاتی تجربہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ ہلاکت خیزی اپنے اوپر گزرتی ہے۔ وہ خط ایک ایٹم بم سے کم نہیں تھا۔ دھن راج ورما ڈائریکٹر "را" کے دل اور دماغ کو ہلاک کر چکا تھا۔ جیتے جی اس کے اندر سے گردے اور اس کے سینے سے دل نکال چکا تھا۔ چہرے سے آنکھیں بھی نکل چکی تھیں۔ جسم کے اندر سے یہ تمام اعضاء نکلنے کے باوجود وہ کرسی پر بیٹھا میز پر جھکا ہوا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔

دو ہفتے کے بعد اس کی جوان بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ وہ اپنے جوان بھائی کے ساتھ 16 تاریخ کو شاپنگ کے لئے گئی تھی۔ پھر وہ دونوں بہن بھائی واپس نہیں آئے تھے۔ انہیں ڈھونڈ نکالنے میں حکومت کی اور "را" کی پوری مشینری حرکت میں آگئی تھی۔ 16 تاریخ کی رات گزر گئی۔ 17 تاریخ کا دن پھر رات بھی گزر گئی۔ اپوزیشن پارٹی کے کتنے ہی کارکنوں اور لیڈروں کو گرفتار کیا گیا۔ بال ٹھاکرے سے بھی پوچھا گیا کہ یہ اگر اس کی حرکت ہے تو وہ اس جوان بیٹی اور بیٹے کی واپسی کی قیمت بتائے۔ حکومت سے جتنے اختیارات چاہے حاصل کرے۔

اس نے ہاتھوں میں گیتا اٹھا کر قسمیں کھائیں اور کہا۔ "تم لوگوں نے میری بہن کامنا ٹھاکر کو اغوا کر کے ہلاک کر دیا لیکن میں نے ایسی ذلیل حرکت نہیں کی ہے۔ پھر یہ کہ ڈائریکٹر "را" کے فیملی ممبروں کو اغوا کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اتنا بڑا کام کسی ایک آدمی کا نہیں' کسی خطرناک گینگ کا ہو سکتا ہے۔"

یہ بات موٹی عقل سے سمجھی جا سکتی تھی کہ یہ کسی تنہا شخص کا کام نہیں ہے۔ انہوں نے ایجنسی کے باس سے رابطہ کیا۔ باس نے کہا۔ "مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ میں دھن راج ورما کی آواز فون پر سن رہا ہوں۔ جب سے میرا دست راست صمد خان لاپتا ہوا ہے' تب سے میں کئی بار تم سے رابطہ کر کے اس کی گمشدگی کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا مگر مجھے فون پر یہی جواب ملا کرتا تھا کہ ڈائریکٹر "را" دھن راج ورما صاحب بہت مصروف ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آج آپ کی مصروفیات ختم ہو چکی ہیں۔"

دھن راج نے کہا۔ "آپ یقین کریں۔ میں سچ مچ بہت مصروف رہا کرتا تھا اور جہاں تک صمد خان کا تعلق ہے میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے برسوں سے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی ہے۔ مگر یہ سنا تھا کہ اس نے بال ٹھاکرے کی ایک بہن کو اٹھا لیا تھا۔ اسی ٹھاکرے نے غیرت میں آ کر صمد خان سے دشمنی کی ہو گی۔"

"دھن راج! تمہارے کان سے ریسیور لگا ہے۔ اب ان آوازوں کو ذرا سنو۔"

وہ سننے لگا۔ اسے اس گفتگو کی آوازیں سنائی دیں' جو اس کے اور بال ٹھاکرے کے درمیان ہو چکی تھیں اور آخر میں ٹھاکر نے کہا تھا کہ یہ گفتگو ریکارڈ کی جا رہی ہے اور اس کا ایک کیسٹ ایجنسی کے باس کے پاس بھیجا جائے گا اور وہی فون پر ہونے والی گفتگو کا

کیسٹ سنائی دے رہا تھا۔

پھر باس کی آواز سنائی دی۔ "تمہاری اور ٹھاکرے کی گفتگو اس بات کا ثبوت ہے کہ میری جان سے پیارا صمد خان "را" کی قید میں تھا۔ پھر اسے ایمبولینس میں کہیں لے جایا جا رہا تھا۔ راستے میں بال ٹھاکرے نے اسے مار ڈالا۔ میرا دماغ' میری طاقت صمد خان اب اس دنیا میں نہیں ہے اور میں صبر و تحمل سے اگلے الیکشن کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس الیکشن میں انتقام لوں گا۔ ابھی تو تم سب کو ڈھیل دے رہا ہوں۔"

"آپ ڈھیل نہیں دے رہے ہیں۔ آپ کے آدمیوں نے میری جوان بیٹی اور جوان بیٹے کو اغوا کیا ہے اور تاوان کی صورت میں میری جان مانگ رہے ہیں۔ کہتے ہیں میں اپنے گردے' دل اور آنکھیں ضرورت مند مریضوں کو دان کروں گا تو میرے دونوں بچے خیریت سے گھر پہنچ جائیں گے۔"

باس نے کہا۔ "دھن راج ہوش میں رہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کروڑوں روپے کا نقد لین دین کرتا ہوں' تب کوئی واردات کراتا ہوں۔ میں تمہارے گردے' دل اور آنکھیں لے کر کیا حاصل کروں گا۔ میرے آدمیوں کو الزام دینے سے پہلے بتاؤ کہ تمہاری عمر کتنی ہے؟ جوان بچوں کے باپ ہو۔ اسی مناسبت سے ان چیزوں کی قیمت مجھے کیا ملے گی؟ تم خود بتاؤ کہ انہیں محفوظ رکھنے کے لئے اگر میں تمہارے کام آؤں اور تمہارے اغوا ہونے والے بچوں کو بھی کہیں سے ڈھونڈ نکالوں تو مجھے کتنی رقم دو گے؟"

دھن راج کچھ کہنا چاہتا تھا۔ وہ بولا۔ "ذرا ایک منٹ' میرے صمد خان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ میں تمہاری موت کا تماشا دیکھوں لیکن صمد خان کا انتقام لینے کے لئے میں تمہیں جان سے نہیں مارنا چاہتا۔ میں تو نقدی کاروبار کرتا ہوں۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں آئندہ الیکشن میں تمہاری کانگریس سے کتنی بڑی رقم وصول کروں گا۔"

دھن راج نے پریشان ہو کر کہا۔ "ابھی تو میری جان پر بنی ہے۔ میں الیکشن اور کانگریس کی کوئی بات نہیں سننا چاہتا۔ آج اٹھارہ تاریخ ہے۔ اس نامعلوم مجرم نے مجھے پرسوں بیس تاریخ تک جیسے زندگی دی ہے' اس دوران مجھے مرنا ہو گا۔ ورنہ میرے بچے مجھے زندہ نہیں ملیں گے۔ ابھی تم نے کہا تھا کہ میں اپنے گردوں' دل اور آنکھوں کی کیا

قیمت دے سکتا ہوں؟ اگر تم مجھے اس نامعلوم مجرم سے بچاؤ گے۔ میرے بچوں کو زندہ سلامت گھر پہنچاؤ گے تو تمہیں منہ مانگی رقم دوں گا۔"

"ایسی بات ہے تو مجھے اپنے چھوٹے بڑے دشمنوں کے نام اور پتے بتاؤ۔ مجھے بال ٹھاکرے پر شبہ ہے۔ ہو سکتا ہے وہ دوہری چالیں چل رہا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ الیکشن سے پہلے ہی وہ ہم دونوں کو اس معاملے میں لڑا کر اپنی سیاسی پوزیشن مضبوط کرنا چاہتا ہو۔ اگر وہ ایسا کر رہا ہو گا تو پچھتائے گا۔"

"تمہاری بات دل کو لگ رہی ہے۔ بال ٹھاکرے دوہری چالیں چل رہا ہو گا۔ میں بھی اس سے نمٹ لوں گا۔"

"اگر تم نمٹنا چاہتے ہو تو پھر میں ٹھاکرے سے دور رہوں گا۔"

"ٹھیک ہے' میں پندرہ بیس منٹ میں فون کر کے اپنے چھوٹے بڑے اور نئے اور پرانے دشمنوں کے نام اور پتے تمہیں بتاؤں گا۔ تم اور کیا چاہتے ہو؟"

"یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تمہارے بچوں کو اغوا کرنے والا سیدھے سادے انداز میں تمہیں مرنے کو کیوں نہیں کہہ رہا ہے۔ یہ کیوں چاہتا ہے کہ تم اپنے جسمانی اعضاء کو عطیے کے طور پر دو؟"

ڈائریکٹر "را" دھن راج ورما ذرا سا ہچکچایا۔ یہ اسی کا آئیڈیا تھا کہ خطرناک مجرم کو سزائے موت دیتے ہی اس کے جسمانی اعضاء کو عطیے کے طور پر دوسرے مریضوں تک پہنچایا جائے اور انہیں نئی زندگی دی جائے۔ اس طرح ایک خطرناک مجرم کی بدترین موت ہو گی اور دوسروں کو نئی زندگیاں دے کر نیکی کمائی جائے گی۔

باس نے پوچھا۔ "تم خاموش کیوں ہو گئے؟"

وہ چونک کر بولا۔ "مم.......... میں سوچ رہا ہوں۔ شاید وہ میرے بچوں کو اغوا کرنے والا ایب نارمل ہے یا کوئی درندہ ہے۔ مرنے کے بعد بھی میرے جسم کے حصے دوسروں کو پوجا کے پرساد کی طرح دینا چاہتا ہے۔"

"تمہاری "را" تنظیم کے لوگ مجرموں کو بڑی درندگی سے سزائیں دیتے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اس نکتے پر بھی غور کرو۔ کیا کسی کو اس طرح قتل کیا گیا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے دل اور آنکھوں کو پیروں تلے کچلا گیا ہو۔ یا کسی طرح اس مقتول

کی لاش کی توہین کی گئی ہو اور اب اس کے ساتھی تم سے بھی وہی چیزیں مانگ رہے ہوں؟"

اس بات پر صمد خان ہی یاد آ رہا تھا' جو اس کی معلومات کے مطابق مر چکا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں اس نکتے پر غور کروں گا اور آدھے گھنٹے کے اندر فون کروں گا۔"

اس نے ریسیور رکھ کر "را" کے دوسرے افسران کو دیکھا۔ پھر کہا۔ "ہم بڑی رازداری سے صمد خان کے ساتھ یہی سلوک کرنا چاہتے تھے' جو اس خط کو بھیجنے والا میرے ساتھ کرنا چاہتا ہے۔ کیا یہ خط بھیجنے والا صمد خان کا بھائی اسد خان ہے؟"

ایک افسر نے پوچھا۔ "اسد خان کو کیسے معلوم ہوا کہ ہم اس کے بھائی کے دل گردے نکالنے والے تھے۔ صمد خان تو کسی کو کچھ بتانے سے پہلے ہی مر گیا تھا۔"

دھن راج نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔ "ہمارے اس دفتر سے' ہمارے اندر سے یہ بات باہر گئی ہے۔ یہاں ہمارے درمیان ضرور کوئی غدار ہے۔"

وہ غدار افسر اے آر سی وہاں موجود تھا۔ ایک افسر نے کہا۔ "سر! ہم میں سے آپ کو جس پر شبہ ہو آپ ابھی اس کا گریبان پکڑیں۔ اس کے ذریعے اس خط بھیجنے والے تک پہنچنا آسان ہو جائے گا۔"

وہ بولا۔ "میں کس کا گریبان پکڑوں؟ آپ تمام افسران میرے لئے قابل اعتماد ہیں۔ پھر بھی میں یہاں کسی کو اس لئے غدار کہہ رہا ہوں کہ بات اس کمرے سے باہر گئی ہے۔ جب بال ٹھاکرے کو معلوم ہو سکتا ہے کہ صمد خان کو ایمبولینس میں لے جایا جا رہا ہے تو اسد خان کو بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے بھائی کی لاش کے ساتھ کیا سلوک کرنے والے تھے۔"

ایک نے کہا۔ "اس روز بھی ہم پانچ افسران تھے۔ آج بھی ہم سب وہی ہیں۔ ہم ہزاروں لاکھوں کی بھیڑ میں دشمنوں کو ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ کیا یہاں صرف پانچ افسران میں سے کسی غدار کو نہیں پہچان سکیں گے۔"

افسر اے آر سی کو پسینہ آ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ غدار تک پہنچنے کے لئے کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال کئے جائیں گے۔ "را" کے ماہر نفسیات کو بھی بلایا جائے گا' اس سے بھی کام نہ بنا تو ایک ایک کو اعصابی کمزوری میں مبتلا کر کے اس پر ہپناٹائز کیا جائے گا اور وہ

سچ اگل دے گا۔

افسر نے اعصابی اور دماغی توانائی کی دوا اپنے پاس رکھی تھی۔ د۔ تو ایک کیپسول کھا لیا کرے۔ اس نے جیب سے کیپسول کی ۔ اور خالی گلاس رکھا ہوا تھا۔ اس نے گلاس میں پانی لیا۔ پھر ایڈیشنل ڈائریکٹر نے پوچھا۔ "مسٹر رادھے شیام! خیریت تو ہے؟"

وہ بولا۔ "جی' جی ہاں .... کل شام سے پیٹ ہے۔"

اس نے کیپسول کو منہ میں ڈال کر گلاس سے پانی پیا۔ اس کے پار نے کیپسول کی ڈبیا لے کر دیکھی پھر کہا۔ "یہ پیٹ کے لئے نہیں' دماغی اور ... حاصل کرنے کے لئے ہے۔"

دوسرے نے پوچھا۔ "کیا آپ غلط دوا کھا رہے ہیں؟"

جواب سننے کے لئے سب نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ میز پر ٹیک کر جھک رہا تھا۔ اس کے چہرے سے ایسا پسینہ پھوٹ رہا تھا جیسے پانی سے بھیگ رہا ہو۔ اس نے دیدے پھیلا کر ڈائریکٹر دھن راج ورما کو دیکھا۔ پھر اس کا سر میز پر ڈھلک گیا۔ سب لوگ فوراً ہی اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آئے۔ اسے آوازیں دیں۔ اس کے پھیلے ہوئے دیدے ساکت ہو گئے تھے۔ دھن راج سب کو ہٹاتا ہوا اس کے چہرے پر جھک کر بولا۔ "رادھے شیام! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ جلدی کرو' ڈاکٹر کو بلاؤ۔"

وہ پھر اس کے چہرے پر جھکا۔ اس کے ہونٹوں پر لرزش تھی جیسے کچھ کہنے جا رہا ہو۔ دھن راج ورما اپنا ایک کان اس کے ہونٹوں کے قریب لا کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے منہ سے بالکل مردہ سی آواز ٹوٹ ٹوٹ کر نکلی۔ "کہا .... آن .... جن .... جندہ ہے۔ اے .... اے ...."

وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ زندگی نے کہنے کی مہلت نہیں دی۔ اس کی نبض ... گئی۔ دل کی دھڑکنیں سننے کی کوششیں کی گئیں۔ وہ مر چکا تھا۔ بعد میں ڈاکٹر نے تصدیق کر دی۔ چار شخص آئے اور ایک اسٹریچر پر اس کی لاش ڈال کر لے گئے۔

دھن راج فون پر ملٹری انٹیلی جنس کے چیف سے کہہ رہا تھا۔ "آپ فوراً اپنی گاڑی میں جی این تیواڑی کے پاس جائیں۔ انہیں یہ پیغام دیں کہ ان کے سالے رادھے شیام ایک کار ایکسیڈنٹ میں زخمی ہو گئے ہیں۔ انہیں فوراً ہسپتال بلایا ہے۔ جب تیواڑی صاحب تمہاری گاڑی میں بیٹھ جائیں تو انہیں سیدھے میرے اس دفتر میں لے آنا۔ ذرا جلدی کرو۔"

اب وہاں "را" کے چار افسران رہ گئے تھے۔ وہ اپنے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ڈائریکٹر دھن راج ورما کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ دھن راج نے ریسیور رکھ کر کہا۔ "ہم بڑی ذہانت سے کام کرنے کے باوجود بالکل نزدیک کی بات پر توجہ نہیں دیتے۔ جی این تیواڑی ہمارا پردھان منتری بننے کی چالیں چل رہا ہے۔ ہم یہ بھول گئے کہ وہ اپنی چالوں میں اپنے سالے "را" کے افسر رادھے شیام سے بھی اندر کے بہت سے راز معلوم کر سکتا ہے۔"

ایڈیشنل ڈائریکٹر نے کہا۔ "او گاڈ! ہم نے تو رادھے شیام پر کبھی شبہ بھی نہیں کیا تھا۔ کیا آپ نے اس کی زبان سے کچھ سنا ہے؟"

"ہاں۔" دھن راج نے تمام افسران کو دیکھ کر کہا۔ "وہ مرتے مرتے بڑی مشکل سے اتنا ہی کہہ پایا کہ خان زندہ ہے۔"

"کیا؟" تمام افسران نے بیک وقت حیرانی اور بے یقینی سے پوچھا۔ "یہ کیسے ممکن ہے۔ ہماری تینوں گاڑیاں اور اس میں بیٹھنے والے بموں کے دھماکوں سے مر گئے تھے۔ ان میں صمد خان بھی تھا۔"

"یہ بات غور طلب ہے کہ صمد خان زندہ کیسے ہے جبکہ بال ٹھاکرے یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اپنی بہن کے اغوا کا انتقام لینے کے لئے صمد خان کو حرام موت مار ڈالا ہے۔"

"بہت الجھی ہوئی چال چلی گئی ہے۔ ایجنسی کا باس اس حقیقت سے خوب واقف ہو گا کہ صمد خان زندہ ہے۔ وہ انجان بن کر ابھی مجھے فریب دے رہا تھا۔ بہرحال ہمیں بیس تاریخ کی شام سے پہلے صمد خان کی خفیہ پناہ گاہ تک پہنچنا ہو گا۔ ورنہ وہ میرے بچوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دھن راج نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو! میں ورما بول رہا ہوں۔"

اسے اپنی بیوی کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی' ابھی کسی آدمی نے فون کیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ ہمارے دونوں بچے خیریت سے ہیں لیکن پرسوں شام تک ان کا باپ دھن راج نہیں مرے گا تو دونوں بچے مر جائیں گے۔ جب ان کی لاشیں ہمارے گھر آئیں گی تو ان دونوں کے جسم میں دل' گردے اور آنکھیں نہیں ہوں گی۔"

اس کی بیوی ایسا کہتے وقت روتی جا رہی تھی اور بولتی جا رہی تھی۔ "سوامی! یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ "را" کے ڈائریکٹر ہیں۔ آپ کا مرتبہ پردھان منتری سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ہم اتنے اونچے لوگ ہیں اور ہمارے بچوں کے ساتھ غریب جنتا جیسا سلوک ہو رہا ہے اور آپ اپنے دفتر میں بیٹھ کر کیا کر رہے ہیں؟"

دھن راج نے کہا۔ "چپ ہو جاؤ۔ آنسو پونچھ لو۔ ہم مجرموں تک پہنچنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ یہ اطمینان رکھو کہ ہمارے بچوں پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ فون بند کرو۔ مجھے کام کرنے دو۔" دھن راج نے کریڈل پر ہاتھ رکھ کر پھر نمبر ڈائل کئے۔ رابطہ ہونے پر کہا۔ "میں ورما بول رہا ہوں۔ ابھی کسی نے میری وائف سے فون پر باتیں کی ہیں۔ فوراً معلوم کرو کہ وہ شخص کس فون نمبر سے بول رہا تھا۔ جلدی کرو۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ ایڈیشنل ڈائریکٹر نے کہا۔ "سر! ہمارے ریکارڈ میں صمد خان کی انگلیوں کے نشانات اور اس کی تحریروں کے نمونے ہیں۔ اس لئے اس نے اپنی تحریر میں یہ خط نہیں لکھا ہے اور وہ کسی ایسی جگہ ہے جہاں اسے کوئی ٹائپ رائٹر نہیں مل سکتا ہے۔ وہ فون پر آواز بدل کر آپ سے باتیں کر سکتا تھا لیکن یہ جانتا ہے کہ آپ کے پاس آنے والا فون ٹیپ کیا جاتا ہے۔"

دھن راج نے تائید کی۔ "ان چالاکیوں سے پتا چلتا ہے کہ ایسا زبردست مکار صمد خان ہی ہو سکتا ہے۔"

پھر فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ ریسیور اٹھا کر بولا۔ "ہیلو! میں ورما بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف انٹیلی جنس کے چیف نے کہا۔ "سر! جی این تیواڑی کی لاش چھت کے پنکھے سے لٹک رہی ہے۔ اس نے اپنی دھوتی کا پھندا بنا کر خودکشی کی ہے یا پھر کسی نے

اسے خودکشی پر مجبور کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ بات سمجھ میں آچکی ہے۔ تم یہ کیس پولیس کو دے کر چلے آؤ۔"

پھر وہ ریسیور رکھ کر بولا۔ "تمام آثار بتا رہے ہیں کہ صمد خان زندہ ہے۔ تیواڑی نے اپنی دھوتی کا پھندا بنا کر خودکشی کی ہے۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے صمد خان نے شیوسنا کے اٹل بہاری کو بھی دھوتی کا پھندا بنا کر خودکشی پر مجبور کیا تھا جب وہ کسی مصلحت سے ہتھیار استعمال نہیں کرتا ہے تو ہندوؤں کو ان کی دھوتیاں اتار کر ان سے خودکشی کراتا ہے۔"

ایک افسر نے کہا۔ "را" کے شکنجے میں آکر کوئی بین الاقوامی شہرت رکھنے والا مجرم بھی زندہ سلامت نکل نہیں پایا۔ یہ سوچ کر حیرانی ہوتی ہے کہ خان کیسے نکل بھاگا ہے۔"

دوسرے افسر نے کہا۔ "وہ ہمارے شکنجے سے نکلا ہے۔ بھاگا نہیں ہے۔ وہ یقیناً اسی شہر میں ہے اور یہ دیکھ کر تسلی کرے گا کہ ہمارے سر' ورما صاحب اس کے خط کے مطابق اپنے بچوں کی خاطر جان دیتے ہیں یا نہیں؟"

دھن راج نے ایڈیشنل ڈائریکٹر سے کہا۔ "آپ ابھی شہر میں ناکہ بندی کرائیں۔ صمد خان کی تصویریں تمام پولیس اسٹیشنوں کے علاوہ شہر سے باہر جانے والی سڑکوں کی چوکیوں تک پہنچائی جائیں۔ انہیں حکم دیا جائے کہ جس پر بہروپیا ہونے کا شبہ ہو اسے حراست میں لے کر وینشنگ لوشن کے ذریعے اس کا اصل چہرہ دیکھا جائے۔"

اس نے دوسرے افسر سے کہا۔ "را" فورس کے تمام جوانوں کو شہر سے باہر جانے والے راستوں کی چوکیوں پر چار چار کی ٹولیوں میں پہنچنے کا حکم دو۔ باقی جوان شہر کے ان علاقوں میں بڑی رازداری سے خان کو تلاش کریں' جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔"

فون کی گھنٹی بجی۔ دھن راج نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے کہا گیا۔ "سر! آپ کی کوٹھی کے پاس سے ٹیلی فون کی جو لائن گئی ہے۔ اسی کے کسی کھمبے پر چڑھ کر کسی نے آپ کی وائف کو فون کیا تھا۔ وہاں کے لوگوں نے یہی سمجھا ہو گا کہ کوئی لائن مین تار وغیرہ چیک کر رہا ہے۔"

دھن راج نے جھنجلا کر ریسیور رکھ دیا۔ پھر اس نے دبئی میں ایجنسی کے باس سے رابطہ کیا۔ باس نے کہا۔ "تم نے آدھے گھنٹے بعد فون کرنے کو کہا تھا' اب تو پونے دو گھنٹے

ہو چکے ہیں۔"

"دیر اس لئے ہوئی کہ میں مسلمانوں کے قبرستان گیا تھا۔ صمد خان کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ اس کی قبر پر پھول چڑھانا چاہتا تھا۔ ایک قبر کے کتبے پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ میں پھول چڑھانا چاہتا تھا۔ اچانک قبر کے اندر سے آواز آئی۔ "رک جاؤ۔ میں صمد خان نہیں ہوں۔ یہ کتبہ سچا ہو سکتا ہے۔ فی الحال مردہ جھوٹا ہے۔ آپ کے لئے خوشخبری ہے کہ آپ کا دست راست اور آپ کی جان سے زیادہ عزیز صمد خان زندہ ہے۔"

باس نے کہا۔ "دست راست کے ایک معنی یہ ہیں کہ سیدھا ہاتھ۔ اس سے پہلے تم نے فون کیا تھا۔ فون کے بعد میں نے ریسیور رکھ کر دیکھا تو میرے جسم پر میرا سیدھا ہاتھ موجود ہے۔ پھر سینے پر ہاتھ رکھا تو دل کی دھڑکنوں نے کہا کہ وہ جان سے زیادہ عزیز ابھی زندہ ہے۔ نہ تم اسے موٹربوٹ بلاسٹ کر کے سمندر میں ڈبو سکے اور نہ ہی بال ٹھاکرے ایمبولینس کو بلاسٹ کر کے صمد خان کو ہلاک کر سکا۔ تم قبر کے مردوں سے ہی باتیں کیا کرو کیونکہ پرسوں شام کو تمہیں ان ہی کی نگری میں جانا ہے۔"

"اس بار میں تم سے سمجھوتا کرنے آیا ہوں۔"

"قبرستان جانے والی باتیں کہہ کر تم نے جو طنزیہ انداز اختیار کیا تھا' وہ انداز سمجھوتے کا نہیں ہو سکتا۔"

"مجھے غلط نہ سمجھو۔ جب یہ خوشخبری ملی کہ وہ زندہ ہے تو میں نے زندہ دلی سے بات شروع کی تھی' تم اسے طنزیہ گفتگو نہ سمجھو۔ میں چاہوں گا کہ تمہاری ایجنسی ہر قیمت پر ہمارے لئے کام کرے۔"

"پہلے بھی صمد خان تمہارے لئے کام کرنے آیا تھا۔ تم لوگوں نے بال ٹھاکرے کی بہن کو "را" کے زونل افسر کی بہن بنا کر خان سے اس کی شادی کرا دی۔ بال ٹھاکرے کو صمد خان کا دشمن بنا دیا۔ پھر اِدھر تم نے اُدھر بال ٹھاکرے نے خان کی موت کا ڈراما پلے کیا۔ بڑے کمال کی چالیں چلیں۔ ایسے تماشے دکھانے کے بعد پھر ہم سے سمجھوتہ کرنے کی باتیں کر رہے ہو۔ آئندہ کیا ارادے ہیں؟"

"ہم نے جو کیا' اس کا تقاضا یہی ہے کہ تم ہم پر اعتماد نہ کرو۔ ہم سے الگ رہ کر ہمارے لئے کام کرو۔"

"تمہارے بعد "را" کا جو ڈائریکٹر ہو گا اس سے شاید سمجھوتے کی باتیں ہو سکتی ہیں۔ تمہاری دو دن کی زندگی رہ گئی ہے اس لئے تم سے معاملات طے نہیں ہوں گے۔"

"پلیز' آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ میں اپنی بیوی اور دونوں بچوں کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے ہی تم سے سمجھوتہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"اگر صمد خان کا دل' گردے اور آنکھیں نکال لی جاتیں تو اسی دن قصہ ختم ہو جاتا۔ مقدر کو منظور نہیں تھا اس لئے یہ قصہ پرسوں بیس تاریخ کو ختم ہو گا۔"

باس نے ریسیور رکھ کر فون کا سلسلہ ختم کر دیا۔ دھن راج نے بھی ریسیور رکھ کر اپنے ماتحت افسروں سے کہا۔ "وہ لوگ کسی شرط پر بھی سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ ابھی ہمارے پاس دو دن اور پندرہ گھنٹے ہیں۔ یہ ہم سب کے لئے آزمائش کا وقت ہے۔ کسی طرح بھی میرے دونوں بچوں کو ڈھونڈ نکالو۔ پھر میں صمد خان کو.........."

بات ادھوری رہ گئی۔ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ اس کے گھر سے ایک ملازم کہہ رہا تھا۔ "مالک! آپ جلدی سے گھر آ جائیں۔ مالکن بے ہوش ہو گئی ہیں۔"

اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ "کیسے بے ہوش ہو گئی ہیں۔ کیا ڈاکٹر کو بلایا ہے؟"

"جی ہاں۔ باہر جو بندوق والے پہرہ دے رہے ہیں ان کا افسر ڈاکٹر بابو کو بلانے گیا ہے۔"

"یہ تو بتاؤ' وہ اچانک بے ہوش کیسے ہو گئیں؟"

"ہم نہیں جانتے مالک! وہ پھون پر کسی سے باتیں کر رہی تھیں۔ پھر ان کے ہاتھ سے پھون چھوٹ گیا اور وہ بستر پر گر کر بے ہوش ہو گئیں۔"

"میں ابھی آ رہا ہوں۔"

اس نے ریسیور رکھ کر اپنے ماتحتوں سے کہا۔ "اسی بدمعاش کا فون آیا ہو گا۔ پتا نہیں اس نے وائف سے کیا کہا ہے۔ وہ بے ہوش پڑی ہیں۔ میں جا رہا ہوں شام کو پانچ بجے آپ سب میرے گھر آ جائیں۔ مجھے امید ہے' اس وقت تک ہمارے لوگ کسی حد تک کامیابی حاصل کر لیں گے۔ میں جاتے جاتے کہہ دوں کہ صمد خان پر قابو پانے کا ایک

ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ میرے دونوں بچے کہیں سے مل جائیں اور کسی طرح خیریت سے گھر پہنچ جائیں۔"

وہ دفتر سے نکل آیا۔ ان افسران کی گاڑیاں عمارت کے بیسمنٹ میں پارک کی جاتی تھیں جہاں کوئی غیر ضروری آدمی نہیں جا سکتا تھا۔ پھر وہاں مسلح گارڈز کا پہرا رہتا تھا۔ وہ اپنی کار میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس کی پچھلی سیٹ پر دو مسلح باڈی گارڈز بیٹھ گئے پھر وہ وہاں سے چل پڑے۔ وہ بیسمنٹ سے نکل کر مین روڈ پر آئے۔ اس کے دماغ میں کئی طرح کے خیالات گردش کر رہے تھے۔ ایک شرمناک خیال آ رہا تھا کہ اس کی جوان سہاگن بننے والی بیٹی کی عزت شاید خاک میں ملائی گئی ہو گی۔ یہ بات فون پر سن کر ایک ماں کا سر چکرا گیا ہو گا اور وہ بے ہوش ہو گئی ہو گی۔

وہ ایسا اس لئے سوچ رہا تھا کہ اس نے بھی ٹارچر سیل میں اپنی ہی ہندو ذات کی عورت کامنا کے پاس زونل افسر کو بھیجا تھا اور اس کی عزت کی دھجیاں اڑائی تھیں۔ پھر خان کے ہوش میں آنے کے بعد اسے اور زیادہ مشتعل کرنے اور پاگل بنانے کے لئے چار ہٹے کٹے پہلوانوں کو بھیجا تھا تاکہ خان اپنی آنکھوں سے اپنی بیوی کی عزت لٹنے کا تماشا دیکھتا رہے۔

پھر اس کی ایک گائیڈ لائن کے مطابق ایک سیّد گھرانے کی لڑکی کو ایسی جگہ بھیجا گیا تھا' جہاں سے نکلنے کے بعد وہ بیرونی ملکوں میں جا کر ایک مہذب، سیاسی طوائف بن جاتی۔ دوسروں کی بہن بیٹیوں کے ساتھ ایسے کھیل میں بڑا مزہ آتا ہے۔ سیاسی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں لیکن اپنی جوان بیٹی دل اور دماغ کے اندر چیخیں مار رہی تھی۔ اپنی عزت اور غیرت اس کے اندر لرزہ طاری کر رہی تھی۔ وہ یقین کے ساتھ سوچ رہا تھا کہ خان کی آنکھوں کے سامنے وہ ایسا شرمناک کھیل شروع کرنا چاہتا تھا لیکن خان نے اس سے پہلے ہی اپنی بیوی کو عزت کی موت مار ڈالا تھا۔ اب اسی خان کے پاس ڈائریکٹر "را" کی جوان بیٹی تھی۔ اب وہ انتقاماً اس کی جوانی کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہو گا؟

دنیا کے ہر مذہب میں اچھی باتیں اور ہدایتیں ہوتی ہیں۔ سمجھنے اور عمل کرنے والوں کے صرف نظریات اور عقائد میں فرق ہوتا ہے۔ مقدس بھگوت گیتا کے ایک اشلوک میں لکھا ہے کہ عمل کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ بھگوان کو فاعل سمجھو۔ تم جو کام کر رہے ہو وہ

دراصل بھگوان کا ہاتھ کر رہا ہے۔

تم بھگوان کی آنکھ ہو جس سے دیکھ رہے ہو۔ تم اس کے کان ہو جس سے سن رہے ہو۔ کام جو بھی کر رہے ہو وہ تم نہیں فطرت کے تقاضے کر رہے ہیں۔ اس لئے اپنے آپ کو خدا کی یا بھگوان کی رضا پر چھوڑ دو۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو غلطیوں پر غلطیاں کرتے جاؤ گے اور اگر خدا کی رضا پر راضی رہو گے تو تمام گمراہیوں سے ایسے بچتے رہو گے جیسے کنول کا پتا پانی میں رہ کر بھی خشک رہتا ہے۔

رہے بے تعلق کرے جب عمل' خدا ہی کی خاطر کرے سب عمل
خطا سے ہمیشہ رہے گا بری' کنول کے نہ پتے پہ ٹھہرے تری

ڈائریکٹر دھن راج ورما کی بیوی روز صبح اٹھ کر گیتا کا پاٹھ کرتی تھی اور وہ اپنے بستر پر لیٹا کبھی سنتا تھا اور کبھی اپنے خیالوں میں کھویا رہتا تھا۔ اب اسے سنا ہوا گیتا کا یہ شلوک یاد آ رہا تھا۔ انسان کو خدا اور رسول سے ہدایات ملیں یا کوئی عام انسان اچھی ہدایت کرے تب بھی وہ اس وقت تک ان ہدایات کو سمجھ نہیں پاتا جب تک پانی سر سے نہیں گزر جاتا۔

موبائل فون سے اشارہ موصول ہوا۔ اس نے پاس والی سیٹ پر رکھے ہوئے فون کو اٹھایا' پھر کہا۔ "ہیلو' میں ورما بول رہا ہوں۔"

"میں بھی بول رہا ہوں لیکن تم مجھے نہیں جانتے' کیونکہ میں نامعلوم ہوں۔"

وہ ناگواری سے بولا۔ "یہ کیا بکواس ہے' کون ہو تم؟"

"میں تمہیں پرسوں شام تک زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔ اس لئے میری بات کو بکواس نہ سمجھنا۔ تمہاری کار میں ٹائم بم لگا ہوا ہے۔ ٹھیک بیس منٹ کے بعد کار کا دیوالہ اور ہماری دیوالی ہو جائے گی۔"

دھن راج نے یکبارگی کار کو بریک لگایا۔ پھر دروازہ کھولتے ہوئے چیخ کر دونوں گارڈز سے بولا۔ "بھاگو یہاں سے' ہماری گاڑی میں بم ہے۔"

وہ کھٹاکھٹ دروازے کھولتے ہوئے اس کار سے دور بھاگتے اور چیختے چلے گئے۔ "بھاگو' اس گاڑی سے دور رہو۔ یہاں بم پھٹنے والا ہے۔ وہ بھری پری شاہراہ تھی۔ ان کی وارننگ سن کر بھگدڑ مچ گئی۔ مرد' عورتیں بچے اور بوڑھے سب ایک دوسرے سے

ٹکراتے ہوئے ... ئے اور کسی نہ کسی کو کچلتے ہوئے دور بھاگ رہے تھے۔ سب ہی ... تھی۔ دکانوں میں لاکھوں' کروڑوں کا سامان تھا مگر اپنی جان ... بھی نہیں تھا کہ دکانوں کو مقفل کیا جاتا۔

اور اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ اس کار میں ٹائم بم ر... فون پر کہا گیا تھا کہ دھن راج کو پرسوں شام تک زندہ رکھا جائے۔ رکھے ہوئے ٹائم بم سے ہلاک نہیں ہونا چاہئے۔ یہ پرسوں شام کا حوالہ ایسا ... راج نے دشمن کو سمجھ لیا تھا کہ وہ ابھی اسے نہیں صرف اس کی قیمتی کار کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔

وہ بہت دور جانے کے بعد کھڑے ہو گئے۔ بیس منٹ گزر چکے تھے اور ابھی تک دھماکہ نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے دیکھا کوئی شخص کار کے پچھلے دروازوں کو بند کر کے آگے اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ پھر اسے اسٹارٹ کر کے تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا جا رہا تھا۔ دھن راج اتنی بدحواسی سے بھاگا تھا کہ کار کی چابی نکالنے کا بھی خیال نہیں رہا تھا۔ بھاگتے وقت اس کے ہاتھ میں صرف موبائل فون رہ گیا تھا۔ اب وہ شدید غصے سے اور اپنی توہین ہونے کے احساس سے دیکھ رہا تھا کہ کوئی اس کی گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا لے جا رہا ہے۔ اس نے فوراً ہی فون کے ذریعے اس علاقے کے تھانے کے انچارج سے کہا۔ "میں ورما بول رہا ہوں۔ فوراً پولیس موبائل لے کر نکلو۔ ایک شخص میری کار لے کر فرار ہو گیا ہے۔ اسے روکو' اور مختلف راستوں کی پیٹرولنگ پولیس کو بھی یہ اطلاع دیتے رہو۔"

پھر اس نے بار بار رابطے کر کے اپنے چند خاص ماتحتوں کو بھی ہدایات دیں۔ اس کے حکم پر ایک باڈی گارڈ نے ایک ٹیکسی کو روکا۔ دھن راج اگلی سیٹ پر اور دونوں باڈی گارڈز پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ جب وہ ٹیکسی تیز رفتاری سے جانے لگی تو دور کہیں زوردار دھماکا سنائی دیا۔ دھن راج نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ چند بلڈنگوں کے پیچھے سے اٹھنے والا دھواں آسمان کی بلندیوں تک اٹھتا اور پھیلتا نظر آ رہا تھا۔

اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ "جدھر یہ بلاسٹنگ ہوئی ہے' ادھر چلو۔"

وہ جگہ زیادہ دور نہیں تھی۔ اس راستے پر دور ایک کار سے شعلے بھڑک رہے تھے۔

اس کار کے کئی حصے ٹوٹ کر بلندی پر فضا میں بکھر کر زمین پر آگرے۔ تھے۔ وہ اور اس کے باڈی گارڈز اپنی کار کو پہچان گئے۔ دھن راج غصے میں بھرا ہوا تھا۔ ڈانٹ کر ڈرائیور سے بولا۔ "کھڑے کیا ہو' واپس چلو۔"

ڈرائیور خوددار تھا۔ کسی کی بے جا ڈانٹ پھٹکار برداشت نہیں کرتا تھا لیکن پیچھے گن مین بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے بڑی خاموشی سے ٹیکسی دوسرے راستے پر موڑلی۔ موبائل فون پر اشارہ موصول ہوا۔ اس نے بٹن دبا کر کہا۔ "ہیلو' میں ورما بول رہا ہوں۔"

وہ ایک دم سے بھڑک کر اسے گندی گندی گالیاں دینے لگا۔ وہ جیسے پاگل ہو رہا تھا۔ ایسے وقت کوئی اسے تھپک کر تسلیاں دے کر سمجھاتا کہ گالیاں نہ دے۔ تب بھی وہ اپنی زبان نہ روکتا لیکن اچانک ہی اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ اس کی زبان رک گئی۔ کیونکہ جوان بیٹے کی آواز سنائی دی تھی' وہ کہہ رہا تھا۔ "ڈیڈی یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ میں آپ کا بیٹا کرن راج ورما ہوں اور آپ مجھے میری ماں اور میری بہن کی گالیاں دے رہے ہیں۔ یعنی کہ اپنی دھرم پتنی اور اپنی سہاگن بننے والی بیٹی کے لئے ایسے ایسے گندے شبد نکال رہے ہیں؟"

وہ بے یقینی سے بولا۔ "تت .... تم میرے بیٹے کرن ہو؟ لیکن ابھی تو کوئی خود کو نامعلوم کہہ رہا تھا۔"

"جی ہاں' وہ نامعلوم صاحب میرے پاس موجود ہیں۔ انہوں نے ریسیور مجھے دے دیا ہے۔ اس طرح تو ساری گالیاں مجھے اور ماں بہن کے حصے میں آئی ہیں۔"

"میری بیٹی ہیم لتا کہاں ہے؟"

چند لمحوں کے بعد پھر وہ نامعلوم آواز سنائی دی' وہ کہہ رہا تھا۔ "بڑے بے غیرت ہو۔ اپنے ہی بیٹے کو ماں بہن کی گالیاں دے رہے تھے۔"

"میں .... میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں کہ تم صمد خان ہو اور آواز بدل کر بول رہے ہو۔"

"نہیں دھن راج! مردے کبھی نہیں بولتے۔ جس کا نام لے رہے ہو' وہ تو مرچکا ہے۔ میں تو نامعلوم ہوں۔ یہ جو دہشت گرد ہوتے ہیں نا' جو کبھی پکڑے نہیں جاتے۔ کبھی معلومات کے خانے میں نہیں آتے۔ قانون کی کھلی آنکھوں کے سامنے بھی پہچانے نہیں

جاتے۔ یہ سرکاری اور غیر سرکاری ایجنسی کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔ ان سب کے کام معلوم ہوتے ہیں' نام نامعلوم ہوتے ہیں۔"

"تم کوئی بھی ہو۔ صرف میرے بچوں کی رہائی کی بات کرو۔"

"بات تو ہو چکی ہے۔ پرسوں شام تک تم ضرورت مند مریضوں کے کام آؤ گے۔ بہت ساری نیکیاں کماؤ گے۔ اس کے بعد تمہارے دونوں بچے خیریت سے گھر پہنچ جائیں گے۔"

وہ جواباً کچھ چاہتا تھا۔ دوسری طرف سے چونک کر کہا گیا۔ "ارے یہ تم کون سی ٹیکسی میں بیٹھ گئے ہو۔ اس میں بھی ایک بم رکھا ہوا ہے۔ تمہیں زندہ رہنا ہے۔ چھوڑ دو وہ ٹیکسی..........."

"یو شٹ اپ۔ تم بار بار بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ میری کار میں کوئی بم نہیں تھا۔ تم نے دہشت زدہ کر کے کار خالی کرائی۔ پھر تمہارا کوئی آدمی اس کار کو لے گیا۔ اس نے کار کو تباہ کیا تھا۔"

"لیکن ٹیکسی میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ابھی بم پھٹنے والا ہے۔ اسے روکو اور اتر کر بھاگو۔"

دھن راج نے فون بند کر کے گاڑی کے باہر تھوکتے ہوئے کہا۔ "سؤر کا بچہ' مجھے اُلو بناتا ہے۔ کیا اس ٹیکسی میں اس کے باپ نے بم رکھا ہے؟"

ٹیکسی ڈرائیور نے گھبرا کر پوچھا۔ "صاحب! آپ کیا میری ٹیکسی کی بات کر رہے ہیں' کیا اس میں بم..........."

وہ ڈانٹ کر بولا۔ "یو شٹ اپ' خاموشی سے گاڑی چلاؤ۔ میں دیکھ لوں گا اسے' ابھی دو دن باقی ہیں۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی ایک دھماکہ سا ہوا۔ ڈرائیور کے ہاتھوں سے اسٹیئرنگ بہکنے لگا۔ شاہراہ پر ٹیکسی اِدھر اُدھر جانے اور قابو سے باہر ہونے لگی۔ اگرچہ بم نہیں پھٹا تھا لیکن دھماکے کی آواز سنتے ہی دھن راج اور اس کے محافظ اپنی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر چھلانگ لگا چکے تھے اور شاہراہ پر دور تک لڑھکتے چلے گئے تھے۔ ان کے حواسوں پر بم کا دھماکہ سمایا ہوا تھا۔ جبکہ صرف ایک فائر کے باعث ٹیکسی کا ایک پہیہ زوردار آواز

سے برسٹ ہو گیا تھا اور وہ ٹیکسی ذرا دور جا کر بجلی کے ایک کھمبے سے ٹکرا کر رک گئی تھی۔

اس جگہ پر بھگدڑ ہونے لگی تھی۔ کچھ لوگ آکر دھن راج اور اس کے محافظوں کو سہارا دے کر سڑک سے اٹھا رہے تھے۔ وہ حواس باختہ سا تھا۔ اپنے دل کو یقین دلا رہا تھا کہ وہ بم دھماکے میں ہلاک نہیں ہوا ہے۔ ابھی زندہ ہے اور یہ کوئی خواب بھی نہیں ہے۔

ذرا دور سڑک پر موبائل فون پڑا ہوا تھا۔ ایک محافظ اسے اٹھا کر لے آیا تھا۔ کچھ پولیس والے بھی آگئے تھے اور دھن راج کو پہچان کر سلیوٹ کر رہے تھے۔ موبائل سے اشارہ موصول ہوا۔ اس نے بٹن دبا کر کہا۔ "میں ورما بول رہا ہوں۔"

پھر اس نامعلوم کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "بال بال بچ گئے۔ آئندہ میری کسی بات کو مذاق نہ سمجھنا۔ ویسے اب تم کسی بھی ٹیکسی میں جا سکتے ہو۔"

وہ ایک دم سے پھٹ پڑا۔ گالیاں دے دے کر کہنے لگا۔ "میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تمہیں تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔"

دوسری طرف سے بیٹی ہیم لتا کی آواز سنائی دی۔ "آپ مجھے گالیاں دے رہے ہیں۔ مجھے رہائی دلانے کے بجائے تڑپا تڑپا کے مارنے کی بات کر رہے ہیں۔ میں تو یہ سمجھ رہی ہوں کہ آپ اولاد کی محبت میں ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں۔ ابھی کرن کہہ رہا تھا کہ آپ اسے گندی گالیاں دے رہے تھے۔ پلیز ڈیڈی! اپنے آپ کو سنبھالیں۔ جلدی سے گھر جائیں۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ ممی بے ہوش ہو گئی تھیں۔ اب ہوش میں آگئی ہیں۔ آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ پلیز جلدی جائیں۔"

وہ غصے میں آکر گالیاں دینے کے بعد بیٹی کی آواز سن کر جھینپ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "لتا! ڈیڈی کی جان، تم خیریت سے تو ہو نا؟ کسی نے تمہیں ہاتھ تو نہیں لگایا ہے؟ بیٹی ہمت سے کام لو۔ میں تمہیں اور کرن کو ضرور رہائی دلاؤں گا۔"

"آپ ہماری فکر نہ کریں۔ مجھے اور کرن کو رہائی کا شوق نہیں ہے۔ سنا تھا دہشت گرد اغوا کرتے ہیں۔ عزتیں لوٹتے ہیں اور بڑی بے دردی سے قتل کر دیتے ہیں لیکن یہاں تو الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ یہ صاحب جو خود کو نامعلوم کہہ رہے ہیں، یہ مجھے بیٹی کہتے ہیں اور آپ نے کسی بیٹی یا بہن کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اسے سن کر آپ کو ڈیڈی کہتے

ہوئے شرم آتی ہے۔ پلیز، آپ ممی کے پاس جائیں۔"

پھر اسی نامعلوم کی آواز سنائی دی۔ "سن لیا دھن راج! اب گھر جاؤ یا کچھ اور سنو گے؟"

فون بند ہو گیا۔ وہ سر جھکا کر بیٹی کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ باپ کو بہت چاہتی تھی۔ مگر اب ڈیڈی کہتے ہوئے شرم محسوس کر رہی تھی۔ وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر پہنچا۔ بیڈ روم میں اس کی پتنی بستر پر تکئے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔ "شانتی! کیسی ہو؟ کیا ہو گیا تھا تمہیں؟"

اس نے جواب نہیں دیا۔ اپنے پتی کو گھور کر دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ "کیا بات ہے؟ اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟"

وہ بولی۔ "آپ "را" کے سب سے بڑے افسر ہیں۔ مجرموں کو بڑی بے دردی سے سزائیں دیتے ہیں۔ عورتیں مجرم ہوں تو انہیں صرف جسمانی موت نہیں مارتے ان کی عزتوں کی بھی دھجیاں اڑا دیتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ یہی سوچا کہ آپ اپنی ڈیوٹی پوری کرتے ہیں۔ مجرم مرد ہوں یا عورت ان سے بدترین سلوک کیا جانا چاہئے اور سزائے موت دینا چاہئے لیکن کامنا کاٹکر نے کیا جرم کیا تھا؟"

"تم کہاں کی باتیں لے بیٹھی ہو۔ یہ سرکاری اور سیاسی معاملات ہیں۔"

"یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ کامنا کا سرکار سے اور سیاست سے کیا تعلق تھا؟"

"تم پچیس برس سے میرے ساتھ ہو۔ اچھی خاصی تعلیم یافتہ ہو اور جانتی ہو کہ راج نیتی کے معاملات میں کامنا جیسے مہرے استعمال ہوتے ہی رہتے ہیں۔"

"ہاں، ایسے معاملات ایک عرصے سے سمجھتی آ رہی ہوں لیکن راج نیتی کی بازی الٹنے سے ہماری جوان بیٹی مہرہ بن گئی ہے تو میرے اندر کی ممتا چیخ رہی ہے۔ میں نے پہلے کبھی نہیں سوچا کہ جو کامنا جیسی بے قصور عورتوں کے ساتھ ہوتا ہے وہ ہماری اولاد کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"تم درست کہتی ہو۔ مگر ایک بات ہمارے حق میں ہے۔ وہ جو خود کو نامعلوم کہہ رہا ہے، وہ پٹھان ہے۔ بڑا ہی غیرت مند ہے۔ اس نے ہماری ہیم لتا کو بیٹی کہا اور جب ایسا کہہ چکا ہے تو سمجھ لو کہ وہ اپنی جان دے دے گا مگر ہماری بیٹی پر آنچ نہیں آنے دے گا۔ یہ

پٹھان بڑے خردماغ ہوتے ہیں۔ مگر تم ذرا دماغ سے سوچو کہ ہم بازی ہار کر بھی جیت رہے ہیں۔ وہ ہماری بیٹی اور بیٹے کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔"

"آپ کیسے فاتحانہ انداز میں کہہ رہے ہیں۔ ایسا کہتے وقت شرمندگی کا کوئی پہلو آپ کی نظروں میں نہیں ہے؟ کیا آپ کو اپنے سلوک اور اس پٹھان کے حسن سلوک کا فرق سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔ شرم و حیا اور حسن سلوک جیسی چیزیں اخلاقی سماجی معاشرے میں ہوتی ہیں۔ سیاست میں نہیں ہوتیں' اگر ہمارے دیس میں تخریب کاری اور دہشت گردی ہو تو ایسی ایجنسیاں غیر قانونی اور مجرمانہ محرکات کی حامل سمجھی جاتی ہیں۔ اگر ہماری "را" تنظیم پڑوسی اور دیگر ممالک میں دہشت گردی اور تخریب کاری کرے تو یہ شرم کا نہیں بلکہ سیاسی فتح مندی کا عمل ہوتا ہے۔"

اس کی پتنی شانتی نے کہا۔ "طاقت کے غرور سے دہرا عمل ہوتا ہے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ جو عمل ہمارے دیس میں مجرمانہ ہے' آپ کا وہی عمل پڑوسی ملک میں عاقلانہ ہے۔"

وہ بستر پر پالتھی مار کر بیٹھ گئی۔ پھر دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر بولی۔ "مقدس بھگوت گیتا کے ادیائے چھ اور اشلوک پانچ میں شری کرشن نے فرمایا ہے۔

مناسب نہیں خود کو انساں گرائے
وہ خود کو ابھارے وہ خود کو اٹھائے
کہ انساں خود اپنا ہی غم خوار ہے
وہ اپنا ہی بدخواہ و غدار ہے

ادھیائے تین اشلوک تیرہ۔

نکوکار کھائیں جو یگ کا بچا
گناہ سے کرتے ہیں خود کو رہا
جو پاپی خود اپنی ہی خاطر پکائیں
تو اپنے ہی پاپوں کا بھوجن وہ کھائیں

آپ کی "را" تنظیم پڑوسی ملک میں جو پاپ پکا رہی ہے اس پاپ کا پکوان ہم اپنے

دیس میں کھا رہے ہیں۔ بلکہ اپنے گھر میں کھا رہے ہیں۔ آپ دوسرے ملک میں کتنے جوانوں کو ماریں گے یا اغوا کریں گے۔ یہاں تو ہمارے گھر کے جوان بچے اغوا ہو چکے ہیں۔"

"شانتی! میں تم سے کہہ چکا ہوں' ہمارے بچوں کو کچھ نہیں ہو گا۔ میں انہیں لے آؤں گا۔"

"آپ کبھی نہیں لا سکیں گے۔ آپ کی تمام تدبیریں' تمام چالاکیاں ناکام رہیں گی۔ جہاں ایسی کوششیں ناکام رہتی ہیں وہاں نیکی اور شرافت کام آتی ہے۔ میری آتما کہتی ہے کہ شری کرشن بھگوان نے اس پٹھان جیسے لوگوں کے لئے فرمایا ہے۔

ادھیائے تین اشلوک اکیس۔

کوئی نامور شخص کرتا ہے کام
تو کرتے ہیں تقلید اس کی عوام
بڑا آدمی جو بنائے اصول
وہی ساری دنیا کرے گی قبول

دھن راج ورما نے بیزار ہو کر کہا۔ "مشکل یہ ہے کہ تم بھگوت گیتا کی زبان سے بولتی ہو اور میں سرکاری زبان سے بولتا ہوں۔ یہ دھرم اور کرشن بھگوان کی باتیں گھر کی چار دیواری تک ٹھیک ہیں۔ مگر آج کے دور میں سیاسی چالبازیوں کے بغیر ایک ملک دوسرے ملک سے برتر نہیں ہوتا۔ بھارت ایشیا کی بہت بڑی طاقت بننے والا ہے۔ اسے بڑی طاقت بنانے کے لئے میں نے بھگوت گیتا کے اشلوک نہیں پڑھے۔ سیاسی ہتھکنڈے پڑھے ہیں۔ ان پر عمل کیا ہے' اس لئے ڈائریکٹر "را" کے اعلیٰ عہدے پر ہوں۔"

"میں اپنے پتی ڈائریکٹر "را" سے پوچھتی ہوں' پرسوں شام تک اعلیٰ عہدے کے دل' گردوں اور آنکھوں کا کیا بنے گا؟"

"تم پرسوں کی بات کر رہی ہو' میں کل تک ان نامعلوم مجرموں کو گرفتار کر لوں گا۔"

"آپ مجھے وقت بتا دیں۔ کل کب تک میرے بچے یہاں آ جائیں گے۔ اگر اس وقت تک وہ نہیں آئیں گے تو میں امراض قلب کے ہسپتال میں پہنچ کر اپنی جان پر کھیل

جاؤں گی۔ اس وقت میرے پرس میں وصیت نامہ لکھا ہوا ہو گا کہ میرے جسم کے جتنے حصے جتنے ضرورت مند مریضوں کو دان کئے جاسکتے ہیں' کر دیئے جائیں۔"

"کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے' تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گی۔"

"میں ضرور کروں گی۔ اگر کل شام تک ایسا نہ کر سکی تو پرسوں شام کو میرا سہاگ لُٹ جائے گا۔ اگر آپ بچوں کی خاطر جان دیں گے تو میں آپ کے بغیر زندہ نہیں رہوں گی۔ اس لئے آپ سے پہلے اغوا کرنے والوں کی شرط پوری کر دوں گی تو میرے بچے آپ کے ساتھ سلامت رہیں گے۔ ان کے سروں پر آپ کا سایہ رہے گا۔"

وہ پاؤں پٹخ کر ٹہلنے لگا' پھر بولا۔ "تم میری اور بچوں کی خاطر بلیدان دینا چاہتی ہو .... مگر وہ قبول نہیں کرے گا۔ وہ میرے جسم کے حصے طلب کر رہا ہے۔"

"میں فون پر اس سے یہ وعدہ لے چکی ہوں کہ اگر اپنے پتی کے بدلے میں اپنے جسم کے حصے دان کروں تو کیا وہ آپ کو معاف کر دے گا؟ اور اس نے آپ کو معاف کرنے کا وعدہ ایک شرط پر کیا ہے۔"

اس نے فوراً ہی پلٹ کر پوچھا۔ "کیسی شرط؟ وہ کیا چاہتا ہے؟"

"وہ چاہتا ہے۔ مسلمانوں کو ان کی تہذیب اور ثقافت کے مطابق زندگی گزارنے دی جائے۔"

"وہ تو گزار رہے ہیں۔ ہم نے مسلمانوں کو ان کے رسم و رواج پر عمل کرنے سے کب روکا ہے؟"

"مسلمان اپنے گھر کی لڑکیوں کو رقاصہ نہیں بناتے ہیں۔ ہم ہندوؤں کی تہذیب میں رقص سیکھنا جائز ہے ہم بھارتی عورتوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ کم سے کم لباس پہن کر فلموں میں کام کریں اور مقابلہ حسن میں شریک ہوں لیکن بھارت سرکار اس کی اجازت دیتی ہے اور آپ کی "را" تنظیم اسے میڈیا کی جنگ کے لئے جائز سمجھتی ہے۔ اس لئے آج کی حسینہ ایشوریا رائے بھی سفارتی سطح پر باہر کے ملکوں کا دورہ کرنے والی ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ کام کی بات کرو۔"

"کام کی اور انصاف کی بات یہ ہے کہ مسلمان لڑکیوں کو رقص اور بے حیائی کی تربیت نہ دی جائے اور نہ انہیں میڈیا کی جنگ میں استعمال کیا جائے۔"

"تم سے کس نے کہہ دیا ہے کہ ہم مسلمان لڑکیوں کو ایسے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں اگر اس نامعلوم شخص نے تم سے کہا ہے تو بکواس کر رہا ہے۔"

"کیا یہ بکواس ہے کہ رضیہ بانو عرف راضی ایسی غیر معمولی حسین لڑکی ہے' جس کے آئندہ عالمی حسینہ بننے کے چانس ہیں۔ اگر وہ کامیاب نہ بھی ہو سکی تو اسے باہر ملکوں میں سیکرٹ ایجنٹ کے طور پر استعمال کیا جائے گا؟"

دھن راج پر چند لمحوں کے لئے سکتہ سا طاری ہو گیا۔ پھر دماغ میں یہ بات آ گئی کہ مخالف ایجنسی کا وہ نامعلوم شخص سید ثناء الرحمان کے گھرانے تک پہنچا ہوا ہے۔ تب ہی وہ راضی کے بارے میں یہ سب کچھ جانتا ہے۔ وہ فوراً ہی ٹیلی فون کے پاس آیا۔ پھر ایڈیشنل ڈائریکٹر سے رابطہ کر کے بولا۔ "ہم مجرم کے قریب پہنچنے والے ہیں۔ تمہیں بڑی رازداری سے کام لینا ہو گا۔ پہلے چپ چاپ یہ معلوم کرو کہ کیا سید ثناء الرحمان کے گھر میں کوئی مہمان یا رشتے دار آ کر رہنے لگا ہے۔ یا کوئی نیا ملازم وہاں رکھا گیا ہے۔ ان کی تمام ٹیلی فون کالیں ٹیپ کی جائیں۔ شہر کے جتنے بھی ڈرگ اسٹورز میں ان کی دوائیں سپلائی کی جاتی ہیں۔ ان کے تمام سپلائی کرنے والے نئے پرانے افراد کے متعلق معلومات حاصل کی جائیں۔"

اس نے ہدایات دے کر ریسیور رکھ دیا۔ شانتی نے پوچھا۔ "کیا آپ راضی کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے ہیں؟"

"ہاں' مجھے یقین کی حد تک شبہ ہے کہ وہ نامعلوم بہروپیا راضی کے گھر میں یا دواؤں کے گودام میں وغیرہ میں کہیں چھپا ہوا ہے یا پھر ہمارے بچوں کو وہاں چھپا رکھا ہے۔"

"آپ ایک سیدھی سی بات کو کیوں الجھا رہے ہیں؟"

"اس میں سیدھی سی بات کیا ہے؟"

"یہی کہ راضی ایک سید گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ آپ اسے اس کے گھر واپس پہنچا دیں۔"

"تم یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ راضی اور اس کا پورا گھرانا ہندوستانی ہے۔ وہ لوگ یہاں کی زمین پر رہتے ہیں' یہاں کا اناج کھاتے اور یہاں کے کپڑے پہنتے ہیں۔ حکومت نے انہیں لاکھوں' کروڑوں کا کاروبار کرنے کے لئے امپورٹ لائسنس دیا ہے۔ جب ہمارا

دیس' ہماری حکومت انہیں ہر طرح کی خوش حالی دیتی ہے۔ تو کیا وہ اتنے دیس بھگت نہیں ہو سکتے کہ اپنے بھارت دیس کے لئے جان و مال سے کام آئیں۔"

"جان و مال سے کام ضرور آنا چاہئے لیکن عزت و آبرو کا سودا نہیں کرنا چاہئے۔ اگر فلموں میں ہندوستانی عورت آدھی سے زیادہ ننگی دکھائی دیتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمارے دیس کی عورتیں بے شرم ہیں۔ ہندوستانی عورت شرم و حیا کی دیوی ہے۔ اگر کسی دیوی کو فلموں میں ننگا کیا جاتا ہے یا میڈیا کی جنگ میں اسے عالمی منڈی میں بھیجا جاتا ہے تو اس سے ہو سکتا ہے کہ سیاسی برتری حاصل ہو جائے لیکن شرم و حیا کی دنیا میں ہم اپنی عورتوں کے دلال ہیں۔ ایسے دلال جنہوں نے اپنے دیس سے باہر نگری نگری چکلے کھول رکھے ہیں۔"

"بکواس مت کرو۔ جو منہ میں آتا ہے' کہتی چلی جاتی ہو۔ تمہیں صرف اتنا یاد رکھنا چاہئے کہ میں ایک سرکاری افسر ہوں اور راج نیتی کے جو تقاضے ہوتے ہیں' انہیں پورا کرتا ہوں۔"

"ہماری بیٹی ہیم لتا بھی خوبصورتی میں کسی سے کم نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے' وہ راضی سے زیادہ حسین نہ ہو اور عالمی حسینہ نہ بن سکے لیکن دشمنوں کو پھانسنے کے لئے دیس کے باہر سیکرٹ ایجنٹ بن کر جا سکتی ہے۔ کیا آپ اپنی بیٹی کے ذریعے راج نیتی کے تقاضے پورے کریں گے؟"

"اس نے گھور کر بیوی کو دیکھا۔ پھر گرج کر اپنے ایک ماتحت کو آواز دی۔ وہ دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے کہا۔ "یہاں کے تمام ٹیلی فون تار کاٹ دو۔ باہر سے کسی کا فون نہیں آنا چاہئے۔ سکیورٹی افسر سے کہو' ہماری ویگن کار نکالے' ابھی باہر جانا ہے۔"

ماتحت دوڑتا ہوا واپس چلا گیا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دھن راج نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو' میں ورما بول رہا ہوں۔"

"اور میں ہوں نامعلوم' میں نے سوچا ذرا دیر سے فون کروں۔ تاکہ تم میاں بیوی کھل کر گفتگو کر سکو اور کسی اچھے نتیجے پر پہنچ سکو۔"

"میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس گھر کے ٹیلی فون کے تار کاٹ دیئے جائیں تاکہ تم میری دھرم پتنی کو بہکا نہ سکو۔ یہ تمہاری حمایت میں بولنے لگی ہے۔"

"وہ محترمہ میری حمایت میں نہیں' سچائی اور شرافت کی حمایت میں بول رہی ہوں گی اور تمہیں آگ لگ رہی ہو گی۔ اب ایسا کرو گھر سے اس وقت تک نہ نکلو جب تک اپنے وکیل کو بلا کر اپنے جسمانی اعضاء کو دان کرنے کی وصیت نہ لکھ لو۔ میرے اس مشورے پر عمل کرنے سے پہلے باہر نکلو گے تو پرسوں شام تک تمہارے زندہ رہنے کی شرط ختم ہو جائے گی۔ تم یہاں آتے وقت دیکھ چکے ہو کہ باہر دو بار مرتے مرتے بچ گئے۔ اب نکل کر دیکھو تمہاری لاش ہسپتال پہنچائی جائے گی' اب فون کے تار کاٹ سکتے ہو۔"

دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ اس نے ریسیور رکھ کر کچھ سوچا پھر ماتحت کو آواز دی۔ وہ پھر دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے کہا۔ "فون کے تار نہ کاٹو اور سکیورٹی افسر سے کہو ابھی گاڑی نہ نکالے۔"

ماتحت چلا گیا۔ اس نے اپنی بیوی شانتی کو دیکھا۔ وہ بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "آپ نے تار کاٹنے کا ارادہ کیوں بدل دیا؟"

اس نے جواب نہیں دیا۔ ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ رابطہ ہونے پر اس نے حسب عادت کہا۔ "ہیلو' میں ورما بول رہا ہوں۔"

پھر اس نے دوسری طرف کی باتیں سن کر کہا۔ "ہیلو ایڈووکیٹ شرما جی! آپ سے ایک ضروری کام ہے۔ میں ایک وصیت ابھی لکھنا چاہتا ہوں۔ جی' جی ہاں۔ اسی کے بارے میں لکھوں گا کہ اچانک کسی وجہ سے میری موت واقع ہو جائے تو میرا دل' گردے اور آنکھیں ضرورت مند مریضوں کو دان کر دی جائیں۔"

شانتی نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ شرما جی سے کہیں کہ ایک نہیں دو کورٹ پیپر لے کر آئیں۔ میں بھی وصیت لکھوں گی' ذرا ٹھہریں' مجھے بات کرنے دیں۔"

اس کے قریب آنے تک دھن راج نے ریسیور رکھ دیا' پھر کہا۔ "بے کار باتیں نہ کرو۔ جاؤ بستر پر آرام کرو۔ اگر باتیں کرنے کی ضد کرو گی تو ٹیلی فون اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔"

"اچانک ایسی کیا بات ہو گئی ہے کہ آپ باہر جانے کا ارادہ چھوڑ کر ابھی وصیت لکھنا چاہتے ہیں؟"

"میں اس نامعلوم بہروپیے کو خوش کر رہا ہوں بلکہ خوش فہمی میں مبتلا کر رہا ہوں۔"

اس نے میز پر رکھے ہوئے موبائل فون کو اٹھایا۔ پھر شانتی کو یوں دیکھا جیسے کسی نادان عورت کو دیکھ رہا ہو۔ پھر وہ تیزی سے چلتا ہوا دوسرے کمرے میں گیا اور اس کے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ شانتی بھی تیزی سے چلتی ہوئی دروازے پر آئی پھر دروازے پر دستک دے کر بولی۔ "آپ نے اسے اندر سے کیوں بند کیا ہے' اسے کھولیں۔"

اندر سے آواز آئی۔ "مجھے ڈسٹرب نہ کرو۔ میں اس وقت سرکاری ڈیوٹی ادا کر رہا ہوں۔ جاؤ یہاں سے..........."

وہ اپنے شوہر کے مزاج کو سمجھتی تھی اس لئے خاموش رہی۔ دروازہ کھلوانے کی ضد نہیں کی۔ دروازے سے کان لگا کر سننے لگی۔ بہت ہی دھیمی دھیمی سی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ یقیناً دروازے سے دور تھا اس لئے باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ وہ تھوڑی دیر تک سننے کی ناکام کوششیں کرتی رہی۔ پھر مایوس ہو کر وہاں سے اپنے بستر پر آ گئی۔

☆======☆======☆

راضی بارہ برس اور دس ماہ کی ہو چکی تھی۔ یعنی دو ماہ بعد تیرہ برس کی ہونے والی تھی۔ اس عمر میں بھارت ناٹیم' کتھا کلی اور منی پوری رقص کے علاوہ ماڈرن آرکسٹرا پر بھی ڈانس سیکھ رہی تھی اور دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ مارکس حاصل کرتی رہی تھی۔ تعلیم اور ذہنی صلاحیتوں کے مظاہرے میں بھی اول رہتی تھی۔ جاسوسی میں ابھی ابتدائی طور پر قیافہ شناسی سکھائی جا رہی تھی۔ اسے سمجھایا جا رہا تھا کہ جب کوئی بولتا ہے تو توجہ سے اس کی آواز کے استحکام کو یا لرزش کو' اس کے لہجے کی پختگی کو' یا جھجک کو' باتوں کے دوران وہ آنکھیں ملاتا ہے' یا جھکاتا ہے یا نظریں چراتا ہے۔ آنکھوں میں مکاری کی جھلک ہے یا نادانی ہے' یا حیرانی ہے یا پھر معصومیت ہے؟ ان تمام ذرائع اظہار کو بڑی توجہ سے سمجھنے کی کوششیں کی جائیں اور وہ ایسی کوششیں کرتی رہتی تھی اور سیکھتی رہتی تھی۔

قد اور جسامت سے پتا چلتا تھا کہ اگلے تین چار برسوں میں قیامت جگائے گی۔ دن رات رقص کرنے کے باعث بدن میں ایسی لوچ اور لچک تھی کہ نظریں بے بہت اختیار اسی کو دیکھتی رہتی تھیں۔ اسے بتایا گیا تھا کہ ملٹری انٹیلی جنس کا ایک افسر اس سے بہت اہم گفتگو کرنے آ رہا ہے۔ اس نے پوچھا۔ "میں کیسے یقین کروں گی کہ وہ انٹیلی جنس کا افسر ہے۔ کیونکہ شناختی کارڈز وغیرہ جعلی بھی ہو سکتے ہیں۔"

اس کے ٹیچر نے کہا۔ "اس افسر کے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن کے نیچے ایک سیاہ تل ہے۔ تم اس سے مصافحہ کرنے کے دوران اس تل کو دیکھ سکتی ہو۔"

ایک کمرے میں اس سے ملاقات ہوئی۔ وہ اس سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ "میں کیپٹن سارنگا ہوں۔ تم سے مل کر بڑی خوشی ہو رہی ہے۔"

راضی نے مصافحے کے دوران اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اسے سکھایا گیا تھا کہ ایسے وقت مرد کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں سے تھام لو تو وہ خوش فہمی

میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس سے ملنے والی اس کی شخصیت سے متاثر ہو رہی ہے اور ایسے ہی وقت اپنی ایک انگلی سے مصافحہ والے ہاتھ کو ہولے سے سہلا دیا جائے تو وہ اپنے لئے معشوقانہ اشارہ سمجھتا ہے۔ راضی نے بھی اس سے مصافحہ کرتے وقت یہی کیا۔ پھر اس کا ہاتھ چھوڑ کر ایک ذرا پیچھے ہٹ کر اچانک فضا میں چھلانگ لگائی۔ پھر اس کے سینے پر ایک فلائنگ کک ماری۔ وہ لڑکھڑا کر ذرا پیچھے چلا گیا۔

ایک شخص فوجی وردی میں ملبوس تالیاں بجاتا ہوا کمرے میں آیا پھر بولا۔ "شاباش راضی! تم نے سمجھ لیا کہ تمہارے ساتھ فراڈ ہو رہا ہے۔ اب میرا دایاں انگوٹھا دیکھو۔"

راضی نے پہلے شخص کے ساتھ مصافحہ کرتے وقت اپنے انگوٹھے سے اس سیاہ تل کو سہلایا تھا تب تل کی سیاہی ذرا پھیل گئی تھی۔ اس نے دوسرے شخص کے تل کو بھی آزمایا۔ وہ فراڈ نہیں تھا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ "یس کیپٹن سارنگا! آپ سے مل کر خوشی ہو رہی ہے۔"

وہ فلائنگ کک کھانے والا مسکرا کر اس کمرے سے چلا گیا۔ راضی کیپٹن سارنگا کے ساتھ ایک میز کے اطراف ایک کرسی پر بیٹھ گئی پھر بولی۔ "ڈائریکٹر "را" نے مجھے فون پر کہا تھا کہ آپ میری صلاحیتوں کو آزمانے کے لئے ایک اہم ڈیوٹی مجھے سونپنا چاہتے ہیں۔ یہ میرے لئے ایک اعزاز ہے کہ ٹریننگ کے دوران ہی مجھے کسی ڈیوٹی کے قابل سمجھا گیا ہے۔"

وہ بولا۔ "تم اس سینٹر میں سب سے نمایاں مقام حاصل کرتی جا رہی ہو۔ لہٰذا یہ طے کیا گیا ہے کہ کبھی کبھی تم سے عملی طور پر بھی کوئی ذمے داری کا کام لیا جائے۔"

"میں حاضر ہوں۔ فرمائیے، مجھے کیا کرنا ہے۔"

"میں جو ڈیوٹی تمہیں دینے آیا ہوں۔ وہ تمہارے لئے ایک چیلنج بھی ہے۔"

"یہ اور اچھی بات ہے۔ یہ میری بچپن کی عادت ہے، کوئی بھی چیلنج کرے تو پھر میں ضرور منہ توڑ جواب دیتی ہوں۔"

"تو پھر سنو۔ تمہیں جاسوسی کی ابتدا اپنے گھر سے شروع کرنی ہو گی۔ فرض کرو کہ تمہارے دادا ایک مجرم ثابت ہوتے ہیں تو پھر تم کیا کرو گی؟"

"میں پہلے ایک ہندوستانی لڑکی ہوں۔ دیس بھگتی میرا پہلا فرض ہے۔ میں اپنے دادا

کو بہت چاہتی ہوں۔ اگر وہ مجرم ثابت ہوں گے تو میں پہلے تو انہیں گرفتار کراؤں گی۔ پھر آپ کے ادارے سے اپنے دادا کے لئے کچھ رعایت حاصل کرنے کی کوشش کروں گی۔"

"اور یہ ہمارا وعدہ ہے کہ تمہارے دادا کو ضرور رعایت ملے گی۔ اگر وہ مجرم ثابت ہوں گے تو ان سے کبھی کوئی گستاخی نہیں کی جائے گی۔"

"آخر بات کیا ہے؟ کیا واقعی دادا کسی جرم میں ملوث ہیں؟"

"ہمیں معلوم ہوتا تو ہم تمہارے پاس نہ آتے۔ تمہارے گھر میں کیا ہو رہا ہے؟ اور جو ہو رہا ہے اس کی خبر تمہارے دادا کو ہے یا نہیں؟ یہ معلوم کرنا ہے۔ دراصل ایک مجرم ہے جو اپوزیشن کے لئے کام کرتا ہے۔ اس کا نام صمد خان تھا یا ہے یعنی وہ زندہ بھی ہے یا نہیں، اس بات کی صحیح طرح تصدیق نہیں ہو سکی ہے۔ جو شخص "را" کے لئے چیلنج بنا ہوا ہے۔ ہم اسے صمد خان سمجھتے ہوئے بھی اسے ایک نامعلوم شخص کہتے ہیں۔"

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ "تم ابھی نئی ہو۔ پہلی بار عملی میدان میں قدم رکھنے والی ہو۔ اس لئے میں "نامعلوم" کی وضاحت کر دوں۔ ایک سیاسی چال یہ بھی ہے کہ ہم اپنی سرکاری ایجنسیوں سے دہشت گردی کراتے ہیں اور انہیں جانتے ہوئے بھی نامعلوم کہتے ہیں۔ دوسرے پہلو سے یہ سمجھو کہ ہماری کسی دشمن ایجنسی میں کوئی بہت ہی خطرناک مجرم ہے اور دشمن ایجنسی نے یہ مشہور کر دیا ہے کہ وہ خطرناک مجرم مر چکا ہے۔ تو ہماری سیاست یہ ہونی چاہئے کہ ہم بھی اسے مردہ تسلیم کر لیں اور اسے نامعلوم دہشت گرد سمجھتے رہیں۔"

راضی نے پوچھا۔ "اسے جان بوجھ کر نامعلوم سمجھنے سے فائدہ کیا ہو گا؟"

"یہ ہو گا کہ وہ ہمارے ہاتھوں مارا جائے گا تو دشمن ملک کی ایجنسی یہ دعویٰ نہیں کر سکے گی کہ ہم نے مثلاً صمد خان کو مارا ہے۔ ہم اسے کیسے مار سکتے ہیں جبکہ خود اس کی ایجنسی اسے مردہ تسلیم کر چکی تھی۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ ہم نے ایک نامعلوم دہشت گرد کو جہنم میں پہنچایا ہے۔"

"میں سمجھ گئی۔ اگر کبھی صمد خان سے سامنا ہو گا تو میں انجان بنی رہوں گی۔ اسے جانتے ہوئے بھی نامعلوم کہتی رہوں گی۔ کسی معاملے میں بیان دینا پڑے گا تو عدالت میں بھی اسے نامعلوم کہوں گی۔"

کیپٹن سارنگا نے ایک فائل اس کے سامنے رکھ دی۔ اس میں صمد خان کی کئی تصویریں کئی زاویوں سے تھیں۔ اس کے بارے میں اہم تفصیلات لکھی ہوئی تھیں، کیپٹن نے کہا۔ "اسے آج رات اچھی طرح پڑھ لو اور اس کے چہرے کو ذہن نشین کر لو۔ ہمیں شبہ ہے کہ یہ تمہارا کوئی رشتے دار بن کر تمہارے گھر میں ہے یا ایک ملازم بن کر وہاں رہتا ہے۔ اگر گھر میں نہیں ہے تو دواؤں کے گودام میں یا دوائیں سپلائی کرنے والے اسٹاف میں موجود ہے۔"

"آج رات اس فائل کی اسٹڈی کرنے کے بعد کیا مجھے سینٹر سے گھر جانا ہو گا؟"

"ہاں، تم ہر سال گیارہ ماہ کے بعد اپنے دادا کے پاس جاتی ہو۔ کل اچانک وہاں پہنچ جاؤ۔ اپنے دادا کو یہ تاثر دو کہ تم اس سینٹر سے بیزار ہو گئی ہو اور آئندہ دادا کے ساتھ رہنے کے لئے آئی ہو۔ جہاں تک ہو سکے اس سینٹر کے خلاف بولو۔ کیونکہ وہ نامعلوم شخص تمہارے یہاں رہنے پر اعتراض کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ تمہیں ایک گھریلو زندگی گزارنے کے لئے سینٹر سے نکال دیا جائے اور گھر کی چاردیواری میں رہنے دیا جائے۔"

"وہ نامعلوم شخص میری زندگی کے بارے میں فیصلہ کرنے والا کون ہوتا ہے؟ اسے مجھ سے کیا دلچسپی ہے؟ میرے گھر میں صرف میرے بڑے ابو عطاء الرحمان اس سینٹر پر اعتراض کرتے ہیں۔ کیا وہ اس نامعلوم شخص کے ذریعے مجھے اس سینٹر سے نکالنا چاہتے ہیں؟"

"تم درست سوچ رہی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے بڑے ابو مسٹر عطا خود معصوم بن کر رہتے ہوں اور ایک نامعلوم دہشت گرد کے ذریعے ہم پر دباؤ ڈال کر تمہیں گھر لے جانا چاہتے ہوں۔"

"ٹھیک ہے اگر بڑے ابو ایسی چال چل رہے ہیں تو میں بھی ان کی ہم خیال بن کر ان سے اصلیت اگلوا لوں گی۔"

وہ دونوں بڑی دیر تک پلاننگ کرتے رہے پھر کیپٹن سارنگا وہاں سے چلا گیا۔

☆======☆======☆

صمد خان کے چہرے پر پلاسٹک سرجری کی گئی تھی۔ عطاء الرحمان کی مختلف تصاویر کو سامنے رکھ کر ویسا ہی چہرہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن جس طرح فلموں میں یا جاسوسی

ناولوں میں جاسوس کو کسی کا بالکل ہم شکل بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ صمد خان ویسا ہی ہم شکل نہیں بن پایا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ قصہ کہانیوں کی باتیں ہوتی ہیں یا پھر بھارت میں ماہر سرجری میک اپ مین نہیں تھا۔ پھر بھی صمد خان کی صورت ایسی ہو گئی تھی کہ وہ عطا سے مماثلت رکھتا تھا۔ دور سے عطاء الرحمان لگتا تھا۔ قریب ہونے پر نامعلوم سا فرق محسوس ہوتا تھا۔ ابھی تک کسی قریبی رشتے دار نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ کوٹھی میں کوئی ملزم نہیں تھا۔ ایک مالی صبح یا شام کو آ کر باغبانی کرتا تھا۔ ایک بوڑھی ملازمہ کھانا پکانے کے لئے آتی تھی۔ پھر اپنا کام ختم کر کے چلی جاتی تھی۔ وہ کبھی کبھی چور نظروں سے اسے دیکھتی تھی۔ چونکہ بوڑھی کی نظر کمزور تھی۔ اس لئے کوئی فرق محسوس نہیں کرتی تھی لیکن اس کے چلنے پھرنے اور باتیں کرنے کے انداز سے ایسا لگتا تھا جیسے چھوٹے مالک کچھ بدل سے گئے ہیں۔

اس بوڑھی ملازمہ سے پہچان لئے جانے کی توقع نہیں تھی۔ راضی کے متعلق یہ معلوم تھا کہ وہ دو ماہ بعد گرمیوں کی چھٹی میں آئے گی۔ چھٹیوں سے پہلے وہ کبھی نہیں آتی تھی اور فون کے ذریعے اپنی آمد کی اطلاع ضرور دیتی تھی۔ اس بار وہ اچانک آ گئی۔ ملازمہ نے اطلاع دی تھی کہ سینٹر کی گاڑی گیٹ کے سامنے آئی ہے۔ صمد خان اوپری منزل میں سید ثناء الرحمان سے باتیں کر رہا تھا۔ یہ سنتے ہی دونوں نے اٹھ کر کھڑکی سے دیکھا۔ راضی اپنا ایک بیگ لے کر گاڑی سے اتر رہی تھی۔ صمد خان نے اس کی تصویریں دیکھی تھیں۔ پھر عطاء الرحمان نے بھی کہا۔ "یہ تو ہماری راضی ہے۔ یہ اچانک آج کیسے آ گئی؟"

صمد خان نے کہا۔ "میں جا رہا ہوں۔ بعد میں آ جاؤں گا۔ وہ بڑے ابو کو پوچھے تو آپ کہہ دیں کہ میں ابھی ضروری کام سے گیا ہوں۔ دوپہر یا شام تک آ جاؤں گا۔ آپ اسے ریسیو کرنے کے لئے نیچے جائیں۔"

وہ دونوں کمرے سے نکلے۔ سید ثناء الرحمان زینے سے اتر کر نیچے جانے لگے۔ صمد خان پچھلے زینے کی طرف جانے کے لئے آگے بڑھا۔ پھر رک گیا۔ دبے قدموں چل کر واپس ثناء الرحمان کے کمرے میں آیا۔ پھر قالین پر لیٹ کر لڑھکتا ہوا پلنگ کے نیچے چلا گیا۔

دھیمی دھیمی سی سریلی آواز آ رہی تھی اور وہ آواز قریب آ رہی تھی۔ راضی اپنے دادا سے کہہ رہی تھی اور ہنستی جا رہی تھی۔ "آپ تو میری بیماری کی بات سنتے ہی پریشان

ہو گئے۔ واقعی آپ مجھے بہت زیادہ چاہتے ہیں۔ بائی دی وے سچ یہ ہے کہ میں بالکل تندرست ہوں۔ میں نے بیماری کا بہانہ کر کے ٹریننگ سینٹر سے چھٹی لی ہے۔ اب یہاں آپ کے ساتھ پندرہ بیس دن گزاروں گی۔"

وہ دونوں کمرے میں آ گئے۔ دادا نے کہا۔ "میری بچی! میں بیان نہیں کر سکتا کہ تمہارے اچانک آ جانے سے مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ میری گڑیا نے میرے پاس آنے کے لئے بیماری کا بہانہ کیا۔ ایسا تو دل سے چاہنے والی بیٹیاں کرتی ہیں۔"

وہ کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی۔ "ابھی بڑے ابو آپ کے ساتھ تھے۔ کہاں چلے گئے؟"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ میرے ساتھ تھے؟"

"میں نے باہر ہی ملازمہ سے پوچھ لیا تھا۔ مجھے ان کی بہت یاد آتی رہتی تھی۔"

دادا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بھئی کیا بات ہے؟ تم تو بڑے ابو سے بیزار رہا کرتی تھیں۔ کیونکہ وہ عطا تمہارے ٹریننگ سینٹر جانے اور ہاسٹل میں رہنے پر اعتراض کرتا رہتا ہے۔"

"ہاں دادا جان! بزرگوں کی نصیحتیں بہت دیر سے سمجھ میں آتی ہیں۔ اب میں محسوس کرتی ہوں کہ مجھے زیادہ سے زیادہ اپنے گھر میں اور اپنے اسلامی ماحول میں رہنا چاہئے۔ کیا بڑے ابو اپنے کمرے میں ہیں؟"

دادا نے پوتی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میری راضی گڑیا بالکل بدل گئی ہے۔ اب تمہاری زبان سے باپ دادا کا خون بول رہا ہے۔"

صمد خان پلنگ کے نیچے لیٹا تمام باتیں سن رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ وہ ٹریننگ سینٹر سے اچانک کیوں آئی ہے اور اچانک اس کے خیالات کیسے بدل گئے ہیں؟"

وہ کہہ رہی تھی۔ "ہاں اپنا خون تو بولتا ہی ہے لیکن جب میں نے سنا کہ ایک مسلمان دہشت گرد نے ٹریننگ سینٹر والوں کو دھمکی دی ہے اور کہا ہے کہ مجھے ہاسٹل سے نکال کر گھر پہنچا دیا جائے۔ تب میرے خون میں بھی اسلامی جوش اور جذبہ پیدا ہوا۔ میں نے سوچا جب ایک مجرم سچا مسلمان ہو سکتا ہے تو پھر میں کیوں نہیں ہو سکتی؟ کیوں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا دادا جان؟"

"ہاں میری بچی! تم درست کہہ رہی ہو۔ ایک مجرمانہ زندگی گزارنے والے نے ہم شریفوں کے گھروں کی عزت رکھنے کا وعدہ کیا ہے اور اپنے وعدے کو نباہ رہا ہے۔ تمہارے ٹریننگ سینٹر والے بہت جلد مجبور ہو کر تمہیں ہمیشہ کے لئے ہاسٹل سے نکال کر یہاں بھیج دیں گے۔"

وہ گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔ "میرے اچھے دادا جان! مجھے اس فرشتے سے ملایئے' جسے یہ بھارتی حکومت دہشت گرد کہتی ہے لیکن وہ ہمارے سیّد گھرانے کی عزت رکھنے والا ہے۔"

"میں اپنی گڑیا کو ضرور اس سے ملاؤں گا۔ وہ واقعی فرشتہ ہے۔ اس کے عمل سے تم بھی متاثر ہو کر اپنے مذہب کو اور ہم سب کو پہچان گئی ہو کہ تمہاری اصل پہچان اسی شریف گھرانے سے ہو گی۔"

"دادا جان! میں نے سوچا ہے کہ آپ کے پاس بہت دولت ہے۔ ہم بھی اس مجرم کو بہت ساری دولت دے کر اسے شریفانہ زندگی گزارنے پر مجبور کریں گے۔ بلکہ اسے اپنے خاندان کا ایک فرد بنا لیں گے۔"

"شاباش بیٹی شاباش! تم نے کتنی دانائی کی بات کی ہے۔ جب وہ تمہیں ایک گندے ماحول سے واپس اپنے پاکیزہ ماحول میں لا سکتا ہے تو ہم بھی اسے شریفانہ ماحول میں لانے کی پوری کوشش کریں گے۔"

"مگر وہ کہاں ہے؟ میں اس سے ابھی ملنا چاہتی ہوں۔"

"ابھی تو اس سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ جب تم اتنے دانش مندانہ انداز میں سوچ رہی ہو اور اپنے گھر آ کر عملی طور پر شریفانہ ماحول کو اپنا رہی ہو تو تم سے ہم کچھ نہیں چھپائیں گے۔ دراصل اس نے تمہارے بڑے ابو کو کہیں چھپا دیا ہے اور میرا بیٹا عطا بن کر اسی کوٹھی میں رہتا ہے۔ ابھی وہ تمہیں دیکھ کر اسی لئے چلا گیا کہ کہیں بھید نہ کھل جائے۔"

"مگر دادا جان وہ عطاء الرحمان بن کر یہاں کیسے رہتا ہے؟ کیا کھانا پکانے والی ملازمہ' باغ کا مالی اور گیٹ کا دربان یہ راز جانتے ہیں؟"

"بالکل نہیں جانتے بیٹی! وہ بڑے کمال کا آدمی ہے۔ وہ پلاسٹک سرجری کے ذریعے

بالکل میرے بیٹے عطا کا ہم شکل بن گیا ہے۔ تم بھی اسے دیکھو گی تو اسے بڑے ابو سمجھو گی۔"

"پھر تو واقعی کمال کا فرشتہ ہے۔ اس سے ملنے کے لئے میرا اشتیاق بڑھتا جا رہا ہے۔ ارے ہاں ابھی ہاسٹل سے نکلنے کے بعد راستے میں یاد آیا کہ میں اپنے ضروری سامان کا دوسرا بیگ بھول آئی ہوں۔ ابھی فون کر کے اپنی فرانسیسی میڈم سے بولتی ہوں۔ وہ بیگ کسی کے ذریعے بھیج دے گی۔"

راضی نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے۔ بے چارے داد کو اپنی پوتی پر اتنا اعتماد ہو گیا تھا کہ اس نے ڈائل کئے جانے والے نمبر نہیں دیکھے۔ پھر رابطہ قائم ہونے پر فرانسیسی زبان بولنے لگی تو دادا نے یہی سمجھا کہ وہ جس ملک کی میڈم ہے' پوتی اسی ملک کی زبان میں اس سے بول رہی ہے۔

وہ کیپٹن سارنگا سے بول رہی تھی۔ "میں ہوں راضی' وہ مجرم میرے بڑے ابو کا ہم شکل بنا ہوا ہے۔ میرے ددا کہہ رہے ہیں کہ وہ دوپہر یا شام کو کوٹھی میں آئے گا لیکن وہ مجھے اچانک یہاں آتے دیکھ کر کسی مصلحت کی بنا پر چلا گیا ہے۔ آپ معلوم کریں ہو سکتا ہے وہ دواؤں کے گودام میں چھپنے گیا ہو۔ ہماری اس کوٹھی کا محاصرہ اس طرح کریں کہ یہاں کسی کو شبہ نہ ہو' ہو سکتا ہے میرے بڑے ابو یہاں واپس آئیں۔ محاصرہ کرنے والے افسران کو میرے بڑے ابو کی تصویریں دکھا دیں۔ تاکہ وہ دھوکا نہ کھائیں اور انہیں دیکھتے ہی گرفتار کر لیں۔"

کیپٹن سارنگا نے کہا۔ "راضی! تم ایک سچی دیس بھگت ہو۔ تم نے اپنی ذہانت سے اتنا بڑا کام کیا ہے کہ ابھی تک "را" تنظیم والے بھی نہیں کر سکے تھے۔ تم وہاں اپنا رول ادا کرتی رہو۔ ہم اپنا کام کر گزریں گے۔"

وہ ریسیور رکھ کر اپنے دادا کو دیکھ کر مسکراتی ہوئی بولی۔ "میڈم سے فرانسیسی بولنے میں مزہ آتا ہے۔ میرا بیگ شام تک پہنچ جائے گا۔ اچھا میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ چینج کر کے آؤں گی۔ پھر آپ کے ساتھ باہر چلوں گی۔"

"تم جہاں کہو گی' میں وہاں تمہارے ساتھ دن رات رہوں گا۔"

"سب سے پہلے تو میں گودام وغیرہ کی طرف جاؤں گی۔ جب تک اس فرشتے سے

نہیں ملوں گی مجھے چین نہیں آئے گا۔"

وہ اپنا بیگ اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ پلنگ کے نیچے لیٹے ہوئے صمد خان کو وہ بیگ اور ددا پوتی کے پیر نظر آ رہے تھے۔ راضی کے جانے کے بعد بڑے میاں تنہا رہ گئے۔ اب ان کے سامنے جانا سراسر حماقت ہوتی۔ وہ اپنی پوتی سے اتنی محبت کرتے تھے کہ اس کی باتوں میں آ کر اپنے ایک محسن کو بے نقاب کر چکے تھے۔ صمد خان فرانسیسی زبان نہیں جانتا تھا۔ چونکہ مجرمانہ ذہن بھی رکھتا تھا۔ اس لئے سمجھ گیا تھا کہ پوتی اپنے ددا کو بے وقوف بنا کر جاسوسی کے فرائض انجام دے رہی ہے۔

وہ جلد ہی لباس بدل کر آ گئی۔ کیونکہ اسے مجرم تک پہنچنے کی جلدی تھی۔ دادا نے پوتی کے نئے لباس کی تعریف کی پھر اس کے ساتھ کمرے سے باہر گیا۔ اس کے بعد دروازے کو بند کر کے مقفل کر دیا۔ صمد خان لڑھکتا ہوا پلنگ کے نیچے سے نکل آیا۔ اس نے دروازے سے کان لگا کر سنا۔ دادا اور پوتی کے زینے سے اترنے کی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ وہ اندر قید ہو چکا تھا اور اسے قید ہی رہنا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ راضی کے پیچھے جاسوس آئے ہوں گے اور انہوں نے کوٹھی کا محاصرہ کیا ہو گا۔

وہ ٹیلی فون کے پاس آیا پھر ریسیور اٹھا کر عطاء الرحمان کے موبائل فون کے نمبر ڈائل کئے۔ رابطہ ہونے پر دھیمی آواز میں بولا۔ "میں بول رہا ہوں۔ توجہ سے میری بات سنو۔ ابھی پولیس والے گودام میں چھاپا ماریں گے۔ تم اپنی گرفتاری پیش کرو اور یہی ظاہر کرو کہ تم صمد خان ہو اور ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنے والد کے کمرے سے نکل کر گودام میں اس لئے چھپنے آئے تھے کیونکہ تم نے راضی کو کوٹھی میں آتے دیکھا تھا۔ اگر تمہیں کسی بات کا خوف ہے تو صاف بیان کرو۔"

عطا نے کہا۔ "خدا کی قسم' صرف خدا سے ڈرتا ہوں۔ میں صمد خان بن کر آخر وقت تک تمہیں موقع دوں گا کہ تم راضی کو ہمارے خاندان میں واپس لے آؤ۔"

"میں تمہاری قدر کرتا ہوں اور تمہاری یہ شریفانہ خواہش ضرور پوری کروں گا اور تم پر بھی آنچ نہیں آنے دوں گا۔"

صمد خان نے فون بند کر دیا۔ چند لمحوں تک کچھ سوچا پھر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اگرچہ اس کے پاس اپنا ایک موبائل فون تھا لیکن وہ مصلحتاً ابھی اسے استعمال

نہیں کر رہا تھا۔

☆======☆======☆

ڈائریکٹر رادھن راج ورما نے اپنے وکیل کی موجودگی میں یہ وصیت لکھ دی کہ اس کی موت کے بعد اس کے جسمانی اعضاء ضرورت مند مریضوں کو دان کر دیئے جائیں۔

ایسی وصیت لکھ کر دستخط کرنے کے بعد اس نے اپنے وکیل سے کہا۔ ''شرماجی! میں نے اس خوش فہمی میں رہنے والے دشمن کے کہنے پر یہ لکھ دیا ہے۔ ویسے موت مجھے نہیں اسے آئے گی۔''

اس کی بیوی شانتی نے کہا۔ ''آپ میرے کہنے پر مجھے بھی ایسی وصیت لکھنے دیں۔ جب آپ کو یقین ہے کہ دشمن کو مرنا ہے تو کیا آپ میری یہ خواہش پوری نہیں کریں گے؟''

وہ بولا۔ ''شرماجی! آپ کی بھابی تو میرے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ کئی گھنٹوں سے ناک میں دم کر دیا ہے۔ پلیز ان کی تسلی کے لئے بھی وصیت تیار کر دیں۔''

وکیل نے یہی کیا۔ ایک اور وصیت تیار ہو گئی۔ اس پر ان تینوں کے دستخط ہو گئے۔ پھر وہ وصیت نامے لے کر جانے لگا شانتی نے کہا۔ ''ٹھہریئے' آپ ابھی امراض قلب کے بڑے سرجن سے رابطہ کریں اور ان دونوں وصیتوں کے سلسلے میں بتائیں کہ یہ آپ کے پاس محفوظ ہیں۔ لہٰذا کبھی ہماری لاش وہاں پہنچے تو وقت ضائع کئے بغیر ان وصیتوں پر عمل کیا جائے۔''

وکیل شرما نے فون پر رابطہ کر کے یہی کہا۔ پھر وہاں سے چلا گیا۔ دھن راج نے کہا۔ ''تم بڑی ضدی ہو۔ آخر تم نے اپنی بات منوالی۔''

''اپنی اولاد کی سلامتی کے لئے میں نے ضد منوائی ہے۔ اگر ہم ان کے ساتھ زندہ رہ سکیں تو اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو گی اور اگر قربانی دینا پڑے تو دل کو اطمینان رہے گا کہ ہمارے بعد ہمارے بچے اپنے طور پر ایک خوش حال زندگی گزاریں گے۔ ہماری موت انہیں سکھائے گی کہ انسان کو دشمنی سے نہیں دوستی سے جینا چاہئے۔ وہ آپ کی غلطیوں کو نہیں دہرائیں گے۔''

''تم ہمیشہ یہی کہتی رہو گی۔ جبکہ میری ڈیوٹی یہی ہے۔''

''میں زندگی میں پہلی بار یہ سمجھ رہی ہوں کہ میرے پتی دیو غلطیاں کرنے والی ڈیوٹی انجام دیتے چلے آ رہے ہیں۔''

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ ریسیور اٹھا کر بولا۔ ''ہیلو' میں ورما بول رہا ہوں۔''

دوسری طرف سے کیپٹن سارنگا نے کہا۔ ''سر! بہت بڑی خوشخبری ہے۔ ہم نے دواؤں کے گودام سے صمد خان کو گرفتار کر لیا ہے۔''

دھن راج خوشی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا پھر بولا۔ ''کیا واقعی! دیکھو صمد خان کو پہچاننے میں غلطی نہ کرنا۔''

''سر! راضی نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اپنے دادا سے یہ اگلوا لیا ہے کہ صمد خان پلاسٹک سرجری کے ذریعے عطاء الرحمان کا ہم شکل بن کر کوٹھی میں رہتا ہے۔ جب راضی کوٹھی میں پہنچی تو وہ خطرہ محسوس کر کے گودام میں چھپنے آ گیا۔ راضی کے داد ثناء الرحمان کا بھی بیان ہے کہ جسے ہم نے گرفتار کیا ہے' وہ ان کا بیٹا عطا نہیں' بلکہ بہروپیا صمد خان ہے۔ دادا اپنی پوتی پر برہم ہے کہ اس نے جاسوسی کر کے صمد خان جیسے محسن کو گرفتار کرا دیا ہے۔''

دھن راج نے خوش ہو کر کہا۔ ''جب راضی کا دادا بھی گواہ ہے تو پھر وہ صمد خان ہی ہے۔ اس کے باوجود اسے ٹارچر سیل میں پہنچانے کے بعد کم از کم دو پلاسٹک سرجری کے ماہرین کو بلاؤ اور ان سے بھی تصدیق کراؤ کہ صمد خان نے سرجری کے ذریعے چہرہ تبدیل کیا ہے۔ میں تھوڑی دیر بعد وہاں پہنچوں گا۔''

اس نے ریسیور رکھ کر اپنی پتنی سے کہا۔ ''دیکھا تم نے' کس طرح وہ پھر ہمارے شکنجے میں آیا ہے؟''

''یہ آپ دیکھیں اور سمجھیں۔ میں صرف اپنے بچوں کی زندگی چاہتی ہوں' وہ کہاں ہیں؟''

''وہ ابھی آ جائیں گے۔ میں معاملات طے کرتا ہوں۔''

اس نے دبئی ایجنسی کے باس سے رابطہ کیا۔ پھر کہا۔ ''شاید آپ تک یہ خبر پہنچ چکی ہو گی کہ ہم نے صمد خان کو گرفتار کر لیا ہے۔''

باس نے کہا۔ ''میرے پاس ایسی کوئی خبر نہیں پہنچی ہے کہ کسی مردے کو گرفتار کیا گیا

ہے۔"

"اچھا تو آپ اس صمد خان کو مردہ کہہ رہے ہیں' جو آپ کا دست راست بھی ہے اور آپ کے لئے جان سے زیادہ عزیز بھی ہے۔"

"اگر کبھی جان سے زیادہ عزیز اس دنیا سے اٹھ جائے تب بھی اپنی سانسیں چلنے تک زندہ رہنا پڑتا ہے۔ میں خاموشی سے اس کی ابدی جدائی کا دکھ اٹھا رہا ہوں۔ تم نے پہلے کہا کہ بال ٹھاکرے نے اسے سمندر میں ڈبو دیا ہے۔ میں نے یقین کر لیا۔ پھر بال ٹھاکرے نے اپنی اور تمہاری گفتگو کا کیسٹ بھیجا۔ میں نے اس پر بھی یقین کر لیا کہ میرا صمد خان سمندر میں ڈوب کر نہیں بلکہ ایک ایمبولینس میں مارا گیا ہے۔ اب اگر کوئی اور صمد خان تم نے پکڑ لیا ہے تو اسے بھی مار ڈالو۔ میں تو خاموشی سے تماشا دیکھ رہا ہوں کہ تم سب آئندہ بھی کتنے صمد خان پیدا کرنے اور پھر اسے مارنے والے ہو۔"

دھن راج نے کہا۔ "دیکھئے آپ نے پچھلی بار تسلیم کیا تھا کہ صمد خان زندہ ہے۔"

"میں اب بھی تسلیم کرتا ہوں۔ وہ صمد خان میرے اندر ہمیشہ زندہ رہے گا۔ جس کمبخت کو تم نے پکڑا ہے' اسے مار ڈالو۔"

دھن راج نے پریشان ہو کر کہا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں تو اسے آپ کے حوالے کر کے اپنی بیٹی اور بیٹے کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"تمہاری کسی اولاد کا کیس میرے پاس نہیں ہے۔ وہ تو نامعلوم کے پاس ہے۔"

"یہ نامعلوم کون ہے؟ آخر آپ ہی کا کوئی ماتحت ہو گا۔"

"میرا ماتحت ہوتا تو مجھے معلوم ہوتا۔ چونکہ معلوم نہیں ہے' اس لئے نامعلوم ہے۔ میں اسے فون کرتا ہوں۔ وہ مناسب سمجھے گا تو ابھی تم سے رابطہ کرے گا۔"

فون بند ہو گیا۔ دھن راج نے ریسیور کو کریڈل پر پٹخ کر کہا۔ "وہاٹ نان سنس از دس۔ وہ کمینہ کہتا ہے کہ صمد خان بہت پہلے مر چکا ہے اور ہم بار بار صمد خان پیدا کر کے مار رہے ہیں۔"

شانتی نے کہا۔ "آپ کیسے باپ ہیں۔ اتنی دیر سے صرف صمد خان کی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ اپنی بیٹی یا بیٹے کی بات کیوں نہیں کرتے ہیں؟"

"بکواس مت کرو۔ میں اپنی اولاد کے لئے یہ سب کچھ کر رہا ہوں۔"

"آپ میرے پتی دیو ہیں۔ مجھے ڈانٹیں' مجھے ماریں' مگر میں ایک ماں بن کر اپنی اولاد کے لئے ڈائریکٹر "را" کا کلیجا نوچ لوں گی۔"

"کیا تم جھگڑا کرو گی تو ہمارے بچے یہاں آ جائیں گے؟"

وہ بولی۔ "ضرور آئیں گے۔ اُدھر ایک پٹھان مسلمان نے زبان دی ہے' اِدھر ایک ماں کہتی ہے کہ دونوں بچے زندہ سلامت رہیں گے۔ صرف ہم مریں گے' ہم.........."

فون کی گھنٹی بجتے ہی اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو' میں ورما بول رہا ہوں۔"

"اور میں ہوں نامعلوم۔ تم سے پوچھ رہا ہوں کہ کس قبرستان میں جا کر صمد خان کا مردہ پکڑ لائے ہو؟ ایک بات غور سے سنو۔ تم ایک بے قصور کامنا کی موت کا سبب بن گئے اور ابھی جس بے قصور عطاء الرحمان کو پکڑا ہے اس کے جسم پر ہلکی سی خراش نہ آنے دینا۔ اپنے ماہرین سے تصدیق کرا لو۔ اس کے چہرے سے پلاسٹک سرجری ظاہر نہ ہوئی' وہ سچ مچ عطاء الرحمان ثابت ہو گا تو اسے رہا کر دو اور ثناء الرحمان کی پوتی راضی اگر دوبارہ ٹریننگ سینٹر اور ہوسٹل جائے گی تو تمہاری موت کے بعد تمہاری بیٹی کے ساتھ بھی وہی سلوک ہو گا۔ اب یہ ریسیور اپنی وائف کو دو۔"

"تم جو کہہ رہے ہو اس پر عمل ہو گا۔ پھر میری وائف سے کیا کہنا چاہتے ہو؟"

شانتی نے جھپٹ کر ریسیور لے لیا۔ پھر کان سے لگا کر بولی۔ "ہاں' میں شانتی بول رہی ہوں۔"

"میں نے آپ کے پتی دیو کو بہت سی دھمکیاں دی ہیں۔ ان پر اسی لمحے سے عمل ہو گا۔ صرف آپ کے بچے میرے بھی بچے ہیں۔ وہ ابھی آپ کے پاس پہنچنے والے ہیں۔ فقط آپ کا نامعلوم بھائی.........."

فون بند ہو گیا۔ وہ خوشی سے ہیلو ہیلو کہہ رہی تھی۔ دھن راج نے ریسیور اس سے لے کر کان سے لگایا' پھر کہا۔ "یہ بند ہو چکا ہے' وہ کیا کہہ رہا تھا؟"

"یہی کہ جو اس نے آپ سے کہا ہے اس پر فوراً عمل کریں۔ ہمارے بچے.........."

وہ کہتے کہتے رک گئی' اس نے پوچھا۔ "ہمارے بچوں کو کیا ہوا ہے؟ تمہارے چہرے سے خوشی ظاہر ہو رہی ہے۔"

"میں ابھی کچھ نہیں کہوں گی۔ پہلے آپ میرے پٹھان بھائی کی باتوں پر عمل کریں۔"

"وہ کمبخت کب سے تمہارا بھائی ہو گیا؟"

"جب سے اس نے میری بیٹی کو اپنی بیٹی کہا ہے۔ ایسا کہنے والا آپ کی نظروں میں کمبخت ہے' میری نظروں میں دیوتا۔"

دھن راج نے فون کے ذریعے ایڈیشنل ڈائریکٹر سے رابطہ کیا' اس نے کہا۔ "پلاسٹک سرجری کے دو ماہرین نے اس کا معائنہ کیا ہے' اور کہا ہے کہ اس کے چہرے پر کبھی پلاسٹک سرجری نہیں کی گئی ہے۔ کوئی ماسک میک اپ بھی نہیں ہے۔ وہ سید ثناء الرحمان کا بیٹا عطاء الرحمان ہے۔"

دھن راج نے کہا۔ "اسے ایک ذرا سی بھی تکلیف نہ پہنچاؤ۔ فوراً رہا کر دو۔ کیا وہاں راضی ہے۔ اگر ہے تو بات کراؤ۔"

راضی کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو سر! میں راضی بول رہی ہوں۔"

وہ بولا۔ "راضی! ہم سب دھوکا کھا گئے۔ شطرنج کی بساط پر یہی ہوتا ہے۔ مہرے آگے پیچھے بھی ہوتے ہیں اور مات کھانے کے آثار بھی نظر آتے ہیں لیکن اچانک ہارنے والی بازی جیت لی جاتی ہے۔ فی الحال ہم مات کھا رہے ہیں۔ تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ ٹریننگ سینٹر اور ہاسٹل چھوڑ دو اور اپنے گھر میں جا کر اپنے بزرگوں کے سائے میں رہو۔ ورنہ ہمارے لئے اور زیادہ مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ ریسیور ایڈیشنل ڈائریکٹر کو دو۔"

ریسیور پر ایڈیشنل ڈائریکٹر کی آواز سنائی دی۔ دھن راج نے کہا۔ "شاید میرا آخری وقت آ رہا ہے۔ میرے بعد یہ عہدہ تمہیں ملے گا' میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ کبھی راضی کی طرف رخ نہ کرنا اور نہ ہی کبھی اسے ٹریننگ سینٹر کی طرف آنے کی اجازت دینا کیونکہ دشمن نامعلوم ہے۔"

اس نے ریسیور رکھا۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا۔ دھن راج کی بیٹی ہیم لتا اور بیٹا کرن راج ورما نظر آئے۔ انہیں دیکھتے ہی ماں باپ نے دوڑ کر انہیں گلے سے لگایا۔ انہیں اتنا پیار کیا جیسے وہ بچے ابھی پیدا ہو کر خوشیاں دے رہے ہوں۔ پھر بیٹی اور بیٹا دونوں الگ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے اپنے لباس سے ایک ایک ریوالور نکال لیا۔ ماں باپ نے

چونک کر انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ بیٹی نے وہ ریوالور باپ کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ بیٹے نے کہا۔ "ڈیڈی! ہم باپ بیٹے کے ہاتھوں میں ریوالور ہیں۔ نامعلوم نے یہ دونوں ریوالور دیئے ہیں اور کہا ہے کہ راضی کو اپنے بزرگوں کے خلاف استعمال کر کے آپ نے یہ تحفہ ہمیں دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ہم آپس میں فیصلہ کر لیں۔ کیا میں اپنے بزرگ باپ کو گولی مار دوں یا باپ مجھے مارے گا؟ ہمیں کسی ایک ریوالور سے گولی چلانی ہو گی۔ یہ نامعلوم کا حکم ہے۔"

ہیم لتا نے کہا۔ "شریفانہ سیاست اسے کہتے ہیں کہ اس نامعلوم نے مجھے بیٹی بنا لیا۔ ورنہ بدمعاشی پر آتا تو مجھے بھی راضی کی طرح میڈیا وار کے لئے عالمی منڈی میں بھیجنے کا اہتمام کرتا۔ گولی تو چلے گی ڈیڈی۔ کسی ایک ریوالور سے چلے گی۔"

شانتی ہنسنے لگی۔ زور زور سے قہقہے لگاتی ہوئی بیٹے کے پاس آئی' پھر اس کے ہاتھ سے ریوالور لے کر بولی۔ "جہاں سے تُو ابھی آیا ہے اور جو سبق سیکھ کر آیا ہے کہ بچوں کو اپنے بزرگوں کے خلاف استعمال نہیں کرنا چاہئے تو پھر تجھے اپنے باپ کے خلاف گولی نہیں چلانا چاہئے۔ وصیت تمہارے ماں باپ نے لکھی ہے اور شرما جی کو دی ہے۔ ان وصیتوں کے مطابق فوراً عمل کرنا' ضرور عمل کرنا.........."

یہ کہتے ہی شانتی نے پلٹ کر ایک فائر کیا۔ گولی دھن راج کو لگی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گیا پھر فرش پر گر پڑا۔ پھر شانتی نے ریوالور کی نال کو اپنی کنپٹی سے لگا کر دوسری گولی چلائی۔ ہیم لتا نے ایک چیخ ماری پھر دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔

بیٹے نے سر جھکا لیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا فون کے پاس آیا۔ پھر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے۔ رابطہ قائم ہونے کے بعد روتے ہوئے اور سسکتے ہوئے بولا۔ "شرما جی! میں کرن راج ورما بول رہا ہوں۔ ممی اور ڈیڈی کا دیہانت ہو چکا ہے۔ آپ سے پرارتھنا ہے کہ فوراً دونوں کی وصیتوں پر عمل کریں.........."

اس کے بعد وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ ریسیور چھوڑ کر بہن کے پاس آیا پھر اس سے لپٹ کر رونے لگا۔

☆-=====ختم شد=====☆